

مکمل اور طویل ترین حیرت انگیز داستان

رولو کا

3



تحریر: اے وحید

ڈرڈائجسٹ کا مشہور و معروف مکمل سلسلہ اور طویل ترین داستانِ حیرت

قسط نمبر 24 سے قسط نمبر 34 تک

نمبر ③

رولو کا

پراسرار قوتوں کا مالک

تحریر: اے وحید

ڈرپائی کیشینز

کتاب مارکیٹ نیوارڈ بازار کراچی

Ph:32744391

جملہ حقوق بحق ڈریپلی کیشنز محفوظ ہیں

رولو کا نمبر ③	نام کتاب
اے وحید	تحریر
ڈریپلی کیشنز	ناشر
خالد پرنٹرز	پرنٹر
150/-	قیمت

اسٹاکسٹ آپ کے اپنے شہر میں

- رشید نیوز ایجنسی اخبار مارکیٹ فریئر روڈ کراچی + زرباغ نیوز ایجنسی چوک یادگار پشاور
- گلزار نیوز ایجنسی اخبار مارکیٹ لاہور + اشرف بک ایجنسی کمیٹی چوک راولپنڈی
- مہران نیوز ایجنسی اخبار مارکیٹ حیدر آباد + الفتح نیوز ایجنسی مہران مرکز سکھر
- الشیخ نیوز ایجنسی حسن پروانہ کالونی ملتان + کامیاب بک ڈپو اردو بازار کراچی
- انصاری بکسٹال پرنس روڈ کوسٹہ + پاکستان نیوز ایجنسی آڈارو ڈسٹرکٹ گودھا

نیو ملک افتخار برادرز نیوز ایجنٹ

دکان نمبر 8 عرفات بزنس سنٹر کچہری بازار فیصل آباد

③ رولو کا

سب لڑکیوں کو رخصت کر دیا تھا اور سب کو اتنا دے دیا تھا کہ زندگی بھر ان کو کسی کی محتاجی نہ ہو۔

دو دنوں لڑکے جوان تھے۔ حاکم خان ہو بہو باپ پر گہا تھا، اس نے باپ کے سارے داؤ بیچ باپ سے سیکھ لئے تھے۔ جابر خان خوش تھے کہ ان کا جانشین ان کی طرح کا تھا۔ جابر خان نے بہت لوگوں کے ساتھ زیادتی کی تھی،

کچھ کی نشانیوں اپنے اپنے دلوں میں لڑکر زبردستی اپنی جاگیر میں سناں کر لی تھیں بہت لوگ جابر خان کے مرنے کی دعا میں لڑتے تھے مرموت تو اپنے وقت پر ہی آتی ہے کسی

دعا کرنے سے نہیں آتی۔ قدرت سب کو موقع دیتی ہے۔ وہ سب کو اپنے گناہوں کی سزا مانگ لے مگر تو یہ کی توقع بھی نصیب دلوں کو ملتی ہے۔

جابر خان آخری وقت تک حاکم خان کو بتاتے رہے،

اس کو کس طرح لوگوں سے سلوک کرنا ہے، اپنا رعب اور

دبیر قائم رکھنے کو کہا کرتا ہے، ہاریوں اور مزدوروں کے

ساتھ کیسا سلوک کرنا ہے، کام سخت رکھو گے تو گھوڑا قابو

میں لے کر، عورت اور گھوڑی ایک ہی طرح ہیں، دونوں پر

کنٹرول کی ایک ہی طرح ہوتا ہے۔ بڑوں کی ہنائی جاگیر میں

کچھ لکھا کرتے جاؤ گے تو یہ کبھی ختم نہیں ہوگی اسی پر کے رہو

گے تو یہ خود بخود مرنے والے ہیں۔ اس کے علاوہ جابر خان نے

اور اپنے جانشین کو بڑھایا اور وہ ہو بہو جابر خان بن گیا۔

جابر خان مر گئے۔ مگر جابر خان کے بنائے ہوئے

قوانین اور سخت ہو گئے۔ انگریز سرکار میں جابر خان کا پہلے

ہی بہت اثر و رسوخ تھا حاکم نے اس کو اور بڑھادیا۔

نشر کوئی بھی ہوا چھان نہیں ہوتا اور دولت کا نشہ تو

تمام نشہ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ شراب اور انجیون

کے نشے کا تو اتار ہوتا ہے لیکن دولت کے نشے کا اتار نہیں

ہوتا۔ یہ زندگی بھر رہتا ہے، اگر دولت نہ رہے تو بھی اس کا

خمار زندگی بھر رہتا ہے۔

یہ نشہ انسان میں غرور اور تکبر پیدا کر دیتا ہے۔

انسان خود کو بہت زیادہ طاقتور سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے

نزدیک نہ کوئی رشتہ چلائے نہ کوئی عزت داری رہتی ہے۔

وہ ہر چیز کو دولت کے ترانہ میں رکھ کر تو لے لے

مگر اسی دنیا میں کچھ ایسے بھی ہیں جو دولت مند

ہوتے ہیں مگر ان پر دولت کا نشہ نہیں پڑتا۔ ان کی زبان

بڑی نرم خوراتی ہے اور ان کا دماغ آسمانوں پر نہیں اڑتا۔

وہ انسان کو انسان ہی سمجھتے ہیں یہ لوگ عام سطح کے انسانوں

سے بلند ہوتے ہیں، ان کی تعداد کم ہے۔

پہلی بھیبت بریلی کے جابر دار جابر خان، بہت کروڑ

کے آدمی تھے۔ ان کی کئی بیویاں تھیں مگر ان سب سے

صرف دو لڑکے تھے۔ لڑکیاں بے شمار تھیں۔ دوسرا لڑکا حاکم

خان ان کی دوسری بیوی سے تھا۔ اس کا نام جابر خان

سب سے زیادہ تھا۔ دوسرا لڑکا خادم خان ان کی چوتھی بیوی

سے تھا اس کا رتبہ بھی پیدا کش کے بعد بہت بڑھ گیا تھا۔

جابر خان نے بڑے دبدبے اور رعب سے اپنی

جاگیر چلائی تھی اس کا ہر لفظ حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کے حکم

سے روگردانی کرنے والا اس کی جاگیر کی حدود میں نہیں رہ

سکتا تھا۔ وہ عمر کے آخری دور سے گزر رہا تھا اس نے اپنی

اظہار جابر خان کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔ عورت کے دل میں اگر محبت ہو تو وہ کبھی نہیں مرتی ہمیشہ زندہ رہتی ہے اور اگر نفرت ہو تو وہ کبھی ہمیشہ رہتی ہے اس کا اظہار کرنے کا موقعہ اس کو جب ملتا ہے وہ ضرور کرتی ہے۔ جابر خان کے مرنے کے بعد خادم سے اس نے کہہ دیا تھا کہ تیرا باپ ایک ظالم آدمی تھا اس نے زندگی بھر لوگوں کی نفرتیں کمائی تھیں۔ میں نے اس سے کبھی محبت نہیں کی اس لئے کہ وہ ایک خود پرست آدمی تھا۔ اس کو کسی کے دکھ کا احساس نہیں تھا۔ اس کو صرف اپنا سکھ عزیز تھا۔ تم میں میرا خون ہے میں تم کو انسان بنانا چاہتی ہوں اور خادم ماں کے مدر سے میں داخل ہو گیا اور اس میں انسانیت اور شرافت کے جراثیم پرورش پانے لگے۔ حویلی کے ماحول سے وہ کٹ گیا اور اس نے جاگیر دار حاکم خان سے رابطہ کم کر دیا مگر حویلی اور جاگیر پر ہونے والی ہر چیز پر اس نے گہری نظر رکھی۔ لوہا گرم ہوتا گیا اور جب لوہے کو برابر آنچ ملتی رہے تو اس کی گرمی بڑھتی جاتی ہے اور وہ تپ کر سرخ ہوتا جاتا ہے اور پھر لوہا اسی وقت چوٹ مارتا ہے۔ خادم بھی لوہے کے سرخ ہونے کا انتظار کر رہا تھا اور اس کے عمل کا وقت آ پہنچا۔

وقت نے کروٹ بدلی اور حاکم خان خود کو نہ بچا سکا اور اس پر برا وقت آ گیا۔ برا وقت تو تباہی پھیلاتا ہی ہے۔ دوسروں کو انتقام کا نشانہ بنانے والا خود نشانے پر آ گیا۔ پوری جاگیر میں یہ خبر گردش کرنے لگی کہ جاگیر دار حاکم خان کا داغی توازن خراب ہو گیا ہے اور اس کی جگہ جاگیر کا انتظام ان کے چھوٹے بھائی خادم خان کے پاس آ گیا ہے۔ حویلی میں کچھ ہوا ضرور مگر خادم نے ہر سازش کرنے والے کو پہلے ہی نظر میں رکھا تھا ان سب کو بلا کر کہہ دیا کہ عزت سے رہنا ہے تو رہو اگر ذرا بھی تمہاری آواز میں نے سنی تو جاگیر بدر کر دوں گا۔ حاکم کی ماں نے بہت زور لگایا مگر خادم نے اس کی زبان بھی یہ کہہ کر بند کر دی کہ تم میری ماں نہیں ہو مگر باپ کی بیوی ہو اس لئے عزت کرتا ہوں اس سے زیادہ کی امید نہ رکھنا۔ تم اپنے پاگل بیٹے کو لے کر جا سکتی ہو یہاں رہو گی تو حویلی کی عزت بن کر رہو۔

باپ نے جہاں کی چھوڑی تھی بنا پوری کرنے لگا۔ پوری جاگیر میں ظلم و ستم کے وہ کھیل کھیلے جانے لگے کہ لوگ بیزار ہونے لگے، کسی کی عزت محفوظ نہ رہی آبادی میں ہندو مسلمان دونوں تھے اور دونوں ہی جاگیر دار سے تنگ تھے۔ سارے فیصلے حاکم خان خود کرتا تھا اس کے نزدیک کوئی نہیں تھا۔ وہ کسی کی نہیں سنتا تھا۔ اس کی حویلی میں روزانہ رات بھر مردانے میں شراب و شباب کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ دور دور سے گانے والیاں آتی تھیں اور خوب کما کر جاتی تھیں۔ حاکم خان کے سارے دوست اس کے مزاج کے تھے وہ بھی بڑے لوگ تھے ان کے پاس بھی حرام کی دولت آ رہی تھی اور وہ بھی حاکم خان کی طرح بے دردی سے اس کو لٹا رہے تھے۔

حاکم خان دن رات اپنے کمرے میں شراب و شباب سے شغل کرتا رہتا۔ کئی سال گزر گئے وہ ڈوبتا گیا اور وقت نے ایک نئی کہانی لکھنا شروع کر دی۔

انسان اپنے طور پر بہت ہوشیار ہے مگر کتنی بھی ہوشیاری کر لے وقت کے فیصلے کو بدلنا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ وقت کے بدلنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ حاکم خان کی عیاشیوں کا سب کو پتہ تھا۔ جابر خان کچھ کم نہ تھے مگر انہوں نے لوگوں کے گھروں کو جلا یا تھا اپنے گھر کو آگ سے دور رکھا تھا مگر حاکم خان اس آگ کو دور نہ رکھ سکا اور سب سے پہلی چنگاری خادم خان کو لگی۔ خادم خان پڑھا لکھا تھا اور اس کو باپ کے مدر سے میں پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

اس کی ماں ایک سمجھ دار عورت تھی جابر خان نے اس کے باپ کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس سے صرف اس لئے شادی کر لی تھی کہ وہ ایک حسین عورت تھی۔ جابر خان اپنی جاگیر کی ہر اچھی چیز پر اپنا حق جتنا تھا اور اس کو حاصل کرتا تھا اگر راضی خوشی سے نہ ملے تو زبردستی حاصل کر لیا کرتا تھا۔ خادم کی ماں بھی اسی طرح جابر کی حویلی میں آئی تھی۔ جابر خان اس کے جسم کا مالک تو ضرور بن گیا تھا مگر اس کے دل کے اندر تو اس کے خلاف نفرت بھری تھی۔ اس نے اس کا

”مگر میرا بیٹا پاگل نہیں ہے، تم نے اس کو پاگل قرار دے دیا ہے۔“ وہ بولی۔

”اس نے لوگوں کی عزت کا خانہ خراب کر دیا۔ حویلی کی عزت خراب کر کے بدنام کر دیا۔ غریب ہاریوں کے منہ سے نوالہ جھین لیا، یہ کیا ہے، یہ پاگل پن نہیں ہے، اس کو صرف اپنی ذات نظر آتی ہے، اس کو جاگیر کو برباد کرنے میں اب کتنے دن رہ گئے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں جولوا اس کے خلاف پک رہا ہے وہ اس کے ساتھ ساتھ ہم سب کو بہا کر لے جائے گا، وہ جو کچھ کر رہا تھا وہ ایک پاگل آدمی ہی کر سکتا تھا، تم اس کی ماں ہو تم نے اس کو نہیں بتایا کہ وہ کیا کر رہا تھا، اب میں جو کر رہا ہوں تم مجھے بتانے آئی ہو کہ وہ پاگل نہیں ہے، وہ بہت خطرناک پاگل ہے آج کے بعد تم بھی اس کے قریب نہ جانا میرا حکم ہے، اس کے قریب کوئی نہیں جائے گا، یہی اس کا علاج ہے اگر اب بھی مرض قابو نہیں آیا تو آگرہ کے پاگل خانے میں داخل کرادوں گا۔“

خادم نے سب کی آواز کو اپنے سلوک سے دبا دیا۔ جاگیر کے قوانین میں تبدیلی ہوگی، ظلم و ستم کے کالے قانون ختم کر دیئے گئے، ہر شخص کو اس کی محنت کے اعتبار سے معاوضہ ادا ہونے لگا۔ ہاریوں اور کسانوں میں نئی زندگی آگئی۔ پہلے ڈروخوف کی جو فضا تھی وہ ندرہی، لوگ خوش سے محنت کرنے لگے اور ان زمینوں پر بھی کاشت ہونے لگی جن کو ویران کر دیا گیا تھا۔

حاکم خان کے پرانے ساتھی جو اس کے ہاتھ پیر تھے ایک ایک کر کے جاتے رہے ان کی جگہ خادم خان کے ملازم آتے گئے، ہرنے آدمی کو پتہ تھا کہ خادم کس مزاج کا آدمی ہے۔ خادم خان نے سخت تاکید کر رکھی تھی کہ کوئی ملازم کسی ہاری کسان سے کچھ وصول نہیں کرے گا جو اجبات کرنے ہوں وہ حویلی آئے گا اور وہاں پر اسی کام کے لئے آدمی مقرر تھا وہ وصول کرے گا اور ان کی شکایات بھی سننے گا۔

حویلی میں صرف خاندان کے لوگ رہیں گے کسی غیر کو ایک رات بھی قیام کی اجازت نہیں ہوگی۔ اگر اس کی

ضرورت پیش آئے تو خادم خان کی اجازت ضروری ہوگی۔ حاکم خان کو دو کمرے دیئے گئے تھے مگر ان دونوں کمروں کا دروازہ ایک تھا اس کی ضروریات وہیں پر پوری کر دی جاتی تھیں، باہر آنے کی اجازت اس کو نہ تھی، کوئی ملازم اس سے بات چیت کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا اور اگر حاکم ان سے بات کرتا تھا تو ملازم اس کو جواب نہیں دیتا تھا۔ یہی اس کی سزا تھی۔ اس کی زندگی اس کو گزارنی تھی۔

اس کی ماں نے بہت شور مچایا پھر خادم سے درخواست بھی کی مگر خادم پر اس کی خوشامد اور دباؤ کا کچھ اثر نہ ہوا وہ اپنی جگہ چٹان کی مانند جم رہا، وہ تو شاید کچھ پکھل جاتا مگر اس کی کمان اس پر سخت تھی کیونکہ اس نے تو ماضی میں ان کی سختیاں برداشت کی تھیں۔

”اب بہت ہو گیا۔ یہ چوہے بلی کا کھیل ختم کر۔“ ایک دن خادم کی ماں نے خادم سے کہا۔

”کیا ہوا ماں جی صاف صاف بات کریں۔“ خادم بولا۔

”تو سانپ کو کب تک پالے گا۔“ کوہ بولی۔
”آپ کس کی بات کر رہی ہیں۔“ خادم نے پوچھا۔

”میں حاکم خان کی بات کر رہی ہوں۔ سپیر اسانپ کو پٹاری میں بند کرنے سے پہلے اس کا زہر نکال دیتا ہے اور جو سپیرے اپنی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی وجہ سے ایسا نہیں کرتے وہ ایک نہ ایک دن ضرور نقصان اٹھاتے ہیں۔“ ماں نے کہا۔

”میں اس کا زہر ہی تو نکال رہا ہوں۔“ خادم بولا۔
”تیرا عمل بہت لمبا اور دشمن کو موقع دینے والا ہے۔“ ماں نے کہا۔

”بے شک یہ درست ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی میرے مزاج کے خلاف ہے۔“ خادم بولا۔

”مجھے اپنے مزاج میں کچھ تبدیلی کی ضرورت ہے تو جابر خان کا بیٹا ہے اس کے نام سے لوگ کانپتے تھے۔ تو وہ نہ کر جو وہ کرتا تھا مگر جاگیر داری نہ زیادہ سختی سے چلتی ہے

اور نہ زیادہ نرمی فائدہ مند ہے، اپنے دونوں کاموں میں توازن تو قائم کرنا ہوگا۔“ ماں نے کہا۔

”ماں جی، میں اس سے زیادہ اس کے ساتھ کیا کروں، آخر وہ میرا بھائی ہے مانا کہ سوتیلا ہے مگر میرے باپ کا بیٹا تو ہے۔ اس نے جو کچھ کیا تھا اس کی سزا وہ بھگت رہا ہے اب اور کیا کروں۔“ خادم بولا۔

”تو اس کی ماں کو بھول رہا ہے، وہ کمرے میں بند نہیں ہے وہ تو آزاد ہے جاگیر میں گاؤں، گاؤں پھرتی ہے وہ لوگوں کے کانوں میں پھونک رہی ہے کہ حاکم خان بالکل ٹھیک ہے پاگل نہیں ہے، اس کو تم نے ملا جب پاگل بنایا ہوا ہے، اس جاگیر کا مالک بننے کے لئے۔“ ماں نے کہا۔

”اس کے اس طرح کہنے سے کیا فرق پڑے گا اس کے کروت لوگوں کو ابھی تک یاد ہیں۔“ خادم بولا۔

”یہ درست ہے مگر کچھ لوگ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور بات آگے بڑھتی جاتی ہے تم کبھی یہ گمان نہ کرنا کہ سب تمہارے دوست ہیں، ذرا گہری نظر سے دیکھو گے تو تم کو دو مستوں میں کچھ دشمن بھی نظر آجائیں گے۔ دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔“ ماں جی بولیں۔

”ماں جی آپ کے تجربے نے مجھے ہمیشہ فائدہ پہنچایا ہے میں آپ کی بات پر غور کروں گا۔“ خادم بولا۔

”اب غور کرنے کا وقت نہیں ہے عمل کا وقت ہے۔“ ماں نے کہا۔

”آپ بتائیں میں کیا کروں۔“ خادم نے پوچھا۔

”حاکم کو فوراً اس حویلی سے دور کر دو، میرا خیال ہے اس کو آگرہ لے جاؤ اور پاگل خانے میں داخل کر دو، ٹھیک کرنے کو نہیں پاگل کرنے کو، اس کے لئے تم کو کچھ جتن کرنے پڑیں گے مگر نوٹوں کی گڈیاں انسان کا دماغ آسان پر پہنچا دیتی ہیں، تم کسی بھی ڈاکٹر کو گڈیوں کا دیدار کرادو گے تو وہ تمہارا مطلب پورا کر دے گا۔“ ماں نے کہا۔

”مگر یہ تو بڑا ظالمانہ عمل ہوگا ماں جی۔“ خادم بولا۔

”تم جاگیر دار جابر خان کے بیٹے ہو، اس نے تمہاری

ماں کے ساتھ کیا ظلم کیا، تم کو میں بتا نہیں سکتی۔ اس نے اس زمین پر رہنے والوں کے ساتھ کیا کیا تم کو پتہ نہیں ہے۔ اس کے بعد تم اس کے بیٹے حاکم خان کے دور کے تو خود گواہ ہو، تم نے تو کچھ کیا ہی نہیں، ان دونوں کے مقابلے میں تم بہت نیک مشہور ہو مگر تم کو یہ کرنا ہے اگر نہیں کرو گے تو تم پچھتاؤ گے۔ تم اگر اس پر رحم کرو گے تو یاد رکھو وہ ایسا زہریلا سانپ ہے جو تم کو قاتل رحم بنادے گا۔“ ماں نے کہا۔

”ٹھیک ہے ماں جی، میں آپ کو جھٹلا نہیں سکتا۔“

خادم خان بولا۔

”تو پھر آگرہ کا تم پہلے ایک چکر لگاؤ آگرہاں پر کام نہ بنے تو بریلی کا چکر لگاؤ ہاں پر بھی بہت بڑا پاگل خانہ ہے۔ اس کام کو ادیت دو۔“ ماں نے کہا۔

اور خادم آگرہ روانہ ہو گیا، مگر اس نے وہاں پر کسی سے ملاقات نہ کی اور پندرہ دن کے بعد واپس آ گیا۔ ماں نے پوچھا تو وہ بولا۔

”ماں جی بہت بڑا پاگل خانہ ہے۔ کسی پاگل کو داخل کرنے سے پہلے کسی ڈاکٹر معائنہ کرتے ہیں اور پھر فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ پاگل ہے کہ نہیں، میں نے جوتوڑ کرنے کی کوشش کی مگر وہ شہر آگرہ ہے کوئی پہلی ہیئت کی ہماری جاگیر نہیں ہے، کسی ڈاکٹر نے حامی نہیں بھری اس لئے دو چار روز کے بعد بریلی جاؤں گا وہ تو قریب ہی ہے شاید یہاں پر کچھ کام بن جائے۔“

ماں کے اصرار پر وہ بریلی بھی گیا مگر وہاں پر بھی اس نے کسی سے بات نہیں کی اور واپس آ گیا۔ وہ اپنے بھائی پر اور سوتیلی ماں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس کی ماں اس کو پوری جاگیر کا مالک بنانا چاہتی تھی اور وہ اس صورت میں ممکن تھا کہ حاکم خان درمیان سے ہٹ جائے۔

حاکم خان قید تھائی میں تھا اور اس سے ملاقات پر بھی پابندی تھی۔ ایک دن اچانک اس کے پاس خادم چلا گیا کمرے کے اندر جا کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ حاکم خان پتک پر لیٹا تھا۔ خادم کو دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”تم کچھ بھی کرلو، میری زندگی میں تم اس جاگیر کے مالک نہیں بنو گے۔“

میرے ایک اشارے پر یہ کمرہ تیری قبر بن سکتا ہے اور تیری ماں جو میرے خلاف گھر گھر جا کر پروپیگنڈہ کر رہی ہے وہ بھی تجھ کو اس قبر سے نہیں نکال سکتی۔ یہ آخری بات تھی جو میں نے تجھ سے کر لی، جو فیصلہ ہو مجھے بتادینا۔ ایک ہفتہ انتظار کروں گا۔ اس کے بعد میں فیصلہ کروں گا۔ پھر تیری کوئی بات میں نہیں سنوں گا۔“ خادم خان اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ ہر معاملے میں اپنی ماں سے رائے لیتا تھا مگر اس معاملے میں اس نے اب تک ماں سے بات نہیں کی تھی وہ شملہ چلا گیا۔ وہاں پر اس نے ایک بنگلہ خرید اس میں کچھ کام کر لیا وہ چار ملازم رکھے اور واپس آ گیا۔ ایک ہفتہ گزر گیا اور وہ حاکم خان کے کمرے میں چلا گیا۔

”میں تیرا فیصلہ سننے آیا ہوں۔“ خادم نے جاتے ہی کہا۔
 ”میں حویلی سے جانا نہیں چاہتا۔“ حاکم خان نے کہا۔
 ”تم کل رات حویلی میں نہیں گزارو گے۔“ خادم

بولے۔

”میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔“ حاکم غصے سے بولا۔
 ”تمہاری انگوٹھی نہیں مگر تم کو وہی کرنا ہے جو میں چاہتا ہوں تم ایک پاگل آدمی ہو، تمہاری بات کون سنتا ہے، تم دولت کے نشے میں پاگل ہو چکے ہو، میں علاج کرانا چاہتا ہوں تمہارا۔“ خادم نے کہا۔
 ”زیادہ ہوشیار مت بن، میں دنیا کو بتا دوں گا کہ

میں پاگل نہیں ہوں۔“
 ”جو شخص انسان کو انسان کا درجہ نہ دے، رشتوں کے تقدس کو نہ جانے، کسی کی مجبوری کا سودا کرے۔ غریب کو مار کر خوش ہو، اس کو میں پاگل کہتا ہوں۔ میں تمہارے اسی پاگل پن کا علاج کرانا چاہتا ہوں۔ تم میری یہ بات یاد رکھنا کہ جاگیر میں تمہارا ایک بھی ہمدرد نہیں ہے، جو تمہارے خریدے ہوئے لوگ تھے۔ تمہارے اشارے پر ظلم و ستم کا بازار گرم کرتے تھے ان کو میں نے بھگا دیا ہے، میں تم کو جہاں پہنچا رہا ہوں وہاں سکون سے رہو اور کوشش کرو کہ انسان بن جاؤ۔ اگر تم نے واپس آنے کی کوشش کی

”مجھے پتہ ہے تم ایک پاگل آدمی ہو، پاگل آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے، وہ کسی کی جان لے سکتا ہے اور کسی طرح خود بھی مر سکتا ہے، تمہارے مرنے کے بعد میں پوری جاگیر کا اکیلا مالک بن سکتا ہوں۔ مگر میں نے آج تک پوری جاگیر حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی، تم میری جگہ ہوتے تو ذرا دیر نہ کرتے، یہ اپنی اپنی فطرت کی بات ہے، مجھ میں باپ کی فطرت کے ساتھ ساتھ ماں کے اثرات بھی ہیں۔“ خادم بولا۔

”زیادہ پارسائی کی ضرورت نہیں تو کب تک مجھے قید رکھے گا آخر ایک دن میں آزاد ہو ہی جاؤں گا۔“
 ”تم آج اور اسی وقت قید سے آزاد ہو سکتے ہو۔“ خادم بولا۔

”کوئی نئی چال، تیری ماں نے تجھے بتائی ہے۔“ حاکم نے کہا۔
 ”میں نے ماں کی کوئی بات نہیں مانی، ماننا تو شاید اس دنیا میں نہ ہوتا، تو میرا بڑا بھائی ہے میں تیرے ساتھ انصاف کرنا چاہتا ہوں۔“ خادم نے کہا۔
 ”یہ ہرگز نہ کرنا اس کے بدلے مجھ سے کچھ امید نہ رکھنا۔ میرے باپ میں بہت خرابیاں لوگ بتاتے ہیں مگر اس میں یہ خوبی بھی ہے کہ وہ چھپ کر دار نہیں کرتا تھا۔ دشمن کو لاکار کر ہوشیار کرتا تھا پھر وار کرتا تھا۔ میں اس کی ہو بہو کاپی ہوں۔“ حاکم خان بولا۔

”میں چاہتا ہوں تو زندہ رہے۔۔۔۔۔ میں تجھے جاگیر کی آمدنی سے آدمی آمدنی دینے پر تیار ہوں مگر تو جاگیر پر نہیں رہے گا تیرا رہنا لوگ پسند نہیں کرتے، تو ان سب کی تکلیف کا باعث ہے، تجھے عیاشی کرنا ہے تو شہر میں کر، یہاں پر تیری حکومت نہیں چل سکتی، تو کسی غریب کی لڑکی کو اٹھا کر نہیں لاسکتا، تیرے اخراجات بھی آمدنی کے اندر رہیں گے۔“ خادم نے کہا۔
 ”تو پوری جاگیر ہڑپ کر جائے اور میں شہر میں تیرا محتاج بن رہا ہوں۔“ حاکم بولا۔
 ”تو نے جو کچھ لب تک کیا ہے ذرا اس پر بھی غور کرنا

تو پھر نقصان کے تم خود ذمہ دار ہو گے۔“ خادم نے کہا۔
☆.....☆.....☆

حاکم خان کو ایک بندگان کی فہرست میں شاملہ روانہ کر دیا۔
اس کے ساتھ خادم خان کے کئی وفادار بھی گئے، سب کو یہی
پتہ تھا کہ حاکم خان خطرناک پاگل ہے، کبھی اچھی باتیں
کرتا ہے، مگر سب کو اس سے دور دور رہنے کا کہہ دیا تھا،
اس کی باتوں پر دھیان ہرگز نہیں دینا تھا۔ پاگل آدمی پر
اعتبار ہرگز نہیں کرنا تھا۔

حاکم خان کے کمرے میں کوئی چیز ایسی نہیں رکھی
جس کو وہ بطور ہتھیار استعمال کر سکے۔ کسی بھی عورت کا
داخلہ بنگلے میں بندھا اور کھانا بھی مرد ہی پکاتا تھا۔

یہ بات اس کی ماں کو کب تک پتہ نہ چلتی۔ وہ
دوسرے دن سخت غصے کے عالم میں خادم کے پاس پہنچی اور
بولی۔ ”تو نے میرے بیٹے کو کہاں بھیجا ہے اور مجھے بھی نہیں
بتایا۔“

”اس کا مرض یہاں رہ کر بڑھتا جا رہا تھا، اس لیے
میں نے اسپتال میں داخل کر دیا۔“ خادم نے کہا۔
”وہ بیمار کب تھا، تو نے اس کو پاگل بنایا ہوا تھا۔“ وہ
بدستور غصے سے بولی۔

”وہ سخت بیمار تھا تم کو اندازہ نہیں۔“ خادم نے کہا۔
”مجھے بھی اس کے پاس جانا ہے۔“ وہ بولی۔
”ابھی تمہاری ضرورت نہیں ہے جب ضرورت
ہوگی میں بھیج دوں گا۔“ خادم بولا۔

میں تمہاری ماں کے برابر ہوں تمہاری پابند نہیں ہوں،
مجھے بتاؤ وہ کس اسپتال میں ہے میں خود چلی جاؤں گی۔“ اب
اس کی آواز میں پہلے والا غصہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔

”میں نے کہہ دیا ہے کہ ضرورت پڑنے پر میں خود
آپ کو اس کے پاس روانہ کر دوں گا۔“ خادم نے کہا۔

”مجھے پتہ ہے تم اس کو مار ڈالو گے۔“ وہ بولی۔
”اگر مارنا ہوتا تو یہاں مجھے کون روک رہا تھا۔“

خادم بولا۔

”تم بڑے نیک نام مشہور ہو۔ اس نیک نامی کو

بچانے کو جاگیر سے دور مرواؤ گے تاکہ تمہارا نام نہ آئے
اور جاگیر پوری تمہاری ہو جائے۔“ عورت بولی۔
”میں تمہاری سوچ کو بدل نہیں سکتا، مگر میرا ایسا کوئی
ارادہ نہیں ہے۔“ خادم نے کہا۔

عورت نے جواب نہیں دیا۔ مگر اس کے چہرے
کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مطمئن نہیں تھی۔

خادم نے شملہ کے بنگلے میں ایسا بندوبست کیا تھا کہ
اس میں کوئی باہر کا آدمی نہیں آ سکتا تھا اور نہ ہی حاکم خان
کسی سے ملاقات کر سکتا تھا۔ گیٹ پر ہر وقت چوکس
پہرے دار موجود رہتا تھا۔ بنگلے کے اندر کئی ذمہ دار
ملازمین موجود تھے۔ کھانے پینے کی فراوانی تھی اور تمام
ملازمین کو اچھی تنخواہوں پر رکھا گیا تھا۔

خادم کی ماں سمجھ رہی تھی کہ حاکم کو پاگل خانے میں
داخل کر دیا گیا ہے۔۔

حاکم کی ماں سخت بے چین تھی۔ اس کو یقین تھا کہ
خادم اس کے بیٹے کو مروا دے گا۔ پہلے تو اس نے حویلی
میں جوڑ توڑ کرنے کی کوشش کی مگر اس میں وہ کسی طرح
کامیاب نہیں ہوئی تو وہ دلی روانہ ہو گئی، دلی میں اس کی
ایک دور کی رشتے کی ایک بہن رہتی تھی۔ دونوں بچپن میں
ساتھ رہی تھیں اس کا نام کنیر تھا۔

اس نے اپنی پوری داستان کنیر کو سنائی، خود کو اور
اپنے لڑکے کو مظلوم ظاہر کیا۔ اور بہت سی باتیں وہ گول
کر گئی، خاص طور سے حاکم خان کے کردار کے بارے میں
اس نے خوب جھوٹ بولا۔ کنیر اس کی بچپن کی سہیلی تھی اس
نے اس کی باتوں کو کچھ مان لیا اور بولی۔

”یہ تمہارا سوتا بیٹا کیا بہت ظالم ہے۔“

”ارے بڑا چال باز ہے اور اس کی ماں تو پوری فتنہ
ہے، سارا کیا دھرا اس کا ہے وہی بیٹے کو پٹی پڑھاتی رہتی
ہے۔“ وہ بولی۔

”اچھا رضیہ تو یہ بتا جب تیرا بیٹا جاگیر دار تھا تو
سارے لوگ اس سے خوش تھے۔ یہ تیرا سوتا بیٹا اور اس

کی ماں بھی خوش تھے۔“

ساتھ دے گی تو تیرا بھی اللہ بھلا کرے گا، حاکم کو پتہ چلے گا تو وہ بھی تیرا احسان مانے گا۔“ رضیہ نے کہا۔

”پہلے تو یہ پتہ کرنا ہے کہ حاکم خان، ہندوستان کے کس پاگل خانے میں ہے۔“ کنیز نے کہا۔

”ہاں یہ بہت ضروری ہے۔“ رضیہ بولی۔

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پاگل خانے میں نہ رکھا گیا ہو۔“ کنیز نے کہا۔

”اور کہاں رکھے گا، اس نے اس کو پاگل قرار دے کر ضرور کسی پاگل خانے میں ہی رکھا ہوگا۔ اتنا نیک نہیں ہے کہ کسی بنگلے میں رکھے۔“ رضیہ بولی۔

”پہلے تو سب پاگل خانوں کو دیکھنا ہوگا، اس کے بعد بات آگے چلے گی۔“ کنیز نے کہا۔

”ارے یہ تو بہت لمبا چکر پڑ جائے گا۔“ رضیہ نے کہا۔

”تو پھر ایسا کرتے ہیں حکیم صاحب سے ملنے ہیں۔“ کنیز بولی۔

”حکیم کیا کرے گا۔“ رضیہ حیرت سے بولی۔

”لال کونیں پر ایک حکیم صاحب ہیں ان کے پاس ہر قسم کا علاج ہے۔ بڑے بڑے الجھے ہوئے مسئلے حل کر دیتے ہیں، ان سے ملاقات کرتے ہیں۔“

اور وہ دونوں خواتین میرے سامنے موجود تھیں۔

میں نے رولو کا کی موجودگی میں رضیہ نامی عورت کی پوری کہانی سنی اس کی کہانی میں بہت جھول تھا، کہیں وہ مظلوم نظر آتی تھی اور کہیں پر ظالم، اس کا بیٹا بھی مظلوم کم اور ظالم زیادہ لگتا تھا، اس کا اسرار تھا کہ جاگیر اس کے بیٹے کو واپس مل جائے۔

پوری روداد سننے کے بعد میں نے کہا۔

”دیکھئے محترمہ، ہم اپنے طور پر آپ کے بیان کی سچائی کو پرکھیں گے۔ اگر آپ پر ظلم ہوا ہے۔ تو ضرور آپ کی مدد بھی کریں گے۔ ابھی آپ صرف ہمیں پہلی بھیت میں آپ کی جاگیر کہاں پر ہے بتادیں۔ حاکم خان کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ یہ سب ہم خود پتہ چلائیں گے

”جاگیر چلانا بڑا مشکل کام ہے۔ کنیز سب کہاں خوش ہوتے ہیں، جس کو ذرا بداد و دشمن بن جاتا ہے۔

گاؤں کے لوگوں کو اتنی سمجھ کہاں ہوتی ہے کہ اپنا اچھا برا سمجھ سکیں۔ دوستی دشمنی تو گاؤں میں ہوتی رہتی ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہاں حویلی میں اس کٹنی نے نہ جانے کیا چکر چلایا کہ ایک دم سب پھر گئے اور اس کا وہ سپولیا پوری حویلی پر چھا گیا اور حاکم کو بند کر دیا اور پاگل مشہور کر دیا، نہ کسی ڈاکٹر کو بلایا نہ حکیم کو اور کر دیا مشہور کہ حاکم خان پاگل ہے اور سب نے جان لیا، بتاؤ اس سے بڑا اندھیر تم نے نہیں دیکھا ہے۔“ رضیہ بولی۔

”تیری بات تو ٹھیک ہے مگر وہ آخر جاگیر دار تھا، اس کے وفادار بھی ہوں گے، انتظام کرنے والے بھی ہوں گے۔ وہ سب کیوں خاموش رہے۔“ کنیز نے پوچھا۔

”وہ عورت بڑی مکار ہے، اس نے نہ جانے کیا چکر چلایا تھا کہ کسی کی آواز اس کے خلاف نہ نکلی۔ سب ٹکر کلوڈ دیکھتے رہے بس۔“ رضیہ بولی۔

”اور تم نے بھی کچھ نہ کیا۔“ کنیز نے پوچھا۔

”میں کیا کرتی حاکم کو بند کرنے کے بعد تو میرے ہاتھ ہی کٹ گئے۔ پھر میری کون سنا، میں نے گاؤں گاؤں جا کر لوگوں کو بتایا کہ حاکم پاگل نہیں ہے میرا ساتھ دو، مگر کسی نے نہیں سنا کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔“ رضیہ نے بتایا۔

”وہ لوگ نئے جاگیر دار سے خوش تھے۔“ کنیز نے پوچھا۔

”لگتا تو ایسا ہی تھا۔“ رضیہ آہستہ سے بولی۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ حاکم خان سے خوش نہیں تھے۔ اس کی کچھ وجہ بھی ہوگی۔“ کنیز نے پوچھا۔

”مجھے کیا پتہ کیا وجہ ہوگی، میں تو گھر میں رہنے والی عورت ہوں۔“ رضیہ اصل بات گول کر گئی۔

”جل ٹھیک ہے تو میری بچپن کی سہیلی ہے مجھے تو تیرا

بنی ساتھ دینا ہے۔“ کنیز نے کہا۔

اور پھر جو مناسب ہوگا کریں گے۔ ہمارا طریقہ کار ذرا مختلف ضرور ہے مگر ہم صرف مظلوم کی مدد کرتے ہیں۔“

”میں آپ کے پاس اپنی مدد کو آئی تھی۔“ رضیہ نے کہا۔

”آپ کی ہی مدد کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔“ میں نے کہا۔

”پھر میں کب آؤں۔“ وہ بولی۔

”آپ حویلی چلی جائیں، ہم آپ سے وہیں پر ملاقات کریں گے۔“ میں نے کہا۔
دونوں عورتیں چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد رولوکا نے کہا۔
”عورت کا یہ کہنا کہ میں تو اپنی مدد کو آئی تھی۔ مجھے شے میں ڈال رہا ہے۔“

”اور مجھے بھی اس کے بیان میں صداقت نظر نہیں آتی۔“ میں نے کہا۔

”معاملہ کچھ اور ہی لگتا ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”اب کیا خیال ہے تمہارا۔“ میں نے رولوکا سے

پوچھا۔

”اب تو سچائی کی ناپ تول کرنا ہی پڑے گی۔“

رولوکا بولا۔ اور رولوکا پہلی بھیت روانہ ہو گیا۔

میں ایک ڈاکٹر کے روپ میں جاگیر میں داخل ہوا اور جاگیر دار سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ حویلی کے باہر جو لوگ تھے انہوں نے مجھے بڑی آسانی سے جاگیر دار کے پاس پہنچایا، جاگیر دار ایک جوان آدمی تھا اس نے اپنا نام مجھے خادم خان بتایا۔

تو یہی وہ ظالم ہے جس نے اپنے بڑے بھائی کو پاگل قرار دے دیا ہے۔ میں نے دل میں سوچا، مگر شکل سے تو یہ بزازم خوار و ملنسار نظر آتا ہے۔

”ڈاکٹر صاحب آپ نے دلی سے آنے کی زحمت

کیوں اٹھائی؟“ وہ بولا۔

بات یہ ہے خادم صاحب کہ ڈاکٹری میرا پیشہ کم اور

شوق زیادہ ہے۔ میں روپیہ کمانے کو یہ کام نہیں کرتا، میں اپنے شوق کی خاطر یہ کرتا ہوں اور دماغی مریضوں کا علاج کرتا ہوں، دلی میں مجھے ایک عورت نے بتایا تھا کہ اس قسم کا کوئی مریض آپ کی حویلی میں ہے تو میں اپنے شوق کی وجہ سے چلا آیا۔ آپ مجھے اس مریض سے ملوادیں شاید میں اس کے لئے کچھ کر سکوں۔“ میں نے جاگیر دار کو جواب دیا۔

”بہت خوب..... بتانے والی وہ عورت مقامی تھی۔“ وہ بولا۔

”نہیں وہ آپ کی سوتیلی ماں اور مریض کی سگی ماں تھی اس کا نام رضیہ تھا۔“ میں نے بتایا۔

”آپ کو اس نے بڑی لمبی کہانی سنائی ہوگی۔“ خادم خان نے کہا۔

”مجھے اس کہانی سے کچھ غرض نہیں ہے اور نہ ہی میں اس جھگڑے میں پڑنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب یہ ہمارے خاندانی جھگڑے ہیں۔ یہ آپ اپنا شوق کہیں اور پورا کر لیں، مریض یہاں پر نہیں ہے اگر ہوتا تو میں ضرور ملاقات کر دیتا۔“ خادم خان نے کہا۔

”آپ کی مرضی اور میں حویلی سے باہر آ گیا۔ باہر آتے ہی میں روپوشی کی حالت میں چلا گیا۔

اور پھر دوبارہ حویلی کے اندر چلا گیا اب مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

خادم خان ایک کمرے میں داخل ہوا، کمرے میں ایک بوڑھی عورت موجود تھی۔ اس نے جاتے ہی کہا۔ ”امی ایک نئی کہانی سنانے آئی ہے۔“

عورت بولی۔ ”اب کیا ہوا؟“

ایک ڈاکٹر آیا تھا کہتا تھا اس کو دلی میں آپ کی سوتن نے بتایا ہے کہ ایک پاگل حویلی میں ہے۔ وہ ڈاکٹر اس کو دیکھنے آیا ہے۔“ خادم نے بتایا۔

”تم میری بات مان لیتے تو فائدے میں رہتے۔ تم نے اسے پاگل خانے کا پتہ بتادیا ہوگا جہاں وہ ہے۔“

”تمہاری رحمدلی، میری سمجھ میں نہیں آتی، تم جاگیر دار جابر خان کی تو اولاد لگتے ہی نہیں ہو۔“ عورت نے غصے سے کہا۔

کہ جاگیر سے دور کر دوں، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کروں گا۔“ خادم خان نے کہا۔
یہ تو کچھ اور ہی کہانی لگتی ہے۔ جس کو ظالم کہا گیا تھا وہ ظالم نہیں تھا جس کو مظلوم بتایا گیا تھا وہی ظالم لگتا تھا۔ رضیہ نامی عورت کی کہانی میں اور اصل کہانی میں بہت فرق تھا۔

اب مجھے حاکم خان کی تلاش تھی، ہر دس پندرہ دن کے بعد خادم خان، مریض کے پاس جایا کرتا تھا۔ یہ بات بھی مجھے اس کی باتوں سے پتہ چلی تھی۔ میں خادم کے ساتھ لگا ہوا تھا اور ایک روز خادم گاڑی سے روانہ ہوا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کی منزل شملہ کا ایک جنگل تھا۔ گیٹ پر ایک چاک وچو بند جوان کھڑا تھا، اس نے خادم کو دیکھ کر گیٹ کھول دیا اور گاڑی پورج میں کھڑی ہو گئی، حاکم کے گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی دو تین جوان آ دی اس کے پاس آ گئے۔

خادم نے اترتے ہی پوچھا۔ ”کیا حال ہے سہن۔“

سہن ایک جوان مرد تھا۔ آگے بڑھ کر بولا۔

”سب ٹھیک ہے سرکار۔“

”کوئی نئی خبر کوئی آیا تو نہیں۔“ خادم نے کہا۔

”نہیں سرکار سب ہوشیار ہیں۔ آکون سکتا ہے۔“

سہن بولا۔

”حاکم سو رہا ہے کہ جاگ گیا ہے۔“ خادم نے پوچھا۔

”جاگ رہے ہیں سرکار..... آج کل کم ہی سوتے ہیں۔ سہن بولا۔

”اچھا تم دروازے پر رکو میں اندر جاتا ہوں۔“ اور

خادم ایک کمرے کے اندر داخل ہوا یہ ایک بہترین کمرہ تھا، اس کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ بہت شاندار

فرنیچر پڑا تھا اور فرش پر بہترین ایرانی قالین تھا، کھڑکیوں پر پردے تھے اور لوہے کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک

بہت بڑی میز پڑی تھی اور اس پر کتابوں کا ریک رکھا تھا

”امی آپ کی بات کسی حد تک درست ہے، میں حاکم خان نہیں بن سکا، جابر خان نہیں بن سکا۔ اس کے باوجود اس جاگیر کے لوگ مجھ سے خوش ہیں جو کام وہ ظلم اور زبردستی سے کراتے تھے۔ میں نے محبت اور اچھے بولوں سے وہ کام کرائے۔ یہ تو اپنا اپنا طریقہ کار ہے امی۔“ خادم بولا۔

”مگر تمہارا طریقہ کار حاکم اور اس کی ماں کے معاملے میں ٹھیک نہیں ہے یہ دونوں تمہیں کبھی نہ کبھی بہت بڑا نقصان پہنچائیں گے۔“ عورت نے کہا۔

”میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔ میں حاکم خان نہیں بن سکتا۔ میں جانتا ہوں میں اگر حاکم کی جگہ ہوتا تو ضرور واقعی پاگل ہوتا وہ میرا بھائی ہے اس جاگیر کا آدھا مالک ہے میں اس کو اس کا پورا حق دینا چاہتا ہوں۔ صرف ذرا سا اس کو سبق دینے کو یہ سب کر رہا ہوں۔ میں اس کو مارتا بھی نہیں چاہتا۔“ خادم نے کہا۔

”امی زندگی میں کیا ہونے والا ہے، کس کو پتا ہے۔

مگر میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا کہ لوگ مجھے اچھے الفاظ

میں یاد نہ کریں میں اپنے باپ اور بھائی کے لگائے زخموں کو

لوگوں کے جسموں سے ٹھیک کرنا چاہتا ہوں، لوگ میرے

باپ کو بھول جائیں اور مجھے یاد رکھیں، میں یہ چاہتا ہوں اور

چند سال کے بعد وہ ضرور بھول جائیں گے۔ اگر حاکم خان

بھی یہی کرتا تو میں اس کا ہاتھ بٹاتا۔ اس کا ساتھ دیتا مگر وہ تو

باپ کے ظلموں سے بھی آگے جا رہا تھا۔ اس نے اس حویلی

کو طوائف کا کھانا بنا دیا تھا۔ گاؤں کی کسی لڑکی کی عزت محفوظ

نہیں تھی۔ اگر میں آگے نہ آتا تو کیا یہ جاگیر قائم رہتی، باپ

کا گڑھا ایک نہ ایک دن تو بھرنا تھا۔“ خادم بولا۔

”میں نے تم کو نہیں روکا تم سب کی بھلائی کرو۔ مگر

اپنی طرف بھی نظر کرو مجھے صرف تمہاری سلامتی عزیز ہے۔

تم نے آستین میں سانپ پال رکھا ہے۔ وہ تم کو ضرور

کانٹے گا ایک دن۔“ عورت نے کہا۔

”اگر میری موت اس کے کانٹے سے ہونا لکھی ہے تو ٹھیک ہے مگر میں اس کے خلاف صرف اتنا کر سکتا ہوں

نکل جائیں گی۔“ خادم نے کہا۔
 ”تم خود کو آسمان سے اترا فرشتہ سمجھو۔“ حاکم
 نے کہا۔

”نہیں میرے اندر بھی ضرور خرابیاں ہیں، مگر میری
 خرابیاں میرا نقصان کرتی ہیں۔ مخلوق خدا کو نقصان نہیں
 پہنچا۔ مگر میں پھر بھی ان خرابیوں پر شرمندہ ہوں۔“ خادم
 نے کہا۔

”تیری چکنی چڑی باتیں مجھ پر اثر نہیں کریں گی۔
 تیرے اور تیری ماں کے ڈرامے میں جانتا ہوں۔“ حاکم بولا۔
 ”آپ یقین کریں نہ کریں۔“ آپ کا فعل ہے مگر
 میں نے اب تک جو کیا ہے صدق دل سے کیا ہے۔“ خادم
 بولا۔

”تو پھر مجھ پر لگی پابندیاں ختم کر اور مجھے جاگیر
 جانے دے۔“ حاکم بولا۔

”ابھی آپ کے اندر جاگیر داری کی بوموجود ہے،
 جاگیر مگر جا کر آپ پھر عوام الناس کی زندگی اجیرن
 کر دو گے۔ آپ نے اب تک اپنا محاسبہ نہیں کیا، اپنی
 کمزوریوں پر نظر نہیں کی، بھائی صاحب ایک شے ہوئی
 ہے ایمان، آپ نے شاید اب تک نہیں سنا۔ آپ اپنے
 ایمان کو داغ دار کرتے رہے ہیں۔ آپ نے صرف ظلم کیا
 ہے۔ یاد رکھیے کہ آپ کو بھی خدا کے پاس ایک دن جانا
 ہے۔ وہاں پر کچھ کام نہیں آئے گا۔ اپنی عاقبت سنواری
 ہے تو زندگی کا رخ بدلنا ہوگا۔ ایمان کا دامن تھامنا ہوگا۔
 فرض کے تقاضے پورے کرنا ہوں گے اور اگر آپ نے خود
 کو برائے خول میں پیک کر لیا تو یاد رکھیں میری طبیعت بھی
 بدل سکتی ہے۔ جب مالی کسی درخت سے مایوس ہو جاتا
 ہے، وہ کوشش کے بعد بھی اس پر پھول پھل نہیں اگا پاتا تو
 وہ اس درخت کو کاٹ کر لکڑی جلا ڈالتا ہے۔ میں اس سے
 زیادہ صاف اور کیا کہوں، ابھی وقت آپ پر مہربان ہے،
 کیا پیٹہ آنے والا کل مہربان نہ ہو۔“

اور خادم کمرے سے باہر آ گیا۔ حاکم خان نے اس
 کو حیرت سے جاتے ہوئے دیکھا، مگر بولا نہیں۔

اور اس میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ میز کے کنارے ایک
 جوان آدمی بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔
 اس نے نظریں اٹھا کر آنے والے کو دیکھا، مجھے تو
 وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔

اس کی نظر میں غفرت کی چنگاریاں نظر آنے
 لگیں۔ چہرے پر تناؤ کے آثار بھی آ گئے۔ اس نے
 کھڑے ہو کر غفرت بھری آواز میں کہا۔

”تیری تنہا پوری نہیں ہوگی تو جاگیر دار نہیں بن سکتا
 میری زندگی میں، یہ بات یاد رکھنا۔“
 ”مجھے خوب یاد ہے۔ میں نے آپ کو کسی بری نیت
 سے نہیں رکھا ہے۔“ خادم بولا۔

”میرے کمرے سے باہر جانے پر پابندی ہے۔
 میں قیدی ہوں تیرا اور تیری نیت صاف ہے، کیوں ڈرامہ
 کرتا ہے۔ میں نے تجھ سے پہلے اناج کھایا ہے تجھ سے
 زیادہ تجربہ رکھتا ہوں۔“ حاکم بولا۔

”وقت ایک جیسا نہیں رہتا زندگی میں تغیرات آتے
 جاتے ہیں۔ میں اگر آپ کو مارنا چاہتا تو جاگیر پر مار دیتا،
 تجھے کون روکتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا، آپ نے زندگی
 میں کبھی کوئی کام ایسا کیا ہے جس کو لوگ اچھا کہیں، یاد
 کریں۔ میں آپ کے لگائے زخموں کا علاج ابھی تک کر رہا
 ہوں اور چاہتا ہوں آپ اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیں۔
 اپنے گناہوں کی معافی اللہ سے مانگیں، میں آپ کا دشمن
 نہیں ہوں آپ ہی جاگیر دار ہیں۔ مگر جو انداز آپ نے
 اپنائے تھے وہ انسانیت اور مذہب کے خلاف تھے۔

میں نے آپ کو موقعہ دیا ہے کہ خود کو سدھار لیں،
 اگر نہیں سدھارے گا تو یاد رکھیں وقت بہت ہولناک و
 بھیانک عفریت ہے۔ یہ انسان کو سالم نگل جاتا ہے۔
 غفرت کی کھیتی کرنے والے زیادہ دن پھل نہیں کھاتے۔
 انسانوں سے محبت کا جذبہ تمام طبقاتی نسلی اور علاقائی
 جذموں اور مصلحتوں سے بلند ہوتا ہے۔ خود کو زمین پر رہنے
 والے انسانوں کے برابر خیال کرو، خود کو ان سے اونچا
 خیال نہ کرو تو بہت خرابیاں خود بخود آپ کے اندر سے

لگائے زخموں کا علاج کر دیا ہے۔

☆.....☆.....☆

بزرگ کہتے ہیں آدمی خود پریشانیاں خریدتا ہے۔
سیدھی اور آسان زندگی نہیں گزارتا، بھینس اور کشمش پیدا کرتا ہے۔

اگر وہ سرمایہ دار ہے تو اس کی پریشانیاں بھی اس معیار کی ہوتی ہیں۔ اگر غریب ہے تو اس کی پریشانیوں اس کے معیار کی ہوتی ہیں۔ بچوں والا ہے تو اس کو ان کی فکر میں بیوی کے اخراجات کی فکر، گھر کے کرائے کی فکر اور نہ جانے کتنی فکریں، اس کی زیادہ تر فکریں معاشی ہوتی ہیں۔ جو معاشی تفکرات سے آزاد ہیں ان کو اپنی دولت کو بڑھانے کی فکر ہے۔ ایک فیکٹری سے دوسری فیکٹری لگانے کی فکر ہے۔

وہ ایک بیوی گھر میں رکھتا ہے اس سے اولاد پیدا کرتا ہے اس کی بیوی کو کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھ نہیں سکتا، بیوی کے معاملے میں وہ بڑا جذباتی ہوتا ہے۔ اس کی غیرت فوراً جوش میں آ جاتی ہے۔ گھر کے باہر بھی وہ ایک محبوبہ رکھتا ہے اور اس سے محبت کا ڈھونگ رچاتا ہے۔ یہ سارے کام رنگ رنگ کے نوٹوں کے ذریعہ کرتا ہے۔ اس کی محبوبہ بھی جانتی ہے کہ وہ اس کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ مگر وہ بھی خاموش اس سے ڈرا ہے کہ برداشت کرتی ہے۔ اگر نہ کرے تو پھر کھائے کیا۔ اپنی بگڑی عادتوں اور فضول خرچیوں کے لیے کس کے پاس جائے۔

ہر دور میں ایسے کردار رہے ہیں اور رہیں گے۔

سیٹھ گردھاری لال کان پور کے کئی ملوں کے مالک تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑا مالک چند گردھاری ان کی پہلی بیوی سے تھا۔ مالک چند کی پیدائش کے دس سال بعد تک گردھاری لال کے دوسری اولاد نہیں ہوئی تو سیٹھ گردھاری نے ایک اور عورت کو بیوی بنا کر رکھ لیا۔ روپے پیسے کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا، اس عورت سے بھی ایک لڑکا پیدا ہوا اس کا نام راجن چند رکھا گیا۔ راجن چند مالک چند سے بارہ سال چھوٹا تھا۔

اس کے باہر آتے ہی سلمان نے دروازہ بند کر دیا۔ اب پوری کہانی میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں خادم کے ساتھ ہی جاگیر پر آ گیا اور ایک دیہاتی کے روپ میں گاؤں گاؤں پھر لگا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ حاکم خان اور اس کا باپ جابر خان بہت ظالم آدمی تھے۔ ان کے لگائے زخم لوگ اب تک برداشت کر رہے تھے۔ مگر خادم نے ان زخموں پر مرہم رکھا تھا۔ غریب کسانوں پر جو قرض تھے وہ معاف کر دیئے تھے۔ ان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے ہوئے ہر قسم کی سہولت دے دی تھی، ان کو عزت کا مقام دینے کو ان کے ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا تھا۔ ہر کوئی اس کے پاس آ سکتا تھا، اس نے اپنے اور کسانوں، ہاریوں کے درمیان کوئی آدمی نہیں رکھا تھا کچھ روز میں لوگ اس پر جان دینے کو تیار تھے۔ گاؤں میں خوشیاں نظر آتی تھیں۔ ڈر خوف کی جو فضاء حاکم خان نے قائم کی تھی ختم ہو رہی تھی۔

رولو کا جس کے خلاف کچھ کرنے آیا تھا، اس کے حق میں تھا۔ یہ بھی زندگی کا ایک نیا تجربہ تھا۔ حاکم خان اور خادم خان دونوں ایک باپ کی اولاد، مگر دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق، دونوں دریا کے دو کنارے یہاں پر رولو کا کیا کرے۔

اور پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا اور میں ایک مولوی کے روپ میں خادم سے ملا اور اس کو ساتھ لیکر میں مشملہ حاکم خان کے پاس آ گیا اور یہیں پر قیام پذیر ہو گیا۔ میں نے ہر طرح کوشش کی کہ حاکم خان کے اندر سے جاگیر دار کو نکال دوں، مگر میں کچھ نہ کر سکا۔ اگر کوئی جن بھوت ہوتا تو میں اس سے لڑتا، جنگ کرتا، مگر وہ جاگیر دار تھا اور جاگیر دار بھی خطرناک حد تک بگڑا ہوا، وہ بقول خادم خان کے انسانوں کے لیے سخت خطرناک تھا۔ پھر میں نے وہ نام کیا جو مجھے سخت ناپسند تھا۔ حاکم خان واقعی پاگل و گیا۔ اور اس کی حالت کو دیکھ کر ڈاکٹروں نے کہا یہ طرناک پاگل ہے۔ حاکم خان آگرہ کے پاگل خانے زیر علاج ہے اور خادم خان پہلی بھیت میں اپنی جاگیر کے لوگوں کی خدمت کر کے بڑے بھائی اور باپ کے

کے اندر لڑھی ہیں۔ لندن نوپوری صرح اندازہ تھا لال کی شخصیت کا جادو کیا چیز ہے۔ گردھاری اس کے پاس آتا تو وہ روشنی کو بھول جاتا۔

کندن دسترخوان سجاتی تو اس میں سادگی اور وقار ہوتا وہ باد بہار کے معطر جھونکے کی طرح گردھاری لال کے وجود پر چھا جاتی اور کندن کی زلفوں کے سائے میں گردھاری لال سارے دن کی تفکرات سے نجات پالیتا، کندن کا طریقہ روشنی سے ہر طرح الگ تھا۔ رات کو وہ کبھی گردھاری سے فرمائش یا ضرورت کی بات نہیں کرتی تھی۔ وہ صبح ناشتے پر جو ضرورت ہوتی بناتی تھی اور اس طرح بناتی تھی کہ جیسے وہ گردھاری کی فرمائش پر بتا رہی ہے۔ گردھاری نے اس کا کہا کبھی نہیں ٹالا تھا۔ وہ دونوں کی ضروریات سے واقف تھا۔

گردھاری لال کو روشنی کی ہر بات اچھی لگتی تھی۔ مگر یہ بات کہ وہ اس کے آتے ہی اپنی ضرورت اور فرمائش رکھ دیا کرتی اور پوری کرواتی تھی۔ جو کہ گردھاری کو پسند نہیں تھی، لیکن اس خرابی کو وہ اس لئے درگزر کر دیا کرتا تھا کہ اتنی خوبیوں میں ایک آدھ خرابی تو ہوتی ہی ہے۔

ماک چند، دلی میں ایک ہوٹل میں رہتا تھا۔ اس کی عمر پندرہ سال ہو چکی تھی۔

راجن چند، ماک چند سے بارہ سال چھوٹا تھا۔ وہ ابھی تک کسی اسکول میں داخل نہیں ہوا تھا۔

ماک چند باپ پر گیا تھا۔ اس کا رنگ زیادہ صاف نہیں تھا۔ مگر ماں کے نفوش اس کو خوبصورت بناتے تھے۔ دلی کے ہوٹل میں اس پر بڑی پابندی تھی، جس کمرے میں وہ رہتا تھا، اس کے برابر کے کمرے میں گردھاری ایک ملازم رہتا تھا اس کا کام ماک چند کی دیکھ بھال کر تھا، اس کے کھانے پینے کا خیال کرنا تھا۔ اور بلاوجہ ک مصروفیات سے اس کو روکنا بھی تھا۔ ماک چند کا تعلیم معیار اچھا تھا۔

گردھاری کے کاروبار میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ملو کے علاوہ بھی اس کے اور بہت کاروبار تھے۔ وہ ایک

ایک بڑے مکان میں ان سب کی رہائش بھی نوکر چاکر تھے۔ دونوں بیویوں کو ان کا جیب خرچ بھی خوب ملتا تھا۔ دونوں پر کوئی پابندی بھی نہیں تھی۔ گردھاری لال سارے دن کاروباری مصروفیت میں مصروف رہتا تھا۔ اس کو رات تک سر اٹھانے کی فرصت نہیں تھی۔ مگر دونوں عورتیں اس پر شک کرتی تھیں۔ بڑی سمجھتی تھی کہ یہ چھوٹی کے پاس ہے اور چھوٹی کا شبہ بھی یہی رہتا تھا۔ عورت عورت پر اعتبار نہیں کرتی اور سونکوں کا معاملہ ہوتا بات اور زیادہ سنگین ہو جاتی ہے۔

بڑی کا نام کندن ہے، وہ کسی بڑے گھرانے کی عورت نہیں ہے۔ گردھاری سبھ سے اس کی شادی بھی ایک جذباتی فیصلے کی وجہ سے ہو گئی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کندن ہزار عورتوں میں ایک عورت ہے، اس کا قد، رنگ اور نفوش سب ہی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔

مگر مرد کی فطرت کہ وہ نئی منزلیں، نئے راستے تلاش کرتا رہتا ہے۔ پرانی چیزوں کو چھوڑ کر نئی کی طرف بھاگتا ہے۔ یہ مرد کی فطرت تو ہے مگر بعض مرد تو چیزیں تبدیل کرنے کے عادی ہوتے ہیں، ان میں ان کے تصرف میں آئی عورتیں اور گاڑیاں بھی ہوتی ہیں۔

عورت اور گاڑی میں فرق ہے۔ گاڑی کیرج میں کھڑی کر دی دروازہ بند کر دیا، وہ کھڑی ہے۔ مگر عورت کے ساتھ یہ نہیں ہوتا۔ عورت ایک زبان رکھتی ہے ایک مقام رکھتی ہے۔ اور یہاں تو دونوں نے ایک ایک ہتھکڑی گردھاری لال کے ہاتھ میں ڈال دی تھی۔ دونوں کا پلہ برابر تھا۔ دونوں کے حقوق برابر تھے۔

دوسری کا نام روشنی تھا، یہ بھی کچھ کم حسین نہ تھی، مگر قد میں مار کھاتی تھی۔ لیکن اس کی وارسی اور خود سپردگی گردھاری کو بہت پسند تھی وہ کم عمر بھی تھی اور حسین بھی۔

حسین ہونا ایک اچھی بات ہے، کندن عمر میں زیادہ ضرور تھی لیکن اس کی شخصیت میں بالکل اس قدر زیادہ تھا کہ وہ جس محفل میں ہوتی اس پر چھا جاتی تھی۔ مرد تو مرد عورتیں بھی اس کی طرف حسرت سے دیکھتی تھیں اور دل

ویسے تو گردھاری بھی بیٹے کو کم خرچ روانہ نہیں کرتا مگر کندن نے تو حد سے زیادہ دے کر اس کو غلط راہوں پر ڈال دیا تھا۔ وہ لندن میں بڑے فخر سے لوگوں کو بتاتا تھا کہ وہ بہت بڑے مل اور کارینا ہے۔ اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ کسی معاملے کو شدیدگی سے نہیں لیتا تھا۔ اس کی نظر سطحی تھی۔ مگر وہ ایک کڑیل جوان تھا، اس کے نقوش تیکھے اور جاذب نظر تھے۔ وہ ایک بھرپور مرد تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک عیش کوش غیر ذمہ دار اور سطحی مزاج کا شخص تھا۔ اس کے نزدیک زندگی ایک کھیل تماشہ تھی وہ سونے کا چیمہ من میں لیکر پیدا ہوا تھا، اس نے زندگی کے سخت مقام تو دیکھے ہی نہیں تھے۔ اس کا جسم خوبصورت تھا، قد اور چہرہ بھی پرکشش تھا۔ مگر اس کا دماغ تیز نہیں تھا۔

انسان کا جسم اور چہرہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا، ان کے ساتھ دل اور دماغ، جذبات، نظریات کا بھی حسین ہونا ضروری ہے۔ ایک مکمل انسان ہر طرح سے مکمل ہوتا ہے، مگر لوگ کہتے ہیں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے، تو پھر میں کہوں گا کہ انسان کو انسان تو کم از کم ہونا چاہئے۔

پانچ سال لندن میں رہنے کے بعد بھی وہ کوئی قابل ذکر ڈگری نہ لے سکا۔ لندن نے اس کو شراب نوشی سکھائی، عورتوں کے ساتھ عیش کرنا سکھایا اور بیدردی سے خرچ کرنا سکھایا۔

گردھاری نے اس کو واپس بلانا چاہا تو اس نے آنے سے انکار کر دیا۔ گردھاری کو بہت دکھ ہوا۔

”میں اس کو یہاں پر کچھ دینا چاہتا تھا مگر اس نے آنے سے انکار کر دیا، تم نے مایک کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس کو چوری چھپے تم بڑی بڑی زمیں بھیجا کرتی تھیں، اس نے وہاں پر کچھ نہیں پڑھا، وہ عیاشی کرتا رہا ہے۔ مگر اب میں دیکھتا ہوں وہ عیاشیاں کیسے کرے گا۔ میں اس کو ایک روپیہ بھی نہیں بھیجوں گا اور تم بھی نہیں بھیجو گی۔ مفت کے مال سے اس نے خوب عیاشی کر لی، میں نے اس کو پڑھنے بھیجا تھا، اس کی رپورٹ آگئی ہے۔ اس نے کچھ نہیں پڑھا۔ اس نے بھی پوری کلاس انٹیڈ نہیں کی۔“

پیدا انٹی پو پاری تھا۔ وہ جس کا رو بار کو کرتا تھا اس میں اس کو پتہ ہوتا تھا کہ منافع ہوگا کہ نہیں، اس نے اب تک گھائے کا کاروبار نہیں کیا تھا۔ اس کی تجربہ کار نگاہیں اپنے کارندے مقرر کرنے میں کبھی غلطی نہیں کرتی تھیں، اس کی ہر فیکٹری اور کاروبار کا ایک منیجر تھا اس کو وہ بھرپور معاوضہ دیتا تھا مگر خفیہ طریقہ پر ایک آدمی اور رکھتا تھا جو منیجر پر بھی نظر رکھتا تھا۔ وہ آدمی صرف اس کو رپورٹ کرتا تھا اور کوئی اس کی اصل حیثیت سے واقف نہیں ہوتا تھا۔

اس طریقہ کار سے ایک اضافی بوجھ تو ضرور تھا مگر اس کی نظر میں صورتحال ضرور رہتی تھی۔ وہ ایک ایک ماہ نہیں جاتا تھا، باہر بھی چلا جاتا تھا مگر رابطہ اس کا رہتا تھا۔ اس کے ہر دفتر میں اضافی کام کرنے والے موجود تھے۔

اس طرح گھر میں بھی اس کے مقرر کردہ ملازم موجود تھے۔ وہ ایک ایک بل کی خبریں دیا کرتے تھے۔ یہ اس کا خود ساختہ نظام تھا اور وہ اس میں کامیاب تھا۔ مایک چند لندن جا چکا تھا اور راجن اسکول میں پڑھ رہا تھا۔

راجن چند اپنی ماں پر گیا تھا۔ مگر قد باپ کا تھا، وہ کسی طرح مایک چند سے کمتر نہ تھا۔ مزاج کا نہایت سنجیدہ اور خاموش طبیعت، زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا کم بولتا تھا اور زیادہ کام کرتا تھا۔ اپنے اسکول میں کھیل کود میں سب سے آگے تھا اور اپنی عمر سے زیادہ کا لگتا تھا۔

لندن میں مایک چند پڑھ کر رہا تھا اور عیش زیادہ کر رہا تھا۔ اس کے مشغلے انگریزوں والے تھے۔

ہندوستان میں اس نے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا مگر یہاں پر وہ خوب پیتا تھا۔ نئی نئی لڑکیوں سے دوستی کرتا تھا اور رات رات بھران کے ساتھ ہوٹلوں میں داد عیش دیتا تھا۔ اس کو بگاڑنے میں اس کی ماں کندن کا بڑا ہاتھ تھا وہ اس کی ہر فرمائش پوری کرتی تھی اور مایک چند کی فرمائش روپے کی ہوتی تھی۔ گردھاری کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا اور بہت بڑی رقم کندن بیٹے کو بھیج دیا کرتی تھی۔

”پھر وہ اپنا گزارہ کس طرح کرے گا۔“ کندن نے پوچھا۔

”کندن میں رہنا چاہتا ہے تو خود کمائے گا۔“ گردھاری نے جواب دیا۔

”میں اس سے بات کروں گی ابھی تم اتنا سخت قدم نہ اٹھاؤ۔“ کندن نے کہا۔

”کرو بات میں تم کو منع نہیں کرتا۔“ گردھاری بولا۔

”اس کا خرچ تو روانہ کر دو۔“ کندن نے کہا۔

”تم پہلے بات کرو، اس کے بعد میں غور کروں گا۔“

گردھاری بولا۔

دوسرے دن کندن نے مامک سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر فون نہیں ہو سکا۔

اب صرف خط ہی ایک ذریعہ تھا اس نے ایک تفصیلی خط روانہ کر دیا اور جواب کا انتظار کرنے لگی۔ ست ڈاک کا نظام اس زمانے میں بہت سست تھا۔ جواب آنے آنے میں ایک ماہ لگ گیا۔

مامک چند نہ نہایت گھٹیا الفاظ باپ کے لیے استعمال کئے تھے اور صاف الفاظ میں واپس آنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور آخر میں دھمکی دی تھی کہ میں اپنا حصہ عدالت کے ذریعہ وصول کر سکتا ہوں۔ کندن اس کا خط پڑھ کر شرمندہ ہوئی تھی، اس نے وہ خط چھپا دیا اور گردھاری کو کہہ دیا کہ اس نے آنے سے انکار کیا ہے۔ مگر وہ کچھ بن کر آنا چاہتا ہے۔ اس لیے شرمندگی کے مارے ابھی نہیں آ رہا ہے۔ گردھاری نے کہا۔ ”مجھے تمہاری بات کا اعتبار نہیں ہے تم مجھے خط دکھاؤ میں خود پڑھنا چاہتا ہوں۔“

کندن نے خط اس کے حوالہ کر دیا اور خود اٹھ کر چلی گئی۔

گردھاری خط پڑھ کر حیران رہ گیا۔ ”میرا خون اتنا خراب نکلے گا۔“ اس کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

اس نے غصے میں خط کے پرزے پرزے کر دیئے۔

”اب آئندہ تو کان پور نہ آنا۔ یہاں پر تیرا کوئی

نہیں ہے۔“ گردھاری نے جواب لکھ دیا۔ اور کندن کو کہہ دیا۔ ”تم بیٹے اور پتی میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو۔ اگر بیٹا پسند ہے تو تم اس کے پاس لندن چلی جاؤ، میں تم کو پہنچائے دیتا ہوں، مگر میرے نام کا منگل ستر اتار کر جانا۔ اور اگر پتی کے ساتھ رہنا ہے تو بیٹے کا نام کبھی زبان پر مت لانا اور یاد رکھو کہ تمہاری ہر حرکت میرے سامنے رہے گی، تم کسی قسم کا رابطہ اس حرام خور سے نہیں کرو گی اور اگر کیا تو پھر تمہارا ٹھکانا یہ گھر نہیں ہوگا، میرا نام گردھاری ہے میرے فیصلے بار بار نہیں ہوتے۔ میں دیر میں فیصلہ کرتا ہوں مگر کرنے کے بعد بدلتا نہیں، میرے باپ نے ایک چھوٹی سی فیکٹری مجھے دی تھی، آج میرے پاس درجنوں فیکٹریاں ہیں، ملک کے گوشے گوشے میں میرے دفتر ہیں، ہزاروں آفیسر کام کرتے ہیں۔ یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ میں جو فیصلہ کرتا ہوں، جو وعدہ کرتا ہوں اس کا پالن کرتا ہوں، قائم رہتا ہوں۔ میں تم کو یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم سمجھ جاؤ کہ میں مامک کے بارے میں اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کروں گا۔ اس کے لیے عدالت کا دروازہ کھلا ہے۔“ گردھاری نے کہا۔

”اس نے بڑی بھول کی ہے، میں مانتی ہوں یہ سب

اس کو نہیں لکھتا تھا، مگر وہ نادان ہے کسی نے اس کو غلط راہ دکھائی ہوگی، اگر اس میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو وہ ہرگز یہ نہ لکھتا، تم اپنے فیصلے پر ذرا غور تو کرو۔“ کندن نے کہا۔

”میں غور نہیں کروں گا تم اس کو میرا فیصلہ لکھ دو، اس کے جواب آنے پر تم مجھ سے بات کرنا۔“

گھر میں کندن اور گردھاری واقف تھے کہ کیا ہو رہا تھا اور کیا ہونے والا تھا۔ گردھاری نے کسی کو نہیں بتایا تھا اور کندن تو کسی کو بتا ہی نہیں سکتی تھی۔

راجن چند بنارس چلا گیا تھا وہ ہیں پر پڑھ رہا تھا، روشنی کو گردھاری نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ مگر اس نے اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر بنارس جانا شروع کر دیا تھا۔ یہاں پر اس نے آدمی مقرر کر دیئے تھے جو راجن کے بارے میں روزانہ رپورٹ دیتے تھے۔ راجن کا ریکارڈ بڑا

کیونکہ وہ ماں کے آسرے پر قرض لے رہا تھا، ماں کا خط پا کر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس پر جان نثار کرنے والی لڑکیاں اور دوست ایک ایک کر کے دور ہونے لگے۔ قرض وصول کرنے والے روز آنے لگے۔ آمدنی رہی نہیں اور خرچ قائم تھا۔

سر پر قرض کا بوجھ، آخر وہ ایک نہایت گھٹیا ہوٹل میں کام کرنے لگا۔ وہاں پر اس کو گھر سے گرا کام کرنا پڑ رہا تھا اور وہ کئی سال کے لیے پابند کر دیا گیا۔ جب تک قرض پورا نہیں ہو جاتا اس کو یہ ذلیل کام کرنا تھا۔ اس نے ماں کو جواب نہیں دیا۔

قرض اتنا تھا کہ وہ مزید پانچ چھ سال ادا کرنا رہتا تو بھی پورا نہ ہوتا، جن پر اس نے یہ رویہ خرچ کیا تھا ان کا اب دور دور پتہ نہیں تھا۔ سارے دوست ہوا ہو چکے تھے۔ اب اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

راجن نے اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی اور وہ بمبئی آفس میں بیٹھتا تھا۔ بمبئی آفس Export کا کام کرتا تھا، راجن نے بڑی جلدی Export کا کاروبار سمجھ لیا تھا۔ اس کے بعد کان پور کی فیکٹریاں بھی اس نے چیک کر لی تھیں، گردھاری کے کاندھے کا دھاوا بوجھ اس نے کم کر دیا تھا۔

وہ پورے بھارت میں پھرتا تھا۔ پہلے یہ کام گردھاری کرتا تھا مگر اب راجن چند گردھاری یہ کام کر رہا تھا، گردھاری کا پور میں ملوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

کندن بیٹے کے غم میں کھل کھل کر ختم ہو گئی۔ مگر اس خود دار عورت نے شوہر سے لفظ شکایت نہیں کیا۔ بیٹے نے پلٹ کر ماں باپ کی خبر نہیں لی۔

راجن کی شادی ہو گئی اور گردھاری لال بھی اچانک بھگوان کے پاس چلے گئے۔

راجن چند گردھاری پوری انڈسٹری کے مالک و مختار تھے۔ ان کا کاروبار اور پھیل گیا تھا۔ راجن نے باپ کے بنائے طریقوں پر پوری طرح عمل کیا تھا۔ اس کی کسی انڈسٹری میں سیاست نہیں تھی۔ مذہب کا بھید بھاؤ نہیں تھا۔ سب برابر تھے۔ قابلیت کی بنیاد پر نوکری ملی تھی اور

صاف تھا، وہ نہ صرف پڑھائی میں بلکہ ہر قسم کے گیم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا اور اپنے کالج کا ایک بہترین اسپورٹس مین تھا۔ اس کی صحت بھی قابل رشک تھی اور کردار بھی قابل تقلید تھا۔ مگر گردھاری نے اس پر آدمی لگائے رکھے، ایک بھول وہ کر چکا تھا دوسری بار وہ پچھلی غلطی کو دہرائی نہیں چاہتا تھا۔ اب اس کی امیدوں کا مرکز راجن چند ہی تھا۔

کندن کے لیے یہ بڑے دکھ کی بات تھی کہ اس کا بیٹا دودھ میں سے کبھی کی طرح نکال دیا گیا تھا۔ اور سون کا بیٹا منظور نظر ہو رہا تھا۔ وہ ماں تھی اپنے بیٹے کے لیے کسی بھی انداز میں سوچ سکتی تھی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ مانک چند کو کسی نے کچھ نہیں کہا، اس نے لاکھوں روپیہ باپ سے لے کر اور لاکھوں خود اس سے لے کر بر باد کر دیا اور کچھ پڑھ کر نہیں دیا۔ واپس آنے کی بجائے باپ کو دھکی دے ڈالی اور عدالت میں بلانے کے بارے میں لکھ دیا، اس نے ذرا نہیں سوچا کہ وہ اب تک لندن میں کس کا کھار ہا تھا، عیاشیاں کس کے پیسے سے کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے زاویے اتنی جلدی بدل گئے کہ باپ اس کو دشمن نظر آنے لگا۔

کندن نے بیٹے کو سارے حالات لکھے اور پھر لکھا۔ ”یہ سارے حالات تمہارے خلاف ہیں، تم نے لندن میں رہ کر کچھ نہیں کیا تم خود ان حالات کے ذمہ دار ہو۔ میں تمہارے باپ سے کیا شکوہ کروں، اس نے باپ ہونے کا پورا حق ادا کیا ہے تم ہی ناقص نکلے تو کوئی کیا کرے۔ اگر تم خاموشی سے واپس آ جاتے تو بھی میں تم کو ان سے معافی دلا دیتی، مگر تمہارا خط انہوں نے پڑھ لیا ہے۔ مجھے حیرت ہے تم صرف پانچ سال میں اتنے بدل گئے کہ باپ کو دشمن سمجھنے لگے۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں بیٹے کا ساتھ دوں گی، میں اپنے پتی کی بے عزتی کرنے والے کسی شخص کو ہرگز ہرگز منہ نہیں لگاؤں گی۔ جب تک باپ تجھ سے راضی نہیں ہوگا تیری ماں بھی تجھ سے نہیں ملے گی۔“

مانک چند تو ماں پر ہی بھولتا تھا۔ وہ یہ خط پڑھ کر حیران رہ گیا۔ اس کی پریشانیوں میں ایک دم اضافہ ہو گیا

کرو گے۔“ وہ بولا۔

”بیٹے تو تم ہو مگر تم ایسے بیٹے ہو جس نے اپنے باپ کو کوئی سکھ نہیں دیا، کوئی خوشی نہیں دی۔ تم نے اپنی ماں کو تڑپا تڑپا کر مار دیا، تم کس منہ سے خود کو ان کی اولاد کہتے ہو۔ راجن نے کہا۔

”اس سے میرے حق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔“ مانک

چند بولا۔

”بہت پڑتا ہے مگر تم خود پرست آدمی ہو، تم نے کسی کے جذبات کا خیال نہیں کیا۔ تم اب بھی نہ آتے۔ تم کو باپ کی دولت اور روپے کا لالچ یہاں لایا ہے۔ مگر گدھاری سیٹھ اتنا بے وقوف نہیں تھے، انہوں نے پہلے ہی سب انتظام کر دیا ہے۔ تم اس انڈسٹری میں سے ایک روپیہ بھی نہیں لے سکو گے، باپو نے مرنے سے پہلے ہی سب کچھ میرے نام کر دیا تھا۔ میں اس کا تنہا مالک ہوں، تمہارے بارے میں انہوں نے تمام اخبارات میں اشتہار چھپوا دیا تھا کہ مانک چند میرے مرنے کے بعد آئے تو اس کو کچھ نہ دیا جائے، اس لیے کہ میں نے اس کو اپنی وراثت سے خارج اس کے خراب چال چلن کی وجہ سے کر دیا ہے۔ ہندوستان کی عدالتیں کھلی ہیں تم جاؤ اور میرے خلاف مقدمہ دائر کرو اور اب دوبارہ میرے دفتر مت آنا۔ تم باپ کے نہیں ہوئے، ماں کے نہیں ہوئے تو سو تیلے بھائی کے کب کچھ ہو سکتے ہو۔“

مانک چند کرسی پر پہلو بدل بدل کر راجن کی بات

سناتا رہا پھر بولا۔

”تم اس طرح مجھ سے جان نہیں چھڑاؤ گے، میں آدھی جائیداد اور کاروبار کا مالک ہوں۔ وہ تم کو دینا ہوگی، میں ضرور کیس کروں گا، تم اتنی آسانی سے یہ سب ہڑپ نہیں کر سکو گے۔“ وہ غصے سے اٹھ کھڑا ہوا اور سخت غصے میں بولا۔ ”میں نے بڑے بڑوں کو لندن میں سیدھا کر دیا ہے تم ہو کیا چیز، تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ بیٹھ کر بات کر لو۔“

”باپو نے مرنے سے پہلے کہا تھا کہ میں تم سے کوئی

بات نہیں کروں گا۔ اس لیے تم جاؤ۔“ راجن نے کہا۔

ترقی ملتی تھی۔ سب آفیسروں اور منیجروں کو سیٹھ کی پالیسی کا پتہ تھا، سب اس پر عمل کرتے تھے جو نہیں کرتے تھے وہ گدھاری کے نہیں رہتے تھے۔ یہ کاروباری نقطہ اس کے باپ نے اس کو بتایا تھا۔

دس سال گزر گئے۔

راجن چند گدھاری کی تین اولادیں ہوئیں، دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ بچوں کی تربیت اس سے خالص ہندوستانی طرز پر رکھی اور ان پر کڑی نگاہ اس کی تھی۔

اس کا ہیڈ آفس بمبئی آفس تھا اور وہ خود بھی وہیں پر رہتا تھا اور اسی دفتر میں بیٹھتا تھا۔

وہ دفتر پہنچایا تھا کہ اس کے سیکریٹری نے بتایا کہ ایک آدمی ملنا چاہتا ہے۔ مگر اس نے ملنے کی وجہ نہیں بتائی ہے۔

راجن چند نے اس کو بلالیا۔ وہ شخص سرخ سفید تھا اور ڈاڑھی کالی تھی، اس کا قد لامبا تھا اور آنکھیں سرخ تھیں، ایسا لگتا تھا کہ وہ کچھ نشہ کئے ہوئے ہے۔ وہ اس کے سامنے کرسی چھینچ کر بڑی لاپرواہی سے بیٹھ گیا۔ راجن چند کو ایسا لگا جیسے اس کو اس نے کبھی دیکھا ہے، مگر یاد نہیں آیا کہ وہ کون ہے، چند منٹ خاموش رہی پھر مانک نے کہا۔

”میں کون ہوں تم جانتے ہو۔“ مانک نے پوچھا۔

”یاد کر رہا ہوں یاد نہیں آ رہا۔ راجن نے جواب

دیا۔

”تم جس سیٹ پر بیٹھے ہو وہ میری ہے۔“ مانک

بولا۔

”میں اب بھی تم کو نہیں پہچان سکا ہوں۔“ راجن نے دوبارہ کہا۔

”تم اس لیے نہیں پہچانو گے کہ تمہاری سیٹ تمہارے بیٹے سے کھسک جائے گی۔ میرا نام مانک چند گدھاری ہے تم میری سیٹ پر بیٹھے ہو۔“

”راجن نے کھڑے ہو کر کہا۔“ اگر تم اس کے اہل ہو تو میں تم کو یہ سیٹ دے سکتا ہوں۔ مگر تم اپنی اہلیت ثابت نہیں کر سکتے۔“

”میں سیٹھ گدھاری کا بیٹا ہوں تم اس سے انکار

”باپور گئے ان کی بات بھی مر گئی، اب نئے حالات ہیں، تم مجھ سے بات کرو۔“ مانک چند بولا۔

”تم نے زندگی میں باپو کی بات نہیں مانی ان کو عدالت میں لے جانے کی دھمکی دے ڈالی۔ تم نے ذرا خیال نہیں کیا کہ باپ نے تمہاری بھلائی کے لیے کیا نہیں کیا۔ تم نے ماں کا خیال نہیں کیا، اس نے ماتا کے مارے باپ سے چھپا کر تمہاری ضرورت پوری کی تم نے کیا کیا، اس کی پلٹ کر خبر نہ لی اور وہ خاموشی سے مر گئی، تم کس کے ہو، تم صرف اپنی ذات کے غلام ہو مگر یاد رکھو میں بے خبر نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ تم ایک نہ ایک دن اپنی شکل لے کر ضرور آؤ گے اور اپنا حق جٹاؤ گے۔ باپو کو بھی احساس تھا اس لیے انہوں نے ایسا کچھ کر دیا ہے کہ تم ہزار کیس کر دو، تم کو کچھ نہیں ملے گا۔ ہاں اگر بے حس بن کر کچھ طلب کرو تو مدد کروں گا۔“

مانک چند کو اتنے سخت جواب کی امید نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا اسکو دیکھ کر راجن کی ہوا سرک جائے گی اور وہ اس کے سامنے ڈر کر اس کے مطالبات مان لے گا۔ آخر وہ بھی تو گردھاری سینٹھ کا قانونی مینا تھا۔ مگر راجن کے یور تو کچھ اور کہانی بیان کر رہے تھے۔

وہ اٹھ کر سیدھا ایک بہت بڑے وکیل کے پاس پہنچا۔ اور اس نے پوری روداد اس کو سنادی۔ سینٹھ گردھاری کا بیٹا ہونے کے ثبوت اس کے پاس تھے۔ وکیل نے پوری کہانی سننے کے بعد کہا۔

”راجن گردھاری بہت بڑا آدمی ہے۔ میرا خیال ہے اگر وہ تمہارا بھائی ہے تو تم اس سے بھائی بن کر ملو اور اپنا کام نکالو۔ عدالت سے شاید تمہیں کچھ نہ ملے۔ یہ میرا تم کو مشورہ ہے۔“

”آپ کیسے وکیل ہیں، میں آپ کے پاس کیس دائر کرنے کو آیا ہوں اور آپ مجھے الٹا مشورہ دے رہے ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہوا۔“ مانک بولا۔

”اس کا مطلب میں تم کو بتاتا ہوں۔ میرا نام اشوک ہے۔“ میں ایک زمانے سے گردھاری اینڈ کوکا

وکیل ہوں گردھاری سینٹھ نے تم کو اس انڈسٹری سے نکال دیا ہے۔ تم صرف بیٹے ہونے کے ناطے کچھ نہیں پاسکو گے۔ کیونکہ راجن کو انہوں نے اکلوتا مالک اور مختار بنایا ہے۔ قانونی پوزیشن تمہاری صفر ہے۔ عدالت تم پر اگر رحم کرے تو گردھاری اینڈ کوکا سے درخواست کر سکتی ہے کہ تم کو گزراہ الاؤنس دے دیا کرے۔ وہ دیتی ہے کہ نہیں یہ اس کی مرضی پر ہے۔“

مانک چند کا چہرہ اتر گیا اور وہ خاموشی سے دفتر کے باہر آ گیا۔ اس کے بعد مانک چند بہت سے وکیلوں سے ملا مگر کامیابی کی امید کسی نے نہیں دلائی۔

بیمبئی میں وہ ایک ہوٹل میں رہتا تھا، اس کا روزانہ کا خرچہ اتنا تھا کہ جو سرمایہ وہ لندن سے لایا تھا وہ ختم ہونے کو تھا اور ابھی تک وہ وہیں کھڑا تھا، اس نے انڈیا آنے سے پہلے جو خواب دیکھے تھے وہ دور ہوتے جا رہے تھے۔ اور وہ خواب اتنے دور ہوئے کہ اس کا بریف کیس اور بیک ہوٹل کی فٹ پاتھ پر آ گیا۔

لندن کے بے غیرت دوستوں کے ساتھ رہنے سے وہ بھی ایک نمبر کا بے غیرت بن چکا تھا۔ اس کے سامنے اب کوئی راستہ نہیں تھا، اس نے سامان ایک دوکان میں رکھ دیا اور راجن کے دفتر چلا گیا۔

راجن نے اس کو دیکھ کر کہا۔ ”تم اب کیوں آئے ہو، میری اور تمہاری ملاقات تو عدالت میں ہونا تھی، تم اشوک کے پاس گئے تھے۔ کیس کیوں دائر نہیں کیا؟“

”میں نے کیس کرنے کا ارادہ بدل دیا ہے۔ اس سے خاندان کے نام کو بھلے لگے گا۔“ مانک بولا۔

”بہت خوب خاندان کے نام کا خیال تم کو خوب آیا اور جب تم باپو کے خلاف عدالت میں جا رہے تھے اپنا حصہ وصول کرنے، اس وقت کیا خاندان کا نام بلند ہوتا۔ مانک چند تم مجھے بچہ سمجھتے ہو۔ تم اپنا دوبارہ آنے کا مقصد بیان کرو۔“ راجن نے کہا۔

”میں فلاح ہو گیا ہوں، جو لایا تھا خرچ کر چکا ہوں۔“ مانک نے بے غیرتی سے بولا۔

ملنے والا ہے۔“ راجن نے کہا۔

”مجھ پر لندن میں بہت قرض ہو گیا تھا۔ اس کو اتار تے اتار تے دس سال گزر گئے اور دس سال کے بعد میں ہندوستان واپس آیا، بھائی نے باپ کی سخت تاکید کے خلاف میری مدد کی ہے۔ میں اس کے خلاف کیس کرنا چاہتا تھا، مگر میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ بھائی راجن نے میری مدد کی اور دس لاکھ روپے نقد ادا کئے تاکہ میں واپس جاسکوں اور زندگی آسروں میں رہ سکوں۔ میرا اب بھائی راجن کے خلاف کوئی دعویٰ نہیں ہے، میں باپ کی وصیت کا پالن کرتا ہوں، مجھے اپنی پچھلی غلطیوں کا احساس ہے۔“

”کردود ستخط“

راجن نے کاغذ لے کر پڑھا اور کہا۔ ”کو اکتنا ہوشیار اور چالاک بنا ہے، مگر اکثر کندی میں چونچ مار دیتا ہے۔ تم بھی بڑے ہوشیار تھے۔ تمہارے دوستوں نے تم کو پڑھا کر بھیجا ہوگا کہ جاؤ انڈیا اور سیٹھ بن جاؤ، مگر تم نے دیکھا تم کتنی آسانی سے بے وقوف بن گئے۔ تم نے خود اقرار کر لیا۔ مجھے اس اقرار کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ باپو نے تمہارا دھمکی والا خط پھاڑ دیا تھا اور مجھے ڈاکو میٹری ثبوت کی ضرورت تھی۔ تم اگر اس خط سے انکاری ہو جاتے تو میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ تمہاری یہ تحریر میرے پاس ثبوت ہے کہ تم نے باپ کو دھمکی دی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے کوئی قدم اٹھایا۔“ راجن نے کہا۔

”تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔“ مانک بولا۔

”میں اس تحریر کا معاوضہ ادا کر رہا ہوں دھوکا کیسا۔“

راجن نے جواب دیا۔

”اچھا تو پھر دس لاکھ ادا کرو۔“ مانک بولا۔

”دس لاکھ تو لکھے گئے ہیں، تم اس اوقات کے آدمی

نہیں ہو، میں تم کو دس ہزار دے سکتا ہوں اگر وہ بھی نہ لینا چاہو تو جاسکتے ہو۔“ راجن بولا۔

”یہ دوسرا دھوکا ہے میرے ساتھ، تم بہت فریبی

ہو۔“ مانک بولا۔

”بزرگوں کا کہنا ہے ہر آدمی کے ساتھ ایک جیسا

ظاہر ہے خرچ تو کر ہی چکے ہو گے تم کو روزانہ شراب چاہئے، اس کے بعد شباب چاہئے۔ تم نے لندن میں یہی تو پڑھا ہے، تمہارے اخراجات تو کوئی نواب بھی پورے نہیں کر سکتا۔ تم نے صرف خرچ کرنا سیکھا ہے، کمانا تم جانتے نہیں۔“ راجن بولا۔

”تم مجھے ذلیل کر رہے ہو، میں تمہارا بھائی ہوں۔“

مانک ملائم لہجے میں بولا۔

”مگر تم بھائی بن کر کب آئے تھے تم تو مانک بن کر آئے تھے۔“ راجن نے کہا۔

”یہ میری بھول تھی، میں نے اپنا وزن غلط کیا تھا۔ حالات میرے خلاف اس قدر ہوں گے، مجھے اندازہ نہیں تھا، مگر اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں، میری سابقہ غلطیوں نے میرے راستے روک دیے ہیں۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔“ مانک چند بولا۔

”واپسی کا خرچ چاہئے۔“ راجن نے پوچھا۔

”ہاں اس کے بغیر میں نہیں جاسکتا۔“ مانک بولا۔

”مل جائے گا مگر اس کے بدلے تم کو میں جو کہوں

لکھ کر دینا ہوگا۔“ راجن نے کہا۔

”تم کو اس کے بدلے کیا چاہئے؟“ مانک نے

پوچھا۔

راجن نے ایک سفید سادہ کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا اور قلم ہاتھ میں پکڑا دیا۔ اور بولا میں جو کہہ رہا ہوں اس کاغذ پر لکھتے جاؤ۔

”میں مانک چند ولد گوپال گردھاری اقرار کرتا

ہوں کہ میں نے اپنے باپ ماں کا کہا کبھی نہیں مانا، میں

پڑھنے لندن گیا مگر وہاں پر صرف عیش کئے پڑھا نہیں۔

باپ نے مجھ پر زور دیا تو میں نے آدھی جائیداد اور کاروبار

کا مطالبہ کر دیا اور باپ کو عدالت میں لے جانے کی دھمکی

بھی دے ڈالی۔“

مانک چند نے ہاتھ روک کر کہا۔ ”تم یہ کیا

لکھوا رہے ہو۔“

”تم لکھتے جاؤ اس تحریر کے بدلے تم کو بہت کچھ

”آگے کون سا اسٹیشن آنے والا ہے۔“ مانک چند نے پوچھا۔

”اجین آئے گا ایک گھنٹے کے بعد۔“ چیکر بولا۔
 ”ٹھیک ہے آپ ہمیں سے اجین تک کا ٹکٹ بنادیں۔“ چیکر اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس نے رسید بک اپنی بڑی سی پاکٹ سے نکال کر لکھنے لگا۔ مانک چند نے کرایہ پوچھا، چیکر نے کرایہ بتایا اور رسید کاٹ کر مانک کے ہاتھ پر رکھ دی اور بولا۔ ”اترنے میں جلدی کرنا ایک منٹ کا اسٹاپ ہے۔“

مانک چند نے اجین کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس نے سنا تھا یہاں پر بہت بڑا مندر ہے۔

یہ جیوئوں کا ہے اور ان کے بانی مہاپیر کا بہت بڑا مندر یہاں پر ہے۔ یہ مندر پورے بھارت میں جیوئوں کا سب سے زیادہ متبرک مندر ہے۔ یہاں پر پورے ملک سے لوگ آتے ہیں۔ یہاں پر زیادہ آبادی ان کی ہے۔ یہ ہندوؤں کا ایک فرقہ ہے یہاں پر اس فرقے کا بانی ہے۔ اجین کا اسٹیشن آتے ہی مانک چند جلدی سے اتر

پڑا۔ اسٹیشن زیادہ بڑا نہ تھا۔ رات کا وقت تھا دو دوڑ بٹیاں لگی ضرور تھیں مگر ان کی روشنی ناکافی تھی۔ اس کے سوا چند مسافر اترے ضرور تھے۔ مگر وہ پلیٹ فارم سے باہر جا چکے تھے۔ مانک چند کے پاس صرف ایک بریف کیس تھا وہ ایک بیچ پر بیٹھ گیا اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی ایک بڑی لمبی داڑھی والا آدمی اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور پھر مانک چند سے بولا۔

”درشن کو آئے ہو یا کوئی اور کام ہے۔“
 ”تم کون ہو، میں کس کارن آیا ہوں تم کو اس سے کیا مطلب ہے۔“ مانک چند بولا۔

”میں تمہاری مدد ہر معاملے میں کر سکتا ہوں۔ میرا نام رگھیر سنگ ہے پورا اجین مجھے جانتا ہے۔“

”تم کوئی جن بھوت ہو کہ ہر طرح میری مدد کر دو گے۔“ مانک چند نے بیزار سے کہا۔

”جن بھوت میرے سامنے کیا چیز ہیں۔“ رگھیر

سلوک نہیں کرنا چاہئے۔ جیسا آدمی ہو اس کے ساتھ دیا ہی سلوک اچھا لگتا ہے۔ تم خود کو کیا سمجھتے ہو۔“ راجن بولا۔
 ”میری مجبوری مجھے تیرے در تک لائی ہے تو نے اس کا فائدہ بھی اٹھالیا اور خوب ذلیل بھی کر دیا، مگر یاد رکھنا میرا نام مانک چند ہے۔ زندگی رہی تو کبھی نہ کبھی میں اس بے عزتی کا حساب برابر ضرور کروں گا۔ میری رقم میرے حوالے کر دے۔“ مانک بولا۔

”راجن نے دس ہزار روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور کہا۔“ اب تم جاؤ آئندہ کبھی آئے تو تمہارے ساتھ بہت برا ہوگا۔“

مانک چند نے غصے سے راجن کو دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا اور دروازے سے باہر چلا گیا۔

مانک چند نے اسی دن بمبئی چھوڑ دیا۔ راجن کے آدمی اس کے پیچھے تھے۔

راجن جانتا تھا کہ مانک چند، خطرناک سانپ ہے وہ اندن نہیں جائے گا۔ اب اس کا طریقہ واردات بدل جائے گا۔

مانک چند سخت غصے کے عالم میں راجن کے دفتر سے نکلا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ راجن کو قتل کر ڈالتا، مگر وہ اس کے دفتر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ راجن کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔ بمبئی میں وہ اس کا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پاس سرمایہ تھا اور اس کے چاروں طرف اس کے آدمی تھے، مگر وہ پھر بھی اس کے خلاف کچھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے خلاف کیا کر سکتا تھا یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ بے ارادہ گاڑی میں سوار ہو گیا تھا۔ وہ کہاں اترے گا، اس کا اس نے فیصلہ نہیں کیا تھا۔

رات کے تین بجے اس کو کسی نے اٹھا دیا، اس کے سامنے ٹکٹ چیکر کھڑا تھا۔ آپ ٹکٹ دکھائیں وہ بولا۔

”میں جلدی میں سوار ہوا تھا، ٹکٹ نہ لے سکا۔“

مانک چند بولا۔

”اب آپ ٹکٹ نہ لیں کہاں جانا ہے۔“ چیکر

بولا۔

نے جواب دیا۔
 ”تمہارے حلیے اور چہرے سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔“ مانک چند نے کہا۔
 ”آدمی تم عقل مند لگتے ہو بتاؤ کیا کام ہے۔“ وہ بولا۔
 ”میرا کام سخت ہے اور بات لمبی ہے۔ صبح ہونے دو بتا دوں گا۔“ مانک چند بولا۔

”میں دن میں سوتا ہوں، رات میں جاگتا ہوں، میں تم کو دن میں نہیں ملوں گا۔ جو بات کرنی ہے ابھی کرلو۔“ رگھیر بولا۔
 ”تم کیا الو کی نسل سے ہو کہ دن میں سوتے ہو۔“ مانک چند چڑ کر بولا۔

”تم نے خوب پیچنا نہیں وہی ہوں۔“ وہ بولا۔
 مانک چند چونک پڑا بولا۔ ”میں تو سمجھا تھا تم برا مانو گے مگر تم تو کہتے ہو میں نے ٹھیک کہا ہے۔“
 ”ٹھیک بات کو تو ٹھیک ہی کہا جائے گا۔“
 ”تم میرا دماغ چکرائے دے رہے ہو۔ تم ہو کیا چیز؟“

”یہاں چین ہے۔ میرے دوست یہاں پر تم کو بہت کچھ ایسا نظر آئے گا جو اور کہیں نہیں ہوگا۔ اگر تم اسی طرح چو سکتے رہو گے تو بس تمہارا یہی کام رہ جائے گا۔“ رگھیر بولا۔
 ”میری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آئی۔“ مانک چند بولا۔

”الو اور چمگاڈ رات کے پرندے ہیں، دن میں ان کو نظر نہیں آتا۔ انسانوں میں تم کو ایسے لوگ ضرور نظر آئے ہوں گے جو کوئے کی طرح چاروں طرف دیکھ کر چلتے ہیں۔ ان کی ہوشیاری کوئے کی طرح ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں میں تم نے لومڑی کی عیاری پائی ہوگی۔ کچھ تم کو کچھوے کی طرح ست رو نظر آتے ہوں گے، اور کچھ تو تم کو چیتے کی طرح چاک وچوند بھی ملے ہوں۔ شیر کی طرح بہادر بھی تمہاری نظر سے گزرے ہوں گے۔ ہر انسان میں کسی نہ کسی جانور کی خوبی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ وہی جانور

بن گیا ہے۔ مگر ہاں ذرا سی کوشش کرے تو وہ وہی جانور بن سکتا ہے۔ اس کے اوصاف تو اس کے اندر ہوتے ہی ہیں۔ بس ذرا مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے اور کچھ گروایسے منتر پڑھاتا ہے کہ آدمی مکمل وہی بن جاتا ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہوتا ہے کہ کس آدمی میں کس جانور کی خصوصیات پہلے سے موجود ہیں۔ یہ کام گرو کرتا ہے۔“ رگھیر نے کہا۔
 ”میری خصوصیات کیا ہیں۔“ مانک چند نے پوچھا۔

”میں نے تم کو آج پہلی بار دیکھا ہے، میں کیا بتاؤں بار بار دیکھوں گا، پرکھوں گا تو اندازہ ہوگا۔“ رگھیر نے جواب دیا۔

”مگر تم تو رات کو ہی ملو گے۔“ مانک چند بولا۔
 ”تو کیا ہو!..... میرے لیے تو رات ہی دن ہے۔ تم کہو میں تم کو ہر جگہ تلاش کر لوں گا۔“ رگھیر نے کہا۔
 ”یہاں پر میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، تم تلاش کس طرح کرو گے۔“ مانک چند بولا۔
 ”میں تلاش کر لوں گا، تم رات کو کہیں پر بھی ہو مگر میں اجین کے باہر نہیں جا سکتا، اجین میں تم کہیں پر بھی رہو، میری نظر میں رہو گے۔“ رگھیر بولا۔
 ”میرے لیے تو یہ بڑی مشکل ہوگی کہ رات میں تم مجھے تنگ کر دو گے، نیند خراب کرو گے۔“ مانک چند نے کہا۔
 ”دو چار دفعہ کے بعد تم خود بھی رات کے راہی بن جاؤ گے تم کو رات میں نیند نہیں آئے گی اور دن میں تم گھوڑے بیچ کر سوؤ گے۔“ رگھیر بولا۔
 ”اب دن نکلے والا ہے، تمہارے سونے کا وقت ہو رہا ہے۔“ مانک چند بولا۔
 ”ہاں میں اب جاؤں گا۔ دن میں تم مجھے یاد نہ کرنا، رات میں یاد کرو گے تو میں آ جاؤں گا۔“ رگھیر بولا۔
 ”رات میں تم کو پتہ کیسے چلے گا کہ میں نے یاد کیا ہے؟“
 ”ابھی ساری باتیں مت پوچھو، ابھی ابتدا ہوئی ہے ابھی بہت کچھ باقی ہے۔“

کچھ ہوا۔ اگر واپس لندن جاتا ہے تو وہاں کیا کرے گا۔ وہ تو ایک نمبر کا مادہ پرست شہر ہے۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں، کوئی کسی کی نہیں سنتا، اگر جیب میں کرارے نوٹ ہیں تو چاروں طرف دوستوں کا غول موجود ہے۔ اگر جیب خالی ہے تو دور دور کوئی نہیں ہے۔

رات ہوگئی رگھیر اس کے پاس آ گیا، مانک چند ایک پارک میں گھانٹے پر بیٹھا تھا۔

”تم کو کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں۔“ مانک نے پوچھا۔

”مجھے کون بتائے گا، مجھے خود پتہ چل جاتا ہے۔“ وہ بولا۔

”ایسا کس طرح ہو سکتا ہے معلوم کرنے کا کچھ تو ذریعہ ہوتا ہے۔“ مانک نے پوچھا۔

”ہے ذریعہ بھی مگر وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔“ رگھیر نے جواب دیا۔

”تم بتاؤ گے تو سمجھ میں بھی آ جائے گا۔“ مانک بولا۔

”دیکھو دوست زندہ رہنے کو بڑے پاپڑیلنا پڑتے ہیں۔ بہت بڑی بڑی تلکیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ میں جب آیا تھا تو میرے ساتھ بھی ہزاروں میری مشکلات

میرے ساتھ آ گئی تھیں، مگر میں نے ایک ایک کر کے سب کو اجین سے بھگا دیا۔ میرے لئے کم از کم اجین میں کوئی بڑی پریشانی نہیں ہے۔“ رگھیر نے کہا۔

”تم نے اپنی پریشانیوں سے نجات کے لیے کیا کیا تھا۔“ مانک بولا۔

”میں کسی کی شرن میں چلا گیا تھا اور آج تک اسی کی شرن میں ہوں، میرے لئے اجین امن و شنتی کی جگہ ہے۔ اس سے باہر جانے کی گرو کی اجازت نہیں ہے۔“

رگھیر بولا۔

”اچھا اب بتاؤ مجھ میں کیا خصوصیات تم کو نظر آتی ہیں۔“ مانک بولا۔

”میرا خیال ہے تم میں لکڑ بھگا والی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ تم نے اس جانور کو دیکھا ہے۔“ رگھیر نے پوچھا۔

رگھیر چلا گیا، مانک چند حیرت سے اس کو دیکھتا رہا۔ اس کے جانے کے بعد وہ اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ ایک ہوٹل میں اس نے ناشتہ کیا اور اجین کے بازار دیکھنے لگا۔ ہر طرف ایک مخصوص فضاء تھی۔ سر سے گننے تک ڈھونگ سا دھو بھرتے نظر آتے تھے۔ مگر ایک ڈسپلن تھا، کوئی لوجھڑ نہیں رہا تھا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے۔ پھولوں کی دوکانوں پر گیندے کے پھول کثرت سے نظر آتے تھے۔ کسی دوکان یا ہوٹل میں فلمی گانے نہیں بج رہے تھے۔ دو تین جگہوں پر بچپن کے ریکارڈ ضرور بج رہے تھے۔

مانک چند کے لئے یہ ماحول نیا تھا، اس نے تو لندن کا بے باک اور ناچ گانے سے بھرپور معاشرہ دیکھا تھا۔ ایسا پرسکون بازار اس کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ پھر وہ مندر کی طرف چل دیا۔

مندر آبادی سے دور تھا۔ اس کا راستہ جوڑا تھا۔ اس راستہ پر کہیں کہیں موٹے موٹے سادھو ننگے پڑے تھے۔ ان کے ننگے ہونے پر کسی کو اعتراض نہیں تھا، اس کے سامنے سے مندر میں جانے والی عورتیں بھی گزر رہی تھیں، کوئی کوئی ان کے قریب رک کر ہاتھ جوڑتی تھی اور آگے بڑھ جاتی تھی۔ وہ سادھو اتنے موٹے تھے کہ خود سے وہ اٹھ نہیں سکتے تھے نہ چل پھر سکتے تھے۔ وہ بے حاشہ کھاتے تھے۔ میلے کے موقع پر لوگ ان کو شرط لگا کر کھاتے تھے اور وہ سیروں مٹھائی کھا جاتے تھے۔ اس کے بعد شرط کی رقم کے علاوہ انعام بھی لے لیا کرتے تھے۔ ان کی اصل کمائی میلے کے موقع پر ہی ہوتی ہے۔ ان کی دیکھ بھال کرنے والے ان کے ارد گرد ہی ہوتے ہیں۔

مانک چند مندر کے اندر نہیں گیا۔ مانک چند ہندو نام کا تھا وہ ہندو مت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت تو لندن میں گزرا تھا۔ ہندوستان اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر آیا تھا کہ کروڑوں کا کاروبار اس کا انتظار کر رہا ہے وہ آتے ہی M.D کی سیٹ پر بیٹھ جائے گا۔ سب اس کے آگے سر جھکا سکیں گے اور وہ ان پر حکومت کرے گا۔ مگر اس کی سوچ کے خلاف سب

بے ایمانی کہتا ہے۔ ”رگھیر نے کہا۔
”پھر تو مجھے اپنی کہانی تم کو سنانا ہی بے کار ہوگا۔“

نامک چند بولا۔

”کیوں بیکار ہوگا، انسان میدان میں کھڑا ہو تو ہر طرف راستے ملتے ہیں۔ تم تو ابھی کھلے میدان میں ہو، ہاں اگر کسی بند گلی میں ہو تو پھر ہرگز ہرگز زبان نہ کھولنا۔“ رگھیر بولا۔

”اپنی کہانی کا میں، ہیر نہیں ہوں، میں ویلن ہوں اور ویلن سے کسی کو ہمدردی نہیں ہوتی، میں نہیں چاہتا کہ تم

بھی میرے ہمدرد نہ رہو۔“ نامک چند بولا۔

”یہاں پر تم پھر غلطی کر گئے۔ ویلن خود کو ویلن کہی خیال نہیں کرتا، اگر اس کو احساس ہو جائے کہ وہ جو کر رہا ہے وہ غلط ہے تو پھر وہ سیدھی راہ پر نہ آ جائے گا۔“ رگھیر بولا۔

”مجھے میرے باپ نے پڑھنے کو لندن بھیجا تھا، میری ماں اور باپ دونوں کی خواہش تھی کہ میں پڑھ کر باپ کا ہاتھ بناؤں، میرا ایک سوتیلہ بھائی مجھ سے بارہ سال چھوٹا بھی تھا۔ میرا باپ کروڑ پتی آدمی تھا، اس نے لندن میں مجھے شہزادوں کی طرح رکھا تھا۔ میری ماں مجھے لاکھوں روپے بھیج دیا کرتی تھی۔ میں نے لندن میں شہزادوں والی زندگی گزاری ہے۔

میں وہاں پر صرف عیش کرتا تھا۔ پڑھنا لکھنا کیسا، میرے ذہن میں تو یہ تھا کہ میرا باپ مل اون ہے، نہ پڑھتا تو بھی میں ایک بہت بڑا سیٹھ ہوں۔ میں تو عیش کرنے آیا ہوں۔ میرے ارد گرد ہر وقت حسین تیلیوں کا میل لگا رہتا تھا۔ میرے باپ نے روپیہ بھیجتا بند کر دیا، ماں نے بھی ہاتھ کھینچ لیا، مجھ پر قرض کا بوجھ بڑھتا گیا۔ لندن میں میرے دوستوں نے مشورہ دیا کہ میں اپنے حصہ کا مطالبہ کر دوں، میں نے ایک خط لکھ دیا۔ اور اسی خط کے بعد میرا باپ مجھ سے ناراض ہو گیا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے سب کچھ

میرے سوتیلے بھائی کے نام کر دیا۔ میں قرض کے پھندے میں پھنسا ہوا تھا، دس سال میں دنیا بدل گئی۔ میں ایک فلاش اور میرا بھائی ارب پتی ہو گیا۔ دس سال کے بعد میں آیا تو پتہ چلا کہ میرے غم میں میری ماں مر گئی ہے اور باپ بھی سب کچھ بھائی کو سوئپ کر مر چکا ہے۔ اب اس کی قانونی پوزیشن

”نہیں میں نے نہیں دیکھا۔“ نامک چند بولا۔

”بڑا مسکین سا نظر آتا ہے، شکار خود نہیں کرتا

دوسروں کے شکار پر قبضہ کرتا ہے۔ اور ٹولی میں رہتا ہے، ٹولی پوری ہو تو شیر کے سامنے بھی جم جاتا ہے۔ اگر اکیلا ہو تو عیاری کرتا ہے مگر شکار کے قریب ہی رہتا ہے اور کسی نہ کسی طرح پیٹ بھر لیتا ہے۔ تم خود اپنی شخصیت پر غور کرو اور بتاؤ کہ میں نے کیا غلط کیا ہے۔“ رگھیر بولا۔

نامک چند خاموش رہا، غور کرتا رہا۔ رگھیر کے چہرے کو پڑھتا رہا اور بولا۔

”تم اپنے بارے میں زیادہ جانتے ہو، تمہاری خصوصیات گیدڑ والی بھی ہو سکتی ہیں، مگر میں تم کو بتا دوں کہ گیدڑ شکار بھی کرتا ہے اور محنت بھی کرتا ہے، مگر لکڑ بھگا گیدڑ کی برابری نہیں کر سکتا۔“

نامک چند کافی دیر کے بعد بولا۔ ”تمہاری پہلی بات مجھے درست لگتی ہے۔ میں نے آج تک اپنی محنت سے ایک روپیہ نہیں کمایا، باپ کی کمائی خرچ کرتا رہا ہوں، کچھ عرصہ ہوٹل میں ذلیل کام کیا ہے۔ مگر وہ کمائی میرے ہاتھ نہیں آئی۔ مجھے صرف کھانا ملتا تھا۔“ نامک نے جواب دیا۔

”یہ ہوئی نا بات انسان خود اپنے بارے میں زیادہ جانتا ہے۔ تم اپنی پیدائشی خصوصیات سے ہٹ کر اگر کہو کہ میں شیر بن جاؤں گا، میرے اندر عقاب کی آنکھ لگ جائے۔ شیر کا ساعزم و حوصلہ پیدا ہو جائے، لومٹری کی سی ہوشیاری اور چال بازی آ جائے تو یہ مشکل ہے۔ تم زندگی بھر اپنی پیدائشی خصوصیات کے دائرے میں ہی رہو گے، اگر اس سے اوپر جانے کی کوشش کرو گے تو بھی اوپر نہیں جا پاؤ گے۔“ رگھیر نے کہا۔ تو نامک پھر بولا۔

”میں ایسوں کا ڈسا ہوا ہوں، میرے ساتھ بڑا انیائے ہوا ہے۔“

”میں ابھی فیصلہ نہیں کر سکتا، تم پوری کہانی گرو کے پاس سناؤ گے تو پھر اندازہ ہوگا کیونکہ انسان خود کو ہمیشہ حق بجانب سمجھتا ہے اور سارے الزام دوسروں پر رکھ دیتا ہے۔ وہ اپنی بے ایمانی کو بھی اپنا حق سمجھتا اور دوسروں کے حق کو بھی

سے لگی ایک جھونپڑی بنی تھی اس کے سامنے ایک کنواں تھا، اس پر ایک ڈول اور سی پڑی تھی۔ دور دور کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ جھونپڑی خالی تھی۔ رگھیر اور مانک دروازے پر کھڑے تھے کہ اچانک بڑی رعب دار آواز میں کسی نے پوچھا۔

”کیوں کیا بات ہے رگھیر، کیوں آیا ہے؟“
رگھیر اور مانک آواز سن کر چونک پڑے پھر رگھیر نے بڑی نرم آواز میں کہا۔

”گرو کچھ کام تھا، اس کارن آتا ہے۔“
”کام لیکر آتا ہے کام کر کے نہیں آتا۔“ آواز آئی۔
”گرو جی درشن نو دو، من بیکال ہے۔“ رگھیر بولا۔
اور پھر مانک چند نے دیکھا کہ ایک نہایت کمزور جسم آدمی جس کے بدن پر صرف ایک لٹکائی تھی۔ برگد کے اوپر سے اتر کر زمین پر آ گیا۔

اتر کر آنے والا شخص اتنا کمزور تھا کہ اس کی ایک ایک پنسل اور ہڈی الگ الگ نظر آتی تھی۔

چہرہ سوکھ کر چرچر ہو رہا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ مگر حیرت انگیز طور پر آواز میں رعب اور دبہہ تھا۔ مانک چند نے حیرت سے اس شخص کو دیکھا۔ یقین کرنے کو دل نہیں کرتا تھا کہ آواز اس ڈھانچے کی ہے۔

ڈھانچے نے جسم میں اتر جانے والی نگاہوں سے مانک چند کو دیکھا اور کہا۔

”دیکھ کر اور چھو کر بھی منش دھوکا کھا جاتا ہے تو کس پکر میں پڑا ہے۔“

مانک چند خاموش رہا مگر رگھیر بولا۔ ”گرو یہ مادہ پرست دنیا کا آدمی ہے، اس کے لیے یہ سب نیا ہے۔

اس لئے پریشان ہے۔ میں اسی کے کارن آیا ہوں۔“

”تو خود ابھاگی ہے، تیری سزا میں نے کالی ہے، ارے نہ کرتا کس نے کہا تھا کہ تو ادھوراکام کر اور جب کرنا تھا تو پورا کرتا، مجھے پھنسا دیا، میں درمیان میں نہ آتا تو، تو کسی

گندے نالے میں پڑا ہوتا اور تیری کھوپڑی آسانوں پر ہوتی۔ تجھے پتہ ہے چالیس راتیں مجھے منانے میں گزارنی پڑی ہیں۔ اور تو پھر ادھورا کا دھورا ہے۔ میرے لیے یہ کتنے

اتنی مضبوط ہے کہ میں اس کا کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نے واپس جانے کو مجھے دس ہزار روپے دیئے ہیں اور میں یہاں آ گیا ہوں۔ یہاں میں کسی پروگرام کے تحت نہیں آیا، بس گاڑی میں بیٹھا اور یہاں پراتر گیا۔“ مانک چند نے کہا۔

”تم پروگرام بنا کر نہیں آئے، تم یہ بتاؤ تم کوئی کام پروگرام بنا کر کرتے ہو۔ لندن تم یہ پروگرام بنا کر گئے تھے کہ

میں پڑھوں گا نہیں، عیش کروں گا۔ اور جب عیش کر رہے تھے اس وقت تم نے آنے والے وقت کا کچھ سوچا تھا، ہرگز تم نے

نہیں سوچا تھا تم تو سمجھتے ہو گے کہ تم صرف عیش کرنے کو پیدا ہوئے ہو، تم نے کبھی نہیں سوچا ہوگا تم کسی کام کا آؤ گے کسی

کا کام کرو گے۔ تم کو پیٹ بھرنے کو سخت کرنا ہوگی۔ انسان بہت خود غرض ہے، تم بھی ہو، لکڑ بھگا مرنے دم تک دوسروں

کے شکار چر کر کھاتا ہے تم میں بھی وہی خاصیت ہے۔ تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ کوئی دوسرا تمہارے لیے لڑے اور تم کو تمہارے

بھائی سے تمہارا حصہ دلا دے تو پھر بھول جاؤ اور کہیں پر مزدوری کر لو، کوئی کسی کی آگ میں نہیں کودتا۔ تم کو خود ہاتھ

بڑھانا ہوگا۔ نوالہ توڑنا ہوگا اور منہ تک پہنچانا ہوگا اور اپنا پیٹ بھرنا ہوگا۔ زندگی اتنی آسان نہیں ہے۔ جتنی تم نے اب تک

نگہ راری ہے۔ تم میری صاف اور کھری باتوں کا برا نہیں مانتا، میں جھوٹ نہیں بولتا۔ جو محسوس کرتا ہوں بیان کرتا ہوں۔ یہی

میری تعلیم ہے، میں تمہاری مدد بھی نہیں کروں گا تم کو خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔ میں صرف تم کو راستہ بتا سکتا ہوں، کاندھے پر

بٹھا کر منزل تک نہیں لے جا سکتا۔“ رگھیر نے کہا۔

”تم مجھے راستہ ہی بتا دو۔ یہ بھی تمہاری مہربانی ہوگی۔“ مانک بولا۔

میں نے تم سے گرو کا ذکر کیا ہے، آؤ میرے ساتھ تم کو اپنے گرو سے ملواتا ہوں، تم ان کو اپنی روداد سنانا مگر ایک

بات یاد رکھنا اگر ذرا بھی غلط بات کی تو پکڑے جاؤ گے۔“ رگھیر نے سمجھایا۔

رگھیر ایک راستہ پر چل پڑا۔ آبادی ختم ہو گئی۔ اور کھیت شروع ہو گئے۔ اور وہ چلتے رہے کھیتوں کے درمیان ایک بہت بڑا برگد کا پیڑ کھڑا تھا اور اسکی جڑ کے ساتھ تین

شرم کی بات ہے کہ گرو گو بندہ کا چپلا ادھورا ہے۔“
 ”گرو میں بہت شرمندہ ہوں، اسی شرمندگی کی وجہ سے میں درشن کو نہیں آیا تھا۔ مجھے معاف کر دو گرو، میں نے آپ کو کشت دیا ہے۔“ رگھیر بولا۔
 ”سانپ نکل گیا اب لکیر کو پیٹنے کا فائدہ نہیں ہے۔“
 بول کیوں آیا ہے۔“ گرو گو بندہ نے پوچھا۔

”گروہ یہ ماکب چند ہے، بڑی پریشانی میں پڑا ہے۔“ رگھیر بولا۔

”تو نے سب کی پریشانی دور کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔“ گرو نے کہا۔

”کیا کروں گرو عادت سے مجبور ہوں۔“ رگھیر بولا۔

”تیری یہ عادت تیری پونجی ختم کروا دے گی۔ گرو نے کہا۔

”اس کی پریشانی سن تو لو گرو۔“ رگھیر بولا۔

”سنا کیا کہتا ہے؟“ گرو نے پوچھا۔

”ماکب چند نے اپنی پوری کہانی لندن جانے سے آنے تک بیان کر دی۔“

گرو نے کچھ سوچا اور کہا۔

”تیرے بیان سے تو تیری کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ ہر کمزور کو طاقتور سے دب کر رہنا پڑتا ہے۔ تیرا آسان حل یہ ہے کہ اپنے سوتیلے بھائی کے سامنے جھک جا، اس کو بڑا مان لے، اس کو مالک مان لے اور اس کے وفادار ہو جا اور آسان زندگی گزار۔“ گرو نے کہا۔

”گرو میں یہ ہرگز ہرگز نہیں کر سکتا۔“ ماکب چند نے پہلی بار زبان کھولی۔

”مجھے پتہ تھا تو یہی کہہ گا۔ مگر مجھے تو راستہ دکھانا تھا، میں نے تجھے آسان راستہ بتا دیا۔ میں تیری تقدیر کا لکھا نہیں پڑھ سکتا، کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ اندازے کرتے ہیں، میں بھی اندازے ہی کروں گا۔ تو نے اب تک جو کیا ہے تجھے اس کا احساس ہے۔ اپنے اندر گوشے گوشے کے اندر نظر کر، اگر احساس ہے تو میرے مشورے پر غور کرنا تو

اس کو ٹھیک پائے گا۔ اور اگر تو احساس سے عاری ہے تو مجھے تو بے وقوف کہے گا۔“ گرو نے کہا۔

”گرو میں نے جو کچھ کیا ہے میری غلطی تھی میرے دشمن ندامتوں نے مجھ سے بہت غلطیاں کروائی ہیں مگر اب وقت اتنا آگے چلا گیا ہے کہ اس کا سرا بھی میرے ہاتھ نہیں آ رہا، میں لاکھ برا ہوں مگر کیا میں اپنے جائز حصے سے بھی الگ ہو جاؤں۔ اپنا حق بھی طلب نہ کروں۔“ ماکب بولا۔

ارے بے وقوف مال جس کا تھا اس نے خود فیصلہ کیا ہے تو ہے جو کیا وہ غلط تھا مال والے نے اپنی مرضی سے اپنا مال جس کو چاہا دے دیا۔“ گرو نے جواب دیا۔

”میں ایسا علم سیکھنا چاہتا ہوں جس کے ذریعہ میں اپنا حق لے سکوں۔“ ماکب بولا۔

گرو نے بڑی تیز اور رعب دار آواز میں کہا۔

”دمنش کو ایسا علم سیکھنے کے لیے بڑی گھٹنا میں بھیلنا پڑتی ہیں۔ بڑے دکھا ٹھانا پڑتے ہیں۔“

تو ایک عیاش آدمی ہے تو یہ سب نہیں کر سکے گا۔ ایسا خیال بھی دل میں نہ تیرے لیے وہی ٹھیک راستہ ہے جو میں نے پہلے بتلایا ہے۔“ گرو نے کہا۔

”تو پھر گرو تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ میں یہ نہیں کر سکتا۔“ ماکب چند بولا۔

”مگر تجھے یہی کرنا ہوگا۔ تیرے نصیب میں اس وقت ایسا ہی لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے آگے تیرے ستارے اپنی کندھی تبدیل کر لیں اور کچھ اور ہو جائے، تجھے ابھی تو یہی کرنا ہے۔“ گرو نے کہا۔

”گرو بڑی سخت سزا آپ دے رہے ہو، میرے مزاج کے خلاف ہے یہ۔“ ماکب بولا۔

چپلا بننے آیا تھا تو، گرو بننے کی کوشش مت کر، تو میرے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور تو ہی کیا کوئی نہیں جانتا میں، میں ایسا ہی ہوں۔ میرا ایک ٹھکانا نہیں ہے، میرا ایک شریں نہیں ہے۔ میری آتما پوری دھرتی پر گشت کرتی ہے تو نہیں جانتا کہ تیرے لئے کیا ٹھیک ہے اور کیا ٹھیک نہیں ہے، اپنے جسم کو دیکھ اس پر کتنا میل ہے، کتنا بوجھ ہے اس

ماک چنڈ پور سے ایک مہینہ اجین میں رہا اور پھر
رگھیر کو بتائے بغیر بسکی روانہ ہو گیا، اس کے دماغ اور دل
کی جنگ ختم ہو چکی تھی اور وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

بسکی پہنچتے ہی وہ گڑھاری انڈسٹری کے دفتر گیا تو
پتہ چلا کہ سیڈھ راجن بسکی میں نہیں ہے وہ واپس آ گیا اور
ایک نہایت ہی گھٹیا سے ہوٹل میں رک گیا۔

وہ روزانہ راجن کے دفتر جاتا تھا۔ آٹھ دن کے بعد
راجن آ گیا تو ماک چنڈ اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
راجن نے پوچھا۔

”تم گئے نہیں لندن۔“

”میں یہاں پر رہنا چاہتا ہوں۔“ ماک چنڈ بولا۔

”تو رہو کن منج کرتا ہے۔“ راجن نے کہا۔

”مجھے سہارے کی ضرورت ہے، کس کے سہارے

رہوں۔“ ماک بولا۔

”تم دھرم کو مانتے ہو تو بھگوان کے سہارے رہو۔“

راجن نے کہا۔

”میں اب بھی ناشک نہیں ہوں، میں بھگوان کو مانتا

ہوں۔“ ماک بولا۔

”تو پھر انڈیا بہت بڑا ہے کوشش کرو تم کو بھگوان بھوکا

نہیں رکھے گا۔“ راجن نے کہا۔

”میں تمہارے پاس بڑی آس لے کر آیا ہوں۔“

ماک بولا۔

”میں کیا کروں تم کو جو دو گنا تم شراب پی کر اڑا دو

گے۔“ راجن نے کہا۔

”میں نے شراب پینا ختم کر دیا ہے تم یقین کرو۔“

ماک بولا۔

”اس کی جگہ کیا استعمال کرتے ہو۔“ راجن نے

پوچھا۔

”میں ہر نشہ ختم کر دیا ہے۔“ ماک بولا۔

”دل نہیں کرتا یقین کرنے کو مگر خیر تم کیا چاہتے ہو

۔“ راجن نے پوچھا۔

”میں تمہارے ہاں ملازم تو ہو سکتا ہوں۔“ ماک بولا۔

پر، اور چلا ہے اپنا حصہ وصول کرنے۔ پہلے اپنا بوجھ اتارتا رہا،
بوجھ اترے گا تو ٹھیک سے چلا جائے گا، پھر آگے قدم
بڑھانا، پھر ان قدموں میں آگے جانے کی قوت ہوگی، ابھی
سے کچھ نہیں ہوگا۔ تجھے غلامی کرنا ہوگی، نہیں کرتا تو پھر جا،
میرے پاس پھر پلٹ کر نہ آنا آئے گا تو دھکا چار جائے
گا۔“ گرو نے یہ کہا اور پھر برگد کی داڑھ پکڑ کر اوپر چلا گیا۔
رگھیر نے ماک کو اشارہ کیا اور دونوں کونوں کے
پاس سے گزر کر کھیت کی پلڈنڈی پر آ گئے اور واپسی کا سفر
شروع ہو گیا۔

”اجین میں تمہارا کوئی ٹھکانا نہیں۔“ رگھیر نے

پوچھا۔

”نہیں میں نے اب تک کوئی ٹھکانا نہیں بنایا۔“

ماک بولا۔

”تو پھر تم میرے پاس رہو، کھانا وغیرہ تو میں مندر

میں کھاتا ہوں، ٹھکانے پر صرف سوتا ہوں تم بھی صرف سو

سکتے ہو کھانا تم کو کسی ہوٹل میں کھانا ہوگا۔“ رگھیر بولا۔

”میرے مطلب کا تو یہاں ملنا مشکل ہوگا۔“

ماک بولا۔

”میں سمجھ رہا ہوں تم لندن سے آئے ہو مگر یہاں پر

تم اس قسم کے کھانے کا ذکر بھی کسی سے نہ کرنا ورنہ اجین

میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔“ رگھیر بولا۔

”گرو نے تو کورا جواب دے دیا اب کیا کروں۔“

ماک نے پوچھا۔

”تم کو جو کورا نظر آ رہا ہے وہ کورا نہیں ہے، بات

صرف اتنی تھی کہ تمہاری اور میری آنکھ پڑھ نہیں پاری،

تمہاری نظر اس قابل نہیں کہ تم وہ دیکھ سکو جو گرو نے دیکھا

ہے، تم کو جو کہا گیا ہے اس کو مان لو۔“ رگھیر نے کہا۔

”میرا دل قبول نہیں کرتا مگر دماغ کہتا ہے قبول

کر لوں۔“ ماک بولا۔

”دل اور دماغ کی جنگ کو جاری رکھو، وقت کی قید

نہیں ہے جب کچھ فیصلہ ہو جائے تو اس پر عمل کر لینا، میں

اگر وہ کسی بات میں اپنی گرہ نہیں لگا سکتا۔“ رگھیر بولا۔

”اگر کوئی چال دماغ میں لے کر آئے ہو تو غور سے سن لو کہ میں تم کو آخری موقع دے رہا ہوں مگر ملازمت دینے سے پہلے میری کچھ شرطیں ہوں گی۔“ راجن نے کہا۔
”میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری ہر شرط پر عمل کروں گا۔“ مانک بولا۔

”تم میرے بھائی ہو۔ یہ بات میرے اور تمہارے سوا کسی کو پتا نہیں اور کسی کو اگر پتہ چلی تو اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔“

”میں تم کو جس ادارے میں رکھوں گا اس میں بڑے افسر بھی ہوں گے تم ان کا کہا مانو گے، ان کے حکم پر چلو گے اگر ان کی طرف سے شکایت آئی تو تمہارے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو ایک عام ورکر کے ساتھ ہوتا ہے، کسی قسم کی غلط فہمی میں گرفتار نہ رہنا تم کو کان پور جانا ہوگا وہاں پر رادھا نیکسٹل میں تم کام کرو گے اسل کا نیجر درگا پر شاد تم کو جو کام دے گا وہ کرنا، کام تمہاری قابلیت کے مطابق ہوگا۔ تنخواہ بھی قابلیت سے زیادہ ہوگی۔ تمہاری وفاداری اور کام سے چلن ضرور چیک ہوتی رہے گی۔ تمہارے چاروں طرف میرے آدمی ہوں گے۔ میں نے تم سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ ایمان داری سے بتا دیا ہے اب تمہاری ایمان داری دیکھنی ہے۔“ راجن نے یہ کہہ کر گھٹنی بجائی تو گھٹنی کی آواز پر ایک آدمی آگیا۔ راجن نے کہا۔ ”آخر کو بلاؤ۔“ پندرہ منٹ میں اختر کے آنے پر راجن نے کہا۔ ”آخر صاحب ایک اپائنٹ لیٹر مانک چند کے نام بنائیں۔ رادھا نیکسٹل کے لیے۔“ اور پھر مانک چند سے بولا۔

”جائیں اس لیٹر کو لے کر کان پور درگا پر شاد سے ملیں، آپ کو ملازمت مل گئی ہے۔“

مانک چند تھکے تھکے قدموں سے کمرے سے باہر آ گیا۔

لندن کی شاہانہ زندگی اور شاہانہ ٹھاٹ ہندوستان کی سرزمین نے اس سے چھین لیے تھے۔ اس کی ساری اکڑ بھوں گرد کے مشورے نے ہوا کر دی تھی۔ مگردل کے گوشے میں ایک نفرت کی چنگاری ضرور تھی وہ حالات سے ہار مان

گیا تھا۔ مگر امید کا دامن اس نے نہیں چھوڑا تھا۔

کان پور کی طرف گاڑی تیزی سے چلی جا رہی تھی۔ درگا پر شاد نے ہیڈ آفس کا لیٹر دیکھا اور کہا۔
”تمہارے لیٹر میں پوسٹ کا ذکر نہیں ہے تم بتاؤ کیا کر سکتے ہو؟“

”میں نے کسی مل میں ملازمت نہیں کی ہے۔“
مانک چند بولا۔

”تم سیٹھ کو کس طرح جانتے ہو۔“ درگا بولا۔

”لندن میں ملاقات ہوئی تھی۔“ مانک چند نے جواب دیا۔

”تمہاری تعلیم کتنی ہے۔“ درگا نے پوچھا۔

”میٹرک پاس ہوں۔“ مانک بولا۔

”تم میرے دفتر کے باہر بیٹھو گے میرے ملنے والوں کا خیال کرو گے۔ باقی کام تم کو ترپا بھٹی صاحب بتائیں گے ترپا بھٹی کے پاس جاؤ۔“

اور مانک چند ایک ٹکڑ بھرتی ہو گیا۔ اس کو ایک کمرہ مل کی طرف سے دے دیا گیا اور کھانا مل کینٹین میں کھانے لگا۔ مانک چند کے لیے یہ زندگی کا ایک بھیا تک روپ تھا۔ مگر اس کو برداشت کرنا تھا اس کی سمجھ میں یہ آ گیا تھا کہ اچھا اور بد وقت آتا جاتا رہتا ہے۔ ان ان اچھے وقت کی جستجو کرنا ہے، کوشش کرنا ہے تو پھر دن بدل جاتے ہیں۔

راجن بے وقوف نہیں تھا، اس نے کچھ ایسا انتظام کیا تھا کہ مانک چند کی ایک ایک حرکت اس کی نظر میں تھی وہ سانپ پالنے کا شوقین نہیں تھا مگر سانپ کو آزاد چھوڑنا بھی نقصان دہ تھا، پٹاری میں بند سانپ اس کے لیے نقصان دہ نہیں تھا۔

دو سال گزر گئے۔ رگھیر دو سال کے بعد اس کے پاس کان پور آ گیا۔ رگھیر کا حلیہ بدلا ہوا تھا وہ سفید دھوٹی اور سفید کرتے میں ملبوس تھا پہلی نظر میں مانک چند اس کو پہچان نہ سکا۔

”بھول گئے۔“ رگھیر بولا۔

”نہیں۔“ مانک چند بولا۔ ”تم بہت بدل گئے ہو۔“

”گرو نے تمہاری خاطر بدلا ہے۔“ رگھیر بولا۔

”گرو کے مشورے پر عمل کر رہا ہوں۔“ مانک چند

نے کہا۔

”اسی کارن تم کو واپس بلایا ہے۔“ رگھیر نے کہا۔

”میں اگر یہاں سے گیا تو پھر نہیں آ سکوں گا۔“

مانک چند بولا۔

”تم کو دوبارہ آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی گرو

نے تمہارا پر بند کرنے کے بعد بلایا ہوگا کیونکہ گرو کسی کو خود

سے نہیں جلاتے اور جلاتے ہیں تو پوری طرح شرن میں رکھ

کر جلاتے ہیں۔ میرا دوسرا ہے تم ان کے شرن میں

آچکے ہو۔“ رگھیر نے کہا۔

”مجھے جانے سے انکار نہیں ہے میں نے ان کا کہا

ہی تو مانا تھا۔“ مانک چند بولا۔

اور دونوں اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے مگر ان

دونوں کو پتا نہیں تھا کہ دو آدمی ان کے قریب ان کے ہم

سفر ہیں۔

اجین آ کر وہ دونوں گرو کی طرف چلے تب بھی وہ

آدی دور دور رہ کر ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ وہ دونوں

برگد کے پیڑ کے نیچے آ گئے اور دونوں آدی ان پر نگاہ

رکھے تھے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ایک ہڈیوں کا پنجر

درخت سے اتر کر ان کے قریب آ گیا۔ مگر وہ ان کی بات

نہیں سن سکے۔

”تو نے میرا کہا مانا، بڑا اچھا کیا۔ اب میں تجھے کچھ

دے سکتا ہوں پر تو یہ چیز ایسی نہیں کہ میں اٹھاؤں اور تجھ کو

دے دوں اس کو لینے والا اپنی کوشش سے لیتا ہے اور اپنی محنت

سے وصول کرتا ہے۔ ایک کے بعد ایک اس کے درجے

بڑھتے ہیں مگر اس منزل سے پہلے کچھ درجے اور ہیں جو

ضروری ہیں۔ پراسرار قوتیں حاصل کرنے سے پہلے ہر آدمی

کے لیے ضروری ہے وہ مدتوں تک مطالعہ اور عمل کے بعد کچھ

درجے پاس کر لے سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ آدمی کی

قوت برداشت کتنی ہے وہ روحانی ترقی کی اہلیت رکھتا ہے کہ

نہیں۔ اس میں شوق کتنا ہے اس کی جسمانی ہمت ایسی ہے

کہ مشکل جاب ڈرو خوف کے بغیر کر سکتا ہے کہ نہیں وہ جب

ان مراحل سے گزر جاتا ہے تو اس قابل ہوتا ہے کہ وہ کچھ قوت

حاصل کر سکے، ایک کے بعد ایک قوت اس کی دسترس میں آتی

جاتی ہے اور اس کا مقام بلند سے بلند ہوتا جاتا ہے اور پھر ایک

وقت آتا ہے کہ اس کی شہتی پر م بار ہو جاتی ہے۔ وہ زمین کا

بادشاہ ہو جاتا ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے اس کا ایک اشارہ

کا پلٹ کر سکتا ہے۔ مگر اس کے لیے وقت اور لگن دونوں کی

ضرورت ہوتی ہے تو اگر صرف اپنی دولت حاصل کرنے کو کچھ

کر رہا ہے تو میں تیری مدد نہیں کر سکتا۔ ہاں تجھے یہ ضرور

بتا سکتا ہوں کہ جب تیرے پاس شہتی ہوگی تو تیری نظر میں

دھن دولت کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ سوچ دولت کا حصول

نہیں ہوگی۔ تیرے سامنے سونے کے ڈھیر ہوں گے۔

تیرے سامنے حسین دلخواز ساحرا ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر

قیامت خیز تیرے وجود کو تغیر کرنے کی کوشش کریں گی، مگر

تیری نظر میں ان کی اہمیت بہت معمولی ہوگی کیونکہ میری نگاہ

کے زاویے بدل جائیں گے۔ سونا چاندی سے بڑھ کر جو

دولت سے تیری نگاہیں ادھر ہوں گی۔“ گرو نے کہا۔

”گرو جی اس کا کچھ وقت مقرر ہے کہ کتنا عرصہ ہوگا

یہ سب حاصل کرنے میں۔“ مانک چند بولا۔

”اس کا کوئی وقت مقرر نہیں، تیری محنت اور لگن

فیصلہ کرے گی۔“ گرو نے جواب دیا۔

”میں تو آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔“ مانک چند

بولا۔

”گرو کا درجہ یا درکھنا اور آنکھ بند کر کے وہ کرنا جو کہا

جائے۔ وہ کھانا جو دیا جائے۔ اسی طرح سوچنا جس طرح

کہا جائے۔ اب تیری نہ کوئی سوچ ہے نافرمانی، اب بھی و

قت ہے میں روکوں گا نہیں تو واپس اپنی دنیا میں جا سکتا

ہے۔ اگر رہنا ہے تو یہ کنیا حاضر ہے میں تو درخت پر رہتا

ہوں۔“ گرو نے کہا۔

”میرے لیے کیا حکم ہے گرو۔“ رگھیر بولا۔

”تیرا دن اور رات کا فرق ختم ہوا تو ابھی یہاں رہ

سکتا ہے مگر دونوں کو الگ الگ کام کرنے ہوں گے، الگ

الگ دونوں کا کھانا ہوگا۔ میرا کام تم کو کھانا دینا اور سبق یاد کرانا ہوگا۔ کل سے تم دونوں کام شروع کرو گے۔“

ان کا پیچھا کرنے والے لوگ واپس چلے گئے اور انہوں نے پوری رپورٹ میجر درگاہ پر شاد کو دے دی۔

درگاہ پر شاد نے رپورٹ سننے کے بعد واپس ایجن بھیج دیا اور رپورٹ بھی سینھ کو روک کر دے کر دی۔ رپورٹ پڑھ کر راجن کو پورا یقین ہو گیا کہ مائک چند پورے پروگرام سے آیا تھا اور اب کوئی جادوئی علم حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

جادو یا سحر اس ترقی یافتہ دور اور بڑے بڑے شہروں میں بھی اسی طرح سے موجود ہے جس طرح افریقہ کے

پراسرار گوشوں میں وحشی و نیم وحشی انسان سفلی عملیات کرتے ہیں۔ جادو ایک ایسا علم ہے جو بتاتا ہے کہ اپنے ارادے کی

قوت کا کام کس طرح لیا جاتا ہے۔ پہلے پراسرار طاقت کا حصول اور اس کے بعد اس کا استعمال مطلوبہ مقدار اور

مناسب طریقہ کار مناسب ذریعہ سے پھر عامل مرضی کے کام کر سکتا ہے۔ مگر اس کے لیے سہاری ہے کہ عامل میں اتنی

قابلیت اور صلاحیت ہو کہ جو ضروری قوتوں کو استعمال کر سکے اور مناسب مقدار میں ایک ضروری بات یہ ہے کہ جن حالات

میں اور جن لوگوں میں وہ کام کر رہا ہو اس کے ٹھیک ٹھیک اندازہ بھی ہو اگر اس کو حالات کا پوری طرح اندازہ نہیں ہوگا تو

وہ اپنی قوتوں کو صحیح طور پر ان پرائر اندازہ نہیں کر سکے گا۔ اگر کوئی بنگال کا بڑا جادو گر بمبئی میں اپنا اثر دکھانا

چاہے تو فوری طور پر کامیاب نہیں ہوگا، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے یہاں کے لوگوں کے دماغ اور ان

کی سوچ کو پڑھے۔ ان کے سوچنے کے انداز اور ان کے کمزور پہلوؤں پر غور کرے اور پھر اپنے فن کی آزمائش

کرے۔ اگر خاموش ہو گئے۔ کچھ خاموش رہی۔ رگھیر اور مالک پھر دونوں خاموش رہے اور پھر بولے۔

”زندگی نہ جانے کتنی دفعہ موت کے قریب سے گزر جاتی ہے۔ آدمی سوچتا ہے میں موت سے بچ گیا، وہ یہ نہیں

سوچتا کہ اگر موت اس کے لیے آئی ہو تو وہ چننا کس طرح۔ آدمی کی بہادری و دلیری صرف انسانوں کے لیے

ہے۔ موت سے کوئی نہیں لڑتا، نہ لڑ سکتا ہے۔ تمہارے سبق میں پہلا حصہ یہ ہے کہ تم موت کو بھول جاؤ گے۔ اس کو

جب آتا ہے آئے گی۔ اس کو آج تک کسی نے نہ روکا ہے نہ روک سکتا ہے۔ جب موت کا خوف نہیں رہتا تو آدمی

خود بخود بہادر بن جاتا ہے تم نے جس کام میں ہاتھ ڈالا ہے وہ بڑا بہادری کا کام ہے۔ تمہارے سامنے ایسے ایسے

نظارے آئیں گے جو انسان کی قوت برداشت سے باہر کی چیز ہے۔ مگر تم برداشت کرو گے، جاپ سے پہلے کنڈلی

قائم کرتا ہے یہ ایک حافقی قلعہ ہوتا ہے۔“ پھر گرو نے اس کو قائم کرنے کا طریقہ بتایا، اس کے پیروں کے بارے

میں کافی دیر بتایا اور پھر کہا۔ ”اس دائرے میں بیٹھ کر تم سکون سے اپنا منتر پڑھ

سکتے ہو دائرے کے باہر تمہاری نظروں کے سامنے کچھ ہو رہا ہو، تم پر اس کا اثر نہیں ہونا چاہیے تم کو کوئی نقصان

دائرے کے اندر نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں اگر تم بہک گئے اور دائرے سے باہر آ گئے تو یہ تمہاری فاش غلطی ہوگی۔ اس

غلطی کی یاداش میں تم جان سے بھی ہاتھ دھو سکتے ہو اور عقل سے بھی ہاتھ دھو سکتے ہو۔ ہر حالت میں کنڈلی کے

اندر رہنا ہے۔ تمہارے سامنے تمہارے پیاروں کے ساتھ ہر وہ سب تمہارے بہکانے کو ہوگا۔ تم کو یاد رکھنا ہوگا

کہ کچھ ملتا ہے تو کچھ دینا بھی پڑتا ہے۔ پراسرار دنیا کے بھی کچھ قاعدے قانون ہوتے ہیں۔ پراسرار قوتیں ہوائی

ہوتی ہیں اور ہواؤں میں ہی سفر کرتی ہیں۔“ ”ارواح خبیثہ بھوت پریت اور بیر بھیر و پھیر و یہ

سب کا لے جادو کے تحت ہوتے ہیں۔ مگر اس کے بھی درجے ہیں۔ بھیرو کے بعد شکھا اور اس کے بعد کھنڈیلا

ہوتا ہے۔ یہ بہت دور کی منزل ہے۔ وہاں پر کوئی کوئی ہی پہنچتا ہے۔ جب انسان کھنڈیلا بن جاتا ہے تو ساری

شکستی اس کی غلام ہوتی ہے۔ اس دنیا میں شاید ہی کوئی کھنڈیلا ہو آج سے تم دونوں وہی کرو گے جو میں کہوں

گا، وہی کھاؤ گے جو میں تم کو دوں گا، اگر اس کے خلاف کرو گے تو خود اپنا نقصان کرو گے۔ سزا ابھی مل سکتی ہے

اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔“

☆.....☆.....☆

نے جواب دیا۔
”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میری سمجھ میں اس پریشانی کا حل آ جائے۔“ راگنی بولی۔

”ہو سکتا ہے..... تم نے درست کہا، میں تم کو بتاتا ہوں۔“ راجن نے پوری روداد، مانک کا آنا اور پھر ملازمت حاصل کرنا اور پھر اجین جانا اور اس کا ایک پراسرار سے آدمی سے ملاقات کرنا اور وہ تمام حالات جو اس کے آدمی اس کو لکھ کر بھیج رہے تھے، سب راگنی کو بتادیئے۔ راگنی سن کر کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔

”جادو ٹونا اور سفلی علم اگر دنیا میں ہیں تو ان کا توڑ بھی ضرور ہوگا، تم یوں سوچو کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس دنیا پر ان جادو گروں کا راج ہوتا اور سب ان کے غلام ہوتے، مگر ایسا نہیں ہے، اس کا مطلب ہوا کہ ان کے اوپر بھی کچھ ضرور ہے۔“

”درست ہے مگر اس کچھ کو تلاش کرنا کیا آسان ہے
۔“ راجن بولا۔

”میں دلی کی رہنے والی ہوں، میری نظر میں ایک آدمی ہے۔ بہت مشہور آدمی ہے، پیش تو حکمت ہے مگر کام ہر قسم کے کرتے ہیں، ان کے بارے میں مشہور ہے کہ کچھ لیتے بھی نہیں، خرچ اپنا کرتے ہیں۔“

”کام بھی کرتے ہیں اور کچھ لیتے بھی نہیں اوپر سے خرچ بھی اپنا کرتے ہیں۔ اس زمانے میں ایسا آدمی حیرت ہے۔ تمہارے سمجھنے میں پیسر ہے کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔“ راجن نے کہا۔

”تو حیرت کی بات مگر یہی سچ بھی ہے۔“ راگنی بولی۔

”تو پھر ایسا کرتے ہیں دلی چلتے ہیں تم نے پتا جی سے بہت دن ہوئے ملاقات بھی نہیں کی اور حکیم صاحب سے بھی ملاقات کریں گے۔“ راجن نے مشورہ دیا۔

”جب جائیں گے تو باپو سے بھی ملاقات ہو ہی جائے گی، تم یہ نہ سمجھنا کہ میں نے دلی جانے کا یہ بہانا ڈھونڈا ہے۔“ راگنی نے کہا۔

راجن کے مقرر کردہ دونوں جاسوسوں نے چھپ کر ان دونوں کی حرکات اور سکنات پر نظر رکھی تھی۔ انہوں نے برگد سے اترتے اس ہڈیوں کے پنجر کو بھی دیکھا اور ان کی دیر تک چلتی میٹنگ بھی دیکھی تھی مگر وہ ان کی گفتگو نہیں سن سکے تھے۔ ان کی رپورٹ پر راجن نے پورا اندازہ کر لیا تھا کہ مانک چند غلط لائن پر لگ گیا ہے۔ ظاہر تھا کہ اس کا ایک ہی مطلب تھا مانک چند نے اپنی قانونی پوزیشن کمزور دیکھ کر عدالتی کارروائی کرنے سے گریز کیا تھا اور راجن کے حالات کو پرکھنے کو اس کے قریب رہنے کی کوشش کی تھی مگر اس کے اندر تو اگنی تھی راجن کے خلاف لاوہ پک رہا تھا، وہ کب برداشت کر سکتا تھا کہ راجن بڑا سینٹھ کہلائے اور وہ کنگال بنا پھرتا رہے۔ اب اس نے سفلی علم کا سہارا لینا چاہا تھا۔ اس کے متعلق راجن چند کچھ نہیں جانتا تھا مگر وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ سفلی کے ماہر کسی کے لئے بھی طرح طرح کی پریشانیاں کھڑی کر دیتے ہیں۔ مالی اور جانی نقصان بھی کر دیتے ہیں یہ صرف اپنا مطلب نکالنے کو بیدردی سے گندے گندے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ یہ گندے لوگ گندے طریقوں سے مال و دولت حاصل کرتے ہیں اور گندگی میں رہتے ہیں۔

راجن کچھ پریشان ہو گیا۔ کیونکہ اس کے پاس ان ہوائی اور پراسرار چیزوں سے لڑنے کا کچھ ہندوستان نہیں تھا اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنا دفاع کیسے کرے؟

اس کی پریشانی اس کی بیوی راگنی سے چھپی نہ رہ سکی۔ ایک دن اس نے پوچھا۔

”میں دیکھ رہی ہوں تم کچھ پریشان پریشان رہنے لگے ہو کیا بات ہے بتاؤ تو؟“

”ہاں تمہارا خیال درست ہے مگر میں اپنی پریشانی میں تم کو اس لیے شامل نہیں کرتا کہ تم بھی پریشان ہو جاؤ گی۔ اب میں اکیلا پریشان ہوں پھر تم بھی ہوگی۔“ راجن

”ایسا ہو بھی سکتا ہے۔“ راجن ہنس کر جلدی سے بولا۔

”اس لیے میں نے وضاحت کر دی ہے۔“ راگنی نے جواب دیا۔

”دو تین دن کے بعد دونوں دلی روانہ ہو گئے۔ دلی پہنچنے کے دوسرے ہی روز وہ حکیم وقار کے مطب میں تھے۔“

”فرمائیے کیسے آتا ہوا۔“ اس جوڑے کو دیکھ کر میں نے کہا۔ مرد نے مسکرا کر کہا۔

”یہ میری دھرم پتی ہیں، ان کو بھی کچھ شکایت ہے، ذرا چپک کر لیں۔“

عورت نے چونک کر مرد کی طرف دیکھا اور جلدی سے بولی۔

”حکیم صاحب یہ مذاق کر رہے ہیں، میں ٹھیک ہوں ہم دونوں کسی دوسرے کام سے آئے ہیں۔“

”پہلے تو آپ لوگ اپنا تعارف کرا میں پھر آگے بات ہوگی۔“ اس نے کہا۔

”میرا نام راجن چند ہے۔ گردھاری گروپ کا میں چیئر مین ہوں اور یہ میری پتی ہیں۔“ مرد نے کہا۔

”اب آپ آگے بتائیں۔“ میں نے پوچھا۔

”کہانی ذرا لمبی ہے وقت لگے گا۔“ مرد نے کہا۔

”آپ ذرا سارک جائیں میں سمجھ رہا ہوں کہانی کیا ہوگی، اس شعبے کے انچارج میرے دوست حکیم کامل ہیں۔ میں ان کو بلاتا ہوں ان کے روبرو پوری روداد بتائیں۔“ ابھی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ رولوکا کمرے میں آ گیا۔

”میں نے دونوں کا تعارف کرایا اور رولوکا نے پوچھا۔“ آپ کا کیا مسئلہ ہے۔“

راجن نے اپنے باپ کے زمانے سے اب تک کے تمام حالات بتا دیے۔

”اچھی طرح یاد کر لیں کوئی ضروری بات رہ تو نہیں گئی۔“ میں نے کہا۔

”نہیں ضروری بات تو کوئی نہیں چھوڑی۔“ راجن

نے جواب دیا۔

”انسان سے غلطی ہو جاتی ہے، کبھی وہ اپنا پہلو صاف رکھنے کو اپنی کمزوری چھپا جاتا ہے اور دوسرے فریق کو ہی مورد الزام بناتا ہے۔ اگر آپ کا کوئی ایسا نرم پہلو ہو

تو آپ وہ بھی بتادیں، ہم صرف سچائی کی طرف داری کرتے ہیں۔ اگر آپ سے کوئی زیادتی اپنے بھائی سے

ہو گئی ہے تو وہ بھی بتادیں۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”میں نے اس کے ساتھ کبھی زیادتی نہیں کی، میں نے اس کے واپس آنے کے بعد سوچا تھا اس کو بیروں پر

کھڑا کروں گا۔ باپ نے سب کچھ مجھے سوپ ضرور دیا تھا مگر میرے دل میں یہ ضرور تھا کہ اس کا حق بنتا ہے، اس کو

ملنا چاہیے۔ مگر اس کے انداز سے اور طرز عمل سے میں بے زار ہو گیا، میں نے اس کو اس کی قانونی پوزیشن بتادی

اور وہ چلا گیا۔“

اس کے بعد پھر وہ بہروپ بدل کر آ گیا میں نے اس کو آزمانے کو ملازمت دے دی، اگر وہ اپنا رویہ اور

کردار ٹھیک رکھتا تو میں ضرور اس کے بارے میں آگے سوچتا، مگر اس نے تو پٹری بدل لی اور غلط لائن پر چلا گیا اس

کا کالے علم کو حاصل کرنا، میں سمجھ سکتا ہوں کہ کیوں ہے۔“ راجن نے کہا۔

”ڈیکھئے راجن صاحب ابھی اس نے آپ کے خلاف کچھ نہیں کیا ہے۔ کسی کے خلاف کچھ نہیں کیا ہے

آپ کا سوچنا غلط بھی ہو سکتا ہے، اس نے آپ سے کچھ کہا بھی نہیں ہے، ہم ہر پہلو کو نظر میں رکھ کر کام کرتے ہیں۔“

”آپ اپنے دل میں اپنے بھائی کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں اس کو رہنے دیں، ابھی سے بدگمانی دل میں نہ

لائیں بدگمانی گندگی کے ڈھیر کھڑا کر دیتی ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”میں آپ کی بات پر عمل ضرور کروں گا مگر اچانک کوئی ناگہانی آفت مجھ پر نازل ہوگی تو میں کیا کروں گا۔

آپ کو میں کس طرح بتاؤں گا۔“ راجن بولا۔

”آپ سکون سے رہیں آپ پر کوئی ناگہانی آفت

نہیں آئے گی انشاء اللہ۔“ میں نے کہا۔

”تجھ سے ملاقات کرنی ہے۔“ رولو کا نے جواب

دیا۔

”آپ اس کا کچھ بندوبست کر دیں، حکیم صاحب۔“ راگنی بولی۔

”میں دنیا تیاگ چکا ہوں میرا دنیا سے کیا واسطہ۔“

وہ بولا۔

”اس کا انتظام کر دیں گے آپ بے فکر ہو کر بمبئی

جائیں، مجھے ان آدمیوں کا بتا دیں جو اجین میں آپ کے

لیے کام کر رہے ہیں، مجھے ان کی ضرورت پڑے گی۔“

سے واسطہ تو رہے گا۔“ رولو کا بولا۔

رولو کا نے کہا۔

”تو میرے شریر کو دیکھ کر کہہ رہا ہے، شاید تو نہیں جانتا

”ان کے جانے کے بعد رولو کا سے میں نے

کہ آتما کو رہنے کو ایک شریر کی ضرورت ہوتی ہے اگر شریر نہیں

پوچھا۔“ کیا تم اجین جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔“

ہوگا تو آتما بھٹک جائے گی۔ میرا شریر میری آتما کا گھر ہے تو

”ہاں ایک چکر تو لگانا پڑے گا ہی۔“ رولو کا بولا۔

نہیں جان سکتا کہ میرا شریر کتنا پرانا ہے۔ میں نے اس برگد

تین دن کے بعد رولو کا اجین روانہ ہو گیا۔

کے پیڑ کو اگایا تھا اور یہ برگد بوڑھا ہو رہا ہے۔“ گرو نے کہا۔

”اجین جیوؤں کا شہر ہے یہاں پر ان کی آبادی

”تیری یہ بھول تھی، تو نے اس دنیا میں ایسا کیا، اپنی

زیادہ ہے۔ یہ لوگ کسی جان دار کو مارنا پسند نہیں کرتے۔

”تو نہیں جانتا میرے لئے شریر اہمیت نہیں رکھتی،

کیڑے مکوڑوں کو بھی نہیں مارتے۔ ناک کان سب مٹھی

میں چاہوں تو اس کو چھوڑ بھی دوں مگر اس لئے نہیں چھوڑتا

سے بند کر لیتے ہیں کہ کوئی بھگا وغیرہ اس کے اندر جا کر مر

کہ یہ بڈیوں پر چڑھی کھال میری پہچان بن گئی ہے۔“

نہ جائے۔ یہ لوگ بڑے امن پسند اور سیدھے ہوتے

گرو بولا۔

ہیں۔ میں سب سے پہلے ان دو آدمیوں سے ملا جو وہاں

”میں تیرے معاملے میں دخل دینے نہیں آیا۔

راجن کے لیے کام کر رہے تھے۔“ انہوں نے بتایا۔

صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ تیرے پاس ایک مانک چند نام کا

”دو آدمی ہیں صاحب ایک ان کا گرو ہے۔ گرو

آدی ہے، تیری شرن میں ہے تو اس کو کچھ شکشا بھی دے

رخت پر رہتا ہے مگر درخت پر نظر نہیں آتا۔ روزانہ وہ

رہا ہے، اس کی شکشا بند کر دے۔“ رولو کا بولا۔

کہیں جاتا ہے اور ایک ہنڈیا میں کچھ لاتا ہے۔ اس کے

”تیرے علم پر ارے بے وقوف مجھے تو کوئی نظر نہیں

دونوں چیلے جنگل کے اندر رہتے ہیں۔ گرو اس ہنڈیا کو لے

آتا جو مجھے حکم دے۔“ گرو نے کہا۔

کر جنگل جاتا ہے ہم نے کوشش کی کہ پتا چلائیں کہ کہاں

”ایک ہوتا ہے آنکھ کا اندھا ایک ہوتا ہے من کا

جاتا ہے مگر ڈر کے مارے نہیں گئے۔“ رولو کا نے کہا۔

اندھا، تو مجھے مکمل اندھا نظر آتا ہے۔“ رولو کا بولا۔

”اچھا تم لوگ راجن کے پاس چلے جاؤ تمہارا کام

”ذرا ہوش میں رہ کر بات کر تو مجھے نہیں جانتا۔“

ختم ہوا۔“

گرو نے کہا۔

رولو کا دوسرے روز صبح اندھیرے میں برگد کے

”میری بات کا جواب دے مانک چند کو کنڈل سے

رخت کی طرف چلا، ایک نہایت کمزور بڈیوں کا ڈھانچہ

باہر بلا لے۔“

کٹیا کے دروازے پر کھڑا تھا، جیسے وہ اس کا انتظار کر رہا

”ارے واہ تو، تو حکم چلانے لگا تیرا کرایا کم کرنا ہی

تھا۔ رولو کا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا، گرو نے رولو کا کے

پتا ہوا میں معطل ضرور تھا۔ ایک لمحہ کے بعد وہ پتاریزہ ریزہ ہو کر زمین پر بکھر گیا۔ اور گردو ہائے کر کے زمین پر بیٹھ گیا۔
 رولو کا اس کے قریب چلا گیا اور بولا۔

”جواب اوپر چلا جا۔ میں جا رہا ہوں کل تیرے چیلوں کو دیکھوں گا۔“ اس کے بعد رولو واپس چل پڑا۔

رات کو ہی وہ اس مقام پر تھا جہاں پر دور دور دو آدمی ایسے مقامات پر آسن جما کر بیٹھے تھے جہاں پر کوئی انسان جانے کا تصور نہیں کر سکتا، اس کے چاروں طرف دلدل اور کچڑ تھی۔ ہر قسم کے کیڑے مکوڑے ان کے چاروں طرف مڑ گئی کر رہے تھے۔ سڑی ہوئی کچڑ میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ جنگلی گھاس سر سے اوپر تک اگی ہوئی تھی۔ دن میں بھی پھسر اور کھیاں اس قدر زیادہ تھیں کہ آدمی کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر ایک آدمی ایک چوڑے سے پتھر پر موجود تھا۔ اس کے برابر ایک سایہ لہرا رہا تھا رولو کا سمجھ چکا تھا کہ گرد حفاظت کر رہا ہے۔

رولو کا اس پتھر کے قریب چلا گیا۔ اور زور سے بولا۔
 ”آئیں کھول اور کھڑا ہو جا۔“

مگر وہ آدمی پتھر کے بت کی مانند ساکت رہا۔
 رولو کا پھر بولا۔

”میں جانتا ہوں تو میری بات سن رہا ہے۔ میری بات پر ذرا دھیان دے تو گندگی کے ڈھیر پر بیٹھا ہے۔ تیرے پیٹ میں گندی غذا جا رہی ہے اور تو گندے علوم کی طرف جا رہا ہے، تو شیطان کا غلام بننے والا ہے، شیطان کے غلام انسانوں کو صرف نقصان ہی پہنچا سکتے ہیں۔ تیرا کام بھی معصوم لوگوں کو نقصان، دکھ پریشانی دینا ہوگا، تیری اپنی کوئی مرضی نہیں ہوگی تو روئے زمین پر ایک بدنام داغ بن جائے گا۔ انسانوں میں تیرا گزارہ نہیں ہوگا۔ کسی درخت یا کسی مرگھٹ میں تیرا ٹھکانا ہوگا تو جس دولت کی خاطر یہ کر رہا ہے، وہ تیرے کسی مطلب کی نہیں رہے گی تو کسی ناری کا پتی نہیں ہوگا۔ تو کسی کا باپ نہیں ہوگا۔ تو اندھیروں میں زندگی گزارے گا، روشنی میں تیری آنکھیں بند ہو جائیں گی۔ اس لیے کہتا ہوں باہر آ جا اور انسانوں

مگر رولو کا اس کی آنکھیں بند کرتے ہی روپوش ہو چکا تھا اور اس کی پشت پر چلا گیا۔ گردو نے آنکھیں کھولیں اور سامنے کے رخ دونوں ہاتھ جھٹک دیئے۔ اس کے ہاتھ جھٹکتے ہی زمین پر ایک سانپ نمودار ہوا۔ مگر جہاں رولو کا کھڑا تھا وہاں کچھ نہ پا کر گردو کی طرف بڑھا مگر گردو نے اپنا بچاؤ کر لیا۔ سانپ غائب ہو گیا گردو نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، کچھ نظر نہیں آیا۔ رولو کا گھوم کر پھر اس کے سامنے آ گیا اور نمودار ہو گیا۔ گردو نے آنکھیں پھاڑ کر اس کو دیکھا اور بولا۔

”تو نہیں تھا کیا؟“

”تو اندھا ہے میں نے یہی کہا تھا تا تجھے تیرے سامنے کی چیز نظر نہیں آتی اور بتاتا ہے کہ تو بڑی شگفتی والا ہے۔ اپنی اوقات میں رہ۔ میں جو کہتا ہوں وہ کر۔ مانک چند کو کنڈل سے باہر کر۔“ رولو کا بولا۔

”تو نے میری شگفتی دیکھی کہاں ہے، دیکھ لوں گا تجھے ذرا ساجل کیا دے دیا کہ اکڑ رہا ہے۔“ گردو بولا۔

”میں جا رہا ہوں کل مانک چند کے پاس تجھے ملوں گا اور سن تیرے کنڈل کو تیرے سامنے توڑ دوں گا۔ اگر تو روک سکے تو روک لینا۔“ اور رولو کا روپوش ہو گیا۔ مگر گینا نہیں گردو بھی اندازہ تھا کہ وہ گینا نہیں ہے۔ گردو کھینچا سے باہر آ گیا اور برگد کی راڑھ پکڑ کر اوپر جانے لگا۔ مگر وہ اوپر نہ جاسکا کیونکہ برگد کی وہ مضبوط داڑھ ٹوٹ کر زمین پر گر گئی تھی۔ گردو نے دوسری پکڑی مگر وہ بھی ٹوٹ گئی، اس نے پھر کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور زور سے بولا۔

”یقین نہیں آتا تھا۔“ اس کے کمزور جسم کی یہ بھاری اور خوفناک آواز تھی۔ ”تو مجھے جانے سے روک نہیں سکتا۔“

رولو کا نے اس کا جواب نہیں دیا۔ مگر اس پر نظر رکھی۔ گردو نے زمین پر پڑا ایک پتا اٹھایا اور بولا۔

”ذرا پکڑ تو اس کو۔“ اور پتا ہوا میں اڑا دیا۔ پتا چاروں طرف ہوا میں گردش کرتا رہا۔ اور ایک جگہ رک گیا اس کو رولو کا نے پکڑ لیا تھا، رولو کا تو گردو نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں انسان بن کر رہے۔“

کنڈل خود بخود ختم ہو گیا۔ تیرا کرایا کرم میں کروا دوں گا۔ اب تو جا..... تو نے آتما کو بہت کشت دے لیا، اب آرام کر۔“ اور گرو کا بدن زمین پر گر گیا اور منٹوں میں مٹی ہو گیا۔

مانک چند پتھر سے اتر کر رولوکا کے پاس آ گیا اور اچانک ہوائیں رک گئیں۔ بادل کی گھن گرج ختم ہو گئی۔ اور پھر رگھیر بھی آ گیا۔ رگھیر اور مانک چند رولوکا کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ ان کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ رولوکا نے دونوں کو اٹھایا اور کہا۔

”انسان کو خود غرض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ نقصان دیتی ہے۔ پہلے دوسروں کے بارے میں سوچو اس کے بعد اپنے بارے میں جذبات سنبھالنے پڑتے ہیں۔ مانک چند تم کو تمہارا حق ملے گا۔ مگر اس کو پا کر تم انسان ہی رہو گے۔ میں تم سے دور نہیں ہوں۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔

☆.....☆.....☆

زندگی کیا ہے یہ سوال ہزاروں کے ذہن میں آیا ہے۔ ایک معمولی ٹھیس سے یہ ختم ہو جاتی ہے اور کبھی بڑی سے بڑی چوٹ سے ختم نہیں ہوتی، کئی واقعات آپ نے دیکھے اور سنے ہوں گے کہ حیرت انگیز انداز میں آدمی بچ جاتا ہے، جب کہ اس کے بچنے کے کوئی آثار نہیں ہوتے۔ بڑی سے بڑی پریشانی اور جان لیوا حالات اس کا کچھ نہیں بگاڑتے اور وہ پھر زندگی کی دوڑ میں دوڑتا نظر آتا ہے۔ وہ پیدا ہوا ایک بے نام جزیرے پر، اس جزیرے پر زیادہ آبادی نہ تھی۔ کچھ ہی مکانات تھے، مکانات ان کو کہنا بھی غلط ہے، جھونپڑے تھے اور چند لوگ ہی آباد تھے۔ سب کے سب مجھیرے تھے اور صبح ہی صبح وہ دوستیوں پر سمندر کے سفر پر روانہ ہو جاتے، ان کی کشتیاں باد بانی تھیں اور زیادہ بڑی نہ تھیں، وہ اس کے تھوڑے بڑے تھے۔ پیدائش کے بعد اس کے باپ نے اس کا نام دین محمد رکھا تھا۔ سب اس کو دینو کہتے تھے۔ دینو کا باپ اس جزیرے کا سب سے پرانا باشندہ تھا۔ اس جزیرے کے آس پاس وافر تعداد میں پھیلیاں ملتی تھیں کچھ لوگ وہاں اور آئے اور چارپن جھونپڑیاں اور بن

پتھر کی مورتی میں حرکت ہوئی اور اس نے آنکھ کھول دی۔ کنڈل کے گرد پھرانے والا سایہ تیزی سے کنڈل کے باہر گردش کرنے لگا۔

رولوکا نے پھر کہنا شروع کر دیا۔ ”تو نے اپنی زندگی میں جو کچھ کیا یاد کر..... کبھی کوئی اچھا کرم کیا ہے۔ تیرے نصیب میں اچھا کام نہیں ہے، تو کر ہی نہیں سکتا، کرے گا تو شیطان تجھ سے تیری ساری طاقت چھین لے گا۔ تو تنہا ہو جائے گا اور کھد دنیا میں صرف شیطان کی طاقت ہی نہیں ہے، تو نے دیکھ لیا کہ میں تیری ہر رکاوٹ کو توڑ کر بڑی آسانی سے یہاں آ گیا ہوں۔ تیرے گرد کی ساری شکتی مجھے نہیں روک سکی۔ اب تو اپنے اصل روپ میں آ جا اور اس کو کنڈل کی قید سے آزاد کر دے یہ تیرے مطلب کا نہیں رہا اور تو شیطان کے مطلب کا نہیں ہے، اس لیے کہ تو نے اس کا کام نہیں کیا۔“ رولوکا بولا۔

آسمان پر زور کا کڑا کا ہوا، چاروں طرف جلیاں چمکنے لگیں۔ بادلوں کی گھن گرج عروج پر پہنچ گئی درختوں سے پرندے اڑ کر بھاگ گئے۔ کیڑے مکوڑے اپنی جان بچانے کو بلوں میں جانے لگے۔ ہر طرف ایک افراتفری پیدا ہو گئی۔ پتھر کے بت میں جان پڑ گئی اور وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کے گرد منڈلانے والا سایہ ساکت ہو گیا۔ اور پھر اس سائے کا روپ بدلا اور وہ مجسم شوس انسانی شکل میں آ گیا۔ وہ رولوکا کے سامنے کھڑا تھا مگر اس کو نہیں پتا تھا کہ وہ کسی کے سامنے ہے۔ رولوکا کی آواز اس کے کان میں آئی۔

”بول کیا تو انسان بنے گا؟“

گرو نے گردن جھکا کر کہا۔

”میں ہار گیا۔ میری بھول تھی، میں غلط راہ پر چل رہا تھا۔ تو نے مجھے ہوش دلایا تو کون ہے۔“

رولوکا اس کے سامنے ظاہر ہو گیا اور بولا۔

”تیرا وقت ختم ہو چکا ہے اور وہ شکتی جو کچھ تجھ کو اب

تک دنیا میں رکھے ہوئے تھی اس کو تو نے خود چھوڑ دیا۔ تیرا

اے لوگ اتنی بڑی بڑی کشتیاں اس نے دور سے گزرتے جہاز اور کشتیاں دیکھی تھیں۔ اس کو ان کی وسعت کا پوری طرح اندازہ نہیں تھا، یہاں یہ سب اس کے سامنے تھا جبر ان تو اس کو ہوتا ہی تھا۔
 ”اڑے دینو کیا دیکھتا پڑا ہے۔“ اس کے ایک ساتھی جبر نے پوچھا۔
 ”اڑے ادھر اتنا آدی کدھر سے آ گیا ہے۔“ دینو نے کہا۔

”اڑے تم ابھی بوتا ہے یہ بہت بڑا شہر ہے اڑے، آگے جائیں گا تو تم چریا ہو جائیں گے۔“ جبر نے کہا۔
 ”آگے کدھر جائیں گے۔ ابی ہم لوگ کو گھر بھی جانا ہے۔“ دینو بولا۔
 ”میرا دل کرتا ہے میں بہت باری شہر آیا ہوں، پن آگے نہیں گیا۔“ جبر نے کہا۔
 ”ہاں اڑے ہمارا دل بھی کرتا ہے۔“ دینو نے جواب دیا۔

”وہ دیکھو ادھر کیسا کیسا گاڑی ہے۔ گھوڑا گاڑی گدھا گاڑی، اونٹ گاڑی، سب جانور کو ان لوگ نے دھندے میں لگا دیا ہے واڑے۔“ جبر نے کہا۔
 ”ابھی واپس چلو اماں ہم لوگ کے واسطے پریشان ہوں گا۔“ دینو نے کہا۔

اور وہ دونوں واپس جزیرے پر آ گئے۔ گرد و نون کے دل میں شہر دیکھنے کی خواہش پیدا ہو گئی۔
 دینو نے باپ سے پوچھا۔ ”ابا تم شہر دیکھا ہے۔“
 ”ہم تو ادھر پیدا ہو اہوں۔ سنا ہے بہت اچھا شہر ہے۔ صاف ستھرا، مگر ادھر شہر کے لوگ کا دل صاف ستھرا نہیں ہوتا۔“ اللہ رکھا بولا۔
 ”ابا تم ان لوگ کا دل کس طرح دیکھا ہے۔“ دینو نے پوچھا۔

”تم ابھی بچہ ہے تم میں عقل آئیں گا تو تم کو بھی سب نظر آئے گا۔“ اللہ رکھا نے کہا۔
 دینو کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مگر وہ اٹھ کر سمندر کے

گیس، ان میں ہال بچے دار لوگ بھی تھے۔ ان سب نے پانی کا مسئلہ یوں حل کیا کہ ایک کنواں کھودا گیا اور اس میں پانی بھی میٹھا نکل آیا اور انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

سب ہی غریب تھے، سب نے مل کر ایک کشتی بنائی۔ کشتی بنانے کے لیے درختوں کو کاٹ کر لکڑی حاصل کرتے تھے۔ شکار کے بعد رات کو کشتی بناتے اور ایک اتنی بڑی کشتی بنانے میں کامیاب ہو گئے جس پر ایک ساتھ کئی آدمی شکار کرتے تھے۔ وہ جو شکار کرتے آپس میں برابر تقسیم کرتے اور پھر سب اپنا اپنا مال قریبی شہر لے آتے۔ یہاں پر خریدار ہر وقت تیار ملتے۔ اور وہ ان کو فروخت کر کے ضرورت کی چیزیں خرید کر واپس چلے جاتے۔

کئی سال یہ بستی کسی کی نظر میں نہیں آئی۔ مگر پھر آہستہ آہستہ لوگ واقف ہوتے گئے اور لوگ اللہ رکھا گوٹھ کے نام سے اس بستی سے واقف ہو گئے۔ اور اللہ رکھا گوٹھ کی آبادی میں بھی اضافہ ہوا۔ بہت سے نئے گھرانے آ کر آباد ہو گئے۔ پانی کے لیے اور کنوئیں بنائے گئے۔

ان دنوں اللہ رکھا کی عمر بھی زیادہ ہو گئی تھی وہ اپنی کشتی پر شکار پر جاتا ضرور تھا، مگر زیادہ محنت وہ نہیں کر پاتا تھا، صرف اپنے خیرے سے دوسروں کو فیض یاب کرتا رہتا تھا۔ اس کا حصہ اس کو پورا ملتا تھا، تین جانوروں کے لیے اچھا خاصا کما لیتا تھا۔

اس کا بیٹا دین محمد عرف دینو بڑا ہوشیار تھا وہ بہت کم عمری سے باپ کے ساتھ شکار پر جاتا تھا۔
 باپ نے تو کسی کو بتانے میں کنجوسی نہیں کی تھی۔ پھر اپنی اولاد کو کیوں نہ بتاتا کچھ ہی دن میں دینو سمندر کے بارے میں بہت کچھ جاننے لگا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی مہارت بڑھتی گئی اور پھر دینو نے باپ کو گھر بٹھا دیا اور کام کا پورا بوجھ اپنے اوپر لے لیا۔

اور وہ پہلی دفعہ مال لے کر شہر آیا۔ وہ پیدا ہوا ایک چھوٹے سے جزیرے پر ہوش سمندر کے اندر مچھلیاں پکڑتے سنبھالا۔ شہر کی آبادی اور چہل پہل دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

کنارے چلا گیا۔ وہاں پر اس کا دوست جبرو موجود تھا۔ وہ بولا۔

”اڑے۔ جبرو تم کسی کا دل دیکھا ہے۔“

”دیکھا ہے۔“ جبرو نے جواب دیا۔

”کدھر دیکھا ہے۔“ دینو نے پوچھا۔

”شہر میں ہم مستی مہوج کرتا پڑا تھا۔ ادھر ایک

دکان پر دل اور گھٹی سب بکتا تھا۔“ جبرو بولا۔

”دل کیسا تھا۔ ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔“ دینو بولا۔

”گول تھا لال لال بہت دل ادھر پڑا تھا۔ وہ

دکاندار بولتا تھا کمرے کا دل چار آنے کا لو۔“ جبرو بولا۔

”سب ایک جیسا تھا کہ ان میں فرق تھا۔“ دینو

بولا۔

”نہیں اڑے سب برابر تھا۔ ایک جیسا تھا سب

میں سے خون نکل رہا تھا۔“ جبرو بولا۔

”پھر میرا باپ کیوں بولتا ہے شہر کے لوگ کا دل

صاف ستھرا نہیں ہوتا۔ اڑے اندر میل مٹی گند کس طرح

جائیں گے، میں تو حیران ہوں۔“ دینو نے پوچھا۔

”تیرا مستک پھر بیلا ہے۔ باپ کا مطلب یہ نہیں

ہے جو تو بولا۔“ جبرو نے کہا۔

”پھر تو بتا تو بڑا ہوشیار ہے، بہت دفعہ شہر جاتا

ہے۔“ دینو بولا۔

”میرے خیال میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ادھر کا

آدمی اچھا نہیں ہے۔ جو بولتا ہے وہ نہیں کرتا، جو کرتا ہے

بولتا نہیں ہے۔ آدمی چکر میں پڑ جاتا ہے۔ ادھر جانے کو

ہوشیاری کا جبروت ہے۔“ جبرو نے بتایا۔

”تو برو بولا۔ جبرو وہ اپنا جو مال اٹھاتا ہے تا

میرے کو بولا تو میرے کو مال لا کر دیا کہ اور سب کو بھی بول

میرے کو مال لا کر دیویں میں تم کو کمیشن دوں گا۔ میں بولا

میں اس کا کیا کرتا ہے کار چیز ہوں گا۔ تو بتا یہ کمیشن کیا ہوتا

ہے۔“ دینو نے سوال کیا۔

”کمیشن میرے خیال میں کھانے کا کوئی چیز ہوں

گا، وہ تم کو اس لیے بولا ہے۔“ جبرو نے اپنی معلومات کے

مطابق جواب دیا۔ ”اڑے ہم لوگ کا کیا جبروت پڑا ہے کہ اس کا کمیشن کھائیں گے ہم لوگ بہت اچھا پھل کھاتا ہے۔“ دینو بولا۔

شہر سے دور ایک جزیرے پر پیدا ہونے والے تعلیم

اور سوسائٹی سے دور سمندر میں زندگی گزارنے والے اس

سے زیادہ کیا ہوشیار ہوں گے۔ دونوں کی عمریں پندرہ اور

بیس کے درمیان تھیں۔ دونوں سمندر کے کنارے کھلی

فضاؤں میں اپنے اور پھل کی استعمال کرنے والے جسمانی

طور پر بہت تندرست اور بلند قامت تھے۔ ان کے بازو

بہت طویل اور مضبوط تھے۔ جسم میں پھرنی ایسی کہ جیسے روم

روم میں بجلی کی بیڑیاں لگی ہوں، سمندر کی لہروں سے جنگ

ان کا روز کا معمول تھا۔ ہوا کا رخ دیکھ کر اور ہوا کی خوشبو ان کو

بتاتی تھی کہ سمندر کا موڈ کیا ہونے والا ہے۔ مانی گیری

ان کے جسم میں اس طرح بھری تھی کہ بڑے سے بڑے میسر

جو بات نہیں سمجھ پاتے وہ فوراً سمجھ جاتے تھے۔ کچھ تو ان

دونوں نے سمندر میں زندگی گزارنی تھی۔ اس لیے تھا اور کچھ

ان کے باپوں نے اپنا اپنا تجربہ ان دونوں کے اندر اتارنا تھا۔

سمندر ان کا ہمیشہ دوست رہا تھا۔ اس نے ان کو کبھی مایوس

نہیں کیا تھا۔ اللہ رکھا کہا کرتا تھا۔ ”بیٹا سمندر کو ہمیشہ خوش

رکھنا، اس کی مرضی کے خلاف نہ چلنا، کب اس کا مزاج

بگڑ جائے کسی کو پتہ نہیں ہوتا اور جب اس کا مزاج بگڑتا ہے

تو پورا پورا شہر اس میں ڈوب جاتا ہے۔ اس لیے تم جب بھی

ایسا محسوس کرو اس کے مقابلے پر ہرگز نہ آنا، اس سے جتنی

جلدی ہو دو رہو جانا، یہ بہت ظالم بھی ہے اور دنیا کو یہ کھانے

کو بھی دیتا ہے۔“ سمندر کی مزاج شناسی کے سارے طریقے

اس نے بتا دیئے تھے۔ یہ سب اس کے تجربات تھے ہر مانی

گیر اپنی اولاد میں یہ تجربات اتارتا ہے۔

اللہ رکھا کو اس پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ اب سمندر

کے بارے میں بہت کچھ جان گیا ہے۔

مگر دنیا کے بارے میں اللہ رکھا کو کوئی تجربہ نہیں

تھا، اس نے جزیرہ پر پیدا ہو کر زندگی گزارنی تھی۔ وہ اپنے

کام کا ماہر ضرور تھا۔ مگر دنیا میں کیا ہو رہا تھا۔ دنیا والوں

کے چلن کیا تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ پھر اس کے بارے میں
میں نے کو کیا بتاتا۔

دینو کے دل میں شہر دیکھنے کی حسرت چل رہی
تھی۔ جبرو اس سے ذرا سا ہوشیار تھا۔ مگر وہ بھی شہر دیکھنے کا
شوق رکھتا تھا۔

مجھلی کا خریدار، اللہ رکھا گوٹھ روز آتا تھا اور سب
مال خرید کر لے آتا تھا۔ اس سے مائی گیروں کو یہ فائدہ
تھا کہ ان کو شہر نہیں آنا پڑتا تھا اور ٹھیکدار کو کچھ کم قیمت پر
مال مل جاتا تھا۔ اس کے پاس بڑی سی لالچ تھی اس میں
منوں برف بھری رہتی تھی۔ وہ گوٹھ جا کر محلی خریدتا تھا۔
اور پھر اپنی مرضی کے دام پر شہر میں فروخت کیا کرتا تھا۔
آدمی بڑا ہوشیار تھا، لالچ پر مبنی اس کے ملازم تھے۔ زبان کا
بڑا میٹھا تھا اور گاؤں کے سادہ چھیروں کو بڑی آسانی سے
اپنے دام میں پھانس لیتا تھا۔

”یہ ٹھیکدار ہم لوگ سے مال اٹھاتا ہے۔ شہر میں
رہتا ہے کیا ج۔“ دینو نے جبرو سے پوچھا۔

”میں بولتا ہوں ہم لوگ شہر جائیں گا تو یہ ہم لوگ
کا مدد کریں گا۔“ دینو نے پوچھا۔

”اڑے ہم کو کیا پتہ ابی ہم کیا بولے۔“ جبرو نے کہا۔
”ابی ہم دونوں ایسا کرتے ہیں کہ وہ آئیں گا تو
اس سے بات کریں گا۔“ دینو نے کہا۔

”ٹھیک ہے بات کریں گا تو فکر مت کرو۔“ جبرو
بولے۔

دوسرے دن ٹھیکدار آیا تو جبرو نے مال دینے کے
بعد پوچھا۔

”اڑے گورو دھن دادا تم کو ایک بات پوچھنا تا۔“
بولے۔

گورو دھن نے پوچھا۔ ”یوں کیا بولتا ہے؟“
”ہم لوگ ادھر رہتا ہے اور ہم لوگ نے شہر نہیں
دیکھا، ہم لوگ بھی شہر دیکھنا مانگتا ہے۔ ہم لوگ تو نواہوں گا
بہت بڑا شہر ہے گم ہو جائیں گے تو بولو تو ہمارا لوگ کا مدد
کرو۔“ جبرو نے بڑی مشکل سے انک انک کر مقصد بتایا۔

”بس اتنا بات ہے تم ادھر ہمارا ڈیرے پر آ جاؤ
ہمارا گودام بھی ادھر ہے۔ ہمارا آدمی ادھر ہوتا ہے۔ وہ تم کو
شہر کا سیر کرائے گا۔ ادھر تم دو چار دن رہو۔ موج کرو روٹی
پانی تم کو ملے گا۔“ ٹھیکدار گورو دھن نے لا پرواہی سے کہا۔
”اڑے بہت مہربانی ٹھیکدار ہمارا ایک ساتھی
دینو ہے دونوں آئیں گا۔“ جبرو نے ٹھیکدار کو بتایا۔

”تم لوگ اپنا گھر والوں کو بتادینا اور شہر میں تم
کدھر رولتا پھرے گا، ہمارا ساتھ چلنا جب جانا ہو
بتادینا۔۔۔۔۔۔“ گورو دھن بولا۔

”ٹھیک ہے۔ سائیں ہم لوگ تم کو بتائے گا۔“
جبرو بولا۔

”جبرو دھبی ماں باپ کا اکھوتا لڑکا تھا، مگر اس کا باپ
کام کرتا تھا اور کشتی پر شکار کو جاتا تھا۔ دینو کا باپ زیادہ
بوڑھا تھا اور وہ شکار پر نہیں جاسکتا تھا۔
“ار۔“ جبرو ٹھیکدار کیا بولا۔“

جبرو نے بتایا۔ ”وہ بولتا ہے میرے ساتھ چلو ادھر
اس کا ڈیرہ ہے گودام ہے ادھر اس کا آدمی رہتا ہے۔ وہ ہم
لوگ کو سیر کرائیں گا۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوا پر ہم لوگ کا جانا بہت مشکل
ہے۔“ دینو نے مایوسی سے کہا۔

”ارے خود بولتا تھا ابی بولتا ہے مشکل ہے، کیا الفوا
ہے بول۔“ جبرو بولا۔

”دو چار دن، ہم شکار پر نہیں جائیں گا تو کھائیں گا
کیا۔ ہمارا باپ تو کام نہیں کرتا۔ تیرا بات دوسرا ہے۔ تیرا
باپ ابی کام کرتا ہے۔“ دینو نے کہا۔

”ہاں اڑے تم برابر ٹھیک بولا۔“ جبرو نے کہا۔
”میں ایسا کرتا ہوں تھوڑا زیادہ کام کرتا ہوں مال

زیادہ پکڑتا ہوں، ماں کو آٹھ دس دن کا خرچا دے گا کچھ
دن مال میں سے خرچ خرچ جمع کروں گا تو بھی ایسا کرتا
پھر چلیں گے۔“ دینو نے کہا۔

”واہ اڑے تو بڑا ہوشیاری والا بات کرتا ہے۔“
جبرو نے ہنس کر کہا۔ اور دونوں دوست زیادہ سے زیادہ

محنت کرنے لگے۔

ایک مہینہ گزر گیا اب ان کے پاس اتنا سرمایہ تھا کہ گھر کا خرچ دس پندرہ دن چل سکتا تھا۔ اور ان کی جیب میں بھی بیس بیس روپے خرچ کورہتے تھے۔

اور وہ ٹھیکیدار کی لانچ میں سوار ہو گئے۔ لانچ کئی مقامات پر ان کو پھرتی ہوئی مال اٹھاتی رات کو شہر پہنچ گئی اور مال اتارنے لگی، وہ دونوں بھی ٹھیکیدار کے آدمیوں کی مدد کرنے لگے، ٹھیکیدار یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا، مال ٹرکوں پر لا کر جانے لگا تو ٹھیکیدار نے کہا۔

”تم لوگ اس ٹرک میں بیٹھ جاؤ یہ ٹرک گودام ہی جائے گا۔ میں ڈرائیور کو بول دیتا ہوں وہ تم لوگ کا ادھر سونے اور کھانے کا بندوبست کر دے گا۔ صبح میں آ جاؤ گا۔ بیوی باری لوگ بھی صبح آتے ہیں۔“ دونوں ٹرک میں سوار ہو کر گودام میں آ گئے۔

دینو نے اتنے بڑے بڑے گھر اتنی اونچی اونچی بلڈنگیں کب دیکھی تھیں۔ وہ حیرت سے ان کو دیکھتا رہا، بڑی بڑی صاف سڑکیں بھی اس کے لیے باعث حیرت تھیں۔

رات کو ان دونوں نے گودام کی ایک چار پائی پر گزاری مگر رات بھر ان کو کھل پریشان کرتے رہے۔ اذالوں کے فوراً بعد میں ان کو اٹھنا پڑا۔ کیونکہ پھلی کے خریدار آنا شروع ہو گئے تھے۔ ان دونوں کو ایک ایک مسکابن اور لمبا پانی چائے مل گئی۔ اور زندگی میں پہلی دفعہ دینو نے کھن لگا بن کھایا اور ایرانی ہوٹل کی لمبا پانی چائے پی کر اس کو بہت مزا آیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد ٹھیکیدار آ گیا اور مچھلیوں کے بھاؤ تاؤ ہونے لگے۔

دس بجے تک سارا مال بک گیا اور ٹھیکیدار کو فرصت ہو گئی۔ وہ دونوں ٹھیکیدار کو مصروف دیکھ کر اس کے قریب نہ آئے۔ فرصت ہونے پر ٹھیکیدار ان کے قریب خود گیا اور بولا۔ ”رات آرام سے گزرا تم لوگ کا۔“

”ہاں سائیں بہت آرام سے گزرا۔“ دینو بولا۔ وہ مسکابن اور چائے کے بعد رات کی تکلیف بھول گیا تھا۔ اس نے آواز دی، حمزہ و خان ادھر آ۔ چوکیدار حمزہ و

خان اس کے پاس آ گیا تو وہ بولا۔

”یہ بچہ لوگ ادھر شہر کا سیر کرنے کو آیا ہے، ان لوگوں کو شہر کا سیر کراؤ۔ یہ دورو پیہ کرائے کا پکڑو روٹی بھی کھلا دینا۔“ اور ٹھیکیدار چلا گیا۔

حمزہ و خان نے گودام کو تالا لگایا اور بولا۔ ”ہمارا ساتھ آؤ تم کو گھمائے گا۔“

تینوں پیدال ہی شہر کی سیر کے لیے نکل پڑے۔ روڈ پر گھوڑا گاڑی آ جا رہی تھیں۔ ایک دوکاریں بھی فراٹے بھرتی گزر رہی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف اونچی اونچی بلڈنگیں کھڑی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد یہ لوگ ایک بس میں سوار ہو گئے۔

ایک لمبے سے پل پر یہ لوگ آ گئے۔ پتھر کے اس پل پر آخری میں بارہ درزی بنی ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر تو دونوں حیران رہ گئے، ان کے سامنے سمندر، اپنے جوبن پر تھا۔ دونوں کو بہت مزہ آ رہا تھا۔ بس تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے اسٹاپ پر رکتی پھر چلی پڑتی۔

تین دن وہ شہر کی سیر کرتے رہے اور پھر گھر چلے گئے۔ مگر ان کے دل شہر کے بازاروں اور سڑکوں پر رہے اور نگاہوں کے سامنے شہر کی اونچی اور عالی شان عمارتیں ہر وقت پہنچنے لگیں۔ مگر وہ بے بس تھے وہ پیدا کٹی چھیرے تھے۔ ان کی روزی مچھلی پکڑنا تھا، اس کے علاوہ ان کو کوئی ہنر نہیں آتا تھا۔

دونوں نو جوان تھے۔ دونوں کے جسم کا لے پتھر کے تراشے ہوئے لگتے تھے۔ دونوں کے سینے کشادہ بازو لمبے اور ان کی مچھلیاں بہت ابھری ہوئی تھیں۔ دونوں کے سر کے بال گھنگریلے تھے اور سر گول تھے۔ ان کو حسین نہ ماننے والے بھی ان کے جسم کو حسین کہتے تھے۔

محنت نے ان کو بہت مضبوط اور سمندر نے ان کو بہادر بنا دیا تھا۔ کیسا ہی ہوا کا طوفان ہو وہ گھبراتے نہیں تھے۔ باد بانوں کو اس طرح ہوا کے رخ سے چلاتے تھے کہ کبھی ان کی کشتی کو نقصان نہیں ہوا۔ ان کی مہارت کو آزمانے کے بعد ہی دونوں کے باپو نے ان کو اکیلا چھوڑا

سے بولا۔

”اڑے ہم کو کیا پتہ ہم خود پہلی دفعہ آیا ہے۔“ جبرو

نے جواب دیا۔

”دیکھو جبرو یہ ضرور کچھ گڑبڑ ہے ہم لوگ کو ادھر لایا

گیا ہے۔“ دینو بولا۔

”اڑے کھسوتم ادھر رکواڑے اوگلوتم بھی ادھر کشتی

پر ہیں گا ہم لوگ پتہ کرتا ہے۔“

دینو اور جبرو دونوں کنارے پر کود گئے۔ جزیرے

پر نہایت گمبیر خاموشی تھی۔ کبھی کبھی پانی کے کنارے پر

نعرانے کی آواز آ جاتی تھی۔ کسی قسم کا کوئی پرندہ بھی نظر

نہیں آتا تھا۔ جھاڑیاں اتنی زیادہ تھیں کہ ان کو ہٹا کر راستہ

بنانا پڑ رہا تھا۔ ان جھاڑیوں میں سفید رنگ کے بڑے

بڑے کانٹے تھے اور پہلی پھلیاں لگ رہی تھیں۔

پانچ منٹ کے بعد ایک کھلا میدان ان کے سامنے

تھا اور اس میدان کے آخری سرے پر ایک پیری کا درخت

کھڑا تھا۔ شاید یہ درخت اس جزیرے کا سب سے اونچا

درخت تھا۔

دونوں نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ درخت

تک آنے میں تین چار منٹ صرف ہوئے۔ درخت پر کوئی

پرندہ نہیں تھا ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ کہ اچانک ان کے

کانوں میں آواز آئی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ دونوں چونک پڑے، دونوں بہت

نڈر تھے، جسم میں طاقت بھی رکھتے تھے۔ نظر بھی تیز تھی۔ مگر

جس غیر متوقع انداز میں واقعات ان کے سامنے آ رہے

تھے وہ ان لمحات کے سحر میں خود کو جکڑا محسوس کر رہے تھے۔

دونوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مگر دونوں حکم کے مطابق

زمین پر بیٹھ گئے۔ پھر اچانک ہی ان کے سامنے ایک جگہ

غیر مانوس سی تحریک نظر آئی۔ اور ایک جھاڑی کی اوٹ

سے ایک آدمی آنا نظر آیا۔ اس کو آدمی اس لیے کہا جائے

گا کہ دو پیروں پر چل کر آ رہا تھا۔ اس کا سر بہت چھوٹا اور

پیٹ بہت بڑا تھا۔ سر لمبوتر، اکھاڑی نما تھا۔ اس کو دیکھ کر

خود بخود خوف کا احساس ہوتا تھا۔

تھا۔ اپنی کشتی کے وہ دونوں ناخدا تھے اور پورے گونٹھ میں

سب سے زیادہ مال وہ لاتے تھے۔ دونوں کے باپ ان پر

نفر کرتے تھے۔

دونوں کشتی لیکر رات کو ہی شکار پر روانہ ہو گئے۔

آج ان کا ارادہ جھینگے پکڑنے کا تھا۔ دونوں جانتے تھے

جھینگے کا علاقہ دور ہے۔ مگر ٹھیکیدار نے کہا تھا۔ اس لیے جانا

ضروری تھا۔ ٹھیک مقام پر پہنچ کر انہوں نے لنگر ڈال دیا،

ان کے ساتھ دو آدمی اور تھے چاروں نے جال ڈال دیے

اور سمندر میں اتر گئے، پانی گردن تک تھا۔ کہیں زیادہ ان کو

جال آہستہ آہستہ سمیٹنا تھا۔ وہ چاروں اپنا کام مہارت

سے کر رہے تھے۔ ان کی مہارت اور محنت رنگ لائی اور

جال میں ان کی امید کے مطابق مال آ گیا۔

ہر بار وہ کامیاب ہوئے سورج کی پہلی کرن کے

ساتھ ہی ان کے واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ دن کا وقت

تھا۔ ہوا بھی زیادہ تیز نہ تھی، اس ماحول میں ان کو کشتی

چلانے میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی تھی۔ مگر آج کئی دفعہ

ایسا ہوا کہ کشتی کا رخ خود بخود جنوب کی جانب ہو گیا۔ ہر

دفعہ انہوں نے کشتی کو مشرق کی سمت موڑا، مگر خود بخود کشتی

جنوب کی طرف چلنا شروع ہو جاتی۔

”اڑے کھسو کیا کرتا ہے ادھر کون ہے تمہارا تم ہر

دفعہ ادھر چلتا ہے۔“ جبرو نے کھسو کو کہا۔

”واجبہ ہم کیا کرے۔ یہ خود آپ ادھر کو جاتی ہے۔

وہ دیکھو پردہ کیا بولتا ہے۔“

دینو نے جلدی سے بادبان کا رخ درست کر کے

اچھی طرح اس کو باندھ دیا۔ مگر کشتی پھر بھی جنوب کی طرف

چلتی رہی۔ چاروں سخت پریشان ہو گئے۔ آج یہ انوکھا

تجربہ تھا۔ وہ مشرق کی طرف کشتی کو چلاتے تھے اور وہ جاتی

جنوب کی طرف تھی۔

انہوں نے ہر طرح کی کوشش کر لی، مگر کشتی اپنی

مرضی سے چلتی ہوئی ایک ایسے جزیرے کے کنارے آ کر

رک گئی جس میں ریت اور جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

”ہا کو ہم لوگ کدھر آ گیا ہے۔“ کھسو حیرت

”ہاں ٹے تم بروبر بولا ہم لوگ کو تمہارا نام بی پتہ نہیں ہے۔“

”میں آشامی ہوں اور تو جس جزیرے پر کھڑا ہے یہ بنگال میں ہے۔ تو اپنے جزیرے سے ہزاروں میل دور ہے، مگر فکر مت کرتیرا پکڑا ہوا مال خراب نہیں ہوگا تو اپنے وقت پر گوٹھ پہنچ جائے گا۔“ پھر اس نے ایک اشارہ آسمان کی طرف دیکھ کر کیا اور دونوں کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

اور جب وہ چاروں ہوش میں آئے اس وقت ان کے سامنے اللہ رکھا گوٹھ تھا اور دو پہر کے تین بجے تھے۔ ساحل پر دونوں کے باپ کھڑے تھے۔

”اڑے راجہ کیا بات ہے۔ دیری کر دیا آج۔“

”ہاں ٹے دیر ہو گیا ہے۔“ جبرو نے کہا۔

”ہم لوگ فکر کرتا تھا تم مال کا فکر مت کرو جلدی آیا کرو۔“ اللہ رکھانے کہا۔

”اللہ رکھا ٹھیک بولا۔ ہم لوگ کو تمہارا فکر ہوتا ہے۔“ جبرو کے باپ نے کہا۔

چاروں گھر کی طرف روانہ ہو گئے، اب سب کام اللہ رکھانے کرنے تھے۔

ان دونوں نے کسی کو نہیں بتایا کہ ان پر کیا گزری تھی ان کے ساتھ جانے والے دونوں ان کے ساتھی ان کے جانے کے بعد کشتی پر سوار ہو گئے تھے اور ان دونوں کے دلوں پر خوف طاری ہو گیا تھا کہ اگر کسی کو بتایا تو ان کو اس کا جواب دینا ہوگا یہ احساس دونوں کو ہوا تھا۔ دونوں نے اس واقعہ کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا۔ ایک سال گزر گیا ایک سال میں دونوں نے بہت ترقی کی، اتنا مال ان کو ملنے لگا کہ وہ دو لاکھ انچوں کے مالک ہو گئے۔ ان کی لائیںچوں پر دوسرے مجھیرے ملازم ہو گئے اور ان کی لائیںچیں کبھی ناکام واپس نہیں آتی تھیں۔ جزیرے پر آبادی بڑھ گئی۔ جبرو اور دینو کے گھر بھی اچھے بن گئے اور جبرو کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں مگر یہ شادی نہیں ہو سکی، جس لڑکی سے اس کی شادی ہونے والی تھی وہ اچانک سمندر میں ڈوب گئی۔ یہ انوکھی بات تھی سمندر کے کنارے پرورش پانے والے بچے

وہ دونوں سے دس بارہ قدم دور رگ گیا۔ مگر اتنی دور ہونے پر بھی ان کو بڑی سخت بدبو آ رہی تھی۔ یہ بدبو سڑے گوشت اور چمڑے کے جلنے کی بدبو تھی۔

اس نے اپنی گول گول آنکھیں گھمائیں اور بولا۔ ”ڈرو مت میں نے تم کو بلایا تھا کچھ کام ہے۔“ اس کی آواز بھی اس کی ہیبت کی طرح ڈراؤنی تھی۔ دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے ایک خوفناک اور مکروہ قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”تم دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ ابھی نہیں مگر چلنا ہوگا تم کو بتا دیا ہے تیار رہنا۔“

”مگر ہم لوگ کہاں جائیں گے ہم دونوں کے ماں باپ کا اکیلا کمانے والا ہے۔ پھر ہم لوگ کا باپ کیا کرے گا۔“ جبرو نے ہمت کر کے کہا۔

”تم دونوں میں بھی تو خوبی ہے اسی کارن تو تم پر نظر پڑی ہے۔“

”پر ہم لوگ کا اس میں کیا غلطی ہے۔“ دینو نے پوچھا۔

”میں تم دونوں کو راج کمار بناؤں گا۔ تمہارا یہ خوبصورت شہر کتنی کنیاؤں کو سیراب کرے گا۔ اور پھر ایک نئی دنیا اس جزیرے پر آباد ہوگی۔“ وہ بولا۔

”اڑے ہم لوگ کے ماں باپ کا کیا ہوگا وہ کیا کھائیں گا۔“ جبرو بولا۔

”ان کی فکر نہ کرو میں ان کا بندوبست کر دوں گا۔“ ”اڑے تم ہم لوگ کو جبرو دتی نہیں رکھ سکتا۔“ دینو نے کہا۔

”زور سے مت بول میرے اشارے پر تو درخت پر ہوا میں لٹک جائے گا۔ تو نے دیکھا نہیں کہ تیری کشتی میرے کہنے سے یہاں آ گئی اس نے تیرا کہنا نہیں مانا۔“ دینو ایک دم نرم ہو کر بولا۔ ”ہاں ٹے تم ٹھیک بولا ہے۔“

”تو پھر زیادہ بات مت کر میری شہتی کو مان، تو نہیں جانتا کہ تو اس وقت کہاں ہے اور میں کون ہوں۔“

مچھلی کی طرح تیرتے ہیں، سمندر کو وہ اپنا دوست کہتے ہیں پھر اس سمندر نے جبرو کی ہونے والی دہن کو نگل لیا۔ پھر ایسا ہی دینو کے ساتھ ہوا۔ اور پھر بار بار ایسا ہوتا رہا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ دینو اپنی بڑی سی لالچ کے کمرے میں اکیلا تھا کہ اچانک آشامی اس کے اندر آ گیا۔ دینو اس کو دیکھ کر چونک پڑا اور بولا۔ ”اڑے تم کیسا آ گیا، لالچ سمندر کے اندر ہے۔“

”میرے آنے میں کچھ رکھ کاٹ نہیں ہوتی، میں آشامی ہوں، اس دھرتی کا مہمان شفیق تو اور تیرا دوست برابر کوشش کرتے رہے کہ شادی ہو جائے مگر نہیں ہوئی اس لیے کہ میں نے نہیں ہونے دی تو اور تیرا دوست اتنی بڑی بڑی لالچوں کے مالک ہو گئے تیرے حالات بدل گئے، اس لیے کہ میں نے تیرے حالات کو بدل ڈالا۔ تو اور جبرو دونوں میرے ہوتے دونوں شادی نہیں کر سکتے۔ اگر دل کرے تو اور کوشش کر لے اور کنیا سیں ماری جائیں گی، میں تم دونوں کے لیے کنیاؤں کی بیج سجا رہا ہوں، مگر ابھی اس کا سہ نہیں آیا۔ تھوڑا سہ اور انتظار کرنا ہوگا۔ پھر تم دونوں کو راج کمار بنا دوں گا اور پھر میری کھیتی ہری ہو جائے گی۔“

”اڑے ہم لوگ کا سمجھ میں کچھ نہیں آیا..... تم کیا بولا.....“ دینو نے کہا۔

”میری بات سن، تم دونوں میرے ہو، میں تم کو جب چاہوں گا لے جاؤں گا تم دونوں اپنی مرضی سے کسی کنیا سے واسطہ نہیں رکھو گے میں خود تمہارے لیے انتظام کروں گا۔ اب صرف کچھ دن اور تم کو انتظار کرنا ہوگا۔ تیرے اور جبرو کے مانتا پتا بھوکے نہیں مریں گے میں اب آؤں گا تو دونوں کو میرے ساتھ جانا ہوگا اور ہاں اب شادی کرنے کی کوشش مت کرنا میں تیری اور جبرو دونوں کی شادی بہت سندر کنیاؤں سے کروں گا۔ شادی کی چننا مت کر تو تو راج کمار بنے گا اس دھرتی کا۔ راج کمار تیری جتنی بھی ایسی ہی ہونی چاہئے، میں جانتا ہوں میری بات یاد رکھنا۔“

اور آشامی دروازہ کھول کر چلا گیا۔ اس کو اتے کسی نے نہیں دیکھا اور جاتے بھی کوئی نہ دیکھ سکا۔ اس

کے جانے کے بعد ڈینو اس کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ مگر اس کی سمجھ میں زیادہ نہیں آیا۔

رات کو جبرو نے اس کو بتایا کہ آشامی اس کے پاس بھی آیا تھا اور اس نے جبرو سے بھی وہی بات کی جو دینو سے کر چکا تھا۔ پھر بولا۔

”اڑے یہ کیوں بلا ہے سمندر کے اندر لالچ میں آ جاتا ہے، ہم لوگ کا دماغ تو کام نہیں کرتا۔ ہم لوگ کا حالت بھی ایسا ہے۔ یہ کوئی بڑا جادوگر مادوگر لگتا ہے، بولتا ہے ہم نے تم لوگ کا حالت بدل دیا۔ یہ تو ٹھیک ہے جبرو ہم لوگ کے پاس کیا تھا، ابھی ہم لوگ بڑا لالچ رکھتا ہے۔ مال بھی ہم لوگ کو ملتا ہے، کتنا آدم ادھر کام کرتا ہے۔ ہم نا کو بن گیا تم بھی نا کو ہے۔ یہ ہم اتنی جلدی کر لیا، اڑے ہم لوگ کا باپ ایسا نہیں کیا۔ وہ تو ہم سے اچھا چھیرا تھا۔“

”ہاں اڑے جبرو تم بچ بولا۔“ دینو نے جواب دیا۔

”یہ ہمارا سمجھ میں نہیں آتا، وہ ہم لوگ کے اوپر اتنا مہربانی کیوں کرتا ہے؟“ جبرو نے کہا۔

”ہم بھی سوچتا ہے سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔“ دینو بولا۔

”وہ بولتا ہے تم لوگ کو میرے ساتھ جانا ہوں گا۔“ جبرو بولا۔

”میرے کو بھی بولا تھا۔“ دینو نے کہا۔

”اڑے جائیں گا دیکھیں گا وہ کیا کرتا ہے ہم لوگ کا۔“ جبرو سینہ پھلا کر بولا۔

”لڑائی مڑائی نہیں کرنے کا ہے وہ بہت خطرناک آدمی لگتا ہے۔“ دینو نے کہا۔

”ہم لوگ بھی کاغذ کا بنے انہیں ہے۔“ جبرو بولا۔

”ہمارا بات سنو وہ ادھر سمندر کے بیچ میں آ جاتا ہے۔ واپس چلا جاتا ہے۔ اڑے ذرا سوچو وہ آدمی کبھر ہے وہ تو جبرو کوئی بلا ہے۔ ہم لوگ سمندر سے لڑ سکتا ہے، طوفان سے لڑ سکتا ہے۔ اس واسطے کہ ہم لوگ جانتا ہے پراس بلا کو ہم لوگ نہیں جانتا لڑیں گا کیسا۔ ابی تم غصہ والا بات نہیں کرو۔ خالی دیکھو ہم لوگ کو یہ دیکھنا مانگتا کہ یہ کیوں ہے کیا کرتا ہے۔ اور ہم لوگ کا کیا کریں گا!! دینو نے جبرو

کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”بات تمہارا اسلہ آتا ٹھیک لگتا ہے بھڑو۔“
جبرہ بولا۔

جاری تھی اور ان کو پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں پر ہیں اور کس طرف جارہے ہیں، یہ سفر رات بھر جاری رہا اور صبح وہ پھر اس جزیرے پر مڑے تھے۔ جہاں پر ایک دفعہ پہلے بھی آچکے تھے۔ ایک رات میں اتنا لمبا سفر حیرت انگیز تھا، ان کے لیے۔

آشامی کنارے پر ان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ان سے پہلے وہاں پر پہنچا۔ دونوں حیران تھے مگر سوال دونوں نے نہیں کیا۔

”دیکھ لو یہی استھان ہے تمہارا اب تم کو یہیں پر رہنا ہے۔“ آشامی بولا۔

دونوں لالچ سے اتر کر کنارے پر آگئے۔ دینو بولا۔ ”ہم لوگ کالا لچ ادھر آ گیا، ہمارا آدمی شکار پر کیا جائیں گا۔“

”تم اس کی فکر نہ کرو، یہ لالچ ان تک پہنچ جائے گا۔“ جبرہ کے لب تک کئی سوال آئے مگر وہ خاموش رہا۔ آشامی نے اپنے گول پیٹ پر ہاتھ پھیرا، چھوٹی سی کھوپڑی کو ہلایا اور بولا۔

”تم لوگوں کے کارن میں نے اپنی پہچان ختم کر دی ہے اور اب تم کو باس نہیں آئے گی۔ میری ہر بات کو فور سے سننا اور جو تم کو کھانے کو ملے کھانا، تم نے اپنی زندگی میں کبھی جو نہ کھایا ہوگا وہ تم کو میں کھلاؤں گا۔ جہاں کی کہو گے سیر کراؤں گا تم آزادی سے جس شہر میں کہو گے پہنچا دوں گا۔ مگر یاد رکھنا ہو گے میری نظروں کے سامنے ہی۔ تم دونوں کی سکھشا آماؤں کی اندھیری رات سے شروع ہوگی۔ تمہارے پاس ایک مہینہ ہے سیر کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔“

”اس کھٹارا جگہ ہم لوگ کیا سیر کریں گا ادھر کیا ہے۔“ دینو نے کہا۔

”پورا ملک پڑا ہے جہاں بولو گے پہنچا دوں گا۔“ آشامی نے جواب دیا۔

”ابلی تم ہر دو بولا میں تو دلی جائیں گا، ادھر سنا ہے بہت بڑا شہر ہے۔“ دینو نے کہا۔

”میں بھی ادھر جائیں گا۔“ جبرہ نے جلدی سے کہا۔

”ابلی دوسرا بات سنو وہ بولا ہے کہ کبھی بھی ہم لوگ کو لے جائیں گا۔ میں باپ کو بولتا ہوں۔ ہم لوگ اور آگے بھی سیر کو جائیں گا تم فلا۔ مت کرنا۔ اب ہم پھر نہیں واپس گا۔“

”تم بھی اپنا باپ کو بول دو۔“ دینو نے کہا۔
”بات تو ٹھیک ہے۔“ سمندر میں سے لے گیا تو جبرہ کی طرح بتائیں گا۔“ جبرہ بولا۔

”اس واسطے بولتا ہے۔“ دینو نے کہا۔
”ٹھیک ہے بھڑو میں کرتا ہوں جگاڑ۔۔۔۔۔۔“
جبرہ بولا۔

اور پھر تین ماہ گزر گئے۔ رات کا وقت تھا سمندر می خاموش تھا۔ اللہ رکھا جزیرے پر خاموشی تھی، آسان پر اب تارہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ رات اس قدر کالی تھی کہ نہ کو آنکھوں کے قریب کر کے دیکھنا پڑتا تھا۔

دینو کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی آنکھ کس آواز سے کھلی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کے سامنے سائے کی طرح شامی کھڑا تھا۔ رات کے اندھیرے میں اس کی شکل نظر آ رہی تھی۔ پھر اس کی آواز دینو کے کانوں میں آئی۔
”سے پورا ہوا تجھے چلنا ہوگا۔“ آشامی کی آواز ف سنائی دی۔

”میں تیار ہوں، دیکھیں۔“ دینو نے کہا۔
دونوں جھوپڑے سے باہر آگئے، ان کے باہر تے ہی سامنے سے جبرہ بھی آ گیا۔ ”تم دونوں اپنی لالچ فر کرو گے۔“ آشامی نے کہا۔

وہ دونوں لالچ کی طرف چل پڑے اور پھر لالچ ارٹ ہو کر ایک طرف روانہ ہو گئی۔

دونوں سمندر کے رہنے والے ان کی اب تک کی سمندر کے درمیان گزری تھی، مگر وہ حیران تھے کہ آج خود بخود سمندر کے درمیان بہت تیز رفتاری سے

گرائٹ ہوٹل ہے۔“ وہ بولا۔
 ”یہ ہوٹل ہے، یہ تو گھر لگتا ہے۔، یہ کیسا ہوٹل
 ہے۔“ جبرو نے کہا۔
 ”یہ تو ہماری سروس کا کمال ہے، سر آپ کو گھر جیسا
 آرام ہم دیتے ہیں۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔
 ”اچھا تم کون ہے اس ہوٹل کے مالک ہے۔“

جبرو بولا۔
 ”میں تو معمولی ملازم ہوں، آپ لوگ کی خدمت
 کرتا ہوں بس۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”اڑے ہم بولتا ہے تمہارا نام تو کچھ ہوں گا۔“
 جبرو نے کہا۔
 ”میرا نام فرناڈس ہے، میں بیرہ ہوں ادھر۔“

وہ بولا۔
 ”واڑے تم بیرہ ہے اور برو برستہ بھی ہے۔“ جبرو بولا۔
 ”میں کان سے بیرہ نہیں ہوں کام کا بیرہ ہوں۔“
 فرناڈس بولا۔

”ابھی تم ہم لوگ کا کھانے پانی کا کچھ کرو ہم اندر
 جاتا ہوں۔“ اور جبرو کمرے میں آ گیا۔
 اندر دینو اٹھ چکا تھا، مگر حیران حیران کمرے کو دیکھ
 رہا ہے۔ ”دینو ابی ہم لوگ دلی میں ہے یہ ہوٹل ہے۔“
 جبرو بولا۔

”ہم لوگ ادھر کیسا آ گیا ہے یہ ہمارا کھوپڑی میں
 نہیں آ رہا۔“
 ”اڑے آشامی بولا تھا تا کہ تم جدھر بولے گا پہنچ
 جائے گا۔“ جبرو نے کہا۔

”لیکن یہ کمرہ میں ہم لوگ کب آیا، اڑے ہم
 سوچ سوچ کر پاگل ہو جائے گا۔“ دینو نے کہا۔
 ”تم پھر بھول گیا۔ اڑے وہ آشامی بہت بڑی بلا
 ہے یہ سب اس نے کیا ہے۔“ جبرو بولا۔

”جوہو میں گاد کیجیے گا۔ ابی ہم کا کوس جانے کا ہے،
 وہ کدھر ہے۔“ دینو بولا۔

”ہم کو کیا پتہ۔“ جبرو بولا۔

”ٹھیک ہے کل تم دلی میں ہو گے، مگر دونوں ساتھ
 رہنا، دلی بڑا خطرناک شہر ہے اس میں بڑے بڑے سورا
 گم ہو جاتے ہیں، ایک بار گم ہونے کے بعد دوبارہ ان کا
 ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔“ آشامی نے کہا۔
 ”اڑے تم فکر مت کرو ہم لوگ ساتھ ہی رہیں
 گا۔“ جبرو بولا۔

”تم کسی جگہ رہو، یہ بات یاد رکھنا کہ تم میرے
 سامنے ہی رہو گے، مجھ سے بھاگنے والا اس دھرتی پر نہیں
 رہتا اور اگر رہتا ہے تو موت کی دعائیں کرتا ہے، مگر موت
 بھی اس کو نہیں ملتی میں آشامی ہوں۔“
 ”پتہ ہے تم آشامی ہے، ابی ہم لوگ کوڈراڈرا کرتے
 ادھر ہی خانہ خراب کرے گا۔“ دینو بولا۔

”تم دونوں میری آس ہو میرے راج کمار ہو، تم
 کو میرے بہت سے کام کرنا ہیں۔“ آشامی بولا۔
 دوسرے دن ان کی آنکھ کھلی تو وہ ایک ہوٹل کے
 کمرے میں تھے۔ جبرو نے حیرت سے اپنے ارد گرد کے
 ماحول کو دیکھا۔ یہ ایک خوب کشادہ کمرہ تھا۔ دو چنگ اس
 میں پڑے تھے۔ ایک پردہ بیٹھا تھا اور ایک پردہ نیچا ہوا تھا۔
 کمرے میں وہ الماریاں اور میز کرسیاں پڑی تھیں، الماری
 کا ایک پٹ کھلا تھا اور اس میں لباس لٹکے ہوئے تھے۔ وہ
 حیرت میں ڈوبا ہوا دروازے کی طرف گیا اور دروازہ کھول
 کر باہر آ گیا۔ دروازے کے سامنے لوہے کی جالی لگی تھی
 اور سامنے زینہ نظر آ رہا تھا اور ایک آدی سفید کپڑوں میں
 لمبوس سر پر صاف باندھے اوپر آ رہا تھا۔ اس آدی نے اس
 کے قریب آ کر ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا اور بولا۔

”سر آپ گھنٹی بجادیتے میں آ جاتا۔“
 ”اڑے گھنٹی کدھر ہے اندر۔“ جبرو بولا۔
 ”گھنٹی تو نیچے ہے کمرے میں اس کا بٹن ہے اس کو
 دبا دیتے میں آ جاتا۔“ وہ بولا۔

”ابھی گھنٹی کا بات چھوڑو یہ بتاؤ یہ کس کا گھر
 ہے۔“ جبرو بولا۔

”یہ گھر نہیں ہے یہ بہت بڑا ہوٹل ہے۔ اس کا نام

”وہ دروازے کے باہر ہوں گا۔“ دینو نے دروازہ کھولا تو وہ ایک صاف ستھرا چھوٹا سا کرا تھا۔ اس میں تولیہ صابن رکھا تھا اور ایک بڑا سا آئینہ بھی لگا تھا۔ وہ اس کے اندر چلا گیا۔

”اڑے بڑا خوشبودار صابن پڑا ہے، جا تو بھی نہ لے۔“ دینو نے واپس آ کر کہا۔

”جاتا ہے“ اور جبرو بھی غسل خانے میں چلا گیا۔ واپس آ کر بولا۔

”اڑے ہم تو کبھی اتنا زبردست نہیں نہایا۔ بہت مزا آیا۔“

”اڑے وہ کدھر ہے جو بولتا تھا میں میرہ ہوں۔“ دینو نے پوچھا۔

”وہ بولتا تھا گھنٹی لگا ہے اس کو بجائو تو وہ آتا ہے۔“ جبرو نے کہا۔

”اڑے گھنٹی کدھر ہے گھنٹی۔“ دینو نے جبرو سے پوچھا۔

”دکھتا تو ہم کو بھی نہیں ہے۔“ جبرو نے جواب دیا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو جبرو نے کہا۔ ”اڑے

اندر آ جاؤ کیا ٹھک ٹھک کرتا ہے۔ ادھر کوئی زبانی نہیں ہے۔“ دروازہ کھول کر فرناؤس اندر آ گیا اس کے ہاتھ

میں ایک بڑی سی ٹرے تھی۔ اس میں کئی انڈے فرائی اور ڈبل روٹی اور نہ

جانے کیا کیا ناشتہ کا سامان رکھا تھا۔ فرناؤس نے سب سامان کو میز پر قاعدے سے رکھ دیا اور بولا۔

”سر آپ ناشتہ کریں، میں گرم چائے لے کر آتا ہوں۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں، وہ بھی لے آؤں گا۔“

”نہیں تم جاؤ اور چائے لاؤ۔“ جبرو بولا۔ اس کے جانے کے بعد زندگی میں پہلی دفعہ ان

دونوں نے میز پر بیٹھ کر ناشتہ کیا اور انڈے ڈبل روٹی کھائی، ان کے لیے یہ ایک نرا لذائقہ تھا۔ دونوں کو بہت

مزا آیا۔

ناشتہ کے بعد دونوں نے چائے پی، فرناؤس نے سب سامان ٹرے میں رکھ دیا، مگر گینٹیں بولا۔ ”سر ہم کو

آپ کی ڈیوٹی پر لگایا گیا ہے۔ دلی بہت بڑا شہر ہے، آپ خود اکیلا نہیں گھوم سکتا، آپ کا گاڑی کھڑا ہے اور ایک گارڈ

بھی موجود ہے وہ آپ کو دلی گھمائے گا۔ آپ جو پوچھ گاہ وہ بتائے گا۔“

”اڑے یہ کون ہے تم کیا بولا اور اس کو کون آنے کو بولا۔“ دینو نے چکر کر پوچھا۔

”آپ کا بل جو دے رہا ہے، یہ سب انتظام اس نے کیا ہے۔“ بیرہ بولا۔

”اڑے وہ کون ہے یہی تو پوچھنا ہے۔“ دینو نے کہا۔

”میں تو جی بہت چھوٹا سا ملازم ہوں مجھے کیا پتہ کون ہے؟“ فرناؤس بولا۔

”اچھا تم ابی ادھر سے پھٹا کھاؤ۔“ جبرو بولا۔ ”فرناؤس نے ٹرے اٹھائی اور خاموشی سے چلا گیا۔

”ہم لوگ تو چکر اگیا ہے۔“ دینو نے کہا۔ ”ابی تم کو کتنی بار ہم بولے گا تم پریشان مت ہو جو

ہوتا ہے ہونے دے۔ ہم لوگ نہ اس کو روک سکتا ہے نہ اپنی مرضی چلا سکتا ہے۔ چلائیں گا تو گردن اور اندر ہو

جائیں گے۔“ جبرو نے کہا۔ ”یہ کپڑا نہیں کس کا ادھر پڑا ہے۔“ دینو نے کہا۔

”ہم لوگ کا کپڑا تو کچرا ہو گیا ہے۔ اڑے دیکھو تو کیسا کپڑا ہے۔“ جبرو نے کہا۔

دینو اٹھ کر الماری کے پاس گیا۔ اس نے ایک شرٹ اتاری اور اپنی شرٹ اتار کر اس کو پہن لیا۔ وہ اس کو

پوری طرح فٹ تھی، ایسا لگتا تھا جیسے اس کی سی ہو۔ پھر اس نے دوسری الماری کھولی، اس میں بھی

کپڑے لٹکے تھے۔ جبرو اور دینو کے جسم ایک جیسے تھے۔ قد اور لمبائی بھی ایک تھی۔ دونوں نے اپنی پسند کے کپڑے

پہن لئے۔ اتنے اچھے لباس انہوں نے زندگی میں پہلی بار پہنے تھے۔ دونوں نے خود کو آئینہ میں دیکھا تو خود حیران رہ

گئے۔ ان کے رنگ کالے تھے۔ مگر جسم اور قد اس قدر مناسب تھے کہ وہ حسین مردوں میں شامل ہو سکتے تھے۔ مگر ان دونوں کو اس کا احساس آج تک نہیں ہوا تھا۔ آج اس خوبصورت لباس میں دونوں نے خود کو دیکھا تو اندازہ ہوا کہ وہ دونوں کتنے دلچسپ اور پرکشش ہیں۔

فرناؤس نے آ کر بتایا۔ ”صاحب گاڑی تیار ہے۔“ وہ دونوں اس کمرے سے باہر آ گئے اور زینہ سے نیچے اترنے لگے۔ زینہ ایک بڑے ہال میں ختم ہوا، اس ہال میں بہت سارے لوگ تھے۔ ان میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان دونوں پر کئی نظریں ٹھہری ہوئی تھیں۔

ایک سرخ بلاؤز اور اسی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس نوجوان عورت ان کے قریب آ کر بولی۔

”آئیے میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“

”ہم لوگ کا انتظار کیوں؟“ جبر و چونک کر بولا۔

”آپ کو گاؤں کی ضرورت تھی، میں گائند ہوں،

میرا نام چمپا ہے۔“ عورت بولی۔

”تم کیا کرتی ہو۔“ اپن کو یہ تو بتاؤ۔“ دینو نے

سوال کر دیا۔

”میں آپ جیسے شوقین لوگوں کی خدمت کرتی

ہوں۔“ چمپا نے جواب دیا۔

”اڑے مگر کیوں کرتی ہو؟“ جبر و نے پوچھا۔

”میرا یہ پیشہ ہے، میرا کام ہے میری یہ روزی

ہے۔“ چمپا نے کہا۔

”اڑے اپن نے تم کو کب بولا کہ تم ہمارا خدمت

کرو۔“ دینو نے پوچھا۔

”آپ کی خدمت کرنے کا معاوضہ مجھے مل چکا

ہے۔“ چمپا نے جواب دیا۔

دینو نے گردن جھکا کر کچھ سوچا اور پھر کہا۔ ”اچھا

ٹھیک ہے چلو۔“

بہت سی حسین عورتوں کی نگاہیں ان پر لگی تھیں، مگر

وہ چمپا کے ساتھ ہوٹل کے مین گیٹ پر آ گئے، ان کے

آتے ہی ایک کاران کے سامنے آ گئی اور جتنا نے دروازہ

کھول کر کہا۔ ”آئیے سر۔“

دونوں اس پہچانی کار میں بیٹھ گئے، چمپا ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئی اور کار روانہ ہوئی۔

بازار میں زیادہ تر تانگے، کیے سڑکوں پر نظر آتے

تھے۔ شرفاؤں کے پاس ان کی اپنی ٹم ہوا کرتی تھیں، ان کے گھوڑے بہت تندرست اور خوبصورت ہوا کرتے تھے۔

کاریں شہر میں بہت کم تھیں، جن کے پاس تھیں وہ بہت

بڑے لوگ مانے جاتے تھے۔ انگریز افسران اور کروڑ پتی

لوگ ہی یہ شوق کر سکتے تھے جو کبھی اتفاق سے کوئی موٹر کار

میں تھوڑا بہت سفر کر لیتا تھا۔ وہ دوسروں کو بتاتا تھا کہ وہ

موٹر میں بیٹھ چکا ہے۔

سینو اور جبر و تو ایک ویران جزیرے کی پیداوار تھے،

ان کے لیے تو دلی شہری عجوبہ تھا۔ پھر ان کو موٹر کی سواری ملی۔

حیرتوں کے سمندر میں تو ان کو غرق ہونا ہی تھا۔ انہوں نے کبھی

خواب میں بھی ایسا نہیں دیکھا تھا۔ ان کی سوچ سے بہت اوپر

کی یہ چیز تھی۔ گڑھی اور خواب نہیں حقیقت تھی۔

قطب مینار کے نیچے وہ کھڑے تھے۔ ان سے دور

ایک شخص کھڑا تھا۔ بظاہر وہ ایک غریب کسان لگتا تھا۔

جبر و نے عورت سے کہا۔ ”میں اوپر جانا مانگتا ہوں۔“

”سر، اونچا بہت ہے آپ تھک جائیں گے۔“

عورت نے لگاؤ سے کہا۔

”اڑے ہم لوگ کمزور نہیں ہے۔“ جبر و بولا۔

”سر آپ بھی اوپر چلیں۔“ عورت نے دینو سے

پوچھا۔

”نہیں تم لوگ جاؤ میں ادھر ہی ہے۔“ دینو نے

منع کر دیا۔

”چل اڑے مڑا آئے گا۔“ جبر و نے کہا۔

”تیرے کو جانے کا ہے جا میں ادھر ہوں۔“ دینو

نے پھر منع کر دیا۔

”پن ہم تو جائیں گام ادھر ٹھہرو۔۔۔۔۔“ اور جبر و

سیڑھیوں کی طرف بڑھا تو عورت بولی۔

”میں بھی چلتی ہوں۔“ اور دونوں مینار کی

دلا یا دیا کہ کسان نے ٹھیک کہا تھا۔
کسان نے اطمینان سے کہا۔ ”وہ نہر کے اس
طرف نہیں آئے گی تو میرے ساتھ آ۔“

وہ کھڑی اپنا سر جلتی رہی..... بھیا تک آواز میں
پکارتی رہی..... مگر کسان دینو کو لے کر آگے بڑھ گیا۔

چلتے چلتے شام ہو گئی اور وہ ایک آم کے باغ میں
پہنچ گئے۔ اس باغ کے درمیان میں ایک جھوپڑی پڑی
تھی اور ایک چار پائی پڑی تھی، کسان بولا۔ ”تیرے لیے
یہ محفوظ جگہ ہے، میں اس باغ کا مالک ہوں، میرا کام صرف
اتنا ہی تھا کہ تجھے اس شیطان سے بچا کر لے آؤں۔“

واقعات اتنی تیزی سے پیش آتے گئے کہ دینو کی
عقل کام نہیں کر رہی تھی۔

”اڑے بھاٹی وہ عورت کون تھا ہم لوگ سے کیا
چاہتا تھا۔“ دینو نے کسان سے پوچھا۔

”میں صرف یہ جانتا ہوں کہ وہ عورت تمہارے دشمن
کی مقرر کردہ تھی۔ کچھ دن تم اس کے ساتھ موح کرتے اور
پھر تمہارا دشمن تم کو اپنے مکروہ مقاصد کے لیے استعمال
کرتا۔ تم نے دلی آنے کا جو فیصلہ کیا یہ تمہاری تقدیر تھی۔
تمہاری عقل میں دلی آنے کا خیال آ گیا۔ دلی آتے ہی میں
تمہارے قریب آ گیا۔ اس عورت کو بھی تمہارے دشمن نے
تمہارے ساتھ لگا دیا۔ لیکن میں تم کو لے آیا؟“ کسان بولا۔
”مگر جبر و پھنس گیا اس کا کچھ کرونے.....“ دینو
بولا۔

”میں کوشش کروں گا، وعدہ نہیں کرتا۔ کیونکہ جبر و
اب دلی میں نہیں ہے۔“ کسان بولا۔

”پھر کدھر گیا۔“ دینو نے کہا۔
”اس کو اور عورت دونوں دشمن لے گیا ہے۔“

”اڑے ہم تو بے وقوف ہے تم کو کیا پتہ چلا تم تو
ادھر ہے کیا تم بھی جادو گر ہے۔ کیا تمہارا علم انسان لوگ کا
عقل سے اوپر کا ہے۔ کیا تم کوئی بھوت ہے کیا ہے تم.....“
دینو حیرت سے بولا۔

”میں کچھ نہیں ہوں، میں انسانوں کا خدمت گار

سیڑھیوں پر کھٹ کھٹ کر کے چڑھنے لگے۔ ان کے جاتے
ہی دور کھڑا کسان دینو کے قریب آ گیا اور بولا۔

”وقت کم ہے تیرے پاس میرے ساتھ آ۔“ وہ بولا۔
”کیوں اڑے کیوں آؤں۔“ دینو بولا۔

”تو بہت بڑی مصیبت میں پھنسنے والا ہے۔ تیرا
دشمن تجھے جس راستے پر لے جانے والا ہے وہ تباہی کا
راستہ ہے۔ ایک بار اگر پھنس گیا تو پھر زندگی بھر ہاتھ پیر
مارے گا تو بھی تیری جان نہیں چھوٹے گی۔ یہ نشان اور
ٹھٹا بے وجہ نہیں ہیں، قربانی کے جانور کو بھی اچھا کھلاتے
ہیں۔“ کسان بولا۔

”دینو کی سمجھ میں فوراً اس کی بات آ گئی وہ بولا۔
”میرا دوست جبر و پھنس تو ہے۔“

”اس کے بارے میں پھر سوچیں گے، تو اپنی
جان بچا۔“ کسان بولا۔

”پھر ہم کیا کرے۔“ دینو نے پوچھا۔
”آ میرے ساتھ۔“ کسان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا

اور ایک طرف کو دوڑا، اس کے دوڑتے ہی مینار کے اوپر سے
عورت نے اس کو روکنے کی کوشش کی مگر کسان نے دینو کا
ہاتھ نہیں چھوڑا۔ دوڑتا رہا۔ پھر جبر و پھنس دیکھا کہ عورت مینار
کے اوپر سے کود گئی، جبر و پھنس سوچا اتنی اونچائی سے گرنے
کے بعد اس کا جسم زمین پر ٹکڑے ٹکڑے پڑا ہوگا۔ مگر وہ
حیران رہ گیا وہ زمین پر آتے ہی کسان اور دینو کی طرف

دوڑی۔ مگر کسان اور دینو بہت تیز دوڑ رہے تھے۔ عورت بھی
کم تیز نہیں تھی۔ اب وہ ان دونوں کے بہت قریب تھی، اس
کے منہ سے بڑی بھیا تک آوازیں نکل رہی تھیں، اس کی
ساڑھی ہوا میں اڑ رہی تھی۔ ان کے راہ میں ایک نہر آ گئی،
کسان اور دینو اس کے پل پر سے نہر کے پار چلے گئے۔
مگر عورت ایک بھیا تک چنچ مار کر رک گئی۔ اس کا حسین
چہرہ بھیا تک ہو گیا۔ اس کی ساڑھی تار تار ہو گئی، بال جو
بہت حسین تھے اب اس کے سر پر کھڑے ہو گئے تھے۔

وہ نہر کے پار کھڑی بھیا تک انداز میں شور کر رہی
تھی۔ اس کے چہرے کے بھیا تک انداز نے دینو کو یقین

بات سن آج کے بعد تو صرف وہ کرے گا جو میں کہوں گا۔ وہ سنے گا جو میں کہوں گا۔ میں تیرے اندر ایسی شکلی بھر دوں گا کہ تو دنیا کا سب سے زیادہ بلوان ہوگا۔ تیرے سامنے دنیا سر جھکائے گی تو اس دھرتی کا رعبہ ہوگا۔ تو وہ کھائے گا جو میں کھلاؤں گا۔ تیرے لیے جو بھوجن بنائے گا وہ بھی دنیا کا بلوان ہوگا۔

تیری بیج پر دنیا کی حسین کنیاؤں کو لائے گا وہ بھی کم بلوان نہ ہوگا، مگر وہ تیرا داس ہوگا۔ تیرا سیوک ہوگا۔ تیرا حکم مانے گا تو کسی ناری پر نظر ڈالے گا وہ تیری ہوگی۔ آج اس استھان پر ایک بہت بڑا میلہ لگے گا رات کو تیری خاطر میں کرتا ہوں دیکھنا۔“

رات کے نو دس بجے ہی آشامی کھلیا میں آ گیا اور بولا۔ ”اب تو باہر آ جا اور دیکھ کہ یہ وہی استھان ہے کہ کچھ اور ہے۔“

دونوں باہر آئے، اور ایک میدانی علاقے کی طرف چلے۔ جہاں پر صبح تک جھانپاں اور دلدل ہوا کرتی تھی۔ اس میدان میں چراغاں تھا ہر طرف روشنی تھی۔ میدان میں سیکڑوں لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کو دیکھ کر سب نے خوشی سے تالیاں بجائیں اور سب ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ وہ اور آشامی لوگوں کی دو طرفہ قطار سے گزرتے ہوئے آگے بڑھے، قطار کے آخری سرے پر ایک بہت بڑا تخت رکھا تھا۔ اس پر ایک پیلی چادر پڑی تھی۔ آشامی اس کو لے کر اس تخت پر بیٹھ گیا۔

رات کے ٹھیک بارہ بجے سارے چراغ خود بخود بجھ گئے اور ہر طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اب تخت کے سامنے صرف ہیولے نظر آ رہے تھے کسی کی سانس کی آواز بھی نہیں تھی۔ اس خاموشی کی چادر کو آشامی کی آواز نے چاک کیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”اے میرے دیوتا تو پوری دنیا پر راج کرتا ہے، میں تیرا سیوک ہوں، مجھے شکلی دے، میں تیری اور زیادہ شکلی پا کر اور تیرے کام کروں یہ تیرا نیا سیوک ہے، اس کو سو بیکار کر اور میری مدد کر کہ میں دوسرے کو بھی تیرے

ہوں جو حکم ملتا ہے، وہ کرتا ہوں۔ میں خود مختار بھی نہیں ہوں۔ تم مسلمان ہو اور بھولے مسلمان ہو تم کو ضرورت ہے میری، کچھ باتیں جو تم کو پتہ نہیں ہیں بتا دوں گا۔ مگر تمہاری مشکلات کا حل تو تجھے خود تلاش کرنا ہوگا۔ مگر ابھی تمہارا اس باغ میں رہنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ تمہارا دشمن تمہاری تلاش میں چاروں طرف موجود ہے، کیوں کہ اس کو اپنی ودیا کی تکمیل کی خاطر تمہاری ضرورت ہے تمہاری زندگی کے ساتھ ساتھ تمہارے ایمان کو بھی سخت خطرہ لاحق ہے۔“

”ہم لوگ کو کب تک ادھر رہنا ہوں گا۔“ دینو بولا۔
”یہ تو اللہ کی مرضی پر ہے۔ میں ابھی کیا بتا سکتا ہوں۔“ کسان بولا۔

”میں ادھر کیا کریں گا بابا۔“ دینو نے پوچھا۔
”جو میں کرتا ہوں ابھی تم کو میں جیسا بتاتا ہوں اس طرح کرو، پھر میں تم کو کچلڑا دوں گا وہ پہننا اور اس کے بعد میں جو کرتا ہوں کرتے رہنا، اس باغ میں تو ہر طرح محفوظ ہے۔ تیرا کوئی دشمن اندر نہیں آ سکتا۔ اور تو باہر نہیں جاسکتا جائے گا تو دشمن کی نظر میں آ جائے گا۔“

☆.....☆.....☆

جبر و کو اس دلدلی جزیرے میں پہنچا دیا گیا اس کی آزادی دینو کے فرار کے فوراً بعد ختم کر دی گئی اور وہ حسین قتلی جو ان کو سیر کرانے کو مقرر کی گئی تھی ایک بھیا تک روپ میں کچڑ اور دلدلوں میں پھرتی تھی۔ اس کے منہ سے ہر وقت بھیا تک آہیں اور کراہیں نکلتی رہتی تھیں۔ جبرو کے ساتھ البتہ ایسا نہیں تھا۔ آشامی کا سلوک اس کے ساتھ دوستانہ تھا۔

”آج کی رات اماؤں کی رات ہے آج سے تیری سکھنا شروع ہو جائے گی تو تیار ہے۔“ آشامی نے پوچھا۔
”اپن تو تیار ہے، پن تم یہ بولو دیو کا کیا ہوا۔“ جبرو نے پوچھا۔

”اس کے نصیب تجھ سے گھٹیا ہیں، میں کیا کر سکتا ہوں، مگر تو فکر نہ کر وہ مجھ سے بچ کر کہاں جائے گا۔ ایک نہ ایک دن اس کو اس استھان پر آنا ہوگا۔ تو غور سے میری

سامنے پیش کروں، یہ اس رات کی پیدائش ہے۔ اسی رات تیرے پاس آیا ہے۔ تیری بھینٹ حاضر ہے۔“ پھر کسی بہت دہلیز کی چیز کے گرنے کی آواز آئی اور سارے چراغ خود بخود جل گئے اور جبرو نے دیکھا کہ ایک بہت بھاری بھینسا زمین پر پڑا تھا اس کی گردن کٹ کر الگ پڑی تھی اور جسم ٹپ رہا تھا۔ آشامی تخت سے اتر کر نیچے گیا اور ایک گول کٹورے میں اس کی گردن سے ابلتا ہوا خون بھر کر تخت کے اوپر آگیا اور بولا۔ ”یہ مہا گورو کے ہاتھ کی بھینٹ ہے۔ اس کو پی جا۔“ اور پیالہ جبرو کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

جبرو حذر زدہ سا ہو رہا تھا اس کو ذرا حساس نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے، ایک ہی سانس میں اس نے پیالہ خالی کر دیا اور پھر لوٹ بیٹھ گیا۔ ہر آدمی عورت نے بھینسا کھانا شروع کر دیا۔ سب کے منہ لال ہو رہے تھے۔ زمین پر پڑا خون بھی چاٹ لیا گیا اور کچھ دیر کے بعد زمین پر صرف ہڈیاں پڑی تھیں، ان ہڈیوں کو داغوں کے سرچ کر اس طرح صاف کر دیا گیا تھا کہ وہ سفید نظر آ رہی تھیں۔

آشامی کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”اے گرو کے وفادارو تم نے دیکھ لیا کہ آج تم میں ایک نیا آیا ہے۔ میں تو اس کو سکھشا دوں گا ہی پر اس کو تمہاری ضرورت پڑے تو تم بھی مدد کرو گے۔“

سب نے ہاتھ اٹھا کر اقرار کر لیا اور دن کی روشنی ہونے سے پہلے پہلے میدان خالی ہو گیا۔ ان کے جاتے ہی میدان پھر ایسا ہی ہو گیا جیسا کہ دن میں ہوا کرتا تھا۔ دوسرے دن سے جبرو کی سکھشا کا آغاز ہو گیا۔ آشامی نے آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”انسان کے پاس جو سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے وہ ہے زندگی، انسان ہر حالت میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔ حالات کتنے ہی اس کے خلاف ہوں وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ مرنا کوئی نہیں چاہتا۔ مگر پھر بھی ہر شخص مر جاتا ہے۔ مگر کچھ ہوتے ہیں جو شریر اور آدمہ کو الگ الگ کر دیتے ہیں۔ شریر کی حیثیت ان کے نزدیک لباس کی سی ہو جاتی ہے۔ وہ اس کو جب چاہیں تبدیل کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں، مگر اس مقام تک پہنچنے کو محنت درکار ہوتی۔

راہنمائی درکار ہوتی ہے اور خود کو ان قوانین اور اصولوں کا غلام بنانا پڑتا ہے۔ میں تیرا گورو ہوں مگر میں بھی آخری نہیں ہوں، میرے آگے بھی کوئی ہے جس کو ہم مانتے ہیں۔ وہی ہماری طاقت کا سرچشمہ ہے۔ وہی ہمارا پاور ہاؤس ہے۔ اگر ہمارا رابطہ ہمارے پاور ہاؤس سے کٹ جائے تو ہم بے حیثیت ہو جاتے ہیں، اس لیے ہم کو اس پاور ہاؤس کے شرن میں رہنا ضروری ہے۔ اس علم کو سمجھنے کے لیے مرحلہ وار آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ آگے بڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ جو پہلے بتایا گیا ہے اس پر عبور ہو جائے، یہاں پر کسی بھول چوک کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کیونکہ جو میرے تیرے کنٹرول میں آتے ہیں وہ کسی طرح نہیں کرتے۔ تم کو بھی کسی پرہیزگار بن کر ناہوگا تجھ کو آگے بہت کچھ کرنا ہوگا۔ آدمیوں کی بھینٹ دینا ہوگی۔

سات پورن ماشیاں منتر پڑھنا ہوگا۔ یہ کالے جادو کا سب سے بڑا منتر ہے۔ تجھ کو سترہ آدمیوں کی بلی دینا ہوگی۔ مگر وہ مقام ابھی دور ہے۔ اس کے جاتے جاتے تو پتھر ہو چکا ہوگا۔ ہر درجے کے الگ الگ قاعدے اور طریقے ہیں، ایک کے بعد ایک تیرے سامنے آئے گا۔ ہر منزل کی مانگ الگ الگ ہے۔ بھوجن الگ الگ ہے اور اس کی طاقت الگ الگ ہے چوک کرنے والا کڑی سزا کا مستحق ہوتا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ذرا سی غلطی ساری تیرا ایک لمحے میں اڑن چھو ہو جاتی ہے۔ دھرم تو کب کا ختم ہو جاتا۔ اس کے بعد سنسار کا بھی نہیں رہتا۔ کالے جادو کے بہت درجے ہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ تیرا شر بھگ کر دیا جائے جو کہ میں نے کر دیا ہے۔ اب تجھے کالا لٹنے کیوں کے حوالے خود کو کرنا ہوگا۔ اور تیری ابتداء ہو جا۔ اے۔“

جبرو حذر زدہ سا آشامی کی تقریر سن رہا تھا۔ کئی جگہ اس نے کچھ پوچھنا چاہا مگر زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ آشامی بولتا رہا اور اس کی باتوں کو وہ بڑے غور سے نہ صرف سنتا رہا بلکہ ذہن میں محفوظ کرتا گیا اور اس کی تعلیم کا آغاز ہو گیا۔ اس کی غذا انیس بدل گئیں اس کے طور طریقے بدل گئے۔ وہ ویران جزیرہ اس کو اچھا لگنے لگا۔ اس پر رہنے والے حشرات

الارض اس کے دوست بن گئے، اور وہ آگے بڑھنے لگا۔ وہ دنیا سے دور اور آشامی اور اس کے گورو سے قریب ہونے لگا۔ اس کے چہرے کے نقوش اور دیگر جسم کے اعضاء میں تبدیلی ہونے لگی چہرے کی مصوصیت اور بھولپن کی جگہ نحوست اور کھر دراپن آنے لگا۔

☆.....☆.....☆

دینو اس آموں کے باغ میں کام کرتا اس کے لیے کسان نے نئے کپڑے ملا دیئے تھے۔

کسان نے اس کو مسلمان کی بنیادی باتیں ایک ایک کر کے بتانا شروع کر دیں اور ایک وقت ایسا آیا کہ دینو کو احساس ہوا کہ وہ تو مسلمان ہونے پر بھی مسلمان نہیں تھا۔ اب وہ کسان کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ اور وہی کرتا تھا جو کسان استاد اس کو بتاتا تھا۔

آشامی اس کی تلاش میں تھا، پورے ہندوستان میں اس کے گرگے دینو کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ مگر دینو ان کے بہت قریب فرید آباد کے ایک گاؤں میں موجود تھا اور ان کی نگاہوں سے دور تھا، اس کے علم کی پہنچ سے بہت دور تھا۔ آشامی جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا تھا۔

وہ بہت بڑا جادوگر تھا۔ شیطان کی بہت بڑی شکتی اس کے پاس تھی۔ مگر پھر بھی وہ ڈرتا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ دینو ضرور کسی ایسی ہستی کے شرن میں آ چکا ہے جس پر اس کا بس نہیں چلتا۔ اس کی ساری شکتی بھی دینو کو تلاش نہ کر سکی۔ سب کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہو جائے۔

ضرور دینو کے سر پر کسی کا ہاتھ آ گیا ہے۔ مگر آشامی دینو کو بھول جائے یہ ناممکن تھا۔ یہ اس کی سخت توہین تھی۔ اس کی شکتی کی توہین تھی۔ وہ تاک میں تھا اور ایک معمولی کسان جو خود کو کسی گنتی شمار میں نہیں سمجھتا تھا اس پر بھاری پڑ رہا تھا۔

دینو کے عادت و اطوار بہت کچھ بدل گئے تھے۔ وہ سویرے فجر کے وقت اٹھتا تھا اور اس کے شغل وہی تھے جو ایک مسلمان کے ہوتے ہیں، دن کا آغاز اللہ کے نام

سے کرتا اور اس کا اختتام بھی اسی کے نام سے کرتا۔ دن بھر باغ میں مالی بابا کے ساتھ محنت کرتا۔ بڑا سکون اس کو یہ سب کر کے ملتا۔ کبھی کبھی وہ اپنے ماں باپ کو یاد کر کے اداس ضرور ہو جاتا۔ کبھی اس کو جبر و ک خیال آ جاتا اور وہ اس کی یاد میں ملول ہو جاتا۔

کسان بابا اس کو اداس دیکھ کر کہتا۔ ”یہ زندگی کے رنگ ہیں یہ بدلتے رہتے ہیں تو کیوں فکر کرتا ہے۔ رنگ ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے۔ تیری قید ختم ہو جائے گی، مگر جتنا وقت یہاں پر رہنا کھانا ہے اور جتنا رزق تیرا یہاں پر ہے وہ تو تجھے کھاتا ہے۔ اس باغ میں تیری زندگی ہے اور اس کے باہر تیری موت تیرا انتظار کر رہی ہے۔ تیرا دشمن تیری تاک میں ہے، میں صرف تیری حفاظت یہاں کر سکتا ہوں، اس کے آگے میری طاقت نہیں ہے۔ وہ بہت بڑا شیطان ہے۔ یہ میں جانتا ہوں بس۔“

سال گزر گیا درختوں پر پھر سے پورا آ گیا۔ کسان بابا نے دینو کو کہا۔ ”مبارک ہو تجھے دلی جانا ہوگا۔“

”بابا تم تو کہتے ہو میرا دشمن میرے چاروں طرف ہے، پھر کس طرح جاؤں گا۔“ دینو نے کہا۔

”یہ بات تو ہے تو پھر میں کوئی خطرہ نہیں لیتا، میں خود دلی چلا جاتا ہوں، دلی میں ایک حکیم ہے۔ وہ یہ کام کرتا ہے۔ وہی تیرا کام کرے گا۔ میں اس کو یہاں لے آتا ہوں۔“ کسان نے کہا۔

”بابا وہ آجائے گا۔“ دینو نے پوچھا۔

”مجھے بتانے والے نے بتایا ہے کہ وہ بے لوث خدمت کرتا ہے دور دور اپنے خرچ پر جاتا ہے۔“ کسان بولا۔

”بابا اس زمانے میں ایسا بھی آ دی ہے؟“ دینو حیرت سے بولا۔

”ہر زمانے میں نیک لوگ ہوتے ہیں، اگر ایسا نہ ہو تو یہ شیطان کے چیلے دنیا کو کھا جائیں۔“ کسان بولا۔

”تو آپ کب جائیں گے۔“ دینو نے پوچھا۔ دینو کی زبان اور انداز گفتگو کسان کی محبت نے بدل دیا تھا۔

”میں باہر کی ہوا کا اندازہ کر دں گا دروازے

درخواست کروں گا، مگر مریض کون ہے۔“ خواجہ صاحب بولے۔

”مریض میرے پاس ہے، ابھی باغ میں کام کر رہا ہے۔“ کریم الدین نے کہا۔

”مریض اور باغ میں کام، سمجھ میں نہیں آیا۔“ خواجہ صاحب تعجب سے بولے۔

”خواجہ صاحب اس کا مرض جسمانی نہیں ہے۔“ کریم الدین نے بتایا۔

خواجہ صاحب نے گردن ہلا کر کہا۔ ”اب سمجھ میں آیا۔“ اور خواجہ صاحب چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

ٹھیک تین دن کے بعد حکیم وقار اور حکیم کامل (رولوکا) آگئے اور بولے۔ ”آپ کے خط کے جواب میں حاضر ہوئے ہیں۔“

کریم الدین نے آگے بڑھ کر دونوں سے گلے ملے اور بڑی عزت اور احترام کے ساتھ گھر میں لے آئے اور بولے۔ ”حکیم صاحب میں اس باغ کے اسی چھوٹے میں

رہتا ہوں، ہو سکتا ہے یہ جگہ آپ کے شان کے مطابق نہ ہو، مگر میں ملنگ طبیعت کا آدمی ہوں، میری ضروریات بھی مختصر

ہیں گزارہ ہو جاتا ہے۔ میں نے جو حالات آپ کو لکھے ہیں وہ ایک آفت زدہ ہے۔ اس کے لئے میں صرف یہ کر سکتا تھا کہ

شیطانوں کے آنے کے راستے بند کر دوں۔ وہی میں نے کیا ہے۔ اگر میں یہ نہ کرتا تو میں ان شیطانوں سے لڑ کر نہیں جیت

سکتا تھا، کیونکہ ان کی پشت پر بہت بڑا جادوگر آشامی ہے۔“

رولوکا نے گردن ہلا کر اقرار کیا کہ اس نے آشامی کا نام سنا ہے، مگر اس کے ساتھ اس کا کبھی ٹکراؤ نہیں ہوا۔

”میں دینو کو بلاتا ہوں وہ آپ کو پوری تفصیل بتائے گا۔“ کریم الدین نے کہا۔

دین محمد عرف دینو نے آن کر دونوں صاحبان کو ادب سے سلام کیا اور بیٹھ گیا۔

اور حکیم وقار کے سوال پر اس نے بتایا کہ ایک ویران سے جزیرے پر پیدا ہوا، جوان ہوا اور پھل کا شکار

کھڑکیاں سب بند کروں گا، ایسے ہی منہ اٹھا کر تجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ ذرا سی بھی کوئی نالی کوئی پرنا لہ کھلا نہیں چھوڑ سکتا، میں جانتا ہوں اس کے آنے کو سوسنی کے ناکے جتنی جگہ کافی ہے۔ جب میں اطمینان کروں گا تو جاؤں گا۔ اس دوران اگر کوئی بندہ خدا آ گیا تو اس کے ہاتھ پیغام بھیج دوں گا۔ مجھے امید ہے حکیم صاحب ضرور آ جائیں گے۔“ کسان بولا۔

دینو کی سمجھ میں کسان کی بات آ گئی، اس نے غلٹ کا اظہار بھی نہیں کیا کیونکہ اس کے دل کو یہ اطمینان تھا کہ کسان بابا جو کریں گے وہ اس کی بھلائی میں ہوگا۔

ایک مہینہ گزرا تھا کہ ایک آدمی کا بیوہ پاری آ گیا، آم تیاری پر تھے۔ وہ ایک مسلمان بیوہ پاری تھا۔

آدمی کی بات کرنے کے بعد کسان نے کہا۔ ”خواجہ صاحب ایک میرا ذاتی کام ہے، دلی میں مگر میں یہاں پر

قید ہوں جا نہیں سکتا، آپ میرا چھوٹا سا کام کر دیں۔“ خواجہ صاحب بولے۔ ”کیوں شرمندہ کر رہے ہو

کریم الدین جو کام ہو کروں گا، آپ حکم کریں۔“ کسان کریم الدین نے ان کا شکریہ ادا کیا اور

کہا۔ ”ایک خط ہے وہ پہنچانا ہے۔“

”آپ دے دیں پہنچا دوں گا۔“ خواجہ صاحب بولے۔

”ٹھیک ہے میں لکھ دیتا ہوں۔“ اور کریم الدین نے بہت تفصیل کے ساتھ ایک خط لکھ کر خواجہ صاحب کو

دے دیا اور حکیم وقار کا پورا پتہ بتا دیا جس کو سن کر خواجہ صاحب بولے۔

”ارے یہ تو بہت مشہور آدمی ہیں، میں کبھی خود ان سے نہیں ملا مگر ان کی تعریف بہت سنی ہے۔ بڑی حیرت انگیز بڑی بوئیاں ان کے پاس ہوتی ہیں۔“

”زبانی طور پر ان سے کہہ دیں ان کا مریض بے چینی سے ان کا منتظر ہے۔ پہلی فرصت میں آ جائیں۔“

کسان کریم الدین نے کہا۔

”آپ نگر نہ کریں، میں خود جاؤں گا اور زبانی بھی

کرنے لگا اس کا ایک ساتھی اور تھا۔ بہر حال پوری تفصیل اس نے بتادی اور کسان کی تحویل میں آنے تک کے حالات ہو بہو بتادے۔

حالات سننے کے بعد رولو کا کہنا تھا۔ ”کریم الدین صاحب آپ نے بڑی عقل مندی کی کہ آسامی سے ٹکرانے کی کوشش نہیں کی، میں نے اس کے بارے میں جو سنا ہے وہ بہت خطرناک جادوگر ہے۔ وہ اپنے مقام پر رہتا ہے مگر اس کے بہت چیلے ہیں، وہ کام کرتے ہیں، وہ ہر کسی کو اپنا چیلنا بناتا بھی نہیں، اس کے اپنے طور طریقے ہیں، مگر انسانیت اور عام آدمی کے لیے فائدہ مند نہیں ہیں۔ آپ نے یہ کہیں ہمارے حوالے کر دیا، اس قلعے کو اور مضبوط کرنے کی ضرورت ہے، مگر آپ بے فکر ہو جائیں۔ اب یہ کام ہم کریں گے۔“ حکیم وقار بولے۔ ”تو اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ ”آپ دلی مطب میں جائیں اور میں آسامی کو تلاش کرتا ہوں۔“ رولو کا جواب دیا۔

”میرا خیال ہے تم ضرور اس کے استھان کی تلاش کرو گے۔“ حکیم وقار نے کہا۔ ”آپ تو میرے طریقہ کار کو بہت حد تک سمجھ چکے ہیں۔“ رولو نے جواب دیا۔ ”آپ کے ساتھ رہتا ہوں آخر.....“ حکیم وقار بولے۔

”یہ تو درست آپ نے فرمایا۔“ آپ اس سفر میں نہیں جائیں گے کیونکہ معاملہ ذرا سنگین لگتا ہے۔ اور آسامی خطرناک بھی ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کیونکہ سنا ہے کہ انسانوں کی قدر و قیمت اسکے نزدیک کچھ نہیں ہے، میں بھی کوئی خطرہ نہیں لے سکتا۔“ رولو کا کہنا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں دلی چلا جاتا ہوں، مگر مجھے اپنے بارے میں بتاتے رہنا۔“ حکیم وقار نے کہا۔ رات کو رولو کا روانہ ہو گیا۔ ایک سخت قسم کا کارندہ اس نے باغ میں چھوڑ دیا۔

مگر جانے سے پہلے رولو کا دینو سے اس کے

گاؤں کے بارے میں کچھ سوالات کئے، مگر اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس کو اس کی ضرورت کیوں ہے؟

رولو کا کارخ دینو کے جزیرہ کی طرف تھا۔ اور رولو کا کہنا تھا کہ لیے اللہ رکھا گوٹھ کا پتہ کرنا مشکل نہیں تھا۔

وہ ایک مچھلی کے بیوپاری کے روپ میں جزیرے پر گیا۔ اللہ رکھا سے اس نے پوچھا۔ ”ادھر ایک جوان ہوا کرتا تھا، میں شہر میں اس سے ملا تھا اس کا نام دینو تھا۔ وہ کدھر ہے۔“

اللہ رکھا نے اس کا سوال سنا تو اس کے آنسو نکل پڑے۔ بڑی مشکل سے بولا۔ ”اڑے وہ ہمارا چھوکر تھا۔ بڑا زبردست شکاری، ابلی تم جو ہمارا حالت دیکھتا ہے نی یہ گھر لالچ سب اس نے بنایا تھا، ہم لوگ کے پاس کیا تھا اکیلا ادھر پڑایا تھا۔ پر پتہ نہیں وہ کدھر چلا گیا کوئی پتہ نہیں اس کا جانے کے تھوڑا دن کے بعد ہم لوگ کا خانہ خراب ہونے لگا۔ اڑے ہمارا لالچ سب سے زیادہ مال لاتا تھا، پھر خالی آنے لگا۔ ہر دو بھر نقصان، آدمی لوگ کا دہاڑی بھی نہیں نکلتا تھا۔ ہم آدمی لوگ کم کر دیا اور پھر ہمارا لالچ ایک دم کنڈم ہو گیا اور کچھ کام کرانا پڑتا تھا۔ خرچ بہت بڑھ گیا۔ ہم اس کو کیسا چلاتا۔ اس کا انجن بے کار ہو گیا۔ ہم کھڑا کر دیا۔ دینو کا ایک دوست تھا۔ جبرو اس کا کام بہت بڑھ گیا اڑے جبرو کے باپ کا کام ایک دم فسٹ کلاش ہو گیا۔ وہ اور لالچ بنایا، ہم لوگ کا خانہ خراب ہو گیا۔ اور جبرو کا باپ ادھر شہر میں سیٹھ بن کے بیٹھا ہے، بس کیا کرے ہم لوگ کا بیٹا گیا اور سب کچھ چلا گیا۔ جبرو کے باپ کا قسمت اچھا ہے۔ اس کا بیٹا بھی گیا ہے پن وہ پیسہ والا بن گیا۔“ اللہ رکھا نے کہا۔ ”ان دونوں کے جانے کے بعد تم کو ان کی خیر خیریت کچھ پتہ چلی۔“ رولو کا پوچھا۔

”نہیں کچھ پتہ نہیں چلا، ہم لوگ کا بی بی رورو کر پریشان ہوتا ہے، اڑے ہم لوگ کا ایک ہی چھوکر تھا۔“ ”تم اپنے چھوکر کے واسطے پریشان مت ہو۔ وہ آجائے گا۔“ رولو کا کہنا تھا۔

”ہم مرجائے گا، ہم کیا کرے۔“ اللہ رکھا بولا۔

”تم یاد کر کے بتاؤ دونوں میں ضرور ایک جیسی کوئی بات ہے۔“ رولا کا بولا۔

”ہاں رے ہم کو یاد آیا، جبر و اندھیری رات میں پیدا ہوا تھا، ہم کو پتہ نہیں چاند کا کیا تاریخ تھا۔ پر رات ایک دم اندھیرا تھا۔ اور جب دینو پیدا ہوا تب جیسا ایسا تھا، ایک سال کے بعد دینو پیدا ہوا تھا۔ ہم لوگ کا دوسرا کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ دینو بھی اکیلا تھا اور جبر و بھی اکیلا رہا، دونوں ایک جیسا جوان تھا۔“ ناکو کریم نے یاد کرتے ہوئے تفصیل بتائی۔

”دونوں نے ایک ساتھ زندگی شروع کی اور ترقی کرتے گئے۔ تمہارے اور اللہ رکھا کے حالات بہتر ہو گئے۔ دونوں کے جانے کے بعد اچانک اللہ رکھا کے حالات خراب ہونے لگے اور تمہارے اچھے ہونے لگے۔ تم نے غور کیا۔ ایسا کیوں ہوا۔“ رولا نے پوچھا۔

”قسمت کا بات ہے ہم کیا بولے۔“

”تم اس سے زیادہ اور کیا کہو گے، مگر ایسا نہیں ہے۔ دینو نے اپنا راستہ بدل لیا ہوگا۔ اس لیے جو مہربانی کر رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہوگا تم پر یا جبر و پر وہ اب تک مہربان ہے، مگر تم ان باتوں کو نہیں سمجھ پاؤ گے اور میں تم کو سمجھا بھی نہیں پاؤں گا۔ ضرورت پڑی تو پھر ملاقات کروں گا۔“

اب پورا کس رولا کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اندھیری راتوں کے پیدائشی بچے جادو گروں یا کالے جادو کے ماہروں کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان کو بہت آسانی سے اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور ان کو اپنا علم سکھاتے ہیں اور اپنی برادری میں اضافہ کرتے ہیں۔ جبر و ضرور آشامی کے استھان پر ہوگا اور آشامی اس کو اپنا علم ہنر سکھا رہا ہوگا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک اور آشامی پیدا ہوا جائے گا۔

☆.....☆.....☆

وہ جزیرہ ایک دیران نظر آنے والا جزیرہ تھا۔ اس میں کچڑ اور دلدلوں کے علاوہ بھیا تک قسم کے حشرات الارض نظر آتے تھے۔ ان کے علاوہ وہاں کچھ نہیں تھا۔

”تم بے فکر ہو جاؤ۔ وہ جدھر بھی ہے، ٹھیک ہے خیریت سے ہے۔“ رولا نے اللہ رکھا کو تسلی دی۔

”اڑے تم لوگ کا بات اللہ کرے سچا ہو۔“ اللہ رکھا بولا۔

اور وہ جبر و کے باپ کے پاس چل دیا۔

شہر میں ناکو کریم جبر و کا باپ رہتا تھا۔ یہاں پر اس کا ایک گودام بھی تھا وہ اپنا مال خود فروخت کرتا تھا اور بچا ہوا برف میں جمع بھی رکھتا تھا، کئی اس کے ملازم تھے۔

”میرا نام حکیم کامل ہے۔“ رولا نے اپنا تعارف کرایا۔

”ہوئیں گا حکیم ابھی ہم لوگ ٹھیک ہے۔“ ناکو کریم نے جواب دیا۔

”میں تمہارے چھوکرے کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں، وہ کدھر ہے۔“ رولا نے بات شروع کی۔

جبر و کا سن کر ناکو کریم جلدی سے بولا۔ ”تم اس کو کیسا جانتا ہے۔“

”اس کو ایک جادوگر لے کر گیا تھا۔ تم کو پتہ ہے۔“ رولا بولا۔

”نہیں مائی باپ ہم لوگ بہت پریشان ہے۔“ ناکو نے کہا۔

”پریشانی کا بات تو ہے جبر و اس کی قید میں ہے۔“ رولا نے کہا۔

”وہ جادوگر کیا مانگا ہے۔ ہم اپنا سب کچھ اس کو دینے کو تیار ہے۔ ہمارا چھوکرہ ہم کو مل جائے بس۔“ ناکو بولا۔

”تم یہ بتاؤ تمہارا چھوکرہ میں کیا بات ہے کہ وہ اس کو ہی لے کر گیا ہے۔“ رولا بولا۔

”ہم کو کیا پتہ مائی باپ، ہم تو جٹ پھیرا ہے۔ ہم لوگ کیا جانے۔“ ناکو کریم نے کہا۔

”اچھا تم یہ بتاؤ وہ اکیلا گیا ہے ادھر سے۔“ رولا بولا۔

”نہیں اس کا ایک دوست تھا دینو دونوں رات کو غائب ہوا ہے۔“ ناکو بولا۔

نے اس سے دور کر دیا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کالا مرد منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ مگر اس کے گال پر ایک ان دیکھا چاٹا پڑا، اور وہ پلٹ کر گر پڑا۔ ابھی وہ اس سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ رولوکا کی غصہ بھری آواز اس کے کانوں میں آئی۔

”جبرو ہے تو؟“

”ہاں میرا نام جبرو ہے۔“ جبرو گھبرا کر بولا۔

”تو کیا کر رہا ہے تجھے پتہ ہے۔“ پھر آواز آئی۔

”میں وہی کر رہا ہوں جو حکم دیا جا رہا ہے۔“ جبرو

ڈرتے ڈرتے بولا۔

”تیرا دل یہ سب کرنے پر خوش ہوتا ہے۔ جھوٹ

مت بولنا۔“ آواز آئی۔

”پہلے خوش نہیں ہوتا تھا پر اب ہوتا ہے۔“ جبرو

بولا۔

”تیرے پیٹ میں جو غذا ہے اس نے تجھے ایسا کر

دیا ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”گورو کو نہیں جانتا، تو نے مجھے مارا، مگر تیرا خانہ

خراب وہ کر دے گا۔“ جبرو بولا۔

”اس جزیرے پر سے اس کا خر ختم ہو رہا ہے۔ ہر

چیز اصلی شکل میں نظر آنے والی ہے، اس نے جو پردہ ڈالا تھا

وہ ہوائیں اڑنے والا ہے، یہ حسین چہرے جو تیرے چاروں

طرف تجھے نظر آ رہے ہیں اپنی اصلی شکل میں آنے والے

ہیں، ان کے بھانک چہرے تو دیکھ کر ڈر جائے گا، یہ سب

مردہ ہیں یہ آتما نہیں ہیں۔ ان کا اصل روپ تو جلدی دیکھ

لے گا۔ ان کی ہتھکڑیاں ٹوٹنے والی ہیں۔ یہ سب آزاد

ہونے والی ہیں۔ ان کے آزاد ہوتے ہی تیرے گورو کی

آدھی شکتی ہوا ہو جائے گی۔“ رولوکا نے کہا۔

پھر ایک زوردار آواز رولوکا کے کان میں آئی۔

”میں آشامی ہوں ارے کیا تو نے مجھے مٹی کا مادہ

سمجھ لیا ہے میری آتما میں میرے ساتھ ہیں، میں ان کا

حاکم ہوں۔ تو کون ہے چھپ کر کیا لڑتا ہے مردوں کی

طرح بات کر۔“ آشامی کی آواز آئی۔

رولوکا روپوشی کی حالت میں اس کے کنارہ کھڑا تھا مگر اس کو وہ جزیرہ کچھ اور نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف درخت اور ہری ہری گھاس درختوں پر انوکھے پھل بڑے اونچے اونچے پائیل کے درخت اور ان پر تاریل رولوکا کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، وہ آشامی کے منتر کو سمجھ چکا تھا۔ آشامی نے دنیا کو بے وقوف بنانے کو ایسا سحر اس جزیرے کے چاروں طرف پھونک دیا تھا کہ یہ دور سے بہت خطرناک اور بھیاں تک نظر آتا تھا۔ اس کی نظر بندی کا یہ کمال تھا مگر یہ کمال سب کو بے وقوف نہیں بنا سکتا تھا۔ اس میں رہنے والے حشرات الارض اصل میں اس کی قیدی روئیں تھیں، وہ ان کو ضرورت کے وقت استعمال کرتا تھا۔ اس کی شکتی کی بنیادیں یہ بے بس اس کے چنگل میں پھنسی روئیں تھیں۔ رولوکا کے سارے کارندے اس کے اطراف میں موجود تھے اور اشارے کے منتظر تھے۔ رولوکا اور اندر چلا اندر ایک معمولی جھونپڑی نظر آنے والا شاندار مکان تھا۔ اور جھاڑ جھنکار نظر آنے والا میدان ایک باغ تھا۔ اس باغ کے عین درمیان بڑی نرم نرم گھاس کے بستر پر ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس کے چاروں طرف سین کو توں کا بھر مٹ تھا۔ ان عورتوں کے لباس نہ ہونے کے برابر تھے۔ ان کے جسم دھوپ میں چمک رہے تھے۔

درمیان میں بیٹھا مرد کالا سیاہ تھا، اس کے بال گھونگریلے اور جسم تندرست تھا، مگر لمبا تھا۔ اس کی ران پر ایک حسین عورت لیٹی تھی اور وہ اس کے جسمانی اعضا سے کھیل رہا تھا۔

رولوکا اس کے قریب چلا گیا۔ اس کو یا کسی کو بھی ذرا احساس اس کی موجودگی کا نہیں ہوا۔ رولوکا اس بے حیائی کے کھیل کو برداشت نہ کر سکا اور ایک زوردار لات اس عورت کو اس نے ماری۔ رولوکا کی لات اتنی زوردار تھی کہ عورت اچھل کر دور جا گری۔

اس کا لے مرد نے حیرت سے اس عورت کو دیکھا کہ یہ اچھل کر اتنی دور کس طرح جا گری ہے۔ مگر اس کے سامنے اور قریب میں کوئی نہیں تھا۔

رولوکا اس کے اور قریب چلا گیا اور ہر عورت کو اس

ہو جائے۔“ رولوکا نے کہا۔ اور پھر ایک نہایت مکروہ صورت گول مثل سادھواس کے سامنے کھڑا تھا۔

رولوکا پھر بھی روپوش رہا اور اس سے دور ہو گیا کیونکہ اس کے بدن سے سخت بدبو آ رہی تھی۔

”تو کتنا نفرت انگیز ہے کہ کوئی زندہ آدمی تیرے قریب کھڑا نہیں ہو سکتا تو نے کتنی گندی خوراک کھائی ہے کہ تیرا پورا وجود گندگی کا ڈھیر بن گیا ہے۔ تیرا وجود اس زمین پر نفرت انگیز ہے۔ تو نے اس نوجوان کے پاک وجود کو بھی وہی کھلایا ہے اس کی حالت بھی کچھ دن کے بعد تیرے جیسی ہونا تھی۔ تو نے جو کچھ اس کے اندر پہنچایا ہے اس کو باہر نکال، یہ کام تجھے کرنا ہے، اگر تو نہیں کرے گا تو میں کروں گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”میں اس کا بدن صاف کروں گا تو پھر مجھے اور میرے اساتھان کو چھوڑ دیگا۔“ آشامی بولا۔

”بے شرم ہے، تو، اب بھی رعایت چاہتا ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”بنتی ہے میری۔“ آشامی بولا۔

”تو نے کسی کی بنتی سنی ہے آج تک۔“ رولوکا بولا۔

”میرے دھرم میں یہ نہیں ہے، تیرے دھرم میں تو ہے۔“ آشامی عیاری سے بولا۔

”زیادہ دشواری دکھانے کی کوشش نہ کر جو کہا ہے کر.....“ رولوکا نے کہا۔

”کرنا ہوں، تو کون ہے یہ تو بتا دے۔“ آشامی نے پوچھا۔

”تیرے جیسے نہ معلوم کتنے یہ پتہ نہیں کر سکے تو کیا کرے گا۔ جو کرنا ہے وہ کر۔“ رولوکا بولا۔

اچانک جبرو کی حالت خراب ہو گئی۔ اور کسی نامعلوم ہستی نے اس کو پکڑ کر الٹا لٹکا دیا۔ اور اس کے منہ سے نہایت بدبو دار مواد بہنا شروع ہو گیا۔ اس کا جسم الٹا لٹکا تڑپتا رہا۔ اور ایک گھنٹے کے بعد اس کا جسم سکت ہو گیا۔ اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اس کا جسم گرم تھا مگر زندگی کے آثار اس میں کم تھے رولوکا نے اس کے جسم پر ہاتھ رکھا، جبرو

”تو نے کون سی بہادری دکھائی ہے تو بھی زرا اپنے چیلے کے پاس تو آ یہ بچارہ اکیلا پھنس گیا ہے۔ اگر تو نہ آتا تو میں اس کو سمندر کے حوالے کر دوں گا تو جانتا ہے تیری ساری شکتی سمندر سے نہیں لڑ سکتی۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”نہیں تو ایسا نہ کرنا، تو کیا چاہتا ہے یہ بتا.....“ آواز آئی۔

”تو جب سامنے آئے گا تو بات کروں گا۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”میں تیرے سامنے آ سکتا ہوں مگر تو وعدہ کر لے کہ میرا اساتھان تو مجھے سوپ دے گا۔“ آواز آئی۔

”سوپے بازی مت کر تیرا اساتھان تیرا نہیں رہے گا۔ تو نے اتنے خوبصورت جزیرے کو اتنا بھانک

بنا کر لوگوں سے دور رکھا ہے اور یہاں پر انسانیت سوز کام کر رہا ہے تو نے لوگوں پر جو ظلم تم کیا ہے۔ اس کو اور

بڑھانے کو نئے چیلے بنا رہا ہے۔ اپنی کالی شکتی کو وسعت دے رہا ہے۔ پکار اپنی کالی شکتی کو اور کہہ اس کے مجھے

تیرے سامنے لائے۔“ رولوکا نے کہا۔

”پکاروں گا ضرور پکاروں گا، تجھے اسی جزیرے پر مفلوج کروں گا۔“ آواز آئی۔

”مگر ایک بات کا خیال رکھنا بھانگنے کی کوشش مت کرنا تیرے سر پر موت کے ہر کارے موجود ہیں۔ تو یہ مت

سمجھ کہ مجھے پتہ نہیں کہ تو کہاں ہے، مجھے تو نظر آ رہا ہے تیرے، کمزور بیر تیرا ساتھ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ اس لیے کہ ان

کے باپ ان کے سروں پر موجود ہیں تو کیا سمجھتا تھا کہ دنیا میں صرف کالی شکتی ہی ہے اسے تو جو سمجھ میں بھی اس کائنات

کے بنانے والے کی شکتی تو نہیں سمجھ سکتا۔ اب آخری موقعہ تجھے دے رہا ہوں میرے سامنے آ جا اور اس چیلے کو دیکھ اس کی

حالت خراب ہو رہی ہے۔“ رولوکا نے اپنی بات ختم کی۔

کچھ دیر سناٹا رہا پھر آواز آئی۔ ”میں آ رہا ہوں۔“

”تو نے آخری کوشش کر لی میں نے تجھے موقعہ دیا تاکہ تجھے اپنی شکتی کا اندازہ ہو جائے، مگر غرور و شرمندہ

زندہ تھا۔ مگر اس کی ساری طاقت منہ کے ذریعے سے نکل کر زمین پر پڑی تھی، سخت تعفن اس میں سے اٹھ رہا تھا۔ بس اتنی سی مہلت آشامی کے لیے کافی تھی، وہ ایک زنانے کے ساتھ ہوا میں پرواز کر گیا۔ مگر اس کو ردلوکا کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ ردلوکا کا جاگتا لوکھی غافل نہیں ہوتا تھا۔

آشامی کے پرواز کرتے ہی اس نے اس کو دبوچ لیا اور اس کو پھر زمین پر ردلوکا کے پاس لے آیا۔ ردلوکا نے کہا۔ ”تو کتنا بڑا احمق ہے۔ عیاری اور مکاری سے باز نہیں آ رہا۔ ارے بے وقوف جب حساب کا وقت آتا ہے انسان اپنا وزن کم کرتا ہے تو مکاری کمر کے اور اپنا وزن بڑھا رہا ہے۔ یہ ساری آزمائش کو تو نے اپنے مطلب کی خاطر قید کر کے رکھا ہے۔ ان سب کو آزاد کر دے۔ یہ کام تجھے کرنا ہے تو نہیں کرے گا تو میں کروں گا۔“

آشامی نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”جاؤ تم سب آزاد ہو۔“

اور پھر سارے درخت گھاس پھوس پتے اپنی اصلی شکل میں نظر آنے لگے۔ آشامی کا سارا سر جزیرے پر سے ختم ہو گیا۔ حشرات الارض ختم ہو گئے۔ رنگ برنگ کے پرندے درختوں پر خوشی سے اچھل کود کرنے لگے، وقت نے نئی کروٹ بدل لی تھی، نئے دور کا آغاز ہو چکا تھا، ظلم کے بادل آسمان پر سے غائب تھے، انصاف اور نیکی کی ہوائیں ان کو اڑا چکی تھیں، پورے جزیرے پر خوشبو بھری ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ محبت کے شگুনے ہر طرف پھوٹنے لگے تھے۔ خزاں کا موسم منہ ڈھانپ کر چاچکا تھا۔ بہار کا موسم انگڑائی لیکر اٹھ گیا تھا۔ جو درخت ٹنڈ منڈ نظر آتے تھے، وہ بھی خوشی سے جھوم رہے تھے۔ بھنورے اور تیلیاں جو نہ جانے کہاں تھے، سب باہر آ گئے تھے اور ڈال ڈال سستی میں گھوم رہے تھے۔ تیلیاں اپنے شوخ رنگوں سے دل بھانے لگیں تھیں، ہر طرف حسن بکھرتا جا رہا تھا۔

جزیرہ خوش نمائی کی طرف بڑھتا محسوس ہو رہا تھا، جس کا لہر نے اس کی قدرتی خوبصورتی کو بدار کھا تھا۔

وہ اب نمایاں ہو رہی تھی۔ جبرو کی حالت خود بخود ٹھیک ہو رہی تھی۔ اس کے اندر کے گند کے صاف ہوتے ہی اس کے سامنے روشنی ہی ہو گئی تھی۔ اندھیری دنیا سے نکل کر وہ روشن دنیا میں آ گیا تھا۔ اس کو یہ جزیرہ بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ آشامی پر اس کی نظر پڑی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہوں میں نفرت اور غصہ تھا اس کے سوا اس کو کوئی نظر نہیں آیا۔

وہ بے حد کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ کھڑا ہونا اس کے بس سے باہر تھا، اگر وہ کھڑا ہو پاتا تو ضرور آشامی پر ٹوٹ پڑتا، اس نے آشامی کی طرف سے منہ پھیر لیا اور نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

آشامی اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ نادان نہیں تھا۔ سب سمجھ رہا تھا۔ آج اس کو زندگی میں پہلی دفعہ خود سے نفرت ہوئی، اس نے اپنا کیا یاد کیا، میں نے آخر یہ کیوں کیا، اس کے بدلے مجھے کیا ملا؟

میں نے اب تک کیا کیا۔ انسانوں کو بہکایا ان پر ظلم کئے اور نفرت کا بیج بو کر اس کو پھیلایا، میرے پاس کیا ہے۔ پاپوں کی گٹھری میرے سر پر پڑی ہے اور گندگی میرے اندر بھری ہے۔ اب اس گندگی کا تعفن مجھے بھی آنے لگا ہے۔ وہ بے چین ہو گیا برداشت سے باہر تھا اور اس کے منہ سے زور سے نکلا۔ ”مجھے معاف کر دے مجھے اس بد بوسے نجات دے دے، میں توبہ کرتا ہوں میں غلطی پر تھا، میں مانتا ہوں، میں مانتا ہوں۔“

ردلوکا اس کے بہت قریب تھا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ ریاکاری اور جھوٹ اس کے انداز میں نہیں تھا۔ کچھ تناوہ اور گزرے وقت کا غم اس میں نظر آتا تھا۔

ردلوکا حکیم کامل کے روپ میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ آشامی کی نظریں زمین کی طرف تھیں۔ زمین پر اس کے آنسو پک رہے تھے اور وہ ہچکیاں لے کر رو رہا تھا۔ ردلوکا اس کے قریب گیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہاتھ رکھتے ہی آشامی کی حالت بگڑ گئی۔ وہ ایک سمت تیزی سے دوڑا اور دوڑتے دوڑتے سمندر تک چلا گیا اور کنارے پر اس کے منہ سے گندگی کا ایک سیلاب بہہ نکلا اور

وہ گندگی سمندر کی لہریں کنارے سے دور لے جانے لگیں۔
شام تک وہ وہیں پڑا رہا، رولوکا اس کے قریب
نہیں گیا۔ وہ جانتا تھا کہ زندگی بھر کی گند ہے۔ اس کو نکل
جانا ہی بہتر تھا۔ جسم میں اگر گندگی ہو تو انسان صحت مند
نہیں ہوتا۔ صحت کے لیے ضروری ہے کہ جسم پاک ہو۔
شام ہوتے ہی رولوکا نے جبر کو اٹھا کر ایک گھاس کے بستر
پر ڈال دیا۔ اور جزیرے سے ہی کوئی بوٹی اس نے حاصل
کی اور اس کا عرق جبرو کے حلق میں پٹکا دیا۔ اس عرق نے
جبرو کو طاقت دی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دوسری بار عرق پینے
کے بعد اس کے بدن میں کچھ توانائی آئی۔

صبح تک آشامی سمندر کے کنارے پڑا رہا۔ صبح
رولوکا کے پاس گیا تو وہ بے خبر کنارے پر پڑا تھا۔ اس کا
منکا جیسا پیٹ ختم ہو گیا تھا۔ سر بھی بڑا بڑا لگ رہا تھا۔ چہرہ
جو کبھی بہت خوفناک اور مکر وہ لگتا تھا اب ویسا نہیں تھا۔
رولوکا نے اس کو دیکھا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ
آگئی۔ اس نے جھک کر اس کو پھول کی طرح اٹھالیا اور پھر
اس نے اس کے بدن کو گہرے سمندر میں ڈال دیا، مگر
آشامی پانی میں ڈوبا نہیں وہ پانی کی سطح پر تیرتا رہا۔
رولوکا نے پھر آشامی کو پانی سے نکال لیا اور لے کر
جبرو کے پاس آ گیا اور اس کو اس کے قریب ڈال کر اسی بوٹی
کا عرق اس کے منہ میں ڈال دیا۔

جبرو حیرت سے رولوکا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔

”آپ کون ہو یا؟“

رولوکا نے اس کا سوال سنا اور بولا۔ ”خدمت گار

ہوں۔“

”اور یہ آدمی جو پڑا ہے یہ کون ہے؟“ جبرو

پھر بولا۔

”یہ آشامی ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”آشامی! یہ آشامی نہیں ہے۔ وہ تو بڑا خوفناک

ڈراؤنا تھا۔“ جبرو نے کہا۔

”مگر وہ خوفناکی اور بدی اس میں لے نکل گئی ہے

یہ انسانی شکل میں آ گیا ہے۔“

”ہمارا سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔“ جبرو نے کہا۔
”یہ جادو گر تھا تم کو نہیں پتہ کہ جادو شیطانی علم ہے،
اس کے سیکھنے والے کو سب سے پہلے گندی غذا دی جاتی
ہے۔ اس کے بدن کو گندہ کیا جاتا ہے۔ وہ غذا ایسی ہے کہ
اگر انسان عام زندگی میں اس کا تصور کر لے تو اس کو قے
ہو جائے۔ مگر گندگی کو جادو گر عام آدمی کے اندر پہنچا دیتا
ہے اس کو اس گندگی کے کھانے کا عادی بنا دیتا ہے۔ پھر
اس کو جو کلمات ادا کرنے کو کہتا ہے اس کا تعلق شیطان سے
ہوتا ہے اور اس کو ہر وہ کام کرنا پڑتا ہے جس کے کرنے
سے شیطان خوش ہوتا ہے۔“

شیطان کو ماننے والا کبھی کسی کو فائدہ نہیں پہنچائے
گا۔ اس کا ہر کام انسانوں کو نقصان پہنچانے کا ہوگا، گندگی
اس کی خوراک ہوگی۔ آشامی بھی یہی تھا اور تم کو بھی وہ اس
لیے لایا تھا کہ تمہیں آسانی سے اپنی راہ پر لگا سکے۔

اماوس کی کالی راتوں میں پیدا ہونے والے بچے
ان کا کالام علم جلدی اور آسانی سے سیکھ جاتے ہیں۔ وہ
تلاش میں تھا اور اتفاق سے اس کو ایک کی بجائے دو
گئے۔ اور وہ دونوں کو لے اڑا۔ مگر اس کے پاس صرف تم ہی
رہے۔ دینو پر کسی کی نظر پڑ گئی اور وہ اس کو بچا کر لے گیا۔
مگر تم اس جزیرے پر پھنس گئے۔ یہ نہایت خوبصورت
جزیرہ ہے۔ اس نے اپنے سحر سے اس کی خوبصورتی کو
چھپا دیا اور بد صورت بنا دیا، جزیرے کے ساحل پر آتے
ہی ہر کسی کو یہ جزیرہ نہایت بھیا تک اور اجازت نظر آتا تھا۔
اصل میں ایسا نہیں تھا۔ مگر آشامی کے سحر کی وجہ سے اجاڑ
اور بھیا تک نظر آتا تھا۔

مگر جب نیکی کی ہوائیں چلتی ہیں روشنی پھیلتی ہے
تو بدی اور اندھیرا دور ہو جاتا ہے۔

یہ وہی آشامی ہے اس کے اندر کا زہر سمندر نے
چوس لیا ہے یہ ایک نیا آدمی ہے۔ اب تم اس پرانے
آشامی کو بھول جاؤ۔ وہ قابل نفرت تھا، مگر اب نہیں ہے۔
اس کے اندر کا شیطان ختم ہو گیا ہے۔“ رولوکا نے اپنی بات
ختم کی تو جبرو بولا۔

کیا مجال کہ کوئی برتن ٹیڑھایا خراب ہو جائے۔ مٹی کو گرگڑ کر ملائم کرنا اور چاک تک پہنچانا بھی جاگتی کا ہی کام تھا۔ جاگتی اپنے جتی کی بہترین معاون و مددگار تھی، منگل کی پڑوشن میں اس کا برابر کا ہاتھ تھا۔ دونوں جوان تھے۔ محنتی تھے اور دونوں ایک دوسرے کی محنت کو قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔

”بھگوان کی سوگندھ میں پہلے کب اتنا مال بنایا تھا یہ سب تیرے کارن بن رہا ہے۔“ منگل بیوی سے کہتا۔

”ارے لو میں نہ کروں گی تو اور کون کرے گا۔“ جاگتی کہتی۔

”ارے میں بھول گیا، آوا بھی لگاتا ہے اور ایندھن کا کچھ ٹھکانہ ہے۔“ منگل نے کہا۔

”تو فکر نہ کر منگل میں نے سب کر رکھا ہے۔ ایک چھوڑ تو دو آوا کیا لیو۔“ جاگتی نے کہا۔

”ارے واہ یہ تو نے کب کر چھوڑا۔“ منگل بولا۔

”میں تو روز ہی کچھ نہ کچھ ایندھن جمع کر لوں ہوں آوے کے بنا تو یہ ساری محنت ہی بے کار ہے، اس کا بندوبست تو پہلے کرنا پڑے ہے، میرا باپو کہے تھا کہ اصل کہار وہ ہے جو پہلے آوا گرم کرنے کا انتظام کرے۔“ جاگتی بولی۔

”تیرا باپو سمجھ دار کہار ہے، وہ تو روز ہی آوا گرم کرتا ہوگا۔“

منگل نے مٹی کا لوندا چاک پر رکھتے ہوئے کہا۔

”تو کرتا رہ باتیں مئے بہت کام ہیں کرن کو میں جارہی ہوں۔“ جاگتی بولی۔

”ارے جراتورک، سامنے ہوگی تو بھگوان کسم میرا دل کام میں لگا رہے گا، اور تو نے تیر کبھی دیکھا ہے۔“ منگل نے پوچھا۔

”ہاں دیکھا ہے۔ پر تیر کا کیوں پوچھے ہے۔“

”تیر کی لڑائی نہیں دیکھی ہوگی، میں نے دیکھی ہے، لڑائی کرنے والے تیری کو پنجرے میں تیر کے پاس رکھتے ہیں اور تیر کو میدان میں لڑنے کو چھوڑ دیتے ہیں تیر خوب لڑتا ہے۔ تیری آواز نکالتی رہتی ہے، اس کا جواب

”میں ماں باپ کے پاس جانا چاہتا ہوں بابا۔“

”ضرور جانا، دینو بھی ادھر آ جائے گا۔ اس جزیرے کو تم تینوں آباد کرو۔ تمہارے ماں باپ اور دینو کے ماں باپ بھی ادھر آ جائیں گے۔ اللہ رکھا جزیرہ تو اب آباد ہو چکا ہے۔ اب تم آ شانی جزیرہ آباد کرو۔“ آسانی ہوش میں آچکا تھا اور رولو کا کی پوری بات سن چکا تھا بولا۔

”نہیں محترم مہربان، یہ جزیرہ میرے نام پر نہیں آپ کے نام پر ہوگا۔“

”میں ہوائی خدمت گار ہوں۔۔۔۔۔ میرا کوئی نام نہیں ہے، اس لیے تم اس کے مالک ہو، مگر انسانوں سے محبت کرنا، کسی کو دکھی دیکھو تو ضرور مدد کرنا، تم اب ٹھیک ہو۔۔۔۔۔ میں جاتا ہوں۔“

اور رولو کو روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

”جاگتی کی شادی ہوگئی، اس کے گلے میں منگل کے نام کا منگل سوتر آ گیا اور جاگتی باپ کے گھر سے وداع ہو کر کہار واڑہ آ گئی۔

جاگتی گاؤں گولپی چند کے کہار سائونل کی بڑی لڑکی تھی۔ سائونل کی اور دو لڑکیاں اس سے چھوٹی تھیں۔ گاؤں دھول پورا سٹینٹ میں تھا۔ یہاں پر بھی دھول پور لبر کا قانون چلتا تھا۔ جاگتی کی سسرال دھول پور میں تھی۔ منگل کا کام بھی وہی تھا جو جاگتی کے باپ کا تھا۔ باپ کے گھر بھی اس کے ہاتھ مٹی میں رہتے تھے اور سسرال آ کر بھی مٹی میں ہی رہے۔

منگل کے پاس کئی گدھے تھے۔ وہ ہر دوسرے روز ان کو لے کر جنگل کی طرف جاتا تھا اور مٹی ان پر لاد کر لاتا تھا۔ وہ بڑی دور سے اچھی مٹی لاتا تھا، کیونکہ اس کے کام کا معیار اوروں کے مقابلے میں اچھا تھا، اس کے بنائے ہوئے برتن بھانڈے دکا نہ دار فوراً خرید لیا کرتے تھے، اس کے ہاتھ میں صفائی تھی اور وہ رنگتا بھی اچھا تھا۔

جاگتی اس کے ساتھ دن بھر کام کرتی تھی وہ چاک پر بیٹھا مٹی کو برتنوں کی شکل دیتا تھا تو جاگتی ان نرم اور ملائم برتنوں کو بہت ہنرمندی سے اٹھا کر دھوپ میں رکھتی تھی۔

تیر تیار ہوتا ہے اور لڑتا رہتا ہے۔ اگر اس کے سامنے اس کی مادہ تیری نہ ہو تو وہ میدان سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور لڑتا نہیں اور یہیں اس کی ہار مان لی جاتی ہے۔“ منگل نے تفصیل بتائی۔

”ای بتائے کا مطلب کا ہے تو یہ بتا۔“ جاکئی نے پوچھا۔

”اری تو بالکل نا سمجھ ہے میرا سن بھی تیرے سامنے کام کرنا کرے ہے اور کا۔“ منگل بولا۔

”کا پاگل ہوا ہے اندر باہر تو جانا ہی پڑے ہے نہ جاؤں تو میرے کام کون کرے گا۔“ جاکئی بولی۔

”میں جو ہوں سب کروں گا تو کا ہے فکر کرے ہے۔“ منگل بولا۔

”دونوں کریں گے تو کام پورا ہوگا، آج دو ہیں کادو ہی رہیں گے۔ خرچ تو بڑھے گا۔“ جاکئی نے کہا۔

”ہاں بات تیری سولہ آتا ہے پر میں کا کروں میرا من تو صرف تیری طرف لگا رہے ہے۔ زمانہ بھی بہت خراب آگیا ہے۔ راجہ جی کے دیوانے ہر طرف تاک جھانک کرتے ہیں وہ نہ دیکھیں کچھ بس اچھی عورت دیکھی اور لگ گئے۔“

جاکئی غریب کی لڑکی تھی اس نے ہوش سنبھالتے ہی باپ کے ساتھ کام کیا تھا۔ محنت نے اس کے جسم کو ایک سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ قد کاٹھ باپ پر گیا تھا۔ وہ ایک بلند قامت لڑکی تھی۔ جسم کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھی کچھ کم نہ تھا۔ اس پر سب سے بڑی اس کی معصومیت تھی وہ چہرے سے پچیس پچیس سال کی نہیں لگتی تھی۔ اس کے معصوم چہرے نے اس کی عمر کم کر دی تھی۔ اس کے کپڑے جو کہ لہنگا اور چولی پر مشتمل تھا ہر وقت منی میں اٹے رہتے۔ اس کے بالوں اور چہرے پر بھی مٹی پوڈر کی طرح لگی رہتی اور بال بھی بے ترتیب اور مٹی میں بھرے رہتے اس پر بھی اس کا تناسب دار جسم پکار پکار کر اس کے حسن کے قصے بیان کرتا رہتا۔

عورت حسین ہو تو پریشانی اور اگر حسین نہ ہو تو پریشانی، مرد کے لیے حسین عورت کا حصول لازمی مہوتا

ہے۔ اگر اس کو آسانی سے وہ مل جائے تو بہت جلد اس کی نظر سے گر بھی جاتی ہے۔ اور محنت اور کوشش سے ملے تو قدر بڑھ جاتی ہے۔ اگر پیار و التجا سے نہیں ملتی تو دولت سے حاصل کرنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے اور پھر بھی کام نہ بنے تو طاقت سے، اس پر بھی کام نہ بنے تو پھر اس کے قدموں میں سر جھکا دو، مرد اپنی ان کی خاطر سب کچھ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔

حسین عورت مرد کی کمزوری ہوتی ہے۔ بد شکل سے بد شکل مرد بھی حسین عورت کا طلب گار ہوتا ہے۔ وہ نہ اپنی طرف دیکھتا ہے نہ دنیا کی طرف اس کو صرف اپنی طلب سے غرض ہوتی ہے۔

منگل داس بھی مرد تھا مانا کہ اس کی دنیا بڑی مختصر تھی، سوچ بھی مختصر تھی۔ مگر اس پر بھی وہ اپنے ارد گرد کے ماحول کو تو سمجھتا تھا۔ ریاست کے اندھے قانون کو سمجھتا تھا۔ اس کی برادری میں جاکئی جیسی عورت دور دور نہیں تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جاکئی پر ریاست کے کسی کارندے کی نظر پڑے۔ اس لیے وہ جاکئی کو گھر سے باہر کسی کام سے نہیں بھیجتا تھا۔

”اری کیا، ہم دو ہی رہیں گے۔“ ایک دن اس نے جاکئی سے کہا۔

”ارے تو بھگوان کی مرضی ہے میں کا کروں.....“ جاکئی اس کی بات سمجھ کر بولی۔

”بات تو تیری ٹھیک ہے بھگوان کی مرضی ہے۔“ منگل داس نے کہا۔

”اچھا میں داس دوپٹے بات کروں گا۔“ منگل بولا۔

”کا بات کرے گا۔“ جاکئی بولی۔

”ارے وہ بڑا ہوشیار ہے، وہ ضرور کسی سیانے کو جانتا ہوگا۔“ منگل بولا۔

”پر کا ہے۔“ جاکئی الجھ کر بولی۔

”ارے کوئی ہمارا بھی نام لیوا ہو، یہ فکر ہے ہم کا۔“ منگل بولا۔

”ارے تو امی میں اتنی جلدی کا ہے وقت آدے گا تو ہو جاوے گا۔“ جاکئی نے کہا۔

”تو نے جلدی نہ ہے پر موعے تو ہے۔“ منگل بولا۔
مگر ایک سال گزر گیا اور منگل کو خوش خبری نہ ملی۔
ریاست کے کارندے آخر جاگتی تک پہنچ ہی گئے۔
وہ گدھوں پر مٹی لادے آ رہی تھی کہ ان دونوں کی
نظر اس پر پڑی وہ دونوں اس کو غور سے دیکھتے رہے۔ یہ تو
ان کو اندازہ ہو گیا کہ کہارن ہے، پھر بھی ایک نے پوچھا۔
”ارے تو کون ہے، کس کی چھوری ہے۔“
جاگتی بولی۔ ”میں منگل داس کہارن کی گھر والی ہوں تو
کیوں پوچھتے ہے۔“

دونوں نے جواب نہیں دیا اور آگے چلے گئے۔
دیوان کے کمرے میں وہ دونوں موجود تھے۔ ایک نے
دیوان جی سے کہا۔ ”دیوان جی ایک چھوری دیکھی ہے۔“
”کون ہے کوئل بتاؤ۔“ دیوان نے پوچھا۔
کوئل نے کہا۔ ”کہارن ہے بڑی جور کی چھوری
لاگت ہے، منگل داس کہارن کی جو رہے۔“
”ارے تو چھوری کب ہوئی۔ اور وہ بھی کہارن ذات
کی۔“ دیوان نے کہا۔

”پر حضور بڑی مزے کی عورت لاگت ہے۔ میلی
کچلی بھی اچھی لاگت تھی۔“ ہریانے بتایا۔
”ارے کا خبر دو جار کی اماں ہوگی۔“ دیوان بولا۔
”ارے حضور سب پتہ کر لیوں گے۔ پھر ہاتھ
ڈالیں گے۔“ ہریانے جواب دیا۔

”اچھا تو پتہ کر لے پھر بتلاؤ۔“ دیوان نے
جواب دیا۔

ہریانے اور کوئل دونوں دیوان سرداری لال کے
کارندے تھے۔ ملازم تو وہ ریاست کے تھے۔ مگر کام وہ
دیوان کا کرتے تھے۔ دیوان صاحب کو ایسی ہی خبریں دیا
کرتے تھے۔ اس سے نہ صرف وہ دیوان کو خوش کر کے
فائدے اٹھاتے تھے بلکہ ان کی عیاشی بھی ہو جایا کرتی تھی۔
دیوان کی بہت بڑی حویلی تھی وہ راجہ صاحب کے رشتہ میں
پھوپھا لگتے تھے۔ اپنی رشتہ داری کا وہ خوب فائدہ اٹھاتے
تھے۔ راجہ کے محل میں ان کا روز کا جانا تھا اور وہاں کے

ماحول کو وہ خوب جانتے تھے۔ اس ماحول کے راجہ اس پر کس
طرح انگلی اٹھا سکتے تھے۔ ان کی ہمت بہت بڑھی ہوئی تھی۔
وہ جو کرتے کم تھا، کیونکہ اوپری سطح پر تو بہت زیادہ ہورہا تھا۔
ہریانے دھول پور میں منگل داس کا گھر تلاش کر لیا
اور کوئل کے ساتھ اس کے پاس پہنچ گیا۔ ہریانے پوچھا۔
”تیرا نام منگل ہے۔“

منگل ان کی شکل دیکھ کر ہی ڈر گیا۔ بولا۔ ”ہاں
سرکار میں ہی منگل ہوں۔“
”اچھا تو پھر سن تیری جو رو بھی ہے بچے کتنے ہیں۔“

کوئل نے پوچھا۔
”ابھی تو کوئی نہیں۔“ منگل نے جواب دیا۔
”تو پھر سمجھ لے تیری قسمت جاگ گئی۔“ ہریانے کہا۔
”کا مطلب سمجھ میں کچھ نہ آیا حضور۔“ منگل
نے پوچھا۔

”ارے پاگل تیری جو رو کو دیوان جی نے کہیں دیکھ
پالیا ہے بس بلاتے ہیں حویلی میں۔“ ہریانے بولا۔
”کوئی کام ہے تو میں کر دوں، جو رو کو کا ہے بلایا
ہے سرکار نے۔“ منگل کا ڈراس کے سامنے آ گیا۔

”ارے ہم کا جانے بڑے آدمی کی بات ہے، وہی
جانیں گے۔“ کوئل نے جواب دیا۔
”بھائی تمہارا ساتھ چلیں گے دیوان جی سے
پتہ کر لیں گے کا کام ہے۔“ منگل نے کہا۔

”اچھا اٹھک ہے تیری مرضی بھی پوری کر دیں گے۔
کل تیار رہنا چلیں گے۔“ ہریانے جواب دیا۔
رات بھر منگل بے چین رہا، اس کی نیند اڑ گئی۔ مگر
اس نے جاگتی کو کچھ نہیں کہا۔

دوسرے دن دونوں اس کو دیوان کی حویلی میں لے
گئے۔ منگل نے اب تک جاگتی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ دیوان
کے سامنے اس کو پیش کر دیا گیا۔

”اوئے تو منگل کہارن ہے۔“ دیوان نے پوچھا۔
”سرکار ہوں۔“ منگل سر جھکا کر بولا۔
”تیری گھر والی کی حویلی میں ضرورت ہے کل اس کو

یہاں پہنچا دیو۔“ دیوان نے حکم دیا۔

”سرکار وہ نہیں ہوگی تو میرا کام تو بند ہو جاوے گا۔“ منگل نے کہا۔

”تو فکر مت کر جو ضرورت ہو حویلی سے پوری کر دیں گے۔ بھوکا نہیں مرے گا۔“ دیوان نے کہا۔

”سرکار یہ تو بہت مشکل ہے، میں اس کے بنا کیسے رہوں گا۔“ منگل نے کہا۔

”تو جو روکا دیوان ہے، لگاؤ دو چار سر پر جوتے تیری اوقات کیا ہے۔“ دیوان بولا۔

”سرکار آپ کو کیا کمی ہے کوئی اور مل جائے گی، میری تو وہی ہے، بس میں مر جاؤں گا رحم کرو۔“ منگل رو کر بولا۔

”ابے تیری جو روتیرے جھوٹے میں رہنے کے لائق نہیں ہے، وہ یہاں بجے گی۔“ دیوان بولا۔

منگل داس کبار کی دیوان کے سامنے کیا حیثیت تھی۔ اس کی کون سنتا کون اس کا ساتھ دیتا۔

فریاد کس کے پاس کرتا، اس کے دکھ کو کون سمجھتا وہ ایک شودر ذات کا آدمی تھا اور شودر بھی ریاست کا جہاں پر کوئی قانون نہیں ہوتا، ایک تو کر بلا اوپر سے نیم چڑھا۔

جاںکی کو کونول اور ہریانے دیوان کی حویلی میں

ہنچا دیا۔ وہاں پر اس کے لباس کو بدل دیا، اچھے کپڑے

پئے گئے اور وہ زندگی میں پہلی دفعہ خوشبودار صابن سے

ہائی۔ اس کا بناؤ سنگھار بھی کیا گیا اور رات کو دیوان کے

سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس کی کچھ نہیں سنی گئی۔ غریب ماں

پ کی اولاد غریب پتی کی بیوی تھی، وہ لوگ دیوان کے

سامنے کیا حیثیت رکھتے تھے۔

دیوان نے اس کے حسن کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ

س کے اندازوں سے بھی زیادہ تھی۔ ”تیری قسمت چمک

لنی کچھڑ میں پڑی تھی، تیری جگہ یہ حویلی ہے۔ یہ جگہ

برے لیے ہے۔“

جاںکی سب سمجھ چکی تھی، سب جانتی تھی دیوان کی

آنکھوں میں اس کو سب کچھ نظر آ رہا تھا۔

قدرت نے عورت کے اندر ایک ایسا حساس آلہ لگا دیا

ہے کہ وہ مرد کی ہر نگاہ کا مطلب اس کے بتانے سے پہلے ہی

سمجھ جاتی ہے۔ آنے والے وقت کے بارے میں اس نے

اندازے لگا لئے تھے۔ مگر وہ بے بس تھی اور منگل کی طرف

سے کسی مدد کی اس کو امید نہیں تھی۔ وہ پنجرے میں قید چڑیا

تھی۔ وہ کیا کرے اس کی مرضی اور خوشی کون جانے گا۔ اگر وہ

دیوان کے حکم کے خلاف جائے بھی تو کیا ہوگا۔ میری مرضی تو

چلے گی نہیں، منگل کی پہنچ یہاں نہیں ہے۔ مجھے ہر حالت

میں دیوان کی مرضی کرنا ہے اور اس نے ہتھیار ڈال

دیے۔ کوئی فریاد نہیں کی، کوئی شکایت نہیں کی۔

منگل کی دنیا اندھیر ہو گئی، اس کا کام چھٹ گیا۔ وہ

دیوانوں کی طرح شہر میں پھرنے لگا، کسی نے اس کی مدد نہیں

کی اور پھر وہ دھول پور سے نکل گیا۔ گاؤں گاؤں دیوانوں کی

طرح پھرتا رہا۔ اس کی نظروں کے سامنے ہر وقت جاںکی

راتی، وہ اس کو پکارتا رہتا، لوگ اس کو پاگل دیوانہ سمجھ کر اس کو

کچھ کھلا دیتے۔ وہ ان کھلانے والوں کو کبھی گالیاں کبھی

دعاں دے کر آگے بڑھ جاتا، اس کے جسم کے کپڑے

بھٹ گئے، چہرے پر داڑھی بڑھ کر خود روجھاڑیوں کی طرح

ہو گئی۔ سر کے اوپر بالوں کا گھٹا جنگل کھڑا ہو گیا۔ وہ عقل سے

زیادہ مشکل سے دیوانہ نظر آنے لگا۔ اس نے ہزاروں سے اپنی

پتا سنائی، اپنے ظلم کی کہانی بیان کی اور پھر وہ سنا سنا کر تھک

گیا۔ غریب کی کیا کہانی، غریب کی کیا عزت، کسی نے اس

کی بات پر دھیان نہیں دیا اور کسی کے دل میں ذرا سی بھی دیا

آئی تو بھی کوئی اس کی مدد کو آگے نہیں بڑھا، کون کسی کی

مصیبت اپنے گلے ڈالتا ہے۔ یہ دنیا کا چلن ہے۔ یہاں پر

لوگ اس کی مدد کرتے ہیں جس سے ان کو کچھ فائدے کی

امید ہوتی ہے۔ منگل کے پاس کیا تھا کون اس کی مدد کو آگے

بڑھتا۔ منگل داس شہروں شہروں پھرتا رہا۔ اب تو اس نے

بات کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ مگر اس کے دماغ میں جاںکی آج

بھی اسی طرح بیٹھی تھی۔ وہ چاک پر بیٹھا تھا۔ اس کی انگلیاں

ہنرمندی سے گھومتے چاک پر دھری مٹی کو برتنوں کی شکل

دے رہی تھیں، اس کے سامنے جاںکی مسکراتی دوڑ دوڑ کر مٹی

کے کوندے لا رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے یہ سین ایسا

بات نہیں آ رہی تھی، کیونکہ وہ تو صرف ایک فریق یعنی منگل کی آواز سن رہا تھا۔ دوسرے فریق یعنی جاگی کی آواز تو صرف منگل ہی سن سکتا تھا اور پھر منگل خاموش ہو گیا۔

پجاری نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ تب منگل کو اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ چونک پڑا بولا کچھ نہیں، پجاری نے بڑے نرم لہجے میں اس سے پوچھا۔ ”کون تھا کس سے ملاقات کر رہے تھے۔“

منگل خاموش رہا تو پجاری نے پھر پوچھا۔ ”تم کون ہو تمہارا نام کیا ہے؟“

منگل نے بہت عرصہ کے بعد ہمدردی کے بول سنے تھے۔ اس کی آواز نہ نکلی مگر وہ آنسو آنکھوں سے نکل کر زمین پر گر پڑے۔ پجاری کے دل پر ایک چوٹ سی پڑی یہ کتنا تنہا زہ ہے کہ اس کی زبان پر آتے ہوئے بھی ڈر رہا ہے۔ یہ ضرور کسی بہت بڑے سانحے سے گزرا ہے۔ اس پر ضرور کوئی بڑی مصیبت آئی ہے۔

”ڈر نہیں دنیا میں سب طرح کے انسان ہوتے ہیں۔ ظالم بھی اور ہمدرد بھی، تم بتاؤ تو کیا ہوا ہے۔“

منگل نے رحم طلب نگاہوں سے پجاری کو دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ بولا۔ ”میں بہت معمولی آدمی ہوں، میرے پاس کوئی چسکار کوئی ہنسی ایسا نہیں ہے کہ تیرا سارا دکھ میں دوڑ کر دوں، مگر کم از کم میں تجھ سے ہمدردی تو کر سکتا ہوں، دو بول ہمدردی کے انسان پر پڑے بہت بڑے بوجھ کو ختم نہیں کرتے مگر کم تو کر دیتے ہیں، میں انسانیت کے ناطے تجھ سے پوچھ رہا ہوں تو کون ہے۔“ پجاری کی آواز میں اس کے دل کی سچائی بول رہی تھی۔

منگل کو ایسا لگا جیسے اس کے جلنے شری پر کسی نے برف رکھ دی ہو وہ بولا۔ ”میرا نام منگل ہے میں دھول پور کا رہنے والا ہوں اور ذات کا کہہ رہا ہوں۔“

”تو کسی ذات کا ہو میں یہ جانتا ہوں کہ تو انسان ہے، میرا وہاں ذات برادری پر زیادہ نہیں ہے۔ انسانیت پر زیادہ ہے تو ڈر و مت میں عام فہم کا پجاری نہیں ہوں، اپنی پوری بات مجھے بتا۔“ پجاری نے بڑے پیار سے کہا۔

جم گیا تھا کہ ہر وقت وہ اس کو دیکھتا تھا۔ بند آنکھوں سے اور کھلی آنکھوں سے بھی سڑک کنارے گندی نالی کے کنارے بیٹھ کر بھی اور کسی باغ کی بیچ پر لیٹ کر بھی۔

کبھی وہ کسی گاڑی میں سوار ہو جاتا، بغیر یہ جانے کہ گاڑی کہاں جا رہی ہے۔ کوئی رحم دل ہوا تو نہیں اتارتا، کئی دفعہ اسے رات کے اندھیرے میں سنان سڑک پر اتار دیا گیا۔ اس نے کچھ نہیں کہا اور پیدل چلنا شروع کر دیا۔ اس کی کوئی منزل نہیں تھی۔ اس کو کہیں نہیں جانا مگر

پھر بھی اس کا پیر ایک جگہ نہیں رکتا تھا۔ اس کے اندر کی بے چینی اس کو کسی جگہ نہیں رکھ دیتی تھی۔ لوگ اس کو سودا بی سمجھتے تھے اور ٹھیک سمجھتے تھے۔ اب اس کی زبان پر جاگی کا نام نہیں آتا تھا، مگر اس کے اندر وہ رہتی تھی، اس سے باتیں کرتی تھی۔ اس کے کام کرتی تھی، وہ زور زور سے اس سے باتیں بھی کرتا تھا۔ راہ چلتے لوگ اس پر حیران ہوتے تھے۔ اور پاگل سمجھ کر مسکراتے تھے اور گزر جاتے تھے۔

وہ برابر چلتا رہا، آگے بڑھتا رہا۔ گوالیار بلند شہر، علی گڑھ اور نہ جانے کتنے گاؤں شہر سے گزرتا ہوا آگرا اور پھر متھرا آ گیا۔ یہ شہر بہت بڑا شہر ہے، ہزاروں مندر اس شہر میں بنے ہوئے ہیں۔ وہ کسی بھی مندر کے سامنے کھڑا

ہو جاتا، مندر کے بلند میناروں اور ان پر بنی پتھر کی مورتیوں کو دیکھتا رہتا۔ مگر جاگی ان میں اس کو نظر نہ آتی اور وہ آگے بڑھ جاتا، ہزاروں مورتیاں اس نے دیکھ ڈالیں، مگر جاگی اس کو وہاں پر نظر نہ آئی۔ وہ تھک کر دریا کے کنارے بیٹھ جاتا اور چٹم سے جاگی اس کے قریب آ جاتی اور وہ اس سے باتیں کرنے لگتا اور اس میں زندگی کی رقت پیدا ہو جاتی۔

وہ روز ایک مندر کے سامنے اپنی جاگی سے باتیں کیا کرتا تھا۔ اور اس مندر کا پجاری اس کو روز دیکھتا تھا۔ اس کے بات کرنے کا انداز بالکل قدرتی اور اس طرح ہوتا تھا جیسے جاگی اس کے ساتھ ہے۔ پجاری ہمدرد انسان تھا، اس نے سوچا شاید میں اس کی کچھ مدد کر سکوں، وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا، بولا کچھ نہیں، خاموش رہا۔ منگل کو کچھ پتہ نہیں تھا وہ جاگی کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے باتیں کر رہا تھا۔ پجاری کی سمجھ میں اس کی کوئی

پجاری کے پیار میں ڈوبے الفاظ نے اس کی یادداشت کے دروازے کھول دیئے۔

”میں دھول پور میں برتن بناتا تھا میری گھر والی بھی تھی اس کا نام جاگئی تھا، وہ بڑی سندرناری تھی۔ وہ میرے ساتھ مجھ سے زیادہ کام کرتی تھی، میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ میں نے ایسی کوئی عورت نہیں دیکھی۔ وہ کتنی سندرن اور کتنی محنتی تھی میں کا بتاؤں اور یہی خوبی میری بربادی کا کارن ہوگئی۔ اس پر ریاست کے دیوان کی نظر پڑ گئی اور اس کو مجھ سے چھین لیا۔

میری دنیا اندھیر ہوگئی، میں کس کے پاس جاتا کون میری مدد کرتا، سب دیوان کا نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ میری کسی نے نہیں سنی میری بربادی میں جاگئی کا ہاتھ تھا، وہ ناساتی سندرن ہوتی نہ اس پر کسی کی نظر پڑتی، جاگئی کو میں بھول نہیں پایا۔ وہ روز میرے پاس آتی ہے۔ وہ ویسی ہی ہے اس میں ذرا فرق نہیں آتا نہ جانے کتنے سال، نیت گئے ہیں کچھ یاد نہیں، میں نے کتنی نہیں کی ہے، میں اس کی تلاش میں پھرتا ہوں، مجھے پتہ ہے کہ وہ دیوان کی حویلی میں ہے، پتہ نہیں وہاں کا عیش و آرام اس کو اس آگیا ہو وہ مجھے بھول گئی ہو، مگر میرے پاس تو جب آتی ہے ویسی ہی ہوتی ہے باتیں بھی محبت کی کرتی ہے۔ میرے کام بھی کرتی ہے۔ وہ میری جو رو تھی اور اس جنم میں تو کیا اگلے جنم میں بھی رہے گی۔

میں اس جنم میں شاید اس کو نہ پاسکوں مگر اس کے بعد بھی تو اور جنم ہیں، میں کسی نہ کسی جنم میں تو پا لوں گا، کیوں پجاری جی، میں پا لوں گا۔“ منگل داس نے پوچھا۔ ”ابھی میں تیرے سوال کا جواب نہیں دوں گا، کبھی کبھی انسان کی زندگی اس بچ پر پہنچ جاتی ہے جہاں پر وہ خود اس سے لا پورا ہو جاتا، موت سے اس کو ڈر نہیں لگتا کوئی نہ کوئی مقصد اس کے دل و دماغ پر قابض ہو جاتا ہے، وہی مقصد اصل میں انسان کی آتما ہے، جب وہ پورا ہوتا ہے آدمی آسانی سے مر کر پر لوک سدھار جاتا ہے اور اگر وہ مقصد پورا ہوئے بناس کو موت آ جائے تو آتما بیا کل رہتی ہے یا تو دنیا میں بھٹکتی رہتی ہے اور اگر نہ بھٹکتی تو بھی اس

مقصد کی خاطر بار بار آنا چاہتی ہے۔ مگر کب اور کس جنم میں وہ اپنا مقصد حاصل کر پائے گی، کس کو پتہ ہے۔ یہ جنم جنم کا پھیر ہے اس کے بارے میں قیاس لگا سکتے ہیں، ٹھیک ٹھیک کون بتائے گا۔“

”میری محبت میں کیا کھوٹ تھا میرا اس کا لگن پوتر اگنی کے سامنے ہوا تھا، پنڈت نے اشوک پڑے اور پوتر اگنی کے گرد سات پھیرے ہوئے تھے۔“ منگل نے کہا۔

”تیری محبت پاکیزہ تھی۔ یہ ہوس کی آلودگی سے دور تھی تم دونوں دل کے اندر رہنے والی دل کے اندر دھڑکنے والی پیار اور معصومیت اور محبت تم کو ضرور ایک نہ ایک دن کسی نہ کو، جنم میں ملا دے گی تم کسی جنم میں ہوں ایک دوسرے کو پہچان بھی لو گے۔ آتما فنا نہیں ہوتی، صرف شریر مٹ جاتا ہے، یہ تو مٹی ہے اس کو تو مٹی میں ملنا ہی ہے۔ مگر آتما رہتی ہے اور اپنا مقصد بھی یاد رکھتی ہے۔ تو زراش مت ہو تو ضرور جاگئی کو پالے گا۔ یہ میرا دشاں ہے۔ ابھی تیری بہت عمر پڑی ہے۔ اس جنم میں بھی تیرے پاس وقت ہے، میں تیرے ماتھے پر جو دیکھ رہا ہوں وہ تیری کامیابی کی طرف اشارہ ہے، مگر اس کے لیے تجھے کو اپنے اندر ہمت پیدا کرنا ہوگی۔ اٹھ کر کھڑا ہونا ہوگا سدھ بدھ ہو کر دیوانوں کی طرح رہنا چھوڑنا ہوگا کوئی نہ کوئی ضرور تجھے ایسا ملے گا جو دیوان کی حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ اس ریاست کا مالک بھی دیوان کی کچھ مدد نہیں کر سکے گا۔ اس کے لیے تجھے بھی خود کو بدلنا ہوگا تو کمزور نہیں ہے۔ بھگوان نے تجھے عقل دی ہے، عقل اس لیے دی ہے کہ آدمی خود پر بڑی آزمائش اور معصومیت سے اس کے ذریعہ لڑ سکے تو بیل بکری نہیں ہے۔ اگر عقل نہ ہوتی تو ضرور تو بھی بیل بکری ہوتا، مگر تیرے پاس عقل کا ہتھیار موجود ہے تو نے اس کو استعمال نہیں کیا۔

تو نے جاگئی کے جانے کے بعد جو زندگی گزاری وہ کسی بے عقل جانور کی طرح تھی۔ تو خود کو کمزور بے بس لاچار سمجھ کر ناامیدی کے اندھیرے کنویں میں گر گیا۔ میں نے تیرا ہاتھ پکڑا ہے، اس کے سہارے تو باہر آ جا اور نئے سرے سے زندگی کی ابتدا کر میرے پاس رہ کر دیکھ پھر

وہ سوال کرو۔“

”مہاراج میں نے اب تک جتنے بڑی ذات کے لوگ دیکھے ہیں اور خاص طور سے برہمن ان سب میں تم نیارے ہو تم کو پتہ ہے کہ میں کون ہوں، پھر بھی تم مجھ سے نفرت نہیں کی، مجھے دھکارا نہیں میرے ساتھ وہ سلوک کیا جو آج تک کسی نے نہیں کیا تھا۔ اس کا کارن کیا ہے؟“ پجاری نے مسکرا کر اس کا سوال سنا اور جواب دیا۔

”پر تو نے اس سوال کے کرنے میں بہت صبر کیا مگر میں جواب تو دوں گا۔ بہت دن گزرے شاید دس سال گزر گئے ہوں گے میں نے ان گزرے دنوں کا حساب نہیں رکھا اس لیے کہ میرے لئے اس دن کو فراموش کرنا مشکل ہے، میرے نزدیک یہ کل کی بات ہے۔ یہی مندر تھا میں صبح کی پوجا ختم کر کے مندر سے باہر نکلا تھا کہ اچانک میرے سامنے ایک عجیب حلیے کا فقیر آ گیا اس کے بدن پر جو لباس تھا وہ تار تار تھا سر کے بال کھڑے تھے، ان میں میل مٹی کے ساتھ سوکھے تھے اور بچے بھی نظر آ رہے تھے۔ جسم پر میل کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں، پیروں میں تھیکیں نظر آ رہی تھیں اور ان میں جگہ جگہ خون نکل رہا تھا۔ چہرے پر بے تحاشا بال تھے منہ کا دہانہ نظر نہیں آتا تھا، مگر اس کی آنکھیں بہت روشن تھیں، جیسے اندھیری رات میں چراغ جل رہے ہوں۔ اس شخص نے میرے پاس آتے ہی سوال کیا تھا۔

”تیری اولاد کتنی ہے۔“ میں نے اس کے سوال کو دیوانے کی طرح نظر انداز کرنا چاہا تو وہ پھر بولا۔ ”نہیں بتائے گا تو میں بتاؤں گا۔ تو ہی بتا دے۔“

میں نے سوچا بتا دینے میں میرا کیا نقصان ہے۔ میں نے جواب دیا۔ ”دوڑ کے ہیں۔“

”تو ایک سے خوب پیار کر اس کو اچھا کھلا اس کے لباس کا خیال کر اس کے آرام کا خیال کر اس کو اپنی سب چیزوں کا مالک بنا دے، دوسرے کو گھورے پر بٹھا دے، اس سے گھر کے سب گندے کام کروا اس کو کھانا بھی نہ دے، اس کے ساتھ سلوک بھی نفرت انگیز کر، کیونکہ تو اب تک پرکھوں سے یہی کرتا آیا ہے۔“

بھگوان کوئی نہ کوئی اچھی راہ تیرے لیے نکالتے ہیں کہ نہیں۔“ پجاری نے اپنی بات ختم کی تو منگل کو ایسا لگا جیسے اس کے اندر نئی تازہ توانائی آ رہی ہو، امید کی لہر جو بہت مدھم تھی بڑھتی جا رہی ہے۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پجاری کے گلے سے لپٹ گیا اور بولا۔ ”تم نے مجھے پھر سے زندہ کر دیا ہے تم تو دیوتا ہو۔“ ”نہیں انسان کو دیوتا نہ کہ دیوتا بننا جتنا مشکل ہے اس سے زیادہ مشکل انسان بننا ہے۔ پتہ نہیں میں پورا انسان ہوں کہ نہیں۔“ پجاری نے جواب دیا۔

”میرے لیے آپ دیوتا کی طرح ہو، آپ نے میرے مردہ شریر میں نئی زندگی دوادی ہے۔ میں تو مر ہی گیا تھا، ناامیدی کی گہری کھائی میں پڑا سر رہا تھا۔ مگر اب میرے اندر لگن اور شوق کا ایک نیا دیار روشن ہے۔ میں آپ کے بتائے راستہ پر چلوں گا کوشش کروں گا اور ضرور اپنی جاگتی کوپالوں گا۔“ منگل بولا۔

”شاباش میری ایک کوشش کامیاب ہوئی، میں تجھے واپس زندگی کی طرف لے آیا ہوں، میں بہت خوش ہوں۔ جن کی امید زندہ ہو، وہ ضرور، کامیاب ہوتے ہیں۔“ پجاری نے کہا۔

اور پجاری اس کو لے کر مندر کے اندر آ گیا اس نے ایک کونہری میں اس کے رہنے کا بندوبست کر دیا۔ کھانے پینے اور کپڑوں کا انتظام کر دیا۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ وہ کس ذات کا ہے اور کون ہے۔ اس کے ذمے اس نے کچھ کام لگا دیئے تاکہ اس کے رہنے کا جواز پیدا ہو جائے۔

کسی کو پتہ نہیں تھا کہ ایک شودر مندر کے اندر پجاری کے ساتھ رہتا ہے۔ پجاری جو کہ برہمن تھا منگل داس بھی حیران تھا کئی بار اس کی زبان پر ایک سوال آیا، مگر وہ پجاری سے کرنے نہ سکا، آخر ایک رات کے بھوجن کے بعد اس نے ہمت کر کے سوال کر ہی دیا۔

”پجاری جی میں ایک سوال کرنے کے بارے میں بہت دن سے سوچ رہا ہوں، آگیا دو تو کروں۔“ ”اندر کوئی دبدو ہو تو آدمی بیالکل رہتا ہے، تم ضرور

نہیں تھا، میں نے بہت دور تک نظر دوڑائی، پرانی پوتھیوں اور کتابوں کو چھان مارا، مگر اس کے سوال کا انہیں جواب نہیں ملا۔ یہ تفریق کب ہوئی اور کس نے کی، اس کا بھی پتہ نہ چلا، مگر ہزاروں سال سے یہ تفریق تھی، برہمن صاحب عزت تھا، اور شودر ذلت کے گڑھے میں پڑا تھا۔ مگر میری کایا پلٹ چکی تھی۔ میرے اندر انقلاب آ چکا تھا۔ میرے خیالات اس کے چند جملوں نے بدل دیئے تھے۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں صدیوں سے زندہ ہوں اور صدیوں سے انسانوں کے ساتھ ناروا سلوک کرتا آ رہا ہوں، میں نے ظلم کیا ہے، میں صرف یہ کر سکتا تھا کہ اب وہ نہ کروں جو کرتا رہا تھا، گزرے وقت کو تو میں واپس نہیں لا سکتا تھا۔” پجاری خاموش ہوا تو منگل داس نے پوچھا۔

”پجاری جی، آپ کی کایا پلٹ کرنے والا وہ کون تھا۔“

”مجھے کچھ اس کے بارے میں پتہ نہیں ہے مگر پتہ ہوتا تو میں اس کے چرن چھو کر اس کی ہنسی کرتا کہ تیری اتنی سی بات نے میری کایا پلٹ دی ہے۔ آگے بھی کچھ اور بتا، مگر وہ تو ہوا کا جھونکا تھا ایک طرف سے آیا اور گزر گیا، اس کی مہکتی ہوا جس کو گلی اس کے پورا بارہ ہو گئے۔“

”بڑے نصیب ہیں آپ کے پجاری جی کہ آپ کو کوئی ایسا ملا تو۔“ منگل داس نے کہا۔

”اگر وہ نہ ملا ہوتا تو میں ایسا نہ ہوتا اور میں ایسا نہ ہوتا تو تیرا مندر کے اندر بھی آنا ناممکن تھا۔ مگر اب میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ بہت دور تک نظر آ رہا ہے۔ اپنی ابتدا اور انتہا سب نظر آ رہا ہے۔ تیرا میرا ساتھ بھی ختم ہونے والا ہے۔ مندر کے لوگ تیری کھوج کر رہے ہیں۔ ایک پارٹی دھول پور جانے والی ہے تیرے بارے میں پتہ کرنے، واپس آ کر وہ تیری پوچھ پچھ کریں گے، تیرے ساتھ میرے بارے میں بھی پوچھیں گے۔ میں پرکھوں سے کھرا برہمن ہوں میرا وہ کچھ نہیں کر سکیں گے۔ مگر تیرا میرا ساتھ اور آگے نہیں چلے گا۔ تو آج رات ہی خاموشی سے چلے جانا اور میری بات گرہ میں باندھ لے، تیری آشاؤں پوری ہوگی، مگر خود پر کنٹرول رکھنا ہوگا۔“

اس انوکھے آدمی نے مجھے اتنا حکم دیا اور ایک طرف چلا گیا۔ میں نے سوچا کیسا عجیب پاگل تھا۔ کیسی نرالی بات کر کے گیا ہے۔ کون باپ ہوگا جو اپنی اولاد کے ساتھ ایسا دوغلہ سلوک کرے گا۔ میں نے اس کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور چند روز میں ہی اس کو اور اس کی کبھی بات کو بھول گیا۔ ایک سال گزر گیا میں روزمرہ کی طرح صبح کی پوجا سے فارغ ہوا اور مندر سے باہر آ گیا۔

اچانک میرے سامنے ایک سفید پوش شخص آ گیا۔ اس کا لباس بے داغ تھا۔ پیروں میں بہت قیمتی چلنی تھی۔ سر کے بال سلقے سے کٹے ہوئے تھے۔ چہرے پر نہ داڑھی تھی نہ مونچھ آنکھوں میں چمک تھی، جیسے چراغ جل رہے ہوں۔ مجھے اس کا چہرہ ذرا ڈرنا شائسا لگا مگر کچھ یاد نہیں آیا۔ میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

”بھول گیا جو بھولتا ہے وہ کھوتا ہے۔ جو یاد رکھتا ہے وہ پاتا ہے۔“

مجھے اس کی آواز نے یاد دلادیا مگر آج اس کا حلیہ اور جسم کیسا تھا، اس کی آواز پھر آئی۔ ”مجھے پر غور مت کر میں نے جو کہا تھا، اس پر غور کر جو کہ تو نے اب تک نہیں کیا۔ یہ دنیا اور اس میں بسنے والی مخلوق کس نے بنائی ہے۔ تجھے اور مجھے کس نے پیدا کیا ہے تو پجاری ہے بتا کس نے پیدا کیا ہے۔“

میں نے جواب دیا۔ ”بھگوان نے پیدا کیا ہے۔“

”اور ہم سب بھگوان کی اولاد ہیں۔ اس کی محبت سب کے لیے برابر ہے۔ جس طرح تیری محبت دونوں بیٹوں کے لیے برابر ہے تو ایک لوگ رانا اور ایک کوٹھان نہیں چاہتا تو بھگوان اپنی اولاد کے ساتھ یہ سلوک کیسے کرے گا وہ اپنی اولادوں میں تفریق کیوں کرے گا۔ اس کے لیے تو سب برابر ہیں تو پھر یہ تفریق کیسی ہے کس نے کی، پیدا کرنے والے کے کام میں ملاوٹ کر دی ہے تو کس کے حکم پر چل رہا ہے۔ میری بات پر غور کرنا۔“

سفید پوش شخص نے اتنا کہا اور روانہ ہو گیا۔ میں اس کی بھاری دیمل کے نیچے دب گیا، میرے پاس کوئی جواب

اب منگل داس کا متحرا میں رکنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ رات کو ہی ایک لاری میں سوار ہو گیا۔ اس نے نہیں پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ وہ لاری ایک چھوٹے سے قصبے میں جا کر رک گئی۔ اس نے کسی سے پوچھا بھائی یہ کون سی جگہ ہے تو بتایا گیا یہ رجمیرہ ہے۔ رجمیرہ آگرہ کے قریب ایک قصبہ ہے۔ یہاں پر زیادہ تر آبادی کسانوں کی ہے۔ ایک لب سڑک بازار بھی ہے اور گاؤں کے طرز کی آبادی بھی ہے۔ لاریوں کا ایک اڈا بھی ہے، اس کی جیب میں کچھ نہیں تھا، مگر بھوک اس کو لگ رہی تھی۔ کئی لڑکے لاریاں دھورہ تھے اور دوڑ دوڑ کر نہر سے پانی لارہے تھے۔ ایک خالی لاری بڑے سے نیم کے بیڑے کے نیچے آ کر رکی وہ دوڑ کر اس کے ڈرائیور کے پاس گیا اور بولا۔ ”ڈرائیور صاحب کچھ کام ہے تو حکم کرو۔“

ڈرائیور سردار جی تھے بولے۔ ”اوائے تو کی کرے گا۔ گاڑی دھونی ہے۔ تیرے کول نہ باٹی ہے تاکیزا۔ سردار جی میں پہلی بار یہ کام کر رہا ہوں روٹی جو کھانی ہے۔“

منگل بولا۔

”اوائے تو ادھر کانہیں ہے۔“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”ہاں جی پردیسی ہوں گھر دوڑ کوئی نہیں ہے اور جیب بھی خالی ہے۔“

”اوائے فکر دی گل ہی نہیں کوئی میرا کلیئر نس گیا ہے بول میرے نال گڈی پر چلے گا۔ روٹی فکر دی فکر نہ کر جو میں کھاواں گا تو بھی میرے نال کھائے گا تو رہن والا کدھرا ہے۔“ سردار جی نے پوچھا۔

”میں رہنے والا تو جی دھول پور کا ہوں پرا دھر میرا اب کوئی نہیں ہے۔“ منگل نے جواب دیا۔

”چکی لاندہ ہے۔“ سردار نے پوچھا۔

”چکی کیا ہوتی ہے۔“ منگل داس نے پوچھا۔

سردار ڈرائیور زور سے ہنس پڑا۔ ”اوائے پورا اناڑی ہے دارو شارو پی۔ پیندا ہے کنہیں۔“

منگل داس نے جواب دیا۔ ”جی اب تک تو نہیں پی۔“

”بہت چنگا کیا ہے بہت بری چیز ہے لگ جانے

ہے تو پھر جان نہیں چھوڑتی۔“ سردار نے جواب دیا۔

”میں گاڑی دھولیتا ہوں۔“ منگل داس بولا۔

”نہیں اوائے تو سردار سوہن سنگھ ڈریور کا کلیئر ہے۔“

آمیرے نال پہلے پیٹ پوجا کر اس گے۔“

سوہن سنگھ نے کہا۔ پھر ایک لڑکے کو آواز دی اور اس کو گاڑی دھونے کا کہہ کر ایک ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھ منگل داس بھی تھا۔ بچوں پر بیٹھنے کے بعد ڈرائیور بولا۔

”اوائے تو نے اپنا نام تو بتایا نہیں اور بن گیا کلیئر۔“

”میرا نام منگل داس ہے اور میں کہار ہوں۔“

منگل بولا۔

”اوائے کوئی فرق نہیں پیندا توں جو بھی ہے، میرے نال کام کرے گا تو موحاں کرے گا۔“ سوہن سنگھ نے ہنس کر کہا۔ دونوں کھانا کھا کر باہر آئے اس وقت تک گاڑی دھل چکی تھی۔

سوہن سنگھ اچک کر ڈرائیور سیٹ پر بیٹھ گیا اور بولا۔

”آ جا پتر آگرہ جانا ہے۔ یہ مال اتارنا ہے۔ پھر دیکھیں گے کتنے جانا پڑے۔“

آگرہ پہنچ کر سوہن سنگھ نے سچی گودام میں مال اتارا اور پھر قلعہ کے پاس درہی نمبر 2 پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ٹرکوں کا بہت بڑا اڈا ہے۔ ٹرکوں کی مرمت اور سروس بھی ہوتی ہے اور دوسرے شہروں میں مال پہنچانے کے لیے بنگ بھی ہوتی ہے۔

”اوائے منگل تو نے تاج محل دیکھا ہے۔“

”نہیں استاد میں نے نہیں دیکھا۔“ منگل نے

جواب دیا۔

”جا پھر دیکھ آ پھر مڑ کے پتہ نہیں کب آگرہ آنا ہو۔“ سوہن سنگھ نے کہا۔

”پراستاد میں نے تو راستہ بھی نہیں دیکھا۔“ منگل

بولا۔

”اوائے یہ کوئی مشکل گل نہیں ہے دیکھو یہ ٹانگے تاج محل جا رہے ہیں، بیٹھ جاسی میں اور پھر ادھر ہی اتر کر

دیوانہ بنا دیتی ہے۔“ منگل بولا۔

”اوائے پاگلہ محبت انسان کو اوپر اٹھاتی ہے اوائے توں تو بہت اونچا بندہ ہے میں تیری قدر کرتا ہوں، تو کوئی آس امید نہ ہونے پر اتنا ثابت قدم ہے۔“ سوہن نگہ نے کہا۔

”امید تو سردار جی ہے، وہی تو ہے جو مجھے لئے پھر رہی ہے۔ میں ضرور ایک نہ ایک دن جاؤں گا۔ اور میں نے آپ کو بتایا ہے کہ نہ پاسکا تو میری آتما ضرور پالے گی۔“ منگل نے جواب دیا۔

الہ آباد درس گاہوں کا مرکز ہے یہاں کے لوگوں کی زبان پوربی سے متاثر ہے۔ بہت ٹیٹھی اور پیاری زبان ہے اردو یہاں پر ہندی سے آگے ہے، شاعروں اور ادیبوں کا یہ مرکز ہے، ادبی رنگ پورے شہر پر غالب ہے۔ زبان اور لباس سب کا ایک ہے سب ایک دوسرے کا ادب لحاظ کرتے ہیں۔

”اوائے تو الہ آباد دیکھا ہے۔“ سوہن نگہ نے پوچھا۔

”نہیں استاد میں پہلی دفعہ آیا ہوں۔“ منگل نے جواب دیا۔

”بڑا سوہنا شہر ہے، بندے بڑے بھولے بھالے ہیں۔“ سوہن نگہ نے جواب دیا۔

”یہاں پر کتنی دیر رکنا ہے استاد۔“ منگل نے پوچھا۔

”رکنا کی بس یہ مال اتارتا ہے اور پھر آگے خبر نہیں کتنے جانا پڑے۔“ سوہن نگہ نے کہا۔ شام تک مال اترتا

رہا اور رات کو ہی پر تاب گڑھ کا مال مل گیا اور وہ دونوں پر تاب گڑھ روانہ ہو گئے۔ پر تاب گڑھ الہ آباد کے مقابلے میں چھوٹی جگہ ہے۔ مگر یہاں پر بھی تعلیم عام ہے۔ زبان یہاں پر گہری پوربی ہے۔ شہری لوگ صاف زبان یعنی اردو استعمال کرتے ہیں اور گاؤں دیہات میں ہندی کی آمیزش زیادہ ہے۔

گاڑی نے راستے میں ہی تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ بڑی مشکل سے اڈے تک وہ آ پائے تھے۔

”اوائے منگلا بہن نور کتنا ہے گا۔“

میرے پاس آ جانا، میں شام تک ادھر ہی ہوں کچھ کام شام بھی کرانا ہے گاڑی میں اور یہ پھر خرچ دورو ہے۔“ سوہن نگہ نے اس کے ہاتھ پر دورو چڑھ رکھ دیے۔

منگل داس نے ایک تانگہ پکڑا اور تاج محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

گاڑی میں کام زیادہ نکل گیا اور سوہن نگہ کو دوروز آگرہ رکنا پڑ گیا۔ دوروز کے بعد اس کو الہ آباد کا مال مل گیا اور وہ الہ آباد روانہ ہو گئے۔

دوران سفر منگل کی پوری کہانی سوہن نگہ کو پتہ چل گئی۔ ”اوائے تیری تو بڑی دردناک کہانی ہے۔“ سوہن نگہ نے سب سننے کے بعد کہا۔

”بس سردار جی غریب کی کہانی ایسی ہی ہوتی ہے۔ میری بھی ایسی ہی ہے۔“ منگل نے جواب دیا۔

”یار بات یہ ہے کہ یہ جتنے رجواڑے ہیں ان سب میں بڑا انیائے ہوتا ہے سب جانتے ہیں پر ان کا کوئی کچھ نہیں کرتا، یہ اگر بزرگوار بھی ان کی منتی ہے۔“ سوہن نگہ بولا۔ ”صبر کر لے اور بھول جا اپنی جو رو کو زندگی ہے تو اوپر جاے گی۔“ سوہن نگہ پھر بولا۔

”سردار جی وہ میری خالی جو رو نہیں تھی، میرا ایک ہاتھ تھی، میری محبت تھی، اس کا چہرہ میری نظروں سے کبھی دور نہیں ہوا، اس کی ایک بات ایک حرکت میرے دل پر نقش ہے میں اس کو نہیں بھول سکتا۔“ منگل نے جواب دیا۔

”اویا رگل اے ہے کہ بندہ جو نہیں پاسکتا تو پھر بھول جانا ہی چنگا ہوتا ہے۔“ سوہن نگہ بولا۔

”وہ نہیں ملتی نہ ملے اس کی یاد تو میرے ساتھ ہے، میں زندگی کے آخری سرے تک اس کی کھوج کروں گا اور اگر زندگی ہار گیا تو میری آتما اس کی کھوج کرے گی۔“ منگل بولا۔

”چنگا بھی وڈا لپا پروگرام تو ہوتا ہے۔“ سوہن نگہ نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں استاد محبت بڑی بری چیز ہے یہ انسان کو

”میرا کچھ کام ہے استاد۔“ منگل نے پوچھا۔

”نہیں میں گڈی میں کام کراؤں گا تو جابو جاں کر پردھیان نال شام نو اڈے تے آ جانا۔“ سوہن سنگھ نے جواب دیا۔

”آ جاؤں گا استاد۔“ منگل نے جواب دیا۔

منگل سنگھ پیدل شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ زیادہ بڑا شہر نہیں ہے، اس کو قصبہ ہی کہنا ٹھیک ہوگا۔ بازار میں کئی مندر اس کو نظر آئے، مگر مسلمانوں کی مسجدیں اور مدرسے بھی تھے۔ سب کے لباس ایک جیسے تھے۔ ہندو دھوتی بھی اس طرح باندھتے تھے کہ وہ پاجامہ نظر آتی تھی۔ سفید کرتے اور لٹنی میں بھی لوگ پھر رہے تھے۔

ایک جگہ کچھ لوگ کھڑے تھے۔ ان کے درمیان میں ایک شخص کچھ جادوئی کام کر رہا تھا اور لوگ حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

پھر مداری نے بڑی زوردار آواز میں کہا۔ ”کوئی سوال کوئی مسئلہ اگر کسی مہربان کا ہے تو وہ بیان کرے۔ میں اس کے مسئلے کا حل ابھی پیش کر دوں گا۔“ ایک دو نے سوالات کئے مداری نے ان کے جواب دیئے اور وہ لوگ مطمئن نظر آنے لگے۔

منگل بھی آگے بڑھا اور بولا۔ ”میرا بھی ایک سوال ہے۔“

مداری بولا۔ ”کر لے تو بھی سوال کر لے تو بھی پردیسی میں بھی پردیسی تیرے سوال کا جواب ضرور دوں گا۔“ ”میں سب کے سامنے سوال نہیں کر سکتا۔“ منگل نے کہا۔

”پرائیوٹ سوال ہے اس کی تو فیس ہوتی ہے۔“ مداری بولا۔

”کتنی فیس لو سمے۔“ منگل نے پوچھا۔ ”جیسا سوال دیسی فیس ہوگی پردیسی۔“ مداری بولا۔

”تم مجھے پردیسی کہہ رہے ہو تم کو کیسے پتہ ہے کہ میں کون ہوں۔“ منگل نے پوچھا۔

”یہ کوئی جادوئی کمال نہیں ہے یہ میرا تجربہ ہے۔ جادوئی کمال تو تیرے سوال کے بعد ہوگا۔“ مداری نے کہا۔ مداری کا کھیل ختم ہو گیا لوگ چلے گئے۔ مداری نے اپنا سامان اپنے تھیلے میں ڈال لیا اور کھڑا ہو کر بولا۔ ”اگر جیب میں رقم ہے تو آ میرے ساتھ تیرے ہر سوال کا جواب تجھے ملے گا اور اس کا حل بھی ملے گا۔“

”میرے پاس صرف دس روپے ہیں۔ میں ٹرک پر کلینز ہوں، ٹرک خراب ہو گیا ہے ڈرائیور بخوار ہے۔ میں سیر کرنے کو ادھر آ گیا تھا، اگر تو میرا کام کر سکتا ہے تو بول۔“ منگل بولا۔

”دس روپے میں سوال کا جواب ملے گا یہ اتنا آسان کام نہیں ہے کہ تو نے پوچھا اور میں نے جواب دے دیا۔ اس کے لیے کچھ پڑھنا پڑتا ہے۔ اس منتر کے بیروں کو کچھ سمجھنا بھی دینا ہوتی ہے۔ تب وہ کام کرتا ہے۔“ مداری نے کہا۔

”بات یہ ہے میں بہت غریب آدمی ہوں اور بہت ستم زدہ بھی ہوں، میرے ساتھ بہت اتنیائے ہوئے۔ تم کوئی راستہ بتاؤ گے تو میں اس پر عمل کروں گا۔“ منگل نے کہا۔ ”اچھا تو سوال مجھے بتا میں دیکھتا ہوں کہ تیری مدد میں کر سکتا ہوں کہ نہیں۔“ مداری بولا۔

منگل نے کہا۔ ”میری ایک بیوی تھی ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے، وہ بڑی سندرہ تھی میرے آدھے کام کرتی تھی، ہم دونوں بڑی اچھی زندگی گزار رہے تھے، غریب تھے مگر ہمارے پاس محبت کی دولت تھی، محنت کر کے اپنی روٹی زمین سے پیدا کر لیتے تھے۔ پھر ایک آندھی آئی اور میری محبت کو لے کر اڑ گئی میں دیوانہ وار اس کو تلاش کرتا رہا۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ کہاں ہے، مگر میں بے بس تھا، اس حویلی میں نہیں جاسکتا تھا۔ وہ مجھ سے ذات میں اونچا شان میں اونچا دولت اور طاقت میں اونچا تھا، میں اس کی حویلی کی ایک سیڑھی بھی نہیں چڑھ سکتا تھا۔ میری سدھ بدھ کھو گئی، مگر پھر ایک نیک آدمی نے مجھے پھر زندگی کی دوڑ میں شامل کر دیا۔“ منگل نے

ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔
 ”یہ تو ہوتا آرہا ہے اور نہ جانے کب تک ہوتا رہے گا۔ تیری کوئی چیز تیری نہیں ہے۔ ہر اچھی چیز پر بڑی ذات کا حق تسلیم کر لیا گیا ہے اور اس حق کو پوتھیوں میں لکھ دیا ہے جو کھسا گیا وہ قانون مان لیا، اس کے خلاف کون آواز اٹھائے گا جو آواز اٹھائے گا اس کو دھرم کا باغی قرار دیا جائے گا۔ وہ ناستک ہی کہلائے گا۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے تو کچھ نہ کر، میں تیری تسلی کو یہ بتا سکتا ہوں کہ تیری جو رو کس حال میں ہے۔ مگر اس کے پانے کا میرے پاس کوئی طریقہ نہیں ہے۔“ مداری نے کہا۔

منگل داس نے چند منٹ سوچا اور بولا۔ ”دس روپے میں تم میرا اتنا ہی کام کر دو۔“
 ”میرے ڈیرے پر چلنا ہوگا۔“ مداری نے کہا۔
 ”میں تیار ہوں چلو۔“ منگل نے جواب دیا۔
 کافی دیر پیدل چلنے کے بعد ایک اجڑے سے باغ میں وہ پہنچے، دو تین پیوند لگے خیسے وہاں لگے تھے۔ دو گدھے اور دو تین کتے بھی تھے۔

مداری نے باہر سے ہی آواز لگائی۔ ”اری او سورتی۔“
 ایک جوان عورت ایک خیسے سے باہر آگئی اور بولی۔ ”کا بات ہے جلدی آگئے۔“
 ”اری ہاں ایک کام پڑ گیا ہے۔“
 ”میں سمجھ گئی تیرے ساتھ ایک سائل ہے اس کا ہی کام ہوگا۔ اسی کارن دھندہ چھوڑ کر جلدی چلا آیا ہے۔“
 ”ہاں سورتی دھندہ تو روز ہووے ہے، پر بھی دل کرے ہے کہ کچھ اور کام بھی کروں۔“ مداری بولا۔
 ”کر لے اپنا کام میں نے کب منع کیا ہے۔“
 سورتی منہ بنا کر بولی۔

”اری غصہ نہ کر منہ کا حال اچھا نہیں ہوتا۔ جوگی اور سنیا سی کو اپنے اصل رنگ میں ہی رہنا اچھا لگتا ہے۔ کپے کوٹھے میں رہنے والا سنیا سی کب کہلائے گا۔ ارے جس چیز کو چھوڑ کر چلے جانا ہے اس سے پریم کا ہے بڑھایا

جائے، سب کچھ اپنے کارن کرتے ہیں کون کسی کے پھندے میں ٹانگ ڈالے ہے۔ پر کبھی کبھی دل کرتا ہے سو آج یہ سائل میرے ساتھ آیا تو ایسا کر ذرا آگ جلا کر لے آ۔ کچھ منٹ کا کام ہے۔“ مداری نے کہا۔
 ”ٹھیک ہے لے آتی ہوں تو اپنی پر آ جائے تو پھر مانے کب ہے۔“ سورتی منہ بنا کر اندر چلی گئی۔
 مداری بولا۔ ”بیٹھ جا اس کی عادت ہے کرے پورا کام ہے پر منہ بنا کر کرے ہے۔“
 کچھ ہی دیر میں سورتی ایک گول ٹکاری میں آگ جلا کر لے آئی۔

مداری بولا۔ ”دھرتی و شمال ہے (بہت وسیع) پوری دھرتی پر کون دوڑا ہے اتنے بڑے پرکس کے پاس ہیں سب کے اپنے علاقے ہیں، اپنے ٹھکانے ہیں۔ میں ایک بہت معمولی سا مداری ہوں کچھ کرب دکھا کر پیٹ بھرتا ہوں، میری شقتی بہت کم ہے میں کتنی اور شمار میں نہیں ہوں تجھے جو بتا سکوں گا ضرور بتاؤں گا۔“
 اس نے ایک ڈبے سے کچھ نکال کر آگ پر ڈالا کچھ چنگاریاں اس کے ڈالنے سے پیدا ہوئیں، پھر اپنے تھیلے سے ایک لمبی سی ہڈی نکالی اس کو زمین پر رکھ کر ایک بہت چھوٹی سی انسانی کھوپڑی اس ہڈی پر رکھ دی، کھوپڑی پر ایک سوم جی، مٹیالے رنگ کی نکالی، اس کو آگ سے جلایا اور کھوپڑی پر رکھ دی اور آسن جما کر بیٹھ گیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد کھوپڑی سے مخاطب ہوا۔

”تو ہے کہ نہیں۔“ کھوپڑی سے بہت باریک آواز آئی جیسے کوئی بچہ بول رہا ہو۔ ”میں حاضر ہوں پانی پلا دے۔“
 مداری بولا۔ ”پہلے یہ بتا کہ اس کی گھر والی زندہ ہے۔“

بچے کی آواز آئی۔ ”زندہ ہے ایک بہت بڑے کمرے میں بہت بڑے پلنگ پر سو رہی ہے۔“
 ”آرام میں لگتی ہے کہ بے آرام۔“ مداری بولا۔
 آواز آئی۔ ”آرام میں لگتی ہے۔“

”استاد بات ہے تو مشکل مگر میرا دل کرتا ہے کہ میں دلی جاؤں۔“ منگل بولا۔

”میرا بس چلتا تو میں ادھر سے سیدھا دلی چل پڑتا، پر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ گڈی کا مالک کرنا میں بیٹھا ہے پر اس کی نظر ہر گڈی پر ہے، غازی آباد کا مال گڈی پر لوڈ ہو رہا ہے۔ غازی آباد میں کی بنے مجھے نہیں خبر تھی جانا پڑے۔ دلی بہت وڈا شہر ہے توں اکیلا کیا کرے گا۔ میرے نال ہوگا تو میرے اڈے پر بندے ہیں وہ تیری کچھ مدد کریں گے۔ میرے نال جانے گا تو کام بنے گا۔“ سوہن سنگھ بولا۔

”کوئی بات نہیں استاد سالوں سے انتظار کر رہا ہوں اور کر لیتا ہوں۔“ منگل بولا۔

”چل پھر ٹھیک ہے گڈی چیک کر لے اور دیکھ مال لوڈ ہو گیا کہ نہیں زیادہ نہ رکھنے دیتا۔“

اور وہ رات کو ہی غازی آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ دوسرے دن وہ غازی آباد کے اڈے پر کھڑے تھے۔ سوہن سنگھ نے اترتے ہی پتہ کیا کہ دلی کا مال ہے کہ نہیں، مگر اس کی کوشش کے بعد بھی مال نہیں ملا اور اس کو جھانسی جانا پڑ گیا۔

اب سوہن سنگھ کو بھی دلی جانے کی جلدی تھی۔ منگل زبان سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا، مگر اس کی بے چینی نے سوہن سنگھ کو بھی بے چین کر دیا تھا۔

جھانسی میں اس کو ایک دو جگہ کے بھاڑے ملے، مگر اس نے گاڑی کی خرابی کا بہانہ کر دیا۔ آٹھ دن کے بعد آخر دلی کا مال مل گیا۔ اور وہ دلی کو روانہ ہوا۔

منگل بہت خوش تھا۔ وہ ہر کام دوڑ دوڑ کر کر رہا تھا۔ ”آج تو بڑا خوش ہے۔“ سوہن سنگھ نے مسکرا کر پوچھا۔

”ہاں استاد دلی جو جا رہے ہیں۔“ منگل بولا۔

”میری گل سن پتر زیادہ خوش نہ ہو کی خبر ادھر کی ہو جائے، آنے والے وقت کے بارے میں کیا کیا جائے آدمی اپنے بھاگ تو نہیں پڑھ سکتا، اس لئے ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کو تیار رہنا ضروری ہے۔ انسان بڑا

مداری نے مومن بنی پر پھونک مار کر اس کو بچھا دیا۔ ایک کرواہ سی آواز آئی اور اس کے بعد مداری بولا۔ ”اس سے زیادہ یہ نہیں بتائے گا۔ تیری گھر والی زندہ ہے اور آرام میں ہے۔ یہ بات تو تجھے پتہ چل گئی اب دوسری بات یہ ہے کہ تو اب کیا کرے، تو اس کے لئے تو کل مجھے اسی جگہ مل جانا، جہاں پر آج ملتا تھا میں رات کو کچھ تیرا حل نکالوں گا۔ اب تو جا۔“ منگل نے دس روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

مداری نے مسکرا کر نوٹ کو دیکھا اور کہا۔ ”تیری جیب میں اب کچھ نہیں ہے تو جائے گا کیسے لے یہ رکھ۔“ پھر اس نے ایک روپیہ منگل کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ”تاگلے پر چلے جانا۔“

منگل نے زبان سے کچھ نہیں کہا، مگر آنکھوں نے اس کا شکریہ ادا کر دیا۔

دوسرے دن وہ اس وقت پہنچا جب مداری اپنا کام ختم کر رہا تھا۔ مداری نے اس کو دیکھ کر کہا۔

”میں شہر کا پتہ نہیں کر سکا ہوں، مگر نشانی بتائے دیتا ہوں، لال پتھر کے بہت اونچے مکانات برجیاں اور محلات بڑی بڑی سڑکیں، ان پر دوڑتی بھانت بھانت سواریاں۔ بڑے بڑے دروازے ان کے آ پار سڑکیں بس یہی بتا سکتا ہوں، یہی جگہ ہے جہاں پر تیری ساری مشکلات کا حل ہے، تجھے وہاں جانا ہوگا۔ کس کے پاس کون تیرا کام کرے گا۔ یہ تجھے خود پتہ کرنا ہوگا۔ بس اب تو جا اس سے زیادہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“

منگل واپس اڈے پر آ گیا اور اس نے پوری بات سوہن سنگھ کو بتادی۔

سوہن سنگھ اس کی بات سن کر بولا۔

”میرے خیال میں تو دو ہی شہر ایسے ہیں ایک دلی اور آگرہ۔ اس کے بعد اگر جے پور کو شامل کر لو تو دروازے اس میں، میں نے نہیں دیکھے آگرے کے دروازے بھی ختم ہو گئے، دلی میں اب تک موجود ہیں۔ ہو نہ ہو یہ دلی شہر ہے۔ پر دلی بہت بڑا شہر ہے۔ نام پتے کے بغیر اس کی تلاش بہت مشکل ہے۔“ سوہن سنگھ نے کہا۔

میں ہمیشہ تیرے ساتھ نہیں ہوں گا۔ تیرا کام تجھے خود کرنا ہوگا۔ مجھے ڈر ہے کہ تم اپنی مصحوبیت کا شکار نہ ہو جاؤ، اس لیے ساری بات بتا رہا ہوں تم کو ہر طرف نظر رکھنا ہوگی۔“

شام کو سوہن سنگھ اس کو پرانی دلی کی بستی چلتی قبر لے گیا۔ پچھلی بازار کے قریب ایک بہت پتی سی گلی میں ایک دروازے کے سامنے اس نے ایک دروازے کی کنڈی ہلائی۔ وہ دروازہ سڑک سے کافی اونچا تھا۔ بڑے سے کواڑ لگے تھے، مگر بہت پرانے طرز کے، دروازہ بھی بہت قدیم تھا اور اونچا تھا، کسی زمانے میں وہ بہت شاندار رہا ہوگا۔

کچھ دیر کے بعد ایک آدمی نے دروازہ کھول کر پوچھا کس سے ملنا ہے۔ سوہن سنگھ نے کہا۔ ”سردار بلدیو سنگھ سے ملنا ہے۔“

”سردار صاحب تو پیالہ گئے ہیں تم کون ہو۔“

”میں سوہن سنگھ ہوں۔“ سوہن سنگھ بولا۔

”کون سوہن ان کے کون ہو۔“ آدمی نے پوچھا۔

”میں سردار صاحب کا چھوٹا بھائی ہوں، تم شاید

سنے ہو، اس لیے مجھے نہیں جانتے۔“ سوہن نے کہا۔

”میں نے تمہارا نام سنا ہے سردار صاحب اکثر

تمہارا ذکر کرتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”تم کب سے ہوا اور کون ہو۔“ سوہن نے پوچھا۔

”میرا نام شکور ہے، میں پانچ سال سے سردار صاحب

کی خدمت کر رہا ہوں، ان کے سارے کام میں ہی کرتا ہوں،

سارا لین دین میرے ہی پاس ہے۔“ شکور نے بتایا۔

”تو شکور بھائی یہ بتاؤ سردار صاحب کب تک

آجائیں گے۔“

”ان کو آتو جانا تھا، مگر دیر ہو گئی ہے، میں تار دے کر

ان کو خبر کر دیتا ہوں کہ آپ آئے ہیں۔ وہ تم کو بہت یاد

کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے تاکید کر رکھی ہے کہ اگر تم

آ جاؤ تو جانے نہ دوں اور ان کو خبر کر دوں۔ اب تم آ گئے

ہو تو میں جانے نہیں دوں گا۔“ شکور نے کہا۔

”میں بھی ان سے ملے بغائیں جانے کا۔“ سوہن بولا۔

خود غرض ہوتا ہے۔ صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ مگر خود غرضی ہمیشہ نقصان دیتی ہے۔ بارہ آنہ اپنے بارے میں تو چار آنہ دوسروں کے بارے میں ضرور سوچنا چاہتی

دا۔“ سوہن سنگھ نے کہا۔

منگل داس بولا۔ ”استاد تم سے میں نے بہت کچھ

سیکھا ہے۔ میں تمہاری بات پر چلوں گا۔“ میں بھی

تیرے جیسا ہوں، بھوکریں کھا کھا کے میں نے ڈیریوری دی

لائن پھڑی ہے۔ یہ بھی کوئی چنگی لائن نہیں ہے تو اس

لائن سے دور ہی رہنا۔“ سوہن بولا۔

”دلی میں تمہارے جاننے والے ہیں استاد۔۔۔۔۔“

منگل نے پوچھا۔

”اوتے میں دلی کا ہوں سب جاننے والے ہیں تو

فکر نہ کرتیرا پورا بندہ دست کر کے آگے جاؤں گا۔“ سوہن

سنگھ بولا۔

رات ساڑھے تین بجے وہ دلی کے اڈے پر کھڑے

تھے۔ سویرے ان کا مال اتر گیا سوہن سنگھ نے ٹرک کھڑا

کر کے مٹری کو کچھ کام بتائے اور منگل کو ساتھ لے کر

اڈے سے باہر آ گیا۔

”دیکھ لال پتھر کی وہ اونچی دیوار جو نظر آ رہی

ہے یہ شامی قلعہ ہے اور اس کے سامنے وہ شامی مسجد ہے

دروازے بھی آگے نظر آئیں گے۔“ سوہن سنگھ بولا۔

”ہاں استاد سب کچھ ویسا ہی نظر آ رہا ہے۔“

”یہ بہت بڑا شہر ہے آج سے نہیں ہزاروں سال

سے بڑا شہر ہے، سیکلزوں بادشاہوں کا پایہ تخت رہا ہے۔

اس شہر نے نہ جانے کتنے بادشاہوں کو دیکھا ہے، ان کا

عروج اور زوال دیکھا ہے۔

جگہ جگہ ان بادشاہوں کی نشانیاں بکھری پڑی ہیں۔

زمین کے اندر نہ جانے کتنے خزانے چھپے ہوئے ہیں۔

یہاں پر بہت اچھے مہربان لوگ بھی ہیں اور تیری آنکھ کا

سرمہ چرانے والے بھی بہت ہیں۔ اس لیے ہر مقام پر

ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ دوستی کی آڑ میں دشمنی کرنے

والے بہت ملیں گے۔

”تم سردار صاحب کے پاس خبر کر دو میں آیا ہوں اور ضروری کام سے آیا ہوں۔“

”آئیے آپ کو میں آپ کا کمرہ دکھا دوں۔ آپ آرام کرو میں سب انتظامات کرتا ہوں۔“

تین دن کے بعد سردار بلد پوسنگھ آگئے۔ بھائی کو دیکھ کر پھٹ پڑے اور بہت دیر تک ان کے آنسو بہتے رہے، پوری داڑھی بھج گئی، سوہن سنگھ بھی روتا رہا۔

جب ذرا بادل چھٹ گئے اور بوند باندی ختم ہو گئی تو سردار بلد پوسنگھ بولے۔ ”تو نے تو پلٹ کر خبر نہ لی تیری

بھر جانی بھی مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔ پورے گھر میں، میں اکیلا رہ گیا، مگر واہ گورنے یہ شکوہ بھیج دیا، بس یہی ہے میرا غم

خوار، یہی سب کچھ کرتا ہے۔ اب تو آ گیا ہے تو اب یہ گھر پھر سے آباد ہو جائے گا۔ اب تجھے میں نہیں جانے دوں گا۔“

”بھائی جی آپ کہو گے تو نہیں جاؤں گا۔“

”یہ بندہ تیرے نال کون ہے۔“ سردار صاحب نے پوچھا۔

”یہ میرا کلیئر ہے۔ بڑی مصیبت کا مارا ہے۔“ اور سوہن نے سنگھ کی پوری کہانی بیان کر دی۔

سردار بلد پوسنگھ بولے۔ ”چل چنگا کیا کر تو ساتھ لے آیا۔“

”اس کی پریشانی کا حل دلی میں ہے، مگر ڈھونڈنا پڑے گا۔“ سوہن بولا۔

”وہ بھی کریں گے تو کیا فکر کر رہا ہے۔ بہت بندے ہیں کسی نہ کسی کو تو پتہ ہوگا۔“ سردار بولے۔ ایک ہفتہ گزر گیا شام کو سردار بلد پوسنگھ بولے۔

”میں نے ایک کڑی دیکھی ہے تیرا کیا خیال ہے۔ دیکھ انکار نہ کرنا، اس گھر کے آگن کو بچوں کی ضرورت ہے۔“ سردار صاحب نے کہا۔

”بھائی جی۔ آگن کو کا ہے کہہ رہے ہو آپ کو ضرورت ہے یہ کہو۔“ سوہن مسکرا کر بولا۔

”تو سمجھ دار ہو گیا ہے بول بات آگے چلاؤں۔“ وہ بولے۔

”آؤ اندر آ جاؤ میں بھی کیسا باتوں میں مست ہو گیا کہ اندر آنے کا کہنا ہی بھول گیا۔ میاں معاف کر دینا، ملازم آدی ہوں، میری غلطی معاف کر دینا۔“ شکور نے کہا۔

”امید کے برخلاف کچھ ہو تو آدی بدحواس ہو ہی جاتا ہے۔“ سوہن سنگھ بولا۔

”آپ نے درست کہا، میں واقعی بدحواس ہو گیا تھا۔“

”بھائی کا کیا حال ہے۔“ سوہن نے پوچھا۔

”تم کو کسے کتنے سال ہو گئے، اس گھر سے۔“ شکور نے پوچھا۔

”آٹھ نو سال تو ہو ہی گئے ہیں۔“ سوہن نے کہا۔

”تمہارے جانے کے بعد سردار صاحب کی بیوی بھی چلی گئی۔“ شکور نے کہا۔

”کہاں چلی گئی، کیا پٹیا لہا پس چلی گئی۔“ سوہن نے کہا۔

”نہیں جہاں مرنے کے بعد سب جاتے ہیں چلی گئی۔“ شکور نے کہا۔

”میں نے اس کی خاطر یہ گھر چھوڑا تھا اور وہ دنیا چھوڑ گئی۔“ سوہن سنگھ بولا۔

”میں جب سے اس گھر میں آیا ہوں سردار صاحب اکیلے ہیں۔“

”اکیلے تو ان کو ہوتا ہی تھا اولاد ان کو ہوئی نہیں، میرے ساتھ بھائی کی بیٹی نہیں بھائی جی پر بھر جانی کا اتنا اثر تھا کہ میرے کہنے پر بھی سردار صاحب دوسری شادی پر راضی نہ ہوئے اگر ہو جاتے تو شاید یہ آگن اتنا سونا نہ ہوتا۔“

”میاں یہ سب دل کی تسلی کی باتیں ہیں۔ نقد پر کے لکھے کو کون بدل سکتا ہے۔ آدی اپنے تئیں تو پوری کوشش کرتا ہے۔“ شکور نے جواب دیا۔

”تم نے پوچھا نہیں کہ میرے ساتھ کون ہے۔“ سوہن نے کہا۔

”میاں آپ کے ساتھ ہے تو ضرور آپ کا دوست ہوگا میں ملازم آدی ہوں، میرا حق نہیں ہے کہ آپ سے اس قسم کے سوال کروں۔“ شکور نے جواب دیا۔

واپس آگیا۔ نہ آتا تو یہ خوشی کہاں ملتی۔“
منگل دوڑ کر ان کے قریب آ کر بولا۔ ”شریت
لافل سردار صاحب۔“

”ارے ضرور لا بھائی۔“ منگل چلا گیا تو سردار
صاحب بولے۔

”یہ منڈا تم نے دیکھا حکیم صاحب بڑا ہی مصیبت
زدہ ہے۔ سوہن کے ساتھ ہی میرے پاس آیا ہے، اس
کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔“

”کیا ہوا ہے سردار صاحب کچھ بتائیں۔“ حکیم
کامل نے پوچھا۔

”بڑی لمبی داستان ہے بڑے دکھ جھیل کر دلی پہنچا
ہے۔ کسی نے اس کو بتایا ہے کہ اس کے دکھوں کا علاج دلی
میں ہے، مگر کون علاج کرے گا اس کو پتہ نشان نہیں
ہے۔“ اور پھر مختصر الفاظ میں سردار بلد یو سنگھ نے منگل کے
حالات گوش گزار کر دیئے۔

حکیم کامل نے کہا۔ ”اس کی مدد کرنا ضروری ہے،
آپ اسی کو لے کر مطب آ جائیں، شاید ہمارے پاس اس
کا کچھ علاج نکل آئے۔“ اتنے میں منگل شربت لے کر
آ گیا تو سردار بولے۔ ”لومیاں تمہارا کام ہو گیا۔ یہ حکیم
کامل ہیں، اپنے کام کے ماہر ترین آدمی۔ سنا ہے جس پر
انہوں نے اتنا کھدکھدایا اس کا کام ہو گیا۔“

شادی ختم ہو گئی اور باہر سے آئے مہمان بھی
دخست ہو گئے تو سردار بلد یو سنگھ کو فرست ہو گئی اور وہ منگل
کو لے کر حکیم صاحب کے مطب پہنچ گئے۔

حکیم وقار اور حکیم کامل (رولوکا) نے منگل کی روداد
تفصیل کے ساتھ سنی پھر رولوکا نے کہا۔

”اکثر یہ ہوتا ہے کہ مریض کچھ باتیں چمپا لیتے
ہیں۔ شاید اس لیے کہ ان کی کچھ کمزوری اس میں ہوتی
ہے۔ اس سے علاج میں مشکل ہو جاتی ہے۔ معالج کو
پورے معاملات پہنچ نہ سوں تو وہ علاج بھی پوری طرح نہیں
کر پاتا، اس لیے میں کہتا ہوں کچھ بات ہو، چاہے چھاندا
ہی تصور ہو بات چمپا نہیں، یاد رکھ کے بتاؤ۔“

”میں بھی شہر شہر پھر پھر کے بیزار ہو گیا ہوں۔ آپ
کو بھی میری ضرورت ہے اب مجھے کہیں نہیں جانا تم جو کرو
نکار نہیں کروں گا۔“ سوہن نے جواب دیا۔
”اوئے خوش کر دیا۔“

سارے معاملات سردار بلد یو سنگھ نے بہت جلد
طے کر لیے اور سوہن کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔
سردار بلد یو سنگھ دلی کے پرانے ہاسی تھے۔ خانمانی
دگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ دلی کے پرانے اور خانمانی
بگ ان کو جانتے تھے، کسی زمانے میں ان کی دلی میں بڑی
بائیدار تھی۔ ان کے نام کا سکہ چلتا تھا، مگر وقت کے ساتھ
ساتھ تمام رنگ پیچھے پڑ گئے تھے۔ جائیداد کم ہوتے ہوئے
اس اتنی روٹتی تھی کہ ان کا گزرا ہوا ہوا تھا۔

اصولی آدمی تھے۔ بلاشبہ کے اخراجات نہیں کرتے
تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اخراجات بہت کم تھے۔ بھائی
راض ہو کر گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا، اس کے جانے کے بعد
بڑی بھی منہ موڑ گئی، جو آدمی بھی ان کی ذات کو بہت سچی، مگر
کے انتظام کو ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ آدمی ایماندار اور پرانی وضع کا تھا۔
ایک زمانے کے بعد اس حویلی میں خوشیاں آئی
نہیں۔ شادی کی تاریخ طے ہو گئی اور مہمانوں کی
آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ کچھ پیالہ اور جالندھر
سے پار دوست آ گئے، ان کے بچے اور عورتیں آ گئیں اور
گھر میں شادی کی رونق ہو گئی اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب
رات لال کنویں بڑی دھوم دھام سے روانہ ہوئی۔ عجلت
میں دلی کے شرفازوں نے شرکت کی۔ رسومات ادا ہونے
کے بعد کھانے پر ہر ذات کے لوگ موجود تھے۔ ان میں
عدو مسلمان سکھ عیسائی سب تھے سب سردار بلد یو سنگھ کو
بار کھادو سے ہے تھے۔ منگل دوڑ دوڑ کر کام کر رہا تھا۔

اس دعوت میں دلی کی نامی گرامی ہستیاں موجود
نہیں، حکیم وقار احمد اور حکیم کامل نہ ہوں ایسا کس طرح
وسکتا تھا۔ سردار بلد یو سنگھ ہر ایک کے پاس جا رہے تھے۔
حکیم وقار نے سردار صاحب کو مبارکباد دی تو وہ
اے۔ ”حکیم صاحب میرے نصیب اچھے تھے کہ سوہن

”میں نے جو بات تھی کچھ چھپایا نہیں اور جو سچ ہے وہی بیان کیا ہے۔“ منگل بولا۔

رولوکا نے کہا۔ ”سردار صاحب آپ نے اب کچھ نہیں کرنا ہے، جو کرنا ہے ہم ہی کریں گے۔ مجھے شاید کچھ دنوں کے بعد منگل داس کی ضرورت پڑے گی۔ کیونکہ دھول پور جانا ہوگا۔ مگر ابھی نہیں میں خود آپ کے در دولت پر ضرورت پڑنے پر آ جاؤں گا۔“ سردار بلند پونگھ بولے۔

”بڑی مہربانی حکیم صاحب بڑے پن کا کام آپ کریں گے۔“

سردار صاحب اور منگل چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد حکیم وقار بولے۔ ”اب تم دھول پور جاؤ گے۔“

”ظاہر ہے منگل کی جو رو وہیں پر ہے، وہیں سے برا آمد کرنا ہوگا۔“

”مجھے تو یہ کام آسان سا نظر آتا ہے۔“ حکیم وقار نے کہا۔

”گلتا تو ایسا ہی ہے مگر حالات تو جا کر ہی پتہ ہوں گے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔ اور رولوکا دھول پور روانہ ہو گیا۔

اس ریاست کا انتظام دوسری ریاستوں سے الگ تھا۔ دیوان کا حکم ہی قانون تھا۔ راجہ لوگ ان کے کام میں مداخلت کم کرتے تھے۔ کیونکہ ان کو اپنے کاموں سے فرصت نہیں تھی۔ رولوکا ایک گھوڑوں کے ماہر کے طور پر آ گیا۔ اس نے مشہور کر دیا اور کئی بگڑے اور ضدی گھوڑے ٹھیک بھی کر دیے۔ گھوڑے شاہی محل میں بھی بہت تھے۔ ان میں اڑیل اور ضدی بھی تھے۔ کسی نے اس کا تذکرہ کر دیا اور اس کو دیوان نے بلوایا۔ رولوکا اس انتظار میں تھا۔ اس کو دیوان کے حضور پیش کر دیا۔

رولوکا نے دیوان کو دیکھا تو اندازہ ہو گیا کہ یہ کس طبیعت کا آدمی ہے۔ ”تو گھوڑے کا علاج کرے ہے۔“

دیوان نے پوچھا۔

”میں علاج نہیں کرتا علاج تو ڈاکٹر کرتا ہے۔“

رولوکا بولا۔

”ارے تو کا کرے ہے۔“ دیوان مونچھ پر ہاتھ

پھیر کر بولا۔

”جو گھوڑا کام نہ کرے اپنی ضد کرے میں اس کو سیدھا کرتا ہوں۔“ رولوکا بولا۔

”اور ہاتھی اونٹ کا بھی کرے ہے۔“ دیوان نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔ رولوکا سمجھ گیا۔ بولا۔

”جو جانور گڑبڑ کرتا ہے میں اس کا علاج کرتا ہوں۔“

”ارے واہ تو تو بڑا خوبی والا ہے۔ پر ہکا بھروسہ نہیں ہے۔“ دیوان بولا۔

”بھروسہ کرنا ہے تو کام بتاؤ۔ کام نہ ہو تو محل سے جوتے مار کے نکال دو۔“ رولوکا بولا۔

”واہ رے چھوڑا اچھا تو یہ کر یہ طوطا جو بھیرے میں خاموش ہے بہت بولے تھا، پھر بولے ہو لے خاموش ہوتا گیا۔ اب تو بالکل خاموش ہے، پہلے جا کے سیدھا کر دے پھر بڑا کام توئے دوں۔“ دیوان نے کام بتایا۔

دیوان کے ساتھ اس کے حواری ہاں میں ہاں ملانے والے سات آٹھ آدمی موجود تھے رولوکا نے ان سب پر نظر ڈالی اور کہا۔ ”طوطا بڑا سمجھ دار ہے۔ اس نے اپنی زبان اس لیے بند کر لی ہے کہ اس کو اپنی جان کا خطرہ ہے۔“

”ارے کا کہتے ہو ارے جاسر کی جان لے کے کوئی کا کرے گا۔“

دیوان نے پھر مذاق اڑایا۔

”تم یہ گارنٹی دو کہ طوطے کو تم آزاد کر دو گے تو یہ تم سے بات کرے گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”ٹھیک ہے کر دیں گے آزاد۔“ دیوان نے کہا۔

”تو اس کا دروازہ کھول دو یہ اڑے گا نہیں۔“ رولوکا بولا۔

ایک حواری بولا۔ ”اگر حضور دروازہ کھلتے ہی چھوہو جاوے گا۔“

”اڑ جائے تو میری گردن ماریتا۔“ رولوکا بولا۔

دیوان بولا۔ ”کھول دے دروازہ۔“

اسی حواری نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا اور اپنی

• ”مگر تو اس علم کے ساتھ اب باہر نہیں جائے گا۔ میرے سر پر بھی کوئی ہے۔ تجھے بتانا پڑے گا۔ اپنے اندر کے علم کو باہر لانا پڑے گا۔“ دیوان بولا۔

”بندر کے سامنے ہیرے جو اہرات ٹکھ دو تو اس کے لیے بے کار شے ہے۔ مونگ پھلی اور چنے رکھ دو وہ اس پر جٹ جائے گا، تم کیا جانو علم کیا ہوتا ہے، اور رہا تیرے سر پر ہاتھ رکھنے والا تو اس سے ملاقات ہوگی تو بات کرنا۔“

دیوان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ غصے میں چیخ کر بولا۔ ”تیرا حشر بہت برا ہوگا۔ تو نے یہاں آ کر بڑی بھول کی ہے۔“

”نہیں مجھے پتا تھا کہ یہاں پر تو ہے میں تجھ سے ملنے ہی آیا تھا۔“ رولوکا بولا۔

”تو کون ہے اور کیوں آیا تھا؟“ دیوان بولا۔

”تیرے گورو سے ملنے کے بعد بتاؤں گا۔“ رولوکا بولا۔

”بندر دو اس کو لے جا کر۔“ وہ دھاڑ کر بولا۔

”دو موٹے تازے آدمی اس کی طرف بڑھے، مگر قریب آ کر رک گئے اور ادب سے بولے آئے۔“

دیوان کا غصہ اپنے عروج پر پہنچ گیا، وہ غصہ بھری آواز میں بولا۔ ”ارے یہ تمہارا باپ نہیں ہے، لے جاؤ اور بند کر دو۔“

رولوکا ہنس کر بولا۔ ”دیوان جی اب بھی عقل سے کام لے لو یہ آدمی تمہارے ہیں، مگر عزت میری کر رہے ہیں۔ اب تمہارا وقت برا آنے والا ہے۔“

دیوان کچھ نہ بولا، صرف اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا، رولوکا ان کے ساتھ دیوان خانے سے چلا گیا، اس کے جانے کے بعد وہ بولا۔

”ارے یہ کون تھا، کوئی تو بتلائے۔“

مگر سب خاموش تھے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، جواب کیا دیتے۔ رولوکا کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔

دیوان نے گول مہاراج کو طلب کر لیا۔ گول

جگہ چلا گیا۔ رولوکا کا دماغی رابطہ طوطے سے تھا۔ طوطا پنجرے کے دروازے سے باہر آیا اور پنجرے کے اوپر بیٹھ گیا اور خود بخود بولا۔

”دیوان تیرے ارد گرد یہ لوگ جو جمع ہیں تیرے وفادار نہیں ہیں، سب تیری آڑ میں اپنا الو سیدھا کر رہے ہیں۔ تیری بیٹیوں اور عورتوں کے ساتھ ان کے تعلقات ہیں اور تو ان کو اپنا وفادار سمجھتا ہے، میں خاموش تھا اس لیے کہ بولتا تو مارا جاتا، اب مجھے ڈر نہیں، میں آزاد ہوں۔“

اور طوطا تیری سے اڑتا ہوا دیوان خانے سے باہر چلا گیا۔

دیوان کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ ایک حواری آگے بڑھا اور بولا۔

”ارے سرکار یہ سب جھوٹ ہے طوطا جھوٹا تھا۔“

”نہیں وہ اتنا جھوٹا بھی نہیں تھا کچھ سچائی اس میں مجھے نظر آئی ہے۔“ سب نے اس کو جھوٹا قرار دے دیا۔

پھر دیوان رولوکا کے پاس اٹھ کر خود گیا اور بولا۔

”تو نے طوطے کو بلوایا تھا مجھے تیری کارستانی لگتی ہے۔ کیا بات ہے۔“

”میرا کام صرف اتنا تھا کہ اس کی زبان کھلوادوں وہ کیا بولے گا مجھے کیا پتہ اس نے جھوٹ کہا کہ سچ میں کیا جانو طوطا تمہارا تھا تمہارے گھر میں رہتا تھا۔ اس نے جو دیکھا بیان کر دیا۔“ رولوکا نے کہا۔

”تو مجھے نہیں جانتا میں اس ریاست پر حکم چلاتا ہوں، میرا کیا قانون ہوتا ہے، راجہ بھی میرے خلاف نہیں جاتا یہ سب مجھے ایسے ہی نہیں ملا ہے میں تجھے کچھ کچھ جان گیا ہوں۔ طوطے کی زبان میں تیری زبان نمی تو نے جو کہا اس نے کہہ دیا۔“ دیوان بولا۔

”اپنی کمزوری تو میرے سر پر مت رکھ دیوان۔“

رولوکا بولا۔

”تم ضرور کوئی ایسا علم جانتے ہو جو جانوروں پر چلتا ہے۔“ دیوان بولا۔

”علم جانتا برا نہیں ہے، اس کا استعمال برا اور اچھا ہوتا ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

مہاراج قریب کے ایک مندر میں رہتے تھے اور دیوان کے خاص آدمی تھے۔ دیوان ان کا بہت خیال کرتا تھا اور گوگل مہاراج اس کے کام آتے تھے۔

دیوان نے آج کا سارا ماجرہ گوگل کے روبرو بیان کر دیا۔ گوگل مہاراج پوری بات سن کر بولے۔

”آدمی تو کام کا لاگے ہے، قابو کرنا پڑے گا۔“ گوگل نے جواب دیا۔

”ہو جاوے گا قابو۔“ دیوان نے پوچھا۔
”ارے راضی سے نہ ہووے گا تو غیر راضی سے کریں گے۔“ گوگل بولا۔

”یہ بتاؤ جانوروں سے بات کرنے کا کوئی منتر ہووے ہے۔“ دیوان بولا۔

”یہ تو سمندر ہے ایک اور دھوڑی ہے۔“ گوگل بولا۔
”تو میرا خیال ٹھیک لکھا اس نے ضرور طوطے سے اپنی بات کہلوائی ہے۔“ دیوان بولا۔

”ای کام بہت مشکل ہے۔ وہ کر سکے ہے تو اس سے بڑھیا بات اور کیا ہوگی تیرے قابو ایک بہت بڑی شکتی آ جاوے گی، پراوکا راضی کرنا ضروری ہے۔ جبر دیتی ہے کام بگڑ جاوے گا۔ ایسا اپائے کرنا پڑے گا کہ وہ تیرے کہے سے کرے گا۔“ گوگل بولا۔

”گرو تم ہی بتاؤ کا کرنا ہوگا۔“ دیوان بولا۔

”سویرے تم خود اوکا عزت کے ساتھ میرے پاس لے آؤ اور اپنی غلطی کی معافی مانگ لو۔ تم دیوان ہوا کیلے میں یہ کر لو یاد رکھو کبھی کبھی لڑائی کے میدان میں فوجیں پیچھے بھی کرنا پڑتی ہیں۔ وقت پڑے یہ ہونچھ نیچے بھی کرنا پڑتی ہے۔ سمجھ لو تم پر ایسا ہی وقت آن پڑا ہے۔ اگر اکڑے رہو گے تو بہت مشکل ہو جاوے گی۔ مرنے تو وہ ہماری پتھر لاگے ہے۔“

گوگل نے دیوان کو پٹی پڑھا لی۔

دیوان کو پہلے تو غصہ آیا مگر پھر اس کی سمجھ میں گرو کی بات آ گئی۔ سویرے دیوان خود روکاک کے پاس گیا اور بولا۔
”بڑی بھول ہوگئی مہاراج، آدمی ہوں غلطیاں

ہو جاتی ہیں۔ معاف کر دو۔“

روکاک یہ سن کر مسکرا دیا اور بولا۔ ”تم آدمی ہوشیار ہو، ہر موقعہ پر چال بدل لیتے ہو۔ مگر ضروری نہیں کہ بولی ہوئی چال درست ہو۔“

”نہیں، میں نے بعد میں غور کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں ہی غلط تھا۔ مجھے آپ کی شکتی کو مان لینا چاہئے تھا۔“ دیوان بولا۔

”پھر مانے لیتا ہوں۔“ روکاک بولا۔

”گرو نے بلایا ہے۔“ دیوان بولا۔

”تو چلو میں تیار ہوں۔“ روکاک نے جواب دیا۔

گوگل نے اس کے آنے سے پہلے ہی کمرے کی بندش کر دی تھی، اس کے بیروں طرف موجود تھے۔

روکاک کمرے میں آیا اور آتے ہی اس کو اندازہ ہو گیا کہ اس کے لیے جال ڈال دیا گیا ہے، گوگل نے اس کے آتے ہی بڑے نرم لہجے میں کہا۔

”آؤ آؤ لو دیکھو ایسا مہاراج ہمارے سامنے ہے اور ہم اس کو نہ پہچان سکے۔“ روکاک نے پوچھا۔ ”کہاں ہے وہ مہاراج؟“

”ارے مہاراج اب ایسا بھی اندھا ہم کو نہ جانیں کچھ دور قریب ہم کو بھی نظر آتا ہے۔“ گوگل نے حسب معمول نرم آواز میں کہا۔

”اگر تمہارا اشارہ میری طرف ہے تو تم غلطی پر ہو۔“ روکاک بولا۔

”جناوروں سے بات کرنا کوئی معمولی بات ہے۔“ گوگل بولا۔

”میں نے کب ان سے بات کی ہے۔“ روکاک بولا۔
”نہیں کی تو طوطا کیسے بولا جو تم نے بلوایا۔“ گوگل نے کہا۔

”طوطا اپنی مرضی سے بولا تھا، میرا اس میں کیا دخل تھا۔“ روکاک نے کہا۔

”میں جانتا ہوں تم مانو گے نہیں، پر یہ سمجھ لو کہ آگے دیوان کی کرسی کی شکتی ہے اور پیچھے میری شکتی کھڑی اور دو

”گورو میں نے سدا تمہاری خدمت کری ہے اور تم اس مشکل گھڑی میں میرا ساتھ چھوڑ رہے ہو کتنے شرم کی بات ہے۔“ دیوان بولا۔

”بات تو شرم کی ضرور ہے۔ میں شرمندہ بھی بہت ہوں۔ پرتو خالی بندوق تلاشی سے بدتر ہے۔ میرے کار توس کی پیٹی میں راکھ بھری ہے میں اکیلا کھڑا ہوں، کوئی بھی مجھے دوچھڑ مار کر رہنسا سکتا ہے۔ میں تیرا ساتھ کیا دوں۔ تیرے پاس کرسی کی طاقت تو ہے مگر یہ بات یاد رکھنا تیری کرسی کی طاقت تیرے کام نہیں آئے گی۔ نہ مانے تو آزما کے دیکھ لے۔“ یہ کہہ کر گوگل جانے کو کھڑا ہو گیا تو دیوان بولا۔ ”میرے پاس تو رہو کچھ تو ڈھارس بندھی رہے گی، اکیلا تو مت چھوڑو۔“

”تو کسی بات کرتا ہے، میرے دور دور میری مدد کو کوئی نہیں ہے۔ میری ٹھنکی کہاں چلی گئی میں پورا کا پورا کورا کاغذ ہوں، میں تجھ سے اس کارن دور رہنا چاہتا ہوں۔ ذرا سی چنگاری مجھے جلا ڈالے گی تو قریب ہوا تو تو بھی لپیٹ میں آ جائے گا۔ تو جس طرح بھی اپنا بچاؤ کر سکتا ہے کر لے، تیرے پاس عمر کا تجربہ ہے۔ اونچ کوچ بھتا ہے۔“ گوگل تیزی کے ساتھ دروازے سے نکل گیا۔ رولوکا کے کسی کارندے نے اس کو نہیں رولوکا، رولوکا بھی دروازے سے باہر آ گیا اور گل کے اس حصہ کی طرف چلا جہاں عورتیں رہا کرتی تھیں۔ حویلی کا یہ حصہ بہت خوبصورت بنا ہوا تھا۔ اس خوبصورتی میں نیلی پٹی اڈھی گلابی ساڑھیوں اور بلاؤز نے اور رنگ بھر دیے، پوری حویلی میں ایک عورت بھی بوڑھی یا بد صورت نہیں تھی۔ دیوان کی حویلی صرف نو جوان اور حسین عورتوں کے لیے تھی۔ بے شمار کمرے ان کے لیے سجے ہوئے تھے۔ ہانڈیاں مسکرائی دوڑ دوڑ کر کام کر رہی تھیں، ان کے رنگ برنگے آجیل ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس علاقے میں ایک مرد بھی نہیں تھا۔ دروازے پر بھی خوبصورت تھے۔ واہ دیوان دوسروں کے مال پر قبضہ اور پھر ایسی پابندی کہ وہ کوئی مرد دیکھ ہی نہ سکے۔ سارے حقوق دیوان کے نام رہا اندرون بھی کہا راج کیا ہوگا یہ دیوان تو اس سے بھی بڑھ گیا۔ رولوکا

طرف بہت اونچی دیوار ہے۔ سچ بات اٹھوانے کا طریقہ مجھے آتا ہے۔“ گوگل کا لہجہ بدل رہا تھا۔

”بہت اچھا بندوبست تم نے کر رکھا ہے تم اور زیادہ بندوبست کرو، ابھی تم نے بہت کم کیا ہے۔ جب پورا انتظام کر لو تو پھر بلا لینا میں بھاگ نہیں رہا ہوں۔“ اور رولوکا بڑے سکون سے چلتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ اس کے بیرون کھڑے رہے، کوئی قریب نہیں آیا، باہر آتے ہی وہ روپوشی اختیار کر گیا اور پلیٹ کر دوبارہ دیوان کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اب اس کو نہ دیوان دیکھ سکتا تھا اور نہ گوگل، گوگل حیرت سے کہہ رہا تھا۔

”بہت گڑبڑ ہے دیوان جی، میں نے تو سارے دروازے بند کر دیے تھے اور وہ کتنی آسانی سے نکل گیا یہ کچھ اور ہی چیز ہے، میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ ”گورو کچھ تو کرنا ہوگا یہ تو مصیبت کھڑی کر دے گا۔“ دیوان بولا۔

”اس کارن تو میں نے اس کو عزت دینے کی چال چلی تھی۔ مگر وہ تو کچھ اور ہی لاگے ہے۔ میری بدی تو بے کار ہے، میری ٹھنکی اس کے دھورے نہیں جاوے ہے، میرے بیرو کی صورت سے ڈرتے ہیں، بتا میں کا کروں، بس اب تو ایک ہی بات سمجھ میں آوے ہے۔“ گوگل نے کہا تو دیوان جلدی سے بولا۔ ”کابات گورو.....“

”او کے چرنوں میں گرجاؤں اور معافی مانگ لوں۔“ گوگل نے کہا۔

”ارے کا کہہ رہے ہو گورو، بنی بنائی خاک ہو جاوے گی۔“ دیوان بولا۔

”تو ان باتوں کو نہیں جانے گا میں اس لائن کا آدمی ہوں، میں سمجھ رہا ہوں میں نے پہلے ہی کہا تھا، یہ بہت بھاری پتھر ہے۔“ گوگل بولا۔

”ارے پر یہ بھاری پتھر میرے سر پر کیوں آن پڑا ہے۔ یہ تو پتہ چلے۔“ دیوان بولا۔

”یہ پتہ کرنا تیرا کام ہے میں تیرے کام نہیں آ سکتا۔“ گوگل نے کہا۔

واپس اس کمرے میں آ گیا، جس میں اس کو قید کیا گیا تھا۔

رات کے کھانے کا وقت ہوا تو دیوان خود نئے آدمیوں کے ساتھ کھانا لے کر رولو کا، کے پاس آ گیا اور بولا۔ ”آپ کے بھوجن کا وقت ہو گیا ہے مہاراج۔“

”میرے بھوجن کا خیال تم کو اتنا کیوں ہے۔“ رولو کا نے پوچھا۔

”آپ میری چھت کے نیچے ہیں، میرے مہمان تو ہوئے، خیال بھی مجھے ہی ہوگا۔“ دیوان بولا۔

”مگر میں بن بلایا ہوں۔ اس لیے مہمان ہرگز نہیں ہوں، دوسری بات یہ کہ تمہارا کھانا اس قابل نہیں کہ میں اس کو کھاؤں۔“ رولو کا بولا۔

”کیا خرابی ہے اس میں میرے دوست۔“

”سارے رشتے قائم کرلو، مہمان کا رشتہ دوستی کا رشتہ اور بھی کوئی باقی ہو تو وہ بھی قائم کرلو۔ مگر تمہارے سارے پیتترے بے کار ہیں تمہارے گورو نے تم سے منہ پھیر لیا ہے۔ اقتدار کی کرسی تم سے دور ہونے والی ہے۔ تمہاری محل نما حویلی میں سینکڑوں عورتیں تمہارے تصرف میں ہیں، تم نے ان کو کوسنے کے بجائے میں ان کی مرضی کے خلاف قید کر رکھا ہے۔“

تم غریبوں کے خون پسینے کی کمانی اپنی عیاشیوں پر خرچ کرتے ہو، تم نے اس ریاست کے غریب کسان اور مزدوروں کے بارے میں کبھی نہیں سوچا، تم نے ان کی ہر چیز چھین لی، تم نے ان کی عورتوں اور لڑکیوں کو نہیں چھوڑا۔ اب تم مجھ سے نئے نئے رشتے قائم کر رہے ہو، اس لیے کہ تم کو اپنا سنگھاس ڈونٹا نظر آ رہا ہے، کرسی ٹوٹ رہی ہے تو کہتا ہے کیا خرابی ہے۔ اس کھانے میں ذرا غور سے دیکھ کتنی لڑکیوں اور عورتوں کی آہ وزاری نظر آئے گی۔ غریبوں پر ظلم تجھے نظر آ جائیں گے۔“ رولو کا نے بات ختم کی تو وہ دوڑ کر اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”مہاراج میں نے اب تک بہت برا کیا ہے۔ پر اب میرے منہ پر ٹھوک پڑی ہے۔ مجھے ہوش آ گیا ہے۔ تم حکم کرو میں وہی کروں گا۔“ دیوان بولا۔

”نہیں تو ہرگز نہیں کرے گا تیرے اندر اب تک میل بھرا ہے، چل اٹھ اور جو کرنا ہے وہ کر، اس جگہ تیری چھت کے نیچے موجود ہوں۔“

دیوان خاموشی سے ہاتھ ملتا اٹھا اور چلا گیا، اس کے ساتھ آئے آدی بھی چلے گئے۔

دیوان کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ آخر اس نے ایک فیصلہ کیا اور اس پر عمل کر ڈالا، کئی مضبوط آدی تیار تھے اور ان کو رولو کا کے کمرے کی طرف روانہ کر دیا تاکہ رات کی خاموشی میں اس کا کام تمام کر دیں، مگر انسان پر جب دیوانگی سوار ہو تو وہ ایسی بودی حرکتیں کرتا ہے، اس نے ذرا نہیں سوچا کہ گوکل کے بیڑ جہاں پر کچھ نہ کر سکے وہاں اس کے یہ چند آدی کیا کر سکیں گے۔

رولو کا نے ان آدمیوں کا کچھ نقصان نہیں کیا مگر وہ ڈر کر ایسے بھاگے کہ پلٹ کر دیوان کے پاس بھی نہیں گئے۔ دیوان کی عقل جواب دے گئی تھی۔ وہ ایسی حرکتیں کرتا رہا، رولو کا نے اس کے خلاف کچھ نہیں کیا، اس کو کرنے دیا۔ دیوان اس طرح ذہنی طور پر سخت پریشان ہو گیا اور اس نے ہار کر اپنی پریشانی راجہ کے حضور بیان کر دی۔ دیوان کی پریشانی راجہ کی پریشانی تھی۔

راجہ تو پھر راجہ تھا، اس نے ٹکڑے جو انوں کو رولو کا کے پاس بھیج دیا، گرفتار کرنے مگر ہوا یہ کہ وہ سارے جوان ایسے بھاگے کہ اسٹیٹ ہی چھوڑ گئے۔

پھر ایک کوشش کی گئی مگر اس کا بھی حشر وہی ہوا۔ رولو کا ان سے یہ آٹھ بچوں اس لیے کھیل رہا تھا کہ ان کو یہ اندازہ نہ کر دے کہ تم اقتدار میں ہو، طاقت تمہارے پاس ہے، مگر پھر بھی تم بے بس ہو تم کو اندازہ ہو کہ بے بسی کیا چیز ہوتی ہے۔

راجہ اور دیوان ہر جتن کرتے رہے، مگر رولو کا ان کے قریب رہا ان کے بس میں نہیں رہا، ان کی ہر چال ان پر ہی الٹ گئی۔

دیوان کی حویلی اجڑنے لگی۔ دیوان کی توجہ کم ہو گئی۔ ایک رات رولو کا اس کے کمرے میں چلا گیا، وہ

اکیلا بڑے سے بچک پر پڑا تھا۔ وہ سو نہیں رہا، آنکھیں چمکت پر لگی تھیں۔

رولوکا نے کہا۔ ”اوپر کیا دیکھ رہا ہے، ابھی تیرا اوپر کا بلاؤ نہیں آیا ہے۔“ دیوان چونک پڑا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”میرا پچھا چھوڑ دے، میں تجھ سے ہار گیا ہوں۔“ دیوان نے کہا۔

”مگر تیرے اندر کی کالک ختم نہیں ہوئی، موقع ملے ہی تو پھر دہری کرے گا جو کرتا رہا ہے۔“

”میں نہیں کروں گا۔“ دیوان بولا۔

”میں تیرے پاس اتنے دن صرف اس لیے رکا ہوں کہ تیرے اندر کی کالک کو ختم کروں، ورنہ فیصلہ تو ایک منٹ میں ہو سکتا تھا۔ انسان کے مرنے سے دنیا کی سیاہی ختم نہیں ہوتی، اس کو صاف کرنا پڑتا ہے۔ تیرا دل صاف ہوگا تو تیری پریشانیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی تو اور غور کر لے اور جو عورتیں تیری حویلی میں پڑی ہیں وہ اب تیرے لیے بے کار ہیں، کیونکہ تو بوڑھا ہو چکا ہے۔ کوئی حکیم ڈاکٹر تجھے جوان نہیں کر سکتا۔ اس لیے تیرے لیے عورتیں بے کار ہیں تو خود ان کو ان کے گھر بھیج دے۔ اگر نہیں بھیجے گا تو یہ کام مجھے کرنا پڑے گا۔“ رولوکا نے کہا۔

دیوان نے اپنے بارے میں ہر خبر رولوکا کے منہ سے سنی اور اس کو یقین سا آنے لگا، کیونکہ اس کو اپنی حالت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس نے گردن ڈال دی اور بولا۔

”میں سب کو پہچانوں گا۔ مجھے معافی دے دے۔“

”ابھی اور بھی کام ہیں، سب کرنا ہوں گے۔“

رولوکا بولا۔

”میں وہ سب کرنے کو تیار ہوں تم حکم کرو۔“ دیوان بولا۔

”ریاست میں جو اندھا قانون تم نے اور راجہ نے نافذ کیا ہوا ہے اس کو ختم کرنا ہوگا۔ حق دار کو حق دینا ہوگا۔“

رولوکا نے کہا۔

”میرے کرنے کے کام میں کروں گا۔ مگر راجہ کے کام میں میرا دخل نہیں ہوگا۔ وہ راجہ ہے میں اس کو حکم نہیں

دے سکتا۔“ دیوان بولا۔

”تو اپنے کام کر راجہ کے کام راجہ کرے گا۔“ رولوکا نے کہا۔

رولوکا راجہ کے محل کی طرف چل پڑا۔ اندر جانے کو اس نے روپوشی اختیار کی اور راجہ کے خاص محل میں وہ ظاہر ہو گیا۔

یہ راجہ کا انتہائی خاص کمرہ تھا۔ راجہ کے ساتھ ایک نوجوان عورت تھی۔ ایسے مقامات پر رولوکا جایا نہیں کرتا تھا، مگر اب زیادہ انتظار وہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے جاتے ہی کہا۔

”اس عورت کو روانہ کر دے۔“ راجہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور غصہ بھری آواز میں بولا۔

”تو کون ہے اور اس طرح اندر کیسے آیا۔“ پھر سے دار کیا مر گئے سب۔۔۔۔۔“

”کوئی نہیں مرا سب اپنی جگہ موجود ہیں۔“ رولوکا نے کہا۔

”تو پھر تو اندر کس طرح آیا۔“ راجہ بولا۔

”تو اس پر اپنا دماغ مت کھپا یہ بات تیری سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ وقت تیرے پاس کم ہے اور کام زیادہ ہے۔ میری بات دھیان سے سن تو نے اور تیرے حواریوں نے جواب تک رعایا کے ساتھ اندھیر گردی روا رکھی ہے اس کو ختم کرنا ہوگا ہر آدمی کے ساتھ انصاف کرنا ہوگا۔ حق دار کو اس کا حق دینا ہوگا۔ تم نے اور دیوان نے سینکڑوں عورتوں اور لڑکیوں کی عزت لوٹی ہے۔ ان کے خاندان کو برباد کیا ہے۔ ان سب کا خیال کرنا ہوگا۔ اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو میں تجھے ایسی سزا دوں گا کہ تو موت کے لیے بھی ترس جائے گا۔“ رولوکا نے بات ختم کی۔

”ارے تو کون ہے لاٹ گورنر کہ تیرا حکم مجھ پر چلے گا۔ میں اس ریاست کا مالک و مختار ہوں، جو من کرے گا کروں گا۔“ راجہ بکڑ بولا۔

”تیرا من کبھی ایسے کام کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔“

رولوکا بولا۔

”میں راجہ ہوں کوئی گھسیارہ نہیں ہوں۔“

☆ ☆ ☆ (79) ☆ ☆ ☆

”متر تیری سوچ ایک گھسیارے سے بھی بدتر ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

راجہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی وہ دوڑ کر دروازے تک گیا، مگر دروازے کے باہر دور دور تک کوئی نہیں تھا، اس نے کئی آوازیں پہرے داروں کو بلانے کو دیں، مگر کوئی اس کے قریب نہ آیا، وہ حیران ہوتا ہوا پھر کمرے میں آ گیا۔

”کہاں ہیں تیرے پہرے دار؟“ رولوکا بولا۔
”تو نے ضرور کوئی بہت بڑی سازش میرے خلاف کی ہے۔“ راجہ بولا۔

”ہاں بہت بڑی سازش اتنی بڑی کہ تو جنگل میں بکریاں چرائے گا اور گھاس کاٹے گا۔ تیرا اقتدار تیرے ہاتھ سے گیا، تو نے خود اس کو برباد کر دیا۔“ رولوکا بولا۔
”ارے کیا پاگل ہوا ہے، میں راجہ ہوں۔“ وہ بولا۔
”زور سے بول میں راجہ ہوں۔“ راجہ نے زور سے کہا۔

”میں راجہ ہوں۔“
پھر رولوکا نے حکم دیا۔ ”بول میں گھسیارہ ہوں۔“
راجہ بولا۔ ”میں کھس..... کھس..... یا رہوں، ہاں میں گھسیارہ ہوں۔“

وہ بار بار بار بار بیکی کہتا رہا اس نے اپنے کپڑے پھاڑ دیے اور محل سے بھاگتا ہوا باہر آ گیا۔ اس کو محل سے باہر جانے پر کسی نے نہیں روکا۔ وہ سڑک پر دوڑتا رہا اور کہتا رہا۔

”میں گھسیارہ ہوں۔“ اس نے کپڑے تار تار کر دیئے، لوگ حیرت سے اس کو دیکھتے رہے۔ کچھ لوگ جو اس کو شکل سے پہچانتے تھے۔ انہوں نے کان پکڑ لیے ایک بولا۔

”ارے یہ تو راجہ ہے، لگتا ہے اس کا دماغ پھر گیا ہے۔“

دوسرا بولا۔ ”ارے ہزاروں کی بددعائی ہے اس نے، یہ تو ہونا تھا۔“

ہر ایک اپنی اپنی رائے دینے لگا اور راجہ دوڑتا رہا، آبادی سے دور کھیتوں میں بھی وہ یہی کہتا دوڑتا رہا اور پھر وہ جنگلوں کی طرف نکل گیا۔

کچھ ہی دیر میں یہ خبر پوری ریاست شہر میں پھیل گئی۔ دیوان کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ دوڑ کر رولوکا کے پاس آیا اور بولا۔ ”رحم کرو مہاراج راجہ پاگل ہو گیا۔“
”جو لوگ اس کے ساتھی تھے وہ سب پاگل ہوں گے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”نہیں مہاراج ایسا نہ کرنا، آپ حکم کرو میں وہی کروں گا۔“ دیوان بولا۔

”میں بار بار نہیں کہتا تھیے جو کرنا ہے وہ میں کہہ چکا ہوں۔“ رولوکا بولا۔

”یہ کام شروع کر دے اور یہ مت سمجھنا کہ میں نہیں ہوں، میں ہر وقت تیرے سر پر موجود ہوں، ذرا سی غلطی تیرا دماغ بھی الٹ سکتی ہے۔ ہر عورت کو عزت اور احترام کے ساتھ اس کے گھر پہنچا دے، اس کے نقصانات پورے کر، تیری حویلی اور محل میں ایک عورت بھی فالتو نہ رہے اور جن جن حواریوں اور تیرے چیلوں نے دوسروں کا مال دبا یا ہے سب ان کو واپس کر دے۔ اس کام کے لیے تیرے پاس صرف آج اور کل کا دن ہے۔ چل بھاگ جا۔“

دیوان دوڑتا ہوا کمرے سے نکلا اور نئے نئے احکامات صادر کرنے لگا۔ ریاست کی تاریخ میں جو نہیں ہوا تھا وہ ہونے لگا، راجہ کے پاگل ہوتے ہی رعایا کے گھروں میں خوشیاں آنے لگیں۔ کسانوں کو ان کی زمین اور مکان مل گئے۔ چھتری لڑکیاں اور عورتیں گھروں کو آ گئیں۔

جب منگل اور جاگکی ملے تو وہ منظر بڑا رقت آمیز تھا۔ دونوں لپٹ کر روتے رہے اور دونوں نے رولوکا کے آگے جھک کر شکر یہ ادا کیا۔

ریاست کے قوانین میں انصاف نظر آنے لگا۔ بے ایمانی رشوت خور اہل کار ایماندار ہو گئے۔ کیونکہ دیوان کے سر پر تلوار لٹک رہی تھی۔ اس کی ایمانداری یا مجبوری نے سب کو سیدھا کر دیا۔

زبان پوربی ہے اور لوگ زیادہ تر کاشت کار ہیں۔ یہاں پر ایک بہت بڑے زمین دار بشیر خان تھے۔ ان کے بزرگوں نے انگریزوں کی بہت خدمت کی۔ لہذا انگریزوں نے ان کو خوب نوازا، بہت بڑی زمینداری ان کے پاس آئی، آس پاس کے سارے گاؤں ان کے تھے۔

ان گاؤں میں ہندو مسلمان سب ہی آباد ہیں۔ بشیر خان کا سلوک ان سب کے ساتھ ایک جیسا تھا۔ ان کے کارندے گاؤں گاؤں پھرتے رہتے اور زمیندار کے لیے وصولی کرتے۔ بشیر خان کسی پر زبردستی نہیں کرتے، کسی پر ظلم نہیں کرتے، سب کے ساتھ وہ انصاف کرتے۔ کسی کارندے کو انہوں نے آزاد نہیں چھوڑا۔ سب پر سخت نگاہ رکھتے۔ سارے کسان اور ہاری بشیر خان سے خوش تھے، اس لیے کہ وہ ان کی خوشی کا خیال کرتے۔

ان کی حویلی میں روز پچھری لگتی، وہاں پر سب کو بولنے کی اجازت ہوتی، سب کی سنی جانی، بشیر خان کے کان میں کسی کارندے کی کوئی زیادتی آجائے تو اس کو وہ فوراً سزا دیتے۔ ان کے نزدیک اہم بات تھی کہ اصل کسان ہے جو زمین پر محنت کرتا ہے۔ اس کا حق سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگر وہ زمین پر محنت نہ کرے تو زمیندار کو بھی کچھ نہیں ملے گا۔

بشیر خان کے زمانے میں کسی غریب کو زمیندار سے شکایت نہ ہوئی۔ مگر ان کی موت کے بعد ان کے بیٹے کفیل خان کے ہاتھ جب زمینداری آئی تو اس کے رنگ بدل گئے۔ باپ کے زمانے کی ریت رواج ختم ہونے لگے۔ ہر روز جو پچھری بشیر خان لگاتے تھے وہ کفیل کو بے کار اور فضول نظر آنے لگی۔ وہ بھی اس پچھری میں شریک نہ ہوا۔ جب سننے والا ہی نہ ہو تو کسان اور غریب آدمی اپنی بات کس کو سنائے۔ لوگوں نے آنا چھوڑ دیا اور پھر یہ سلسلہ ہی ختم ہو گیا۔ کارندے بے لگام ہو گئے تھے۔ وہ دو کام زمیندار کے فائدے کے لیے کرتے تھے تو چار اپنے فائدے کے کرنے لگے۔ ان کی فریاد زمیندار تک جاتی نہیں پاتی تھی۔

رولو کا اس کے ارد گرد رہا سب کام دیوان نے کئے، ایک مہینہ میں ریاست کی حالت بدل گئی۔ راجہ کو جنگلوں میں تلاش کیا گیا۔ مگر اس کا پتہ نہ چلا۔ دیوان نے اس کے مرنے کا اعلان نہیں کیا۔ اس کے کم سن لڑکے کو گدی پر بٹھا دیا، مگر سب کام اس نے اپنے پاس ہی رکھے۔

پھر اس کو اندازہ ہونے لگا کہ وہ اب درست سمت میں جا رہا ہے۔ پہلے وہ غلط راستے پر تھا۔ رولو کا کابی مقصد تھا۔ آدمی کو اگر خود اچھا کی برائی میں فرق نظر آ جائے تو پھر وہ نادانی نہیں کرتا۔ اب دیوان سے برائی کی طرف جانے کی امید نہیں تھی۔

رولو کا نے واپسی کا ارادہ کیا اور دیوان سے کہا۔ ”تم نے اس نئے سفر میں کیا محسوس کیا، تم پہلے ٹھیک تھے کہ اب بتاؤ۔“

”مہاراج آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں، میں تو اندھا تھا، اب نظر آ رہا ہے۔“ دیوان بولا۔ ”اب بھی میں تمہارے سر پر ہوں، غلطی نہ کرنا۔“ اور رولو کا روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

کچھ لوگ کہتے ہیں وقت بڑا بے رحم ہوتا ہے۔ وہ کسی کو نہیں بخشا۔ بڑے بڑوں کو اس نے ختم کر دیا۔ سو سال پرانے نامی گرامی لوگوں کو بھی آج کوئی نہیں جانتا۔

انسان خود پر غور نہیں کرتا۔ وہ وقت کو اپنا غلام بناتا ہے، اپنے عروج کے وقت اس کو کبھی زوال کا خیال نہیں آتا۔ وہ زمین پر خود کو خدا سمجھ لیتا ہے اور اس کی طرح احکامات صادر کرتا ہے، مگر اس وقت وہ ذرا بھی اپنی حقیقت پر غور کرے تو بہت ساری خرابیاں خود بخود اس کی ذات سے نکل جائیں۔ ایک نہیں ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ اقتدار کی کرسی پر لوگوں نے غور نہیں کیا، طاقت اور دولت نے ان کو نہیں بھٹکایا۔ مگر اس سے کئی گنا زیادہ وہ لوگ نظر آتے ہیں جو راہ سے بھٹک گئے اور پھر ان کا انجام بھی اچھا نہ ہوا۔ ہمالیہ ترزائی میں بہت سے شہر دیہات ہیں۔ سلطان پور بھی ایک بہت اچھا چھوٹا سا شہر ہے۔ یہاں کی

”حضور ہم تو اپنے جانے بڑھیا ہی کریں ہیں۔“
کالے خان بولے۔

”ذرا دیکھ بھال کر ہاتھ ڈالو سنا ہے یہاں کی
عورت بڑی مردار ہوتی ہے۔“ کفیل بولے۔

”آپ نے سنا ہے تو ٹھیک سنا ہوگا۔ پر ہم بھی
اناڑی نا ہی ہیں۔“ کالے خان نے کہا۔

مگر کالے خان اناڑی پن کر بیٹھے، رات میں وہ
ایک گھر میں گئے تو گھر والوں نے ان کی ایسی حجامت کری
کہ پورے علاقے میں شور مچ گیا۔

کفیل نے فوراً اپنا پہلو پچالیا اور ساری بات کالے خان
پر آگئی اور کالے خان بری طرح پھنس گئے۔ کفیل نے فوراً اپنا
فیصلہ سنا ڈالا اور کالے خان کو نوکری سے الگ کر دیا اور اپنی
زمینداری سے بھی بے دخل کر دیا۔ ان کے اس فیصلے کی سب
نے تعریف کی۔ اس واقعہ کے بعد کفیل ذرا محتاط ہو گئے۔

رادھا کشن گول گاؤں کے تھے۔ بڑے چلنے پرزہ
تھے۔ ان کا آنا جانا زمیندار کی حویلی میں تھا۔ آدمی تیز
تھے، چرب زبان بھی تھے۔ ان کی تین جوان لڑکیاں بھی
تھیں۔ کالے خان کے بعد وہ کفیل کے ساتھ لگ گئے۔
ایک نمبر کے خوشامدی تو وہ تھے ہی۔ کفیل کے دل میں بھی
گول گاؤں کے لیے ایک پھانس لگی تھی۔

رادھا کشن بھی زمیندار کی کمزوری جان گئے تھے۔
مگر زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ مگر اپنی تینوں توپوں
کو بھر کر ان کا رخ حویلی کی طرف ضرور کر دیا تھا۔ کہ کب
ذرا اشارہ ملے اور وہ داغ دیں۔

رادھا کشن ذرا بے تکلف ہوئے تو ایک دن دہلی
زبان سے کہا۔ ”سرکار، گول گاؤں کی ہر چیز بڑھیا ہے۔“
”ارے تو تم نے کون سی چیز چکھائی ہے۔“ کفیل
بولے۔

”ارے حضور اس میں کون سی مشکل ہے جب
کہو۔“ رادھا کشن بولے۔

”کالے خان نے بھی کیا تھا اب تم کرو گے ویا
ہی۔“ کفیل بولے۔

کفیل خاں خود شتر بے مہا تھے، ان کا جدھر منہ اٹھتا
چل پڑتے۔ ان کے ساتھ جو لوگ تھے۔ وہ بھی اچھے کردار
کے نہ تھے۔ ان کی بدنامی دن بدن بڑھ رہی تھی۔ مگر کہتا
کون سب ڈرتے تھے۔
کفیل خاں جس گاؤں میں جاتے ان کی عیاشی کا
بندوبست ان کے حواری کر دیتے۔

گول گاؤں ایک بڑا گاؤں تھا۔ اس کو گول گاؤں
اس لیے کہتے تھے کہ اس کے چاروں طرف ایک بہت
بڑی نہر تھی، پانی بے حد اور ہریالی چاروں طرف تھی اور یہ
گول آباد تھا۔

اس گاؤں کی آمدنی سب سے زیادہ تھی۔ یہاں کی
زمین بے حد زرخیز تھی۔ اور کسان بھی خوشحال تھے۔ بشیر
خان یہاں کے لوگوں کا خاص خیال کرتے تھے۔
گاؤں کے ہر طرف کھیتی تھی، تالاب تھے اور ہر گھر
میں جانور تھے۔ دودھ گھی کی فراوانی تھی اور گاؤں کے لوگ
صحّت مند تھے۔

گول گاؤں کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں کے
مرد کے مقابلے میں عورت زیادہ قوی اور خوبصورت ہوتی
ہے۔ ان کے قد لمبے اور جسم توانا ہوتے ہیں۔ بارہ سال کی
لڑکی بھر پور عورت نظر آتی ہے اور کسی بھی مرد کے مقابلے
پر کام کر سکتی ہے۔ کھیتی باڑی کے کاموں میں وہ اپنے
مردوں کا پورا ساتھ دیتی ہے۔ اس گاؤں کے آگے جنگل کا
علاقہ ہے اور دور دور دوسرا گاؤں نہیں ہے۔ مسلمان اور
ہندو دونوں کی آبادی ہے، مگر دونوں مل جل کر رہتے ہیں۔

یہ بڑا خوبصورت گاؤں ہے۔ زمینداری کفیل خان
کی ہے۔ کالے خان ان کے حواری ہر سفر میں ان کے
ساتھ ہوتے ہیں کفیل کو بگاڑنے میں ان کا پورا پورا ہاتھ
تھا۔ کالے خان بذات خود ایک نمبر کے عیاش، زمیندار کی
آڑ میں وہ اپنا کام بھی کر لیا کرتے تھے۔

”آج ہم ایسا بندوبست کئے ہیں کہ طبیعت خوش
ہو جاوے گی۔“ کالے خان بولے۔
”تو ہر دفعہ ایسا ہی بولے ہے۔“ کفیل بولے۔

”کالے خان گول گاؤں کے تابی تھے۔ ہم تو ہیں۔“ رادھا کش بولے۔
 ”چلو ٹھیک ہے تم کا بھی دیکھ لیں گے۔“ کفیل نے کہا۔

رادھا کشن اپنے پلان کے پہلے مرحلے میں اپنی بڑی بیٹی بھگوت کو لے آئے۔ بھگوت کو پورا پروگرام انہوں نے بتا دیا تھا۔ اس کو ایسا کھیل کھیلتا تھا کہ وہ حویلی میں رہ جائے اور ایسی خدمت زمیندار کی کرے کہ وہ اس کی ہو جائے، اگر کچھ کمی رہ گئی تو پھر دوسری توپ چلائی جائے گی۔

بھگوت باپ کی ساری پلاننگ سے واقف تھی۔ رادھا کشن کے پاس دو بیگھار زمین بھی نہیں تھی۔ بھگوت حویلی میں آگئی اور کفیل کی خدمت کرنے لگی۔ عورت مرد کی کمزوری ہمیشہ سے رہی ہے۔ کفیل تو نئے کھلاڑی تھے اور بھگوت کے پیچھے رادھا کشن کا فریبی دماغ تھا اور وہ ایک پروگرام سے آگے بڑھ رہا تھا۔

رادھا کشن جب بھی آتا اپنی غربت کا رونا روتا، اپنی ضرورت کی بات کسی بھی بہانے ضرور بیان کر جاتا۔ رات کو بھگوت کفیل کے کان میں وہی بات ڈالتی۔

رادھا کشن بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا اور پھر ایک وقت یہ بھی آیا کہ کفیل نے اس کی ضرورت پوچھ لی۔
 ”حضور کا بتائیں گز ارہ نہیں ہوتا۔“ وہ مسکین صورت بنا کر بولا۔

”ایک دو بیگھہ زمین لے لو کام چل جائے گا۔“ کفیل نے پوچھا۔

”حضور وہ گاؤں کے سرے پر آم کی بگھیا آپ کی بے کار پڑی ہے۔ آپ کے لیے تو بے کار ہے۔“

”تو کیا کرے گا اس کا۔“ کفیل نے پوچھا۔

”بس جی کرنا کیا ہے کچھ دال دلیا ہو جاوے گا۔“

اور کفیل نے وہ اچھا بڑا باغ جس کو شاید اس نے کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ رادھا کش کے حوالے کر دیا۔ بھگوت نے اس رات خاص تیاری کر کے کفیل کی خدمت کی اور زمیندار خوش ہو گیا۔

بھگوت کا اثر دوسروں حویلی میں بڑھتا گیا۔ رادھا کشن نے بھگوت کے علاوہ بھی زمیندار کو میوے کھلانا شروع کر دیئے اور اس کے پاس باغ کے علاوہ بھی بہت کچھ آ گیا۔ رادھا کشن نے دوسری توپ داغی اور رکنی حویلی میں آگئی۔ دونوں بہنوں کو باپ کے پروگرام کا پوری طرح اندازہ تھا۔ کفیل کو شادی کرنے سے روکنا بھی اس پروگرام میں شامل تھا۔ کفیل کی چھوٹھی بہن نے کئی دفعہ اس کی شادی کی بات کرنا چاہی مگر کفیل راضی نہ ہوا۔ اس کے دسترخوان پر ہر وقت ایک سے ایک بڑھیا چیز رکھی رہتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ شادی کے بعد یہ سب میوہ جات بیوی کب کھانے دے گی۔ ایک ہی دیگ روز روز، کب تک دل نہیں بھرے گا، رکنی اور بھگوت دونوں اس کی خدمت کو ہر وقت تیار، وہ کب اس کو اتنی مہلت دیتی تھیں کہ وہ کسی اور طرف دیکھے۔ رادھا کشن کے پاس ابھی ایک توپ اور تھی۔

بھگوت پرانی ضرورتی مگر تجربہ کار تھی۔ رکنی بدن کی گول منول تھی، چہرہ بھی گول تھا اور قد بھی بھگوت سے کم تھا، مگر اس نے خود کو بڑا بنا کر رکھا تھا، بھگوت اس سے بڑی تھی اور تیس کے اوپر تھی، مگر نازک بدن تھی اور ناک نقشہ بھی کھڑا تھا۔ اس میں جاذبیت تھی۔ اس صورت حال میں کفیل ان کے بچے میں دبا ہوا تھا۔ حویلی میں آتے ہی وہ سب کچھ بھول جاتا تھا۔ یہ دونوں اس کو کسی اور طرف دھیان ہی کب کرنے دیتی تھیں۔

رادھا کشن کا اثر دوسروں بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ زمیندار کے حکم کے بغیر بھی بہت سے کام کر لیا کرتا تھا اور سب اچھے برے کام میں حوالہ زمیندار کا ہوتا تھا۔ اس طرح زمیندار برا بن رہا تھا اور رادھا کشن خود کو معصوم بنا کر پیش کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ اندرونی طور پر وہ ایک خطرناک کام اور کر رہا تھا۔ وہ ہندو کسانوں اور ہاریوں کے ذہن میں یہ ڈال رہا تھا کہ مسلمان زمیندار ہے۔ ہمارا کب خیال کرے گا۔ حالانکہ بہت سی زیادتیوں کا زمیندار کو پتہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ رادھا کشن بالابالا یہ کارروائی کرتا تھا اور برائی آتی تھی کفیل پر۔ حویلی کے اندر اس کی دونوں لڑکیاں اس کے قریب

ہندو سب اس کی طرف تھے۔ اندرونی طور پر اس کی لڑکیاں اس کو اب بھی سب ٹھیک ہے کاراگ سنا رہی تھیں۔ ہر طرف سے کفیل کو جکڑا جا چکا تھا۔ رادھا کشن پر اب آخری وار کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اور پھر اچانک کفیل پر رادھا کشن نے بھرپور وار کر دیا۔ اس نے اپنی لڑکیوں کے اغوا کا مقدمہ کفیل پر کر دیا اور پولیس کے ذریعہ لڑکیوں کو حویلی سے برآمد بھی کروالیا۔ سارے انتظامات وہ کر چکا تھا۔ ہر آدمی کو وہ خرید چکا تھا گاؤں کے لوگ اس سے ہمدردی کر رہے تھے اور کفیل زمیندار کو برا بھلا کہے جا رہا تھا اس کے بعد گاؤں کے بہت سے ہندوؤں نے اس پر مقدمے دائر کر دیے، سب کے پیچھے رادھا کشن کا داغ کام کر رہا تھا اس کے خلاف ہندوؤں نے سخت احتجاج کیا اس کی زمینداری ختم کرنے پر زور دیا گیا۔ انگریز گورنمنٹ کیوں بلا وجہ کی پریشانی مول لیتی اس نے مقدمات کے فیصلے ہونے تک کے لئے ساری زمینیں اپنی تحویل میں لے لیں اور اپنا ایک آدمی انتظام کو مقرر کر دیا اور کفیل کے ساتھ وہ ہو گیا جو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

جائیداد کے مقدمات کے ساتھ اغوا کا مقدمہ اس کی بہت بڑی بدنامی کا باعث بن گیا۔ لڑکیوں نے بیان دیا کہ ہم کو زمیندار نے زبردستی حویلی میں رکھا تھا اور ہم پر وہ بہت ظلم کرتا تھا۔ رادھا کشن نے بھی اس قسم کا بیان دیا کفیل کا داغ گھوم رہا تھا۔

دن رات اس کے گن گانے والا اور ہر وقت اس کی خدمت کرنے والی اس کی لڑکیاں کیسی بدل گئیں اس کے خلاف ہونے کا آخر سب کیا تھا وہ اب تک نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ تو عام زمینداروں کی طرح کسانوں پر زیادہ دباؤ بھی نہیں ڈالتا تھا۔ وہ جتنا اس پر سوچتا پریشان ہوتا۔ اس کے وکیل روزانہ اس کے پاس آتے تھے وہ ان سے مشورے بھی کرتا مگر اس کا اغوا والا کیس بہت کمزور تھا وکیلوں نے مشورہ دیا کہ رادھا کشن سے بات کی جائے اور

کسی کو نہیں آنے دیتی تھیں تو حویلی کے باہر رادھا کشن اس کے سر پر سوار رہتا۔ اس کے آدمی وہ باتیں کفیل کے سامنے لاتے جو رادھا کشن چاہتا تھا۔ پوری زمینداری کی خبریں تک نہیں آتی تھیں۔ وہ سب اچھا ہے ٹھیک چل رہا ہے کے بہلاوے میں ہی رہتا تھا۔ حالانکہ اس کے خلاف ہندو باتیں کرنے لگے تھے اور تو اس سرکاری اہلکار بھی اس کے خلاف باتیں کرتے تھے۔ رادھا کشن نے سرکاری افروں سے ملی بھگت کر لی تھی اور بہت سی زمین اور دروازے کے باغات کے مالکانہ حقوق اپنے نام کروائے تھے۔ اور بچارے کفیل کو کانوں کان کسی بات کی خبر نہیں تھی۔ منشی اور وصولی کے لوگ بھی رادھا کشن کے تھے۔ اس تک کوئی بات آتی ہی نہیں تھی۔ اس کی سوچ اور سمجھ پر بڑے سخت پہرے تھے۔ رکنی اور بھگوت اس کے ذہن اور اعصاب پر بری طرح سوار تھیں، رادھا کشن نے قانونی طور پر خود کو مضبوط کر لیا تھا۔

ہندو ہاریوں نے زمیندار کو اس کا حق دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ زمینوں پر بیٹھے تھے۔ ان کی پشت پر رادھا کشن تھا۔ ہندو پیواری اور بڑے افسر رادھا کشن کے ساتھ تھے۔ کفیل اکیلا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ رادھا کشن نے دور دور سے ہندو کسانوں کو لاکر آباد کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح ہندوؤں کی آبادی مسلمانوں سے بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ آبادی زیادہ ہونے کا مقصد تھا کہ ہندوؤں کی طاقت بڑھ گئی۔ کفیل کی بد قسمتی یہ تھی کہ وہ جس کو اپنا دوست اور وفادار خیال کرتا تھا، وہی اس کے خلاف یہ سب کر رہا تھا۔ کفیل کے نزدیک کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کی راہ نمائی کرتا۔ رادھا کشن نے پہلے ہی سب کا پتا کاٹ دیا تھا۔ رادھا کشن اب تک پوشیدہ تھا کفیل اس کو بڑا وفادار اور معصوم خیال کرتا تھا۔ اور رادھا کشن اندر ہی اندر زمیندار کی جڑیں کاٹ رہا تھا۔ اس کے پاس بہت کچھ جمع ہو گیا تھا۔ قانونی پوزیشن بھی اس نے مضبوط کر لی تھی۔ سرکاری لوگ بھی اس کے ساتھ تھے، کچھ کو وہ نواز چکا تھا اور کچھ اس کے وعدے پر اس کے ساتھ تھے۔

اس کو راضی کیا جائے کہ وہ یہ کیس واپس لے۔

رادھا کشن کو کئی خبریں اس کے بلانے کو پہنچائی گئیں مگر وہ نہیں آیا۔

رادھا کشن کو اندازہ تھا کہ اس کو کیوں بلوایا جا رہا ہے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ زمیندار کی گوٹ پٹ رہی ہے، بھم اور اس کو گرنے دو، وہ کفیل کے پاس نہیں آیا، پیشی کی تاریخ قریب آ رہی تھی اور کفیل کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی، انگو کے معاملے کو رادھا کشن نے اپنی بدنامی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اتنا اچھا لٹھا کہ ہندو تو ہندو مسلمان بھی کفیل کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ رادھا کشن نے ہندو وکیل کر رکھے تھے، ان کو بھی کئی مسلمان کو بدنام کرنے اور اس کی زمینداری کو ختم کرنے کا موقعہ ہاتھ آ گیا انہوں نے اس کیس میں اور کئی فرضی کہانیاں شامل کر کے کیس کو اپنی طرف کر لیا تھا۔ کفیل کی حویلی سے لڑکیوں کی برآمدگی نے کفیل کو مجرم بنا دیا تھا رادھا کشن بڑا مظلوم بنا ہوا تھا اور کفیل خالم کے روپ میں گورنمنٹ اور عوام دونوں کے سامنے تھا۔ اس پر اس کے وکیلوں نے فرضی داستانیں بمعہ گواہوں کے اور بڑھادی تھیں۔

ان حالات میں کفیل کا پریشان ہونا لازمی تھا۔ اس کے دوست اور جان نثار بھی اس کے قریب نہیں آ رہے تھے۔ حویلی کی ساری رونقیں ماند پڑ گئی تھیں۔ روز حویلی میں حاضری لگانے والے بھی نہیں آتے تھے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ پہلے اپنے بارے میں سوچتا ہے، سب بڑھتے سورج کو پوچھتے ہیں۔

منشی غلام حسین اس کے قریب رہ گیا تھا۔ وہ سارے حالات شروع سے دیکھ رہا تھا حویلی کے قریب کا آدمی تھا رادھا کشن کے کردار اور اس کی لڑکیوں کی آمد کی بابت خوب جانتا تھا۔ رادھا کشن نے جس بے حیائی سے اپنی لڑکیوں کو استعمال کیا تھا اس سے غلام حسین کی نظروں میں رادھا کشن نہایت گھٹیا آدمی تھا۔

زمیندار کفیل کا کردار بھی اس کے سامنے تھا اچھا تو وہ اس کو بھی نہیں کہتا تھا مگر رادھا کشن کے مقابلے میں کفیل کا

کردار پھر بہتر تھا۔ یوں تو ہر انسان پر برا دقت زندگی کے کسی موڑ پر آ رہی جاتا ہے مگر اکثر دیکھا گیا ہے کہ انسان خود مصیبتوں کو دعوت دیتا ہے الزام دوسروں پر لگاتا ہے ذرا اپنی حرکتوں پر نظر کرے تو اس کو اپنی کوتاہیوں کا احساس ہو جائے جیسے جیسے پیشی کے دن قریب آ رہے تھے اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ نیند نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ فطری بات ہے کہ نیند اور بے چینی کے درمیان کشمکش ہو تو حواس خسہ پوری طرح معطل نہیں ہوتے۔

غلام بہت دے قدموں سے اس کے کمرے میں آیا تھا مگر پھر بھی کفیل کی آنکھ کھل گئی۔

حویلی میں خاموشی تھی غلام حسین اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

کفیل نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے منشی کیسے آتا ہوا۔“
”پیشی قریب آ رہی ہے سرکار حالات آپ کے خلاف جا رہے ہیں۔ آپ نے کیا سوچا ہے۔“ منشی غلام حسین نے کہا۔

”میرا دماغ کچھ کام نہیں کر رہا، میں نے پتو دریا میں ڈال دیئے ہیں اور کشتی کو پانی کے بہاؤ کے حوالے کر دیا ہے جو کرے گا اللہ کرے گا۔“ کفیل نے جواب دیا۔

”آپ برانہ مائیں تو عرض کروں۔“ منشی نے کہا۔
”میں برامانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں تم جو کہنا چاہتے ہو کو اب مجھے کسی سے یہ امید نہیں ہے کہ کوئی میری مرضی اور پسند کی بات کرے گا۔ تم بھی کہو۔“ کفیل نے کہا۔
”جو کرتا ہے اللہ ہی کرتا ہے مگر اللہ بھی اپنے بندوں

پر اتنا وزن ڈالتا ہے جتنا وہ برداشت کرے۔ آپ نے اگر اللہ کے بتائے راستے کو نہ چھوڑا ہوتا اور رادھا کشن کے راستے کو نہ پکڑا ہوتا تو آج آپ اتنے بے بس نہ ہوتے۔ اب جو کرتا ہے آپ کو خود کرتا ہے رادھا کشن آپ کے پاس نہیں آئے گا کیونکہ آپ اس کے پھیلانے جال میں پھنس چکے ہیں۔“ غلام حسین نے کہا۔

”میں جانتا ہوں پیشی پر کیا فیصلہ ہونے والا ہے سارے حالات میرے خلاف ہیں۔“ کفیل نے کہا۔

کی میسا کھیاں لگا رکھی ہیں اب تم بتاؤ تم نے یہ سب کیوں کیا میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔“ لفیل نے پوچھا۔

”زیادہ اونچا نہ بولو، اب تمہاری آواز میری آواز سے اونچی نہیں ہونا چاہئے میں تم سے کمتر نہیں ہوں، اس بات کا خیال رکھنا۔“ رادھا کھن منہ میڑھا کر کے بولا۔

”وقت کے لحاظ سے تمہاری بات درست ہے تم نے بتایا نہیں۔“

”کیا بتاؤں تم پر اغوا اور ان کے ساتھ زیادتی کرنے کا کیس اتنا بھاری پتھر ہے کہ تم اس کے نیچے ایک بار دب گئے تو زندگی بھر دبے رہو گے تم کو دنیا ذلیل کر تی رہے گی۔“ رادھا کھن نے کہا۔

”مجھے بھٹکانے کے لئے تم نے بھی کچھ کام کیا ہے۔ میری زمینداری اور دولت نے بھی مجھے بھٹکایا ہے دولت انسان کی ضرورت تو ہے مگر انسان کو بگاڑنے میں اس کا دخل بہت ہے۔ میں اس کے نشے میں بہت کچھ بھول گیا تھا۔“ لفیل نے کہا۔

”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔“ رادھا کھن نے پوچھا۔

”تم جانتے ہو کہ اغوا کا مقدمہ غلط ہے یہ مقدمہ تم واپس لے لو۔“ لفیل نے کہا۔

”اس کے بدلے تم کیا پیش کرو گے۔“ رادھا کھن معنی خیز انداز میں بولا۔

”میں جانتا ہوں تم نے یہ سارا کھیل زمین کی خاطر کھیلایا ہے۔“ لفیل نے کہا۔

”تو پھر کھ دو نہرو والی زمین میرے نام۔“ رادھا کھن بولا۔

”زمین عزت سے بڑھ کر نہیں ہے تم مقدمہ واپس لو اپنا بیان بدل لو میں وہ زمین تم کو دے دوں گا مگر یاد رکھنا میں اور تم اس کے بعد اجنبی ہو جائیں گے۔“ لفیل نے کہا۔

سودا ہو گیا رادھا کھن نے اپنا بیان بدل لیا لڑکیوں کے بیانات بھی بدل گئے اور اغوا کا مقدمہ ختم ہو گیا۔

مگر زمینداری کو اب بھی خطرہ ہی تھا۔ زمینوں کے کئی دعویٰ دار پیدا ہو گئے تھے رادھا کھن نے بھی ایک

”اس لئے آپ کو خود رادھا کھن کے پاس جانا ہوگا۔“ نشی نے کہا۔

”اور اس نے مجھے دھکا دیا تو میرے لئے مرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔“ لفیل نے کہا۔

”میرا خیال ہے وہ ایسا نہیں کرے گا میرا اندازہ یہ ہے کہ وہ دولت و زمین کا لاپٹی آدمی ہے۔ اس نے اب تک جو کردار ادا کیا ہے اس سے بھی ظاہر ہی ہوتا ہے وہ آپ سے سودے بازی کرے گا۔ آپ اس کے پاس جائیں میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔“ نشی نے کہا۔

کھیلنے کچھ دیر اس کی بات پر غور کیا اور پھر کہا۔

”تمہاری بات وزنی ہے میں جانے کو تیار ہوں۔“

”ٹھیک ہے میں آپ کو کل اس کے گھر گول گاؤں لے چلوں گا۔“

☆.....☆.....☆

رادھا کھن نے زمیندار لفیل خان کو دیکھتے ہی کہا۔

”میں جانتا تھا تم میرے پاس ضرور آؤ گے۔“

”رادھا کھن میں تم کو سمجھ نہ سکا اور تم نے مجھے پورا بڑھ لیا اور سمجھ لیا۔ یہ میری بھول تھی یا اعتماد کی بوجھ ہوئی غلطی تھی بہر حال تم فتح یاب ہوئے میں شکست خوردہ ہوں۔ مگر شکست کا اعتراف بھی بہادری ہے میں اعتراف کرنے آیا ہوں۔“ لفیل نے کہا۔

”تم اور کیا کر سکتے ہو؟“ رادھا کھن بولا۔

”ہاں تم نے ٹھیک کہا مگر تم جانتے ہو کہ میں کتنا خطا وار ہوں میں نے تمہاری لڑکیوں کو نہیں بلایا تھا تم خود اپنی خوشی سے ان کو حلی میں لائے تھے۔ اس کے بدلے تم نے جو کچھ طلب کیا میں نے تم کو دیا تم کس حالات میں میرے پاس آئے تھے اور اب کہاں کھڑے ہوئے شک میں نے غلطیاں کی ہیں بھروسے کی غلطی مجھ سے ہوئی ہے اگر میں ذرا بھی تم پر شک کر لیتا تو میری زندگی کی اس المناک داستان کا اندازہ یہ نہ ہوتا تھا میرے سامنے اس انداز میں نہ کھڑے ہوتے آج تمہاری گردن تنی ہے اور میری جھکی ہے یہ دوسری بات ہے کہ تم نے اپنی گردن میں اپنی عزت

بہت بڑے زمین کے ٹکڑے پر دعویٰ کر رکھا تھا۔ غلام حسین ہی ایک تھا جو کفیل کے پاس رہ گیا تھا۔

”انسان کی زندگی میں بعض دفعہ بڑے سخت مقامات آ جاتے ہیں پریشانیاں اس کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں وہ سمجھتا ہے کہ بس وہ ختم ہو گیا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا اس کی ہمت اس کو سہارا دیتی ہے اور وہ ان مشکلات سے باہر آ جاتا ہے۔ اسی کا نام زندگی ہے کبھی اوپر کبھی نیچے مگر جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ ڈاڈرا سارہتا ہے ایک وقت آتا ہے کہ سچ اس کو بچھاڑ دیتا ہے اور جھوٹ کی موت ہو جاتی ہے۔“ غلام حسین نے کہا۔

کفیل نے اس کی بات بڑے غور سے سنی اور کہا۔
 ”غلام حسین میں کتنا کم عقل تھا کہ میں نے تم کو کبھی اہمیت نہیں دی، تم اتنے ہوشیار ہو میں نے نہیں سوچا تھا تمہارے بتائے راستے پر چل کر میں بہت بڑی بدنامی سے بچ گیا۔ اب تم ہی بتاؤ اتنے بہت سارے مقدمات میرے خلاف ہیں اگر میں یہ مقدمات ہار جاؤں تو میں کونجاں ہو جاؤں گا اور رادھا کشن جاگیر دار بن جائے گا۔ میں نے زندگی کا جو بھیا تک روپ دیکھا ہے لوگوں کو بدلتے دیکھا ہے اس وجہ سے میرا اعتماد دولت اور زمینوں پر سے بھی اٹھ گیا ہے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے مگر زندگی گزارنے کو کچھ نہ کچھ تو ہونا چاہئے۔“ کفیل نے کہا۔
 ”میرا خیال ہے حضور آپ دلی چلے جائیں وہاں پر بہت بڑے بڑے وکیل ہیں ان سے مشورہ کریں آپ کے پاس اپنی جائیداد کے جو قدیم ثبوت ہیں ان کے ذریعہ آپ ضرور مقدمے جیت جائیں گے مگر یہ کام ایک اچھا وکیل ہی کر سکتا ہے۔“ غلام حسین نے کہا۔
 ”تمہارا مشورہ مناسب ہے۔“ کفیل نے کہا۔

”تو پھر آپ دیر نہ کریں۔ دلی میں ایک بہت بڑے حکیم بھی ہیں ان کے بارے میں سنا ہے بہت ہمدرد انسان ہیں اور مظلوموں کی بہت مدد کرتے ہیں۔“ غلام حسین نے کہا۔
 ”مگر میرے معاملے کا حکمت سے کیا تعلق۔“

کفیل نے پوچھا۔

”حکیم صاحب ہر معاملے میں مدد کرتے ہیں شرط یہ ہوتی ہے کہ ان کو پوری بات سچائی کے ساتھ بتائی جائے۔“ غلام حسین نے کہا۔

”ٹھیک ہے تم کہتے ہو تو میں ضرور ان سے ملاقات کروں گا ان کا پتہ بتاؤ۔“

اسی رات کفیل دلی روانہ ہو گیا اس کے بارے میں صرف غلام حسین کو پتہ تھا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ دلی میں حکیم وقار کا مطب تلاش کرنے میں اس کو ذرا بھی پریشانی نہیں ہوئی وہ ان کے سامنے پیش ہو گیا۔

”حکیم صاحب میں بیمار نہیں ہوں میرا معاملہ دوسرا ہے اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔“

”مگر تم شکل سے پریشان لگتے ہو۔“ حکیم وقار نے کہا۔

”جیسی طور پر میں پچھلے دنوں سخت پریشان رہا ہوں۔“ کفیل نے کہا۔

”ایسا ہی لگتا ہے خیر تم اپنی روداد حکیم کامل کے روبرو بیان کرو میں بھی سنوں گا مگر ان کا سنا بہت ضروری ہے میں ان کو بلاتا ہوں۔“ کفیل نے اپنی پوری کہانی بیان کر دی۔ حکیم کامل اور حکیم وقار نے بڑے غور سے اس کی بات سنی پھر حکیم کامل بولے۔

”اس کہانی میں بہت جگہوں پر آپ کی کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں۔“

”بے شک میری غلطیاں ہیں میں انسان ہوں اور مرد ہوں۔ مگر میرے خلاف جو مقدمات بنائے گئے ہیں وہ جھوٹے ہیں میرے پاس جو شہین ہیں وہ میرے خاندان میں ہمیشہ سے ہیں اور جو اغوا کا مقدمہ بنایا گیا ہے وہ بھی بے بنیاد تھا۔“

”یہ رادھا کشن کیسا آدمی ہے۔“ رولونے پوچھا۔
 ”حکیم صاحب، نہایت ہی لالچی اور بے غیرت آدمی ہے اس کا اندازہ یوں لگائیں کہ وہ خود اپنی دونوں لڑکیوں کو لے کر آیا تھا پھر اس نے موقعہ موقعہ سے مجھ سے

مطالبات کرنے شروع کر دیئے۔ میں اس قدر ان لڑکیوں کے نشے میں مدھوش تھا کہ اس کے مطالبات پورے کرتا رہا وہ میرے خلاف ہندوؤں کو بہکا تا رہا حالانکہ میں نے کبھی ہندو، مسلمان میں فرق نہیں کیا میں نے کبھی ناجائز ان پر زور نہیں ڈالا جیسا کہ زمیندار لوگ کرتے ہیں۔

ہاں میری غلطی کچھ ہے تو وہ یہ ہے کہ میں ان دو لڑکیوں کے جال میں بری طرح پھنس گیا اور اس کے بے غیرت باپ نے موقع ملتے ہی مجھ پر وار کر دیا۔ میری پوزیشن اتنی خراب ہو گئی کہ اگر میں اس بے غیرت کی بات نہ مانتا تو مجھے سزا بھی ہو سکتی تھی آپ تو جانتے ہیں۔“ کفیل نے کہا۔

”ساری زمینیں ابھی سرکاری تحویل میں ہیں۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”جی! ایک مجسٹریٹ دیکھ رہا ہے وہ انگریز ہے۔“

”اور وہ تمام کیس جو تمہارے خلاف ہیں زمینوں کے وہ کہاں کئے گئے ہیں۔“

”الہ باد کورٹ میں ہیں۔“ کفیل نے جواب دیا۔

”کسی کی کوئی پیشی ہوئی ہے۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”تین دن کے بعد سب سے بڑا کیس رادھا کشن کا ہے اس کی پیشی ہے۔“ کفیل نے بتایا۔

”میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ حکیم کامل رولوکا نے کہا۔

اور رولوکا کفیل کے ساتھ ایک دوست کی حیثیت سے اس کے ساتھ آ گیا۔

رادھا کشن گول گاؤں میں رہتا تھا۔ رولوکا آتے ہی اس کی طرف روانہ ہو گیا۔ رات کا وقت تھا رادھا کشن کے گھر اس کے بڑے کمرے میں رادھا کشن بڑی شان سے بیٹھا تھا۔ اور بھی کوئی لوگ موجود تھے۔ رولوکا روپوش کی حالت میں جا کر ان کے قریب بیٹھ گیا۔ رادھا کشن بہت خوش نظر آتا تھا۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔

”ہری چن، تم نے بہت دن اس مسئلے کی غلامی کر لی۔ اب بہت جلد تم خود زمیندار ہو جاؤ گے چتا کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں نے سب بندوبست پورا پورا

کر دیا ہے۔ تمہارے کاغذات تمہارے باپ کے زمانے کے بنوائے ہیں کہ تمہارے باپ نے سوا ایکڑ زمیندار سے وہ زمین خریدی تھی پھر زمیندار نے دھونس سے تم سے وہ زمین لے لی تھی۔ ڈرامت اوپر سے نیچے تک سب اپنے ہیں۔ گواہ بھی کر رکھے ہیں۔“

ہری چن خوشی کے مارے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

”بس رادھا کشن جی تم ہی اپنے ہو ہر کام ہو جائے تو بیڑی در بیڑی دعائیں دیں گے۔“

”ارے تو چتا نہ کر سب رام بھلی کرے گا۔“ رادھا کشن بولا۔

”اور میرا کیا ہوگا۔“ چن شرمابھی بولے۔

”ارے تیرا تو بہت معمولی کام تھا سب کاغذات تیار ہیں تو رقم کا بندوبست کر، پورے ایک ہزار خرچ ہوئے ہیں۔“ رادھا کشن بولا۔

”کام تو کیا ہے۔“ شرمابولا۔

”ارے بڑا چوکس کام کئے ہیں اس زمیندار کو ایک گواہ بھی نہ ملے گا۔ اور تیرے گواہ بہت ہوں گے۔ مگر یاد رکھیو گھرانا نہیں اور زمیندار کے ظلم و ستم کے بارے میں

مجسٹریٹ کو رورور کیاں کرنا۔“

رولوکا نے اندازہ کر لیا کہ خرابی کی اصل بڑی بی بی رادھا کشن ہے اس نے سرکاری اہلکاروں سے مل کر رشوت دے کر جعلی کاغذات زمینوں کے بنوائے ہیں۔ پٹواری اور دوسرے

اوپر کے افسروں کو خریدتا ہے اس نے اس کیس کو قانونی طریقہ پر حل کرنے کا پروگرام منسل کر دیا اور رادھا کشن جیسا آدمی تھا اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرنے کا پروگرام بنایا۔

ایک ایک کر کے سب چلے گئے مگر رولوکا کمرے کے اندر رہی رہا۔

رادھا کشن نے سب کے جانے کے بعد دروازہ دروازہ بند کر دیا اور گھر کے اندر جا کر آواز دی۔ ”اری او بھگوت۔“ ایک کمرے سے ایک جوان عورت پیلی ساڑھی

میں ملبوس نمودار ہوئی اور بولی۔

”کا فرصت مل گئی باپو۔“

”ہاں ری مل گئی اب ذرا بھوجن کا پر بند کر بہت بھوک لگی ہے۔“

”تم اندر چوکی پر چلو میں ابھی لائی۔“ اور بھگوت رسوئی میں چلی گئی اور ایک پیتل کی بڑی سی تھالی میں کھانا لے آئی۔ بڑی تھالی میں تین چار چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں مختلف قسم کی سبزی تھی اور ایک کٹوری میں دال ایک میں اجار اور رائیہ بھی تھا روٹیوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی پوریاں رکھی تھیں اجار کی خوشبو اس کے آتے ہی پورے کمرے میں پھیل گئی مگر رادھا کشن چوکی پر بیٹھا تھا بھگوت نے تھالی اس کے سامنے رکھ دی اور پانی لینے چلی گئی رادھا کشن نے تھالی اپنے سامنے کھسکا لی مگر یہ کیا تھا تھالی خالی تھی کسی بھی کٹوری میں کچھ نہیں تھا بلکہ پوری تک نہیں تھی سارے برتن خالی تھے۔

”ارے کا پائل ہو گئی ہے کا میں کٹوریاں اور تھالی کا کھاؤں۔“ وہ زور سے دھاڑا۔ بھگوت دوڑ کر اس کے پاس آگئی اور بھولی۔

”کا ہوا پانی کا ہے چلاتے ہو۔“

رادھا کشن غصے سے بولا۔ ”دیکھو، اس میں کا ہے کہ کھاؤں۔“

اب بھگوت کی نظر تھالی پر پڑی تو وہ حیران رہ گئی اور بولی۔ ”میں سب بھر کے لائی، ای خالی کیسے ہیں۔“

”ارے تیری کھوپڑیا ٹھکانے نہیں ہے جب سے زمیندار کی حویلی سے آئی ہے سب کام اوندھے کرے ہے۔“ رادھا کشن غصے سے بولا۔

”باپو میں پورا بھوجن تھالی میں لائی ہوں۔“ بھگوت نے کہا۔

”اچھا چل اب پھر لے آ۔“ رادھا کشن بولا۔

بھگوت پھر رسوئی میں چلی گئی۔ اندر سے برتن اٹھانے رکھنے کی آوازیں آتی رہیں اور پھر وہ گھبرا کر تیزی سے واپس رادھا کشن کے پاس آگئی اور بولی۔

”یہ کا ہو رہا ہے باپو۔“

”کا ہو رہا ہے۔“ رادھا کشن بولا۔

”ہانڈی میں بھی کچھ نہیں رہا سب کہاں گیا۔“ وہ بولی۔

”ہیں کا کہہ رہی ہے چل دکھا۔“ اور رادھا کشن بھگوت کے ساتھ رسوئی میں چلا گیا۔ سارے برتن دھلے رکھے تھے کسی میں کچھ نہیں تھا۔

”تو نے کچھ نا ہی پکایا، موئے پاگل بنائے ہے۔“ رادھا کشن بولا۔

”نہ پکا تو رکھنی نے اور میں نے کا کھایا ہے۔“ وہ بولی۔

”سب کھا گئی ہوگی۔ تو ایسا کرو دودھ ہی گرم کر کے لے آ۔“ اور وہ پھر چوکی پر آ گیا۔ مگر رسوئی میں دودھ تھا ہی نہیں بھگوت نے آ کر بتایا۔ ”دودھ بھی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے پھر رادھا کشن بیٹا آج بھوکے سو جاؤ۔“ اور وہ اٹھ کر اپنے بستر پر آ گیا اور لیٹ گیا بستر پر لیٹنے کے کچھ ہی دیر میں اس کو اندازہ ہو گیا کہ بستر پر سرخ رنگ کی چیونٹیاں ہیں وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بستر جھانسنے لگا مگر چیونٹیاں تو فرش پر بھی بے حساب تھیں کسی نے اس کو اب تک کا نا نہیں تھا۔ وہ برآمدے میں آ گیا اور ایک فرشی کھاٹ پر لیٹ گیا مگر اس کا پیچھا چیونٹیوں نے نہیں چھوڑا زمین پر یہاں بھی تھیں اور کھاٹ پر چڑھ رہی تھیں وہ بھاگ کر کمرے باہر آ گیا اور چال کی طرف چلا چو پال کا چبوترہ اٹھائی پڑا تھا۔

سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے وہ اکیلا ہی چبوترے پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھا کہ چیونٹیاں چبوترے پر آ رہی تھیں۔

”ہے بھگوان یہ کیا بلا ہے میں کہاں جاؤں۔“ وہ گھبرا کر بولا۔

وہ دوڑ کر کھیتوں کی طرف چلا گیا وہ جس جگہ ذرا رکا چیونٹیاں اس کے سامنے آ گئیں وہ ساری رات دوڑتا رہا اور صبح تک ہار کر گھر میں داخل ہوا۔

”اری بھگوت اور کرنی تم کہاں ہو۔“

بھگوت دوڑ کر اس کے پاس آگئی بولی۔ ”کابات ہے باپو۔“

”اری ساری رات بھاگت ہو گئی وہ لال لال

اجازت نہیں تھی ورنہ تیرا اس کب کا ان کے پیٹ میں ہوتا اور تیرا پنجر کسی پیڑ کے نیچے پڑا ہوتا اور اس پر کھیاں بھن بھنا رہی ہوتیں مگر یاد رکھو وہ وقت پھر آ سکتا ہے۔“ اجنبی نے کہا ”تو یہ سب تو نے کیا ہے پر میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔“ رادھا کشن بولا۔

”کھیل زمیندار نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ تو نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا پھر یہ غیرتی سے اپنی لڑکیوں کو اس کے پاس بھیج دیا تیرا لالچ اور بڑھا تو زمیندار بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ اس کی مہربانیوں کا تو نے خوب جواب دیا۔“ اجنبی نے کہا۔

رادھا کشن نے خاموشی سے سنا اور بولا۔ ”تو میری جان چھوڑ دے بول میں کیا کروں۔“

”تو نے جو کا غذات تیار کرائے ہیں وہ سب میرے سامنے لے آ۔“ اجنبی بولا۔

”تو کیا کرے گا۔“ رادھا کشن بولا۔

”پہلے لے کر تو آ۔“ اجنبی بولا۔

”پھر تو میری جان چھوڑ دے گا۔“ رادھا کشن بولا۔

”تو اگر شرطیں رکھے گا تو پھر مر بھوکا میں جاتا ہوں۔“ اجنبی بولا۔

”نہیں جا، میں لاتا ہوں۔“ رادھا کشن نے ایک صندوق کھول کر ایک فائل نکالی اور اجنبی کو دے دی اجنبی نے فائل کھول کر اس کو دیکھا اور بولا۔ ”کام تو نے پورا کیا تھا۔

مگر جموٹ زیادہ پائیدار نہیں ہوتا۔ آج تیری پیشی ہے تجھے یہ فائل عدالت میں اپنی سچائی کو ثابت کرنے کو پیش کرنا تھی۔ اب تو کیا کرے گا۔“ اجنبی بولا۔

”میں کیس واپس لے لوں گا میں عدالت جانے سے پہلے ہی ہار گیا ہوں۔“ رادھا کشن بولا۔

”اور سن تجنی فائلیں زمیندار کے خلاف جھوٹی بنوائی ہیں وہ سب میرے حوالے کر دے آج شام تک جب یہ کام تو کرے گا تو تجھے روٹی ملے گی۔ نہیں کرے گا تو بھوکا مرے گا میں شام کو پھر آؤں گا۔“ اور اجنبی دروازے سے نکل گیا۔

چیونٹیاں نے جان نہ چھوڑی کچھ کھاوے کو دے میں تو مارے بھوک کے مرا جاوے ہوں۔“ رادھا کشن نے کہا۔

”کا کہتے ہو پاؤ ساری رات تو خراٹے لے کر تم سوئے پڑے تھے۔“ بھگوت بولی۔

”اری کا تیرا داغ چل گیا ہے میں بھاگا پھرا ہوں اور تو کہت ہے سو پاڑا تھا۔“

رادھا کشن تعجب سے بولا۔

”میں کا ہے جھوٹ بولوں گی رکنی سے پوچھ لو۔“

بھگوت بولی۔

”اری ای سب بعد میں کریو پہلے کچھ کھاؤں کو دے۔“ رادھا کشن بولا۔

”مگر رسوئی میں اس کے کھانے کو کچھ نہیں ملا اور بھگوت نے حیرت سے کہا۔“ باپور سوئی خالی پڑی ہے کہو تو پکا دوں۔“

”اور کا کرے گی جلدی کر۔“ رادھا کشن بولا۔

بھگوت رسوئی میں چلی گئی اور رادھا کشن چوکی پر کھانے کا انتظار کرنے لگا مگر تھالی اس کے سامنے آتے ہی خالی ہو گئی۔

تین دن کی بھوک نے رادھا کشن کے انجر جگر جھیل کر دیئے اس نے کئی دفعہ کسی اور کے گھر جا کر کھانے کی کوشش بھی کی مگر تھالی وہاں پر بھی خالی اس کے سامنے آئی۔

تیسرے دن اس کے پاس ایک آدمی آیا شہری لگتا تھا۔ آتے ہی بولا۔

”اور کتنے دن بھوکا رہ سکتا ہے۔“

”تو کون ہے اور کیوں پوچھ رہا ہے۔“ وہ بولا۔

”تجھے ضرورت ہے زمین کی جائیداد کی روپے کی، کھا اس سے پیٹ بھر روٹی کیوں مانگتا ہے۔“ وہ بولا۔

”روٹی تو پہلے ہے باقی سب تو بعد کی بات ہے۔“ رادھا کشن کمزور آواز میں بولا۔

”تجھے روٹی آسانی سے مل جاتی تھی اس نے تجھے اس کی فکر نہیں تھی۔ تجھے سونے، چاندی زمین کی قدر تھی اب تجھے روٹی کی قدر ہوئی اور یاد رکھ چیونٹیوں کو کاٹنے کی

”ارے تو جا اس میں تمہارے کھاوے کا کاذر ہے۔ ہری چرن بولا۔

”دیکھو ہری چرن بھگوان کے سب کام نیارے ہیں تو ایسا کروہ فائل لے آ میرے پاس اب ہم کوئی کیس زمیندار کے خلاف نہیں کریں گے تو میری حالت دیکھ لے نہیں مانے گا تو تیری روٹی بھی بند ہو جاوے گی میں بھوک سے تڑپ رہا ہوں پر کھانہ نہیں ملتا۔“

ہری چرن نے آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں اور اس نے فائل رادھا کشن کے ہاتھ میں دے دی اور بولا۔ ”میں کچھ لاؤں کھاوے کو۔“

”میری بات کا تو تے یقین نہیں شاید جا لے آ“ ہری چرن نے رسوئی میں جولہ ایک پینٹل کی تھالی میں رکھ کر لے آیا اور ایک گول لوٹے میں پانی بھی لے آیا اور تھالی رادھا کشن کے سامنے رکھ دی۔

تھالی اس کے سامنے آتے ہی خالی ہو گئی۔ رادھا کشن نے تھالی کی طرف دیکھا اور بولا۔

”ارے کا تھالی کو کھاؤں۔“ ہری چرن نے خالی تھالی دیکھی تو اس کی حالت خراب ہو گئی ارے یہ کامیں خود بھر کر لایا ہوں بھوجن کہاں گیا۔

رادھا کشن کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”یہی ہو رہا ہے۔“ ہری چرن حیرت میں ڈوبا رہا اور وہ دروازے سے باہر آ گیا اس کے قدم بہت کمزور تھے۔

وہ بڑی دیر میں شرمائی کے دروازے پر پہنچا اور اس سے بھی فائل لے لی اور اب تک جو کارروائی کی تھی اور کاغذات پیسے خرچ کر کے جعلی بنوائے تھے اور ویکلوں کو دیئے تھے ان سب کو لینے سلطان پور کی بس میں بیٹھ گئے۔ سارے پروگرام ختم ہو گئے۔

رولو کا پورے دن اس کے ساتھ رہا۔ رادھا کشن کے منہ سے نکلا، اس نے سنا اس کی ایک، ایک حرکت اس نے دیکھی اس کے چہرے پر چھتاوے کے بادل منڈلاتے رولو کا نہ دیکھ لئے۔

رات کو وہ نمودار ہو گیا اور بولا۔

فائل بھی چلی گئی زمین اور باغات بھی روٹھ گئے۔ جو خرچ فائل کے بنانے پر ہوا وہ بھی ڈوب گا۔ وہ وہیں کھڑا تھا جہاں سے چلا تھا بھوک نے اس کی حالت دگرگوں کر دی تھی۔

خوراک انسان کے جسم میں وہی کام کرتی ہے جو کسی گاڑی میں پیٹرول کرتا ہے پیٹرول ختم گاڑی کھڑی ہو جاتی ہے رادھا کشن کے دل اور دماغ پر زمین اور اس کی حکمرانی چھائی ہوئی تھی مگر اس کی بھوک نے اس کے سارے کس بل ڈھیلے کر دیئے تھے۔ اس کے سامنے جب بھی تھالی آئی خالی ہی آئی ایک نوالہ اس کے منہ میں نہیں جاسکا اس کے ہمدرد دوست بھی اس کو ایک نوالہ نہ کھلا سکے۔

اس بھوک کی شدت اور پیٹ کی سروڑنے اس کے دماغ کے بہت سے گوشے بتدریج روشنی کر دیئے کچھ بھولے سبق اس کو یاد آ رہے تھے اندھیر اور ہوا تھاروشن باریک باریک شکافوں سے باہر آ رہی تھی اور بڑھتی جا رہی تھی لالچ اور ہوس کا اندھیرا کم ہو رہا تھا۔ سورج نکل رہا تھا وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

”اری اور کمنی ادھر آ۔“ چھوٹی اس کے قریب آئی اور بولی۔

”کہاں جائے ہو باپو کچھ کھاپی لو بہت کمزور ہو رہے ہو۔“

”کھاؤں گا کام پورا ابھی ناسی ہوا آ کے کھاؤں گا۔“ اور وہ بڑے کمزور قدموں سے چلتا ہوا دروازے سے باہر آ گیا۔ اور ہری چرن کے گھر کی طرف چلا۔

ہری چرن دروازے پر ہی مل گیا بولا۔ ”آؤ آؤ رادھا کشن جی کا بات ہے بڑے کمزور کمزور نظر آت ہوؤ ڈاندر آ جاؤ۔“

”ہاں میں بہت کمزور ہوں، تین دن سے میرے پیٹ میں ایک دانہ اناج کا نہیں گیا۔“ رادھا کشن بولے۔

”ہیں کا کہے ہو۔“ ہری چرن حیرت سے بولا۔

”ہاں اور اس کا کارن یہ ہے کہ میں نے زمیندار کے ساتھ بڑا انیائے کیا ہے۔“ رادھا کشن بولا۔

”سب کام ہو گیا کہ ابھی کچھ باقی ہے۔“

”میں نے سب ثبوت اور کذاذات جمع کر لئے ہیں اب زمیندار جی کے خلاف میں کچھ نہیں کروں گا میں ان کے سامنے کس منہ سے جاؤں گا اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں گول گاؤں سے ہی چلا جاؤں۔ میں نے بہت برا کیا ہے بہت زیادہ میں معافی کے قابل نہیں ہوں۔“

رادھا کشن کی آواز میں شرمندگی تھی۔
”دیکھو رادھا کشن انسان بہت خود غرض اور لالچی ہوتا ہے وہ صرف اپنے بھلے کی سوچتا ہے۔ دوسرے کے نقصان کے بارے میں اس کو ذرا احساس نہیں ہوتا اور تقدیر کو بھول جاتا ہے۔ اس میں لکھے پر غور نہیں کرتا تم جس کو بھگوان کہتے ہو اس نے یہ دنیا چائی ہے پوری زمین ایک جیسی نہیں بنائی کہیں پر اونچی ہے کہیں پر نیچی ہے کہیں پر بہت ٹھنڈی ہے کہیں پر سخت گرم ہے۔ کہیں ریت ہے اور کہیں پر پتھر کے پہاڑ کھڑے ہیں۔ انسانوں میں بھی اسی طرح کا فرق ہے سب کو امیر نہیں بنایا سب کو غربت نہیں دی۔“

یہ اس کا نظام ہے سب کے پاس دولت ہو تو کون کام کرے گا۔ کسی کے پاس نہ ہو تو کون کام کرے گا سب اپنا اپنا کام کرتے ہیں اور کام پورا ہوا تو جگہ خالی کر کے باقی کام کسی اور کے حوالے کر کے چلے جاتے ہیں سب کام ہوتے رہتے ہیں کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

تم اس طرح سمجھ لو کہ یہ دنیا ایک خواب ہے ایک پر فریب خواب اور یہ خواب بھی ایک لمحے کا ہے زندگی صرف ایک لمحے کی ہے انسان مر جاتا ہے اس کے لئے دنیا مر جاتی ہے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ دنیا ایک لمحے کی ہے مگر انسان میں خواہشات سمندر جتنی ہوتی ہیں وہ ان خواہشات کی تکمیل کی خاطر ہر طرف ماتھ مارتا ہے جائز ناجائز کی بھی پرواہ نہیں کرتا ظلم و ستم بھی کرتا ہے بے ایمانی فریب کاری بھی کرتا ہے صرف زندگی کے ایک لمحے کی خوشی کی خاطر غور کر دو۔“ رولوکانے اپنی بات ختم کر دی۔

رادھا کشن نے گردن جھکا کر شرمندگی سے کہا۔ ”میں بہت ذلیل آدمی ہوں اسی کارن منہ چھپا کر

جانا چاہتا ہوں۔“

”تم کہیں نہیں جاؤ گے ابھی تم نے کچھ کام کرنے ہیں۔ تم نے اب تک جو کیا اس کو بھول جاؤ جب انسان کی آنکھ میں پچھتاوے کا ایک آنسو بھی آ جائے تو اس کو معاف کر دینا چاہئے۔ تم نے اپنی کوتاہیوں کو محسوس کر لیا امتزاف کر لیا۔ اب تمہارے لئے معذرت کے دروازے کھلے ہیں۔ تم آج جہاں کھڑے ہو یہاں پر تم سکون کی نیند سوؤ گے تمہارے راستے میں کوئی نہیں آئے گا کیونکہ سچائی خود بخود بہت سی رکاوٹوں کو دور کر دیتی ہے۔ ایک سچ ہزاروں جھوٹوں پر بھاری ہوتا ہے تم اپنی لڑکیوں کی شادی کرو گے ان کے گھر آباد کرو گے۔ اور زمیندار تمہارے ساتھ ہوگا۔“ رولوکانے کہا۔

”مگر میں.....“ رادھا کشن کا جملہ پورا نہیں ہوا رولوکانے کا بولا۔ ”تم کو زمیندار نے معاف کر دیا ہے اب تم کھاؤ پیو مروج کرو و فاق میں محبت ہے برکت ہے۔“

اور رولوکانا واپس روانہ ہوا.....

☆.....☆.....☆

شہر بدایوں کسی زمانے میں بڑا پر رونق شہر تھا۔ اس کو عروج نواب واجد علی کے زمانے میں ہوا نواب واجد علی کے ایک بہت منہ چڑھے وزیر ہوا کرتے تھے ان کا نام نواب گوہر تھا۔ وہ بدایوں کے رہنے والے تھے ان کے منہ سے نکلا ہر جملہ گویا نواب واجد علی شاہ کا جملہ ہوا کرتا تھا ان کی ہر فرمائش نواب پوری کیا کرتے تھے نواب گوہر نے بدایوں کے محلہ نکاب گنج میں حویلی بنوائی شروع کر دی۔ نواب واجد علی نے ان کی پوری مدد کی اور پرانے مکانات کو توڑ کر ایک شاندار حویلی کی بنیاد رکھ دی اور بڑی عالیشان حویلی بنائی گئی۔ ملازمین کے مکانات بنائے گئے کئی کنوئیں بنائے گئے اور اس زمانے کی ضروریات کا پورا خیال رکھا گیا۔ مگر اس حویلی کے بنتے ہی نواب واجد علی کی اپنی حویلی ابڑ گئی۔ ان کا دور ختم ہوا اور نواب گوہر اپنی حویلی میں آ گئے۔

نواب گوہر کی خاندانی بیوی ایک تھی۔ یوں تو وہ نواب تھے ان کے پاس لوٹریوں اور باندیوں کی کب کی

تقسیم کی جاتی تھی۔

اس زمانے کے بڑے بڑے ذاکر مجلس پڑھتے تھے مجلس کے بعد ماتم ہوا کرتا تھا اور رات گئے لوگ جاتے تھے یہ ریت اب تک چلی آ رہی تھی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ بنیادی بیگم کہیں نظر نہیں آتی تھیں ان کے کئے گئے بہترین انتظامات ضرور نظر آتے تھے۔

اس مجلس کے بعد سارے سال لوگ حویلی میں نہیں آتے تھے عام تاثر یہ تھا کہ بنیادی بیگم اس حویلی کی ریت کو قائم رکھے ہوئے ہیں مگر خود وہ نہیں جو نواب گوہر علی مرزا تھے۔

ان کو بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا وہ بتاتے تھے کہ وہ آج بھی تیں اور چالیس کے پیٹے میں نظر آتی ہیں ان کا لباس نہایت سادہ ہوتا ہے مگر اس سادگی میں بھی وہ ایک حسین عورت دکھائی دیتی ہیں نواب حیدر مرزا کے زمانے کے کچھ لوگ زندہ تھے وہ بتاتے تھے کہ اس وقت بھی بنیادی بیگم اسی عمر کی لگتی تھیں ان کے چہرے اور جسم پر وقت نے کچھ اثر نہیں ڈالا تھا۔ بات تو حیرت کی تھی مگر سنی سنائی تھی اس لئے لوگوں نے زیادہ کرید نہیں کی۔

نواب گوہر کے جو خاندانی لوگ اس حویلی سے گئے واپس نہیں آئے۔ کسی نے اس حویلی پر ملکیت کا دعویٰ کیا۔ بنیادی بیگم نواب حیدر کے ساتھ کیوں تھیں ان کا کیا رشتہ ان سے تھا کسی کو پتہ نہیں۔ عورتیں ان کے پاس نہیں آتی تھیں مردوں سے وہ دور رہتی تھیں۔

دروازے پر ایک دربان اور حویلی میں ایک گونگی بہری عورت کام کرتی تھی وہ بازار سے سودا سلف بھی خریدتی تھی مگر کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ دربان ادھیڑ عمر کا تندرست آدمی تھا۔

اور نوکرانی بھی اسی عمر کی نظر آتی تھی زیادہ تر وہ قصاب کی دکان پر جاتی تھی اور گوشت خریدتی تھی قصاب حیران ہوتا تھا کہ کھانے والے صرف تین فرد اور گوشت اتنا زیادہ۔ سبزی ترکاری اس عورت نے کبھی نہیں خریدی قصاب بڑا ہوشیار تھا وہ بھی کسی سے کچھ نہیں کہتا تھا۔

قصاب کو دو گنی قیمت ادا کرتی اور خاموشی سے چلی

رہی تھی مگر خاندانی بیوی سے صرف ایک اولاد ہوئی اور وہ تھے نواب ہاشم مرزا۔ نواب ہاشم مرزا کے دو بیٹے پیدا ہوئے لڑکی ان کی کوئی نہ تھی۔ حالات خراب ہو رہے تھے انگریز ان کے دشمن بنے ہوئے تھے ہندو تو ان کو پہلے ہی پسند نہیں کرتے تھے۔ نواب ہاشم کا بڑا لڑکا تو ایسا گیا کہ پلٹ کر نہ دیکھا۔ چھوٹا بیٹا نواب حیدر مرزا اس حویلی میں رہا۔ ہاشم مرزا بھی گزر گئے ان کے بعد بیگم بھی چلی گئیں اور نواب گوہر علی مرزا کی آخری نشانی نواب حیدر مرزا اس حویلی میں اکیلے رہ گئے۔ کچھ دن میں ان کی بیگم بھی رخصت ہو گئیں اب حیدر مرزا کے ساتھ صرف ان کی ایک پرانی ملازمہ رہ گئی۔

کچھ لوگوں کا کہنا تھا۔ ”وہ ملازمہ نہ تھی ان کی کوئی رکھیل تھی۔“ کوئی کہتا۔ ”اس عورت نے ہی ان کی بیگم کو مار ڈالا تھا حیدر مرزا کا بے اولاد رہنا بھی اس عورت کا کارنامہ بتایا جاتا تھا۔“ وہ کون ہے، نواب گوہر مرزا کی حویلی میں کب آئی کون لایا کسی کو پتہ نہیں تھا۔ نواب حیدر مرزا بے اولاد مر گئے اور نواب گوہر مرزا کی نسل حیدر مرزا پر آخر ختم ہو گئی۔ حویلی کو ویران ہو جانا چاہئے تھا مگر حویلی آباد رہی۔ حویلی کے اخراجات پورے ہوتے رہے کہتے ہیں باقی مرنے پر بھی سودا لاکھا ہوتا ہے حیدر مرزا آخر خاندانی نواب تھا۔

اس عورت کا نام بنیادی بیگم تھا۔

نواب گوہر مرزا کے زمانے سے ایک ریت چلی آ رہی تھی۔ محرم میں دس محرم کو ایک بڑی مجلس ہوا کرتی تھی ہر دور میں یہ مجلس ہوتی آ رہی تھی اور یہ سلسلہ آج بھی جاری تھا۔ بدایوں کے لوگ جانتے تھے کہ یہ مجلس نواب گوہر علی کے زمانے سے ہو رہی ہے اس مجلس کے لئے کسی بلاوے کی ضرورت نہیں تھی لوگ دو پہر کے بعد خود بخود آنا شروع ہو جاتے تھے خواتین کے لئے الگ انتظام ہوتا تھا۔ ذاکر کی آواز مردوں اور عورتوں کو پوری طرح آتی تھی۔ کھانے پینے کا پورا انتظام جس طرح نواب گوہر کے زمانے میں ہوا کرتا تھا ویسا ہی انتظام آج بھی ہوتا تھا پوری حویلی کی صفائی کی جاتی تھی اور بے حساب مٹھائی

جاتی۔ ہر روز وہ نہیں آتی تھی کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کئی کئی دن گزر جاتے، محرم میں اکثر وہ نہیں آتی تھی۔

حویلی کی پراسراریت اس گونگی عورت کی وجہ سے اور بڑھ گئی تھی۔ اس کے علاوہ دربان محرم کے علاوہ کسی کو دروازے کے قریب نہیں آنے دیتا تھا مگر لوگ بتاتے تھے کہ حویلی میں رات کے وقت آمد و رفت ہوتی رہتی ہے۔

☆.....☆.....☆

رکاب گنج ایک بہت بڑا محلہ تھا ہر جگہ کچھ سر پھرے تو ہوتے ہیں ایسے لوگ بلاوجہ بھی ہر جگہ اپنی ٹانگ پھنسا دیتے ہیں۔ ایسی ہی ایک ٹولی یہاں پر بھی پیدا ہو گئی اس کے روح رواں اچھ میاں تھے۔ نام تو ان کا کچھ اور تھا مگر سب اسی نام سے جانتے تھے۔ کسرت کرنے کا ان کو بے حد شوق تھا اس لئے گھر میں ہی اکھاڑا بنا رکھا تھا ان کے ہم عمر لڑکے اکھاڑے میں زور کرتے تھے کھاتے، پیتے گھرانے کے تھے اس لئے کمانے کی فکر تو تھی نہیں بس کھاتے کسرت کرتے اور کشتیاں لڑتے تھے اور دن بھر مڑ کشتیاں کرتے تھے۔ سر دار تو اچھے میاں ہی تھے مگر اس ٹولی میں سب ہی اپنی اپنی جگہ بڑے اہم تھے کیونکہ سب ہی کھاتے، پیتے گھرانوں کے تھے۔ ایک دن گونگی بازار میں ان کو نظر آ گئی۔

”یار یہ گونگی کیا کھاتی ہے، میں بچپن سے دیکھ رہا ہوں ذرا نہیں بدلی۔“ اچھن بولے۔ شاہد میاں جن کو سب شمن کے نام سے پکارتے تھے بولے۔

”یار تیری بات تو ٹھیک ہے میں نے بھی دیکھا ہے۔ اس سے پوچھنا پڑے گا کہ کیا کھاتی ہے۔“ اچھن نے کہا۔

”وہ جواب کیا دے گی گونگی ہے اور تمہاری بات کیا سمجھے گی کیونکہ بہری ہے۔“ شمن نے کہا۔

”اشاروں کی زبان تم کو سیکھنا ہوگی۔“ جعفر علی نے کہا۔

”کچھ تو کرنا پڑے گا۔“ اچھن نے کہا۔

پوری ٹولی جب تو میں لگ گئی مگر وہ گونگی عورت ان کو پھر نظر نہ آئی۔ اچھن میاں نے پتہ چلا لیا کہ وہ کس قصاب کی

دکان سے گوشت خریدتی تھی اچھن میاں اس کے پاس چلے گئے ان کے ساتھ ان کے دو تین پہلوان دوست بھی تھے۔

”وہ گونگی جو حویلی کی نوکرانی ہے تمہارے پاس سے گوشت لیتی ہے۔“ اچھن نے پوچھا۔

”ہاں میاں لیتی تو ہے۔“ قصاب نے جواب دیا۔

”بہت دن سے نظر نہیں آ رہی تمہارے پاس آئی تھی کیا۔“ شمن نے پوچھا۔

”وہ روز کب آئی ہے مگر آتی رہتی ہے اور پورے ہفتے کا گوشت لے جاتی ہے۔“

”اور آخری دفعہ تمہارے پاس کب آئی تھی۔“ اچھن نے پوچھا۔

”کل سویرے آ گئی تھی۔“ قصاب بولا۔

”اماں کیا کہہ رہے ہو سارے دن ہم نے تمہاری دکان نگاہ میں رکھی تھی کل وہ کب آئی تھی۔“ شمن نے کہا۔

”میری بات غور سے سنو تم سب اچھے گھرانوں کے بچے ہو تم کیوں اس قسم کی فکروں میں پڑے ہو کہ کون آ رہا ہے کون جا رہا ہے آنے جانے کا سلسلہ تو نہ جانے کب سے لگا ہوا ہے تم اپنے کام سے کام رکھو اس قسم کی فکروں سے کچھ فائدہ نہیں ہوا کرتا بلکہ نقصان ہو جایا کرتا ہے۔“

قصاب نے کہا۔

”بات تمہاری درست ہے مگر یہ پراسراریت تجس

تو پیدا کرتی ہے۔“ اچھن بولے۔

”اور یہی بلاوجہ کی کھوج آدی کو پریشانی میں ڈال بھی دیتی ہے۔“ قصاب نے جواب دیا۔

”اب یہی دیکھ لو تم کہتے ہو وہ صبح آ کر گوشت لے گئی اور ہم جو اس کی تلاش میں تھے اس کو نہ دیکھ سکے یہ

پراسراریت ہی تو ہے بلکہ تعجب کی بات ہے۔“ شمن نے کہا۔

”میں پوچھتا ہوں تم کو آخر اس کی فکر کیوں ہو گئی ہے۔ وہ آج سے نہیں ایک زمانے سے میری دکان سے

گوشت خرید رہی ہے میں جب چھوٹا تھا تو وہ میرے باپ

کے پاس آیا کرتی تھی میں نے دکان سنبھالی تو میرے

”نہیں بھی ہمارا مشن کبھی ادا ہو رہا ہے۔“ چھن نے کہا۔

”میرا تو خیال ہے استاد ادا ہو رہی رہنے دو ہمارا کیا نقصان ہو رہا ہے۔“ گئیش جو کہ سب لڑکوں میں بزدل مشہور تھا بولا۔

”اے تو اپنی تو رہنے دے ڈر پوک کہیں کا۔“ شہین غصے سے بولا۔

”ڈر پوک نہیں ہوں میں مگر بلا وجہ کی کوچہ پھرنے کا فائدہ۔“ گئیش بولا۔

”اے تو کیا وہ حویلی ایسی ہی پراسرار بنی رہے گی۔“ کچھ پیہ تو چلے۔

قصاب کا کہنا تھا کہ وہ عورت برابر گوشت خرید رہی تھی مگر پوری ٹولی پریشان تھی کہ ان کی نظر میں وہ نہیں آ رہی۔

آخر یہ فیصلہ ہوا کہ حویلی میں جانے کی کوشش کی جائے۔ مگر کوئی دیوار اتنی نیچی نہیں تھی کہ وہاں سے کود کر اندر جایا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ دروازے سے جایا جائے۔

اس ٹولی کے سات لڑکے تھے سب اکھاڑے میں زور کرتے تھے اور جوان تھے۔ یہ ساری کارروائی وہ اپنے طور پر کر رہے تھے محلے کے کسی بڑے کو اس کے بارے میں پتہ نہیں تھا۔ تو طے یہ ہوا کہ دروازے سے اندر جائیں گے۔ دروازے پر سب سے بڑی رکاوٹ وہ دربان تھا۔

دوسرے ہی دن اچھن اور جعفر علی حویلی کے دروازے پر موجود تھے۔ دربان نے پوچھا۔ ”کیوں آئے ہو کس سے ملنا ہے؟“

اچھن اور جعفر علی دربان کی آواز سن کر حیران ہو گئے۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے سیٹی کسی بند کرے میں گونجتی ہے۔

اچھن نے کہا۔ ”ہم لوگ اس محلے کے ہیں باجی سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔“

”وہ کسی سے ملاقات نہیں کرتیں۔“ سیٹی پھر گونجی۔

پاس آنے لگی وہ میری بہت اچھی گاہک ہے اس نے کبھی ادا نہیں کیا، میں نے اس میں کبھی کسی قسم کی تبدیلی محسوس نہیں کی۔“ قصاب نے کہا۔

”تم نے تو مجھے اور حیرت کی بات بتادی۔“ اچھن نے کہا۔

”میں اسی لئے کہتا ہوں اپنے کام سے کام رکھو۔“ قصاب نے کہا۔

”حیرت پر حیرت کی باتیں ہم سن رہے ہیں ان حالات میں بھلا ہم خاموش رہ سکتے ہیں اب تو اور زیادہ تجس ہو گیا ہے کھون تو کرنا پڑے گی۔“ چھن نے کہا۔

”میں پھر کہتا ہوں ایسا ہرگز نہ کرنا تم لوگ نوجوان ہوجم میں نیا خون جیزی سے گردش کر رہا ہے، اکھاڑے میں اور دنیا میں بڑا فرق ہے۔“ قصاب بولا۔

”ٹھیک ہے میاں ہم خود ہی سب کچھ کریں گے۔“ ”میں پھر کہتا ہوں ان چکروں میں نہ پڑو کیوں بلا وجہ کی پریشانی میں پڑتے ہو۔“

مگر قصاب کے کہنے کا اثر ان پر کچھ نہ ہوا۔ اب انہوں نے حویلی کے دروازے کی نگہداشت شروع کر دی اور دولڑکے قصاب کی دوکان پر نظر رکھنے لگے۔ پورے ہفتہ وہ عورت ان کو نظر نہ آئی۔ جو دولڑکے دروازے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا۔

”استاد وہ تو عجیب آدمی ہے سارا دن دروازے پر رہتا ہے میں نے سو چار تار کو سوتا تو ہوگا مگر وہ تو رات کو بھی دروازے پر موجود تھا سوتا کب ہے۔“ جعفر علی نے بتایا۔

اچھن نے کہا۔ ”وہ رات کے آخری پہر ضرور سوتا ہوگا، میں رات کو تمہارے پاس آؤں گا اور دیکھوں گا۔“

مگر اچھن حیران رہ گیا کہ پہرے دار رات بھر ایک منٹ کو دروازے سے نہیں ہٹا اور اس کو ذرا نیند نہیں آئی اور دن میں بھی پھر موجود تھا۔

اب تو اچھن کو فکر ہو گئی۔ ”یار یہ کوئی جن بھوت لگتا ہے۔“ اچھن نے کہا۔

”مشن تو ادا ہو رہا گیا پھر۔“ شمشاد کی آواز سنائی دی۔

”ضروری کام ہے ملاقات کرنا ضروری ہے۔“
جعفر علی نے کہا۔

”کیا کام ہے مجھے بتاؤ۔“ دربان بولا۔

”کام تو ان کو ہی بتائیں گے تم ان سے ملاقات

کرادو۔“

”اس وقت ان سے ملاقات نہیں ہوگی تم شام کو

سورج غروب ہونے کے بعد آؤ۔“ دربان بولا۔

”ٹھیک ہے ہم شام کو آ جائیں گے۔“ اور دونوں

واپس آ گئے۔

شام کو پھر دونوں حاضر تھے دربان ان کو دیکھ کر

بولا۔ ”دیکھو بچو! تم غلط جگہ آ گئے ہو اندر تمہارے لئے جانا

خطرے کی بات ہو سکتی ہے۔“

”مگر ہم تو صرف ملاقات کرنے آئے ہیں۔“

اچھن نے کہا۔

”ٹھیک ہے آؤ میرے ساتھ۔“ اور وہ ان کو لے کر

اندر چلا۔ دروازے کے اندر ہر طرف اندھیرا تھا اندر ہر

طرف بڑے بڑے دالان اور کمرے تھے مگر سب

اندھیرے کی چادر اوڑھے تھے۔ ان کمروں میں بڑی بڑی

چمگاڈیں اڑتی نظر آ رہی تھیں کئی ان کے قریب سے بھی

گزر رہی اندر سے یہ حویلی اتنی بڑی ہوگی اس کا اندازہ

دونوں کو نہیں تھا۔

کئی غلام گردشوں اور دالانوں، کمروں سے گزرنے

کے بعد وہ ایک کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو گیا کمرے کا

دروازہ بند تھا اندر بھی اندھیرا تھا۔ جھینگروں کی آوازیں آ رہی

تھیں اور چمگاڈیں ان کے سروں پر گردش کر رہی تھیں۔

دربان نے کہا۔ ”اس کمرے میں مالکن رہتی ہے مگر

میں اس کے اندر نہیں جاؤں گا اور نہ دروازے پر دستک

دوں گا یہ کام تم کو کرنا ہوگا مگر میرے جانے کے بعد۔“ اور

دربان اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ اب دونوں

دروازے کے سامنے اکیلے کھڑے تھے۔ حویلی کے اندر کا

ماحول اتنا ڈراؤنا ہوگا اس کا اندازہ ان کو نہیں تھا ہر طرف

اندھیرا چھ رہا تھا۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی اور ان

چمگاڈوں کے پروں کی آوازاں کی سماعت پر بہت

بڑے دھماکے بن کے آنے لگی۔ ان کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ

دروازے پر دستک دیں۔ ان کے اندر ڈرنے و سوسے پیدا

کر دیئے تھے اندر پہنچ نہیں کیا ہوگا۔ ان کی بہادری ہوا ہو چکی

تھی اور ان کی جگہ پچھتاوے نے لے لی تھی۔ دروازے کے

باہر کھڑے زیادہ دیر نہیں گزری تھی مگر ان کے لئے یہ وقت

بھی اذیت سے بھر پور تھا اچھن نے بڑی مشکل سے کہا۔

”جعفر واپس چلتے ہیں۔“ جعفر کی حالت بھی

اچھن سے بہتر نہ تھی اس نے جواب دیا۔

”ہاں استاد جگہ ٹھیک نہیں ہے۔“

وہ دونوں واپس آنے کو مڑے ہی تھے کہ دروازہ

کھلنے کی جھچکاہٹ پیدا ہوئی تو دونوں نے دیکھا کہ

دروازہ پورا کھلا ہوا تھا اور اس کے درمیان کوئی کھڑا تھا۔

اندھیرے میں بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی جوان

عورت ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ساکت ہو گئے۔

پھر ایک آواز ان کے کانوں میں

آئی۔ ”اندر آ جاؤ۔“ اور عورت اندر چلی گئی۔

اب دونوں کے لئے واپس ہونا مشکل تھا دونوں

کمرے کے اندر چلے گئے۔ کمرے کے اندر گھپ اندھیرا

تھا ان کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا مگر انہوں نے محسوس کر لیا تھا

کہ فرش ننگا نہیں تھا۔ فرش پر دبیز قالین پڑا تھا۔

پھر کئی عورت نے بڑی خوبصورت آواز میں کہا۔

”کھیراؤ نہیں، میں روشنی کرتی ہوں۔“ چند لمحوں

کے بعد کمرہ روشن ہو گیا۔

کمرہ بہت بڑا تھا اور فرش پر سرخ قالین پڑا تھا۔

بہت شاندار فرنیچر رکھا تھا کمرے کی ہر شے سے امارت ٹپک

رہی تھی۔ دیواروں پر قد آدم، ہاتھ کی بنائی تصویریں لگی ہوئی

اس شرط کی بنیادی بات تھی تو بنیادی بیگم آج آزاد ہے تم
نوجوان ہواور میں صدیوں سے پیاسی ہوں۔

دیکھو میں آج تک تروتازہ اور جوان ہوں تم نے
مجھ پر احسان کیا ہے میں تم دونوں کی خدمت کروں اب تم
اس حویلی کے مہمان بن کر رہو گے۔“ عورت نے کہا۔
اچھن نے بڑی مشکل سے کہا۔ ”آپ ہمیں جانے
دیں ہم سے بڑی بھول ہو گئی ہے معاف کر دیں۔“

”تمہاری بھول نے مجھے زندہ کر دیا ہے، میں پھر سے
جوان ہو رہی ہوں اور تم جانے کی بات کرتے ہو میں تم
دونوں کو ہرگز نہیں جانے دوں گی جانے کی بات بھول جاؤ۔“
پھر اس نے زور سے تالی بجائی تو دروازے سے
ایک نو عمر لڑکی اندر داخل ہوئی اس لڑکی کے بدن پر جو لباس
تھا اس نے اس کو اور زیادہ پیمان انگیز بنادیا تھا۔ عورت
نے لڑکی کو کہا۔ ”جشن کا بندوبست کر دیکھتی نہیں کہ کتنے
اہم مہمان آئے ہیں۔“ لڑکی کمرے سے باہر چلی گئی۔
عورت مسہری پر لیٹ گئی اس کے لیٹنے کے انداز کو دیکھ کر
دونوں کے بدن میں چیونٹیاں سرسرا نے لگیں۔

کچھ ہی دیر میں لڑکی نے آکر بتایا سب تیاری ہو گئی
ہے۔ عورت اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”آؤ تمہاری آمد کی
خوشی میں جشن منایا جا رہا ہے میرے ساتھ آؤ۔“ اور وہ
دروازے کی طرف چلی اور دروازے سے باہر آ گئی وہ
دونوں بھی اس کے ساتھ باہر آ گئے اب باہر اندھیرا نہیں تھا
روشنی تھی مگر کہاں سے آ رہی تھی پتہ نہیں چلتا تھا۔ آسان پر
ایک بھی چمکا دھنیں تھا اور جھینگروں کی آواز بھی بند تھی۔ وہ
چلتے ہوئے ایک بہت بڑے چبوترے پر پہنچ گئے ان کے
آتے ہی ہر طرف سے تالیوں کی آوازیں آنے لگیں
چبوترے کے چاروں طرف مرد و عورتیں زرق برق
لباسوں میں بیٹھی تھیں اور سب ہاتھ اٹھا کر اپنی خوشی کا
اظہار کر رہے تھے چبوترے پر تین کرسیاں رکھی تھیں۔

بنیادی بیگم نے دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا چبوترے
پر خوب روشنی تھی۔ اچھن اور جعفر نے روشنی میں بنیادی
بیگم کو پہلی بار اچھی طرح دیکھا۔

تھیں کھڑکی کے پاس ایک بہت بڑی مسہری پڑی تھی اس پر
بھی سرخ رنگ کی چادر پڑی تھی بڑے بڑے سنکے سرہانے
رکھے تھے اور ایک حسین اور جوان عورت ان کے سامنے
بیٹھی تھی۔ ان دونوں کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی
ملاقات کسی جوان اور حسین عورت سے ہوگی۔ واقعات وہ
پیش آرہے تھے جن کے بارے میں انہوں نے ذرا نہیں
سوچا تھا اس لئے ان کے اعصاب بری طرح مجروح
ہو گئے تھے۔ ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی
اب تو حالات کے دھارے پر انہوں نے خود کو چھوڑ دیا تھا۔
”حیران ہو رہے ہو، بہت شوق تھا تم کو ملاقات کرنے
کا۔“ عورت نے کہا۔ مگر دونوں کی آواز نہ نکلی تو وہ پھر بولی۔
”میں بنیادی بیگم ہوں۔ نواب گوہر مرزا کی بیگم۔“

وہ بولی۔
اچھن کو یہ سن کر بہت تعجب ہوا بڑی مشکل سے
بولی۔ ”مگر نواب گوہر کو مرے تو سو سال سے زیادہ ہو گیا۔
ان کے لڑکے بھی مر گئے۔“
”مگر میں ہوں وہ دیکھو نواب گوہر مرزا کی یہ تصویر
ہے۔“ عورت بولی۔

اب تو اچھن اور جعفر کی حالت اور خراب ہو گئی۔
”میں نے نواب سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کی قوم
کے کسی آدمی یا عورت کو کبھی تکلیف نہیں دوں گی میں نے
اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔ میں نے نواب سے کہا تھا کہ میرے
معاملات میں مداخلت اگر ہوگی تو میں آزاد ہوں گی۔ تم
دونوں نے یہاں آ کر بہت بڑی غلطی کی ہے میں اب
آزاد ہوں۔“ وہ زور سے ہنس کر بولی۔ ”میں آزاد ہوں۔“
”آپ کون ہیں۔“ جعفر نے ڈرتے ڈرتے
پوچھا۔

”میں تم کو یہ بتانے کی پابند نہیں ہوں، نواب گوہر
مرزا کو بھی میں نے نہیں بتایا تھا تو پھر تم کو کیوں بتاؤں
میرے حکم کے خلاف اس حویلی میں کبھی کچھ نہیں ہوا۔ جبکہ
میں آزاد بھی نہیں تھی اب تو میں آزاد ہوں تم نے مجھے
آزادی دلائی ہے تم میری کھوج کرنے خود آئے ہو یہی

اچھن بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ رات کب گزر گئی اچھن کو پتہ نہ چلا مگر صبح وہ خود کو بہت کمزور محسوس کر رہا تھا۔

رات والی فتنہ کرنے اس کے سامنے گوشت اور دودھ لا کر رکھ دیا اور اس نے ناشتہ کر لیا۔ اس کو ذرا خیال نہیں آیا کہ وہ کہاں پر ہے اس کے غائب ہونے پر اس کے گھر والے پریشان ہوں گے۔ وہ کیوں یہاں آیا تھا اور کس چکر میں پھنس گیا ہے اس کو صرف وہ حسین جسم اور اس کے ساتھ گزری رات یاد تھی۔ دوسری رات وہ اکیلا ہی رہا، بنیادی بیگم نے جعفر کو موقعہ دیا اور پھر یہ سلسلہ جاری ہو گیا مگر اچھن اور جعفر دونوں الگ، الگ ہی رہے۔ دونوں ہر رات بے چینی سے بنیادی کا انتظار کرتے اور اس کی مرضی جس کے ساتھ ہوتی وہ وہاں پر ہوتی۔ کتنے دن گزر گئے ان کے پاس اس کا شمار نہیں تھا۔ ان کو صرف ایک چیز نظر آتی تھی وہ اس کے دیوانے تھے مگر بدن ان کے پہلوئی جسم پھل رہے تھے۔ ان کو خوراک بہت اچھی دی جا رہی تھی مگر اس خوراک کی غذائیت سے زیادہ ان کی توانائی کھینچی جا رہی تھی آخر انسان تھے کچھ ہی دن میں ان کی ٹانگوں نے کھڑے ہونے سے انکار کر دیا۔

ان کے اعضاء بکھرنے لگے۔ چیتے کی طرح کے سینے اندر کو دھسنے لگے..... اب ان پر بنیادی بیگم کو دیکھ کر لرزہ طاری ہونے لگا۔ ”اب تم دونوں اس قابل نہیں ہو کہ اس حویلی میں رہو۔“ ایک دن بنیادی بیگم نے کہا۔

مدت کے بعد آج دونوں دوست آئے آئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بنیادی پھر بولی۔ ”بولو تم کیا چاہتے ہو تم نے مجھے خوشی دی آرام دیا میں تم پر رحم کرنا چاہتی ہوں حالانکہ یہ یہاں کے اصولوں کے خلاف ہے۔“

دونوں سحر زدہ تھے۔ دونوں گھر کا راستہ بھول چکے تھے دونوں کو اپنا ماضی یاد نہیں تھا سب کچھ گہری دھند میں گم ہو گیا تھا۔ وہ کیا جواب دیتے۔

بنیادی بیگم نے پھر کہا۔ ”میں تم کو تمہارے گھر

ان کی نظریں اس کے سراپے میں گم ہو گئیں۔ وہ دراز قد تھی اور سیسے بدن تھی اس کے بدن کا ایک، ایک نشیب و فراز بہت مناسب تھا۔ اس کی بکھری زلفیں اس کے شانوں پر ڈی تھیں گردن صراحی دار تھی اور آنکھیں ذرا تر چھٹی اور یہی ان کی خوبصورتی تھی۔ اس کے بدن سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ دونوں اس کو دیکھ کر مدہوش ہو گئے تھے۔ بن پنے ان پر اس حسین پیکر کا نشہ چڑھ رہا تھا۔

وہ بھول گئے تھے کہ وہ کہاں ہیں ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے ان کا ذہن ماضی کی ہر بات بھول چکا تھا۔ آنے والے وقت کا بھی ان کو اندازہ نہیں تھا ان کو صرف حال نظر آ رہا تھا اور وہ اس میں مست تھے۔

پھر سازوں کی آوازیں آنے لگیں۔ نہ معلوم کون سے ساز تھے مگر ان کی دھن اور لے دل پر اثر کرتی تھی۔ ان سازوں کی آواز کے ساتھ کسی مغنیہ کی آواز بھی شامل ہو گئی مگر یہ کس زبان کا گیت تھا اس کے بول دونوں کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے مگر مطلب سمجھ میں آ رہا تھا یہ خوشی کے اظہار کا گیت تھا اس کے ہر لفظ میں خوشی کا اظہار ہو رہا تھا اس گیت کو سن کر جذبات میں تلاطم پیدا ہو رہا تھا سامنے بیٹھے لوگ اس گیت کو سن کر مستی میں جھوم رہے تھے اپنی، اپنی عورتوں سے پیار کر رہے تھے جذبات کو بھڑکانے والا یہ گیت ان دونوں کو بھی بے چین کر رہا تھا۔

گیت ختم ہوا اور بنیادی بیگم اٹھ کھڑی ہوئی اس کے کھڑے ہوتے ہی تمام لوگ کھڑے ہو گئے۔ بنیادی بیگم نے دونوں کا ہاتھ پکڑا اور واپس چل دی۔

کمرے کے پاس آ کر اس نے اچھن کو کہا۔ ”تم اندر جاؤ۔“

اچھن ایک سحر زدہ انسان کی طرح کمرے کے اندر چلا گیا۔ بنیادی بیگم نے جعفر علی کا ہاتھ پکڑا اور ایک دوسرے کمرے میں اس کو لے گئی۔ وہاں پر کوئی نہیں تھا مگر کمرہ خوبصورت تھا اور بڑا نرم ملائم بستر ایک بڑی سی مسہری پر پڑا تھا۔ جعفر کو اس نے اس پر لٹا دیا اور واپس آ گئی۔

مگر اس دوران یہ بھی ہوا کہ اچھن کے اکھاڑے لڑ، ایک جوان شوکت علی غائب ہو گیا اب حویلی پر الزام کس طرح رکھیں پہلے ان پر شک کیا تھا تو کیا ملتا تھا۔ پولیس میں رپورٹ کردی اور اپنے طور پر بھی اس کی تلاش جاری کردی مگر ایک مہینہ گزر گیا۔

اچھن اور جعفر کا علاج جاری رہا مگر ان کی صحت ٹھیک ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ حکیموں کا کہنا تھا کہ ایسا لگتا ہے ان کے جسم میں اب تک بھری ہوئی ہے۔

ابھی شوکت کے بارے میں پتہ نہ چلا تھا کہ ایک لڑکا منصور بھی غائب ہو گیا۔ حملہ رکاب بچ کے لوگ پریشان ہوئے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے کبھی یہاں پر ایک مرغی کا بچہ کم نہیں ہوا اور اب جوان لڑکے غائب ہو رہے تھے۔ والدین نے لڑکوں پر پابندی لگا دی ہر طرف نگہداشت ہونے لگی۔

لوگوں نے پھر حویلی والوں پر ہی شک کا اظہار کر دیا۔ پورے محلے کیا پورے شہر میں وہی پر اسرار جگہ نظر آتی تھی سرکاری مشنری حرکت میں آ گئی اور پولیس نے حویلی پر دن کے دس بجے اچانک چھاپہ مار دیا مگر ڈھاک کے تین پات پھرنے کا می ہوئی کچھ برا آمد نہ ہو سکا۔ یہ سلسلہ رکاب بھی نہیں پورا شہر پریشان ہو گیا۔

اب جو لڑکے غائب ہو رہے تھے وہ واپس بھی نہیں آئے صرف اچھن اور جعفر علی واپس آئے تھے مگر ان کی حالت اب بھی بہتر نہ تھی اچھن اور جعفر کے والد نے فیصلہ کیا کہ دونوں کو دلی لے چلتے ہیں وہاں پر بہت بڑے نامی گرامی حکیم موجود ہیں شاید وہ کچھ کر سکیں۔

خاموشی سے ان دونوں لڑکوں کو لے کر ان کے والد دلی آ گئے اور دوسرے ہی دن وہ حکیم وقار کے مطب میں آ گئے حکیم صاحب نے دونوں کا معائنہ کیا۔ پھر رولو کا کو بلایا اور اس نے بھی اپنے انداز میں دیکھا اور کہا۔ ”ان دونوں کو بڑی بے دردی سے استعمال کیا گیا ہے اور استعمال کرنے والی ہستی انسان نہیں ہے۔ ان کے جسم میں

پہنچائے دیتی ہوں حویلی کے باہر جاتے ہی تم کو سب کچھ یاد آ جائے گا۔ مگر میری بات یاد رکھنا تمہاری زبان پر کبھی میرا نام نہ آئے تم نے حویلی کے اندر کیا دیکھا تم نے کیا کیا کسی کو پتہ نہ چلے۔ اگر تم نے کسی کو بتایا تو پھر تمہارا ٹھکانہ زمین پر نہیں ہوگا۔“

اور پھر رات کے اندھیرے میں ان کو دروازے سے نکال دیا گیا۔

حویلی سے باہر آتے ہی ان کے ذہن کی دھند صاف ہو گئی۔ ان کو یاد آ گیا کہ وہ کون ہیں اور کیوں حویلی کے اندر گئے تھے پھر انہوں نے خود اپنی حالت پر نظر کی تو وہ حیران رہ گئے۔ ان پر گزری ساری روداد کو یاد آ گئی اور وہ خود سے شرمندہ ہو گئے۔

رات کو ہی بڑی مشکلوں کے بعد وہ اپنے اپنے گھروں کو پہنچ گئے، ان کو زندہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے ان کے بارے میں مشہور ہو گیا تھا کہ وہ شاید حویلی میں جا کر مر گئے ہیں۔ ان کے ساتھی لڑکوں نے بتا دیا تھا کہ وہ دونوں حویلی میں گئے ہیں۔

محلے والوں نے حویلی والوں کے خلاف رپورٹ کر دی تھی اور مقامی پولیس نے پوری حویلی کی تلاشی لی تھی مگر حویلی میں تین نفر کے علاوہ کوئی نہیں تھا بڑے، بڑے کمروں میں چمکا ڈیس اٹلی لگی تھیں اور سارے کمرے کا ٹھہ کہاڑ سے بھرے پڑے تھے۔ پولیس کے ساتھ کچھ محلے والے بھی تھے حویلی کے چپے چپے کی تلاشی لی گئی تھی مگر ان کو کوئی چیز ایسی نہیں ملی جس سے ان کا سراغ ملتا لوگ مایوس ہو گئے تھے گھر والے رولو کو صبر کر چکے تھے کہ دونوں اچانک واپس آ گئے ان پر سوالات کی بوچھاڑ تھی مگر وہ کسی سوال کا جواب نہیں دے رہے ان کی زبانیں خاموش تھیں ان کے جسم لآخر تھے وہ بہت پرانے مریض لگتے تھے۔

پھر ان کے بزرگوں نے فیصلہ کیا کہ ان سے کچھ نہ پوچھا جائے پہلے ان کا علاج کروایا جائے صحت مند ہونے کے بعد پوچھا جائے۔ اس وقت ان کی ذہنی حالت اچھی نہیں ہے۔ شہر کے بہترین حکیموں سے ان کا علاج شروع ہو گیا۔

”بہت آرام آ رہا ہے سکون مل رہا ہے جلن اور تپش کم ہو رہی ہے۔“ یہی جواب جعفر نے بھی دیا۔

رولوکا اطمینان سے بولا۔ ”خوش ہو جاؤ بزرگو آپ کے بچے ٹھیک ہو جائیں گے۔“

تین دن کی محنت نے ان کے جسم کی سرخی اور گرمی کے تمام آثار ختم کر دیئے۔ اور ان کو مقوی دوائیں اور خوراک دی جانے لگی اور صرف ایک ہفتہ میں وہ اٹھ کر بیٹھ گئے ان کی حالت بدل گئی چہروں پر رونق آ گئی۔ اب رولوکا کو ان سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

”اب تم دونوں یہ بتاؤ اس کے چنگل میں کس طرح پھنس گئے۔“

اور دونوں نے رولوکا کو پوری تفصیل بتا کر کہا۔ ”اس نے کہا تھا کہ تم نے اگر کسی کو میرے بارے میں بتایا تو تمہارا ٹھکانا زمین پر نہ ہوگا، ہم نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے اب وہ ہم کو نہیں چھوڑے گی۔“

”تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، بے فکر ہو کر ہمارے پاس رہو۔ میں بدایوں جانا ہوں اور اس کا کچھ علاج کرتا ہوں۔“ رولوکا نے ان دونوں پر ایک سخت پہرے دار لگایا اور خود بدایوں روانہ ہو گیا۔ بدایوں میں سخت خوف و ہراس تھا کئی نوجوان غائب ہو چکے تھے اور کسی کا پتہ نہیں چلا تھا سرکاری طور پر بھی پولیس کام کر رہی تھی مگر کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔

بدایوں میں رولوکا کسی کے پاس نہیں گیا۔ اس نے کسی سے رابطہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور وہ روپوشی کی حالت میں حویلی کے قریب رہا۔

دن کے گیارہ بجے ایک ادھیڑ عمر عورت بڑے دروازے سے باہر آئی اور بازاری کی طرف چلی رولوکا اس کے قریب تھا وہ عورت گوشت کی دوکان پر گئی اور اس نے پانچ کلو گرامے کا گوشت خریدا پھر دو کلچی بعد دل پھینچڑے کے خریدا اور واپس مڑی۔ رولوکا اب بھی اس کے ساتھ لگا ہوا تھا وہ حویلی کے دروازے کے پاس آئی ہی تھی کہ دروازہ کھل گیا اس کے اندر جانے سے پہلے ہی رولوکا اندر جا چکا تھا اب وہ تھملا اٹھا ہے اندر چلی اور ایک بہت بڑے

اب تک اس کی گرمی کے آثار موجود ہیں پہلے ان اثرات کو ختم کرنا ہوگا ٹھنڈی دوائیں استعمال کرانا ہوں گی جب وہ اثرات زائل ہو جائیں گے تو پھر ان دونوں میں توانائی آئے گی۔ یہ کام بہت صبر کرنے کا ہے میں ان کی دوائیں لے کر آتا ہوں کیونکہ مطب میں وہ نہیں ہیں۔ آپ حضرات جہاں دل کرے رہیں مگر یہ دونوں یہیں پر رہیں گے۔“

”یہ ٹھیک تو ہو جائیں گے۔“ جعفر علی کے والد نے پوچھا۔

حکیم وقار نے جواب دیا۔ ”خدا پر بھروسہ رکھیں ہر مرض کی دوا خدا نے بنائی ہے۔“ رولوکا فوراً روانہ ہو گیا اور کہہ گیا درکار سفر ہے کل شام تک واپسی ہوگی۔

دوسرے دن شام کو رولوکا کچھ پھل لے کر آ گیا۔ ان پھلوں کی رنگت برف کی مانند تھی اور ہری ہری دھاریاں پڑی تھیں جیسے خربوزے پر ہوتی ہیں۔ ان کا سائز بھی خربوزے جتنا تھا۔ رولوکا نے آتے ہی ایک برتن میں رکھ کر اس پھل کو کاٹ دیا اندر سے اس میں پورا گودا بھرا تھا اور پہلی نظر میں وہ برف ہی نظر آتا تھا۔ رولوکا نے بتایا۔ ”یہ پھل زمین سے بہت بلندی پر ایک درخت میں لگتا ہے وہ درخت بارہ مہینے برف میں دبا رہتا ہے یہ اس قدر ٹھنڈا ہے کہ یہ عام آدمی ایک چٹنا تک بھی اگر کھالے تو زندگی بھر اس کو گرمی نہیں ستائے گی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔ اس پھل کو مریض کو کھلانا نہیں ہے بدن پر اس کے گودے کا لپک کرنا ہے۔“

آپ دیکھیں گے کہ مریض کے اندر کتنی گرمی ہے۔ عام آدمی پر یہ گودا اس کے جسم پر پھیر دیا جائے تو اس کو نمونیا ہو جائے گا۔ مگر تمہارے مریض اس سے ٹھیک ہوں گے۔“

رولوکا نے وہ گودا اچھن اور جعفر کے جسم پر رکھنا شروع کر دیا۔

گودا رکھتے ہی مریض کے چہرے پر جو بے چینی اور بے آرامی کی کیفیت تھی ختم ہونے لگی رولوکا نے اچھن سے پوچھا۔ ”اب تم کیا محسوس کرتے ہو۔“

کے لئے یہ کام زیادہ مشکل نہ تھا رات ہو گئی رولوکا حویلی کے اندر رہی رہا۔

سارے کمرے اندھیرے میں ڈوبے تھے مگر میدان میں رونق تھی۔ سارے لوگ میدان میں آگئے تو آخر میں بنیادی بیگم بھی میدان میں آگئی اور چوترے پر رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ رولوکا اس کے قریب ہی تھا۔ ان لوگوں میں سے ایک بوڑھا بنیادی کے قریب آ گیا اور بولا۔ ”حالات خراب ہو رہے ہیں حویلی میں انسانوں کی آمد و رفت بڑھ رہی ہے۔ پہلے ایسا نہیں تھا ہم لوگ سکون سے تھے تم نے ہم پر احسان کیا تھا اس حویلی میں آباد کیا تھا ہم کو جگہ دی مگر اب تمہاری وجہ سے ہماری پریشانیوں بڑھ رہی ہیں۔ تمہارے شوق نے حضرت انسان کو چوکنا کر دیا ہے یہ حویلی ان کی نظر میں خطرناک ہو گئی ہے۔

حالانکہ ہم نے ان کو کبھی نہیں ستایا اور انہوں نے بھی کوئی کھوج نہیں کی نہ ان کو ہم سے دکھ پہنچانے ہم کو ان سے شکایت ہوئی مگر تم نے ہمارے سب کے لئے خطرہ پیدا کر دیا ہے میں پورے قبیلے کی جانب سے کہتا ہوں کہ تم نے اب تک جو کیا وہ کیا مگر اب تم کسی انسان کو حویلی میں نہیں لاؤ گی اور اگر تم نے ایسا کیا تو پھر ہم سب اپنا ٹھکانا بدل لیں گے۔ تمہاری وجہ سے ہم سب بدنام ہونا نہیں چاہتے۔“ اور بوڑھا خاموش ہو گیا۔ بنیادی بیگم نے پوری بات سن کر کہا۔

”اس حویلی میں تمہاری وجہ میں نہیں ہوں۔ میری وجہ سے تم سب ہو۔ اگر تم نہ رہے تو بھی میں یہاں رہوں گی۔ تم احسان فراموش ہو میں نے تم سب کو آباد کیا اور تم مجھ پر ہی انگلی اٹھا رہے ہو میں نے تم کو تمہاری کسی حرکت سے روکا ہے تم کیوں میرے شوق کے آگے دیوار کھڑی کرتے ہو تم اپنا ٹھکانا بدلنا چاہتے ہو تو شوق سے چلے جاؤ۔ مگر یاد رکھو جتنی آسانی سے یہاں پر تم اپنی غذا حاصل کرتے ہو اتنی آسانی تم کو کہیں نہیں ملے گی۔ میں اس حویلی کی مالک ہوں میں اس کی بی بی بھی رہ سکتی ہوں۔“

بنیادی بیگم خاموش ہو گئی پورے میدان پر خاموشی

کمرے میں جا کر وہ گوشت رکھ دیا مگر کبھی اور دل نہیں رکھا اس کو لے کر وہ دوسرے کمرے میں گئی پہلے کمرے میں کوئی نہیں تھا مگر اس کمرے میں ایک اس کی عمر کی عورت موجود تھی۔

”میری چیز لائی ہے۔“ اس عورت نے پوچھا۔
”ہاں مالکن لائی ہوں۔“ وہ بولی۔

مالکن نے تھملا لیا اور اس میں سے کبھی نکال کر کھانے لگی۔ تھوڑی کھا کر بولی۔ ”تازہ نہیں ہے۔“
”بازار میں تو ایسی ہی ملتی ہے تازہ چاہئے تو ایک ابھی زندہ ہے اس کو نکال لاؤں۔“ ملازمہ بولی۔

”نہیں ایسا نہ کرنا ابھی اس میں کچھ دم ہے کچھ دن کام دے گا اس کے بعد دکھوں گی۔“ مالکن بولی رولوکا ان کے سامنے تھا مگر دونوں کو پتہ نہ تھا۔ اس وقت رولوکا نے خود پر بڑا کنٹرول کیا اور وہ حویلی کی طرف نکل گیا۔

یہاں پر ایک پورا قبیلہ آباد تھا اور ان سب پر اس عورت کا حکم چلتا تھا۔ یہی بنیادی بیگم تھی جس کو نو اب گوہر حسین عورت سمجھ کر حویلی میں لائے تھے مگر آدمی سمجھ دار تھے بڑی ہوشیاری سے انہوں نے اس کو پابند کر دیا تھا مگر اب ان کی پابندی ختم ہو چکی تھی اور وہ اپنے اصل روپ میں کام دکھا رہی تھی۔

رولوکا نے پوری حویلی کا اچھی طرح جائزہ لیا۔

یہاں پر اس کو ایک بہت بڑا تہ خانہ بھی نظر آ گیا۔ اس میں کچھ انسانی پنجر بھی پڑے تھے۔

پوری حویلی میں بنیادی کی قوم آباد تھی۔ شہر کے درمیان یہ حویلی تھی اس میں ان کی آبادی خطرناک تھی مگر او کا اندیشہ تو ہر وقت ہی تھا۔ اس کے علاوہ اصل خرابی تو بنیادی بیگم خود تھی وہ عیاش طبیعت رکھتی تھی جو وارداتیں ہو رہی تھیں وہ بنیادی ہی کر رہی تھی۔ اس حویلی کو خالی کرانا بہت ضروری تھا۔ مگر ایک دم پورے قبیلے سے لڑنا بھی ٹھیک نہیں تھا کیونکہ وہ بھی جواب میں ضرور کچھ کریں گے اور سبھی آبادی ہونے کی وجہ سے عوام کو نقصان ہونے کا خطرہ بھی تھا اگر بات صرف بنیادی بیگم تک ہوتی تو رولوکا

نے تیرے تمام راستے پہلے ہی بند کر دیئے ہیں تو اس حویلی کی حدود سے باہر نہیں جاسکتی۔“ رولوکانے جواب دیا۔
 ”ارے جاؤ کیا مجھے روکے گا۔“ بنیادی بولی۔
 ”تو پھر تجربہ کر لے۔“ رولوکانے کہا۔

بنیادی بیگم اچانک ایک چیل کی شکل اختیار کر گئی اور اس نے پرواز کو پر پھیلانے مگر اس کے پروں نے ہی اس کو پرواز نہ کرنے دی۔ کیوں پروں پر بہت زیادہ وزن نہ جانے کہاں سے آ گیا۔ مگر چند سیکنڈ کے بعد وہ ایک چھچھوند کی شکل میں ایک طرف دوڑی مگر ایک بہت بڑا بلا اچانک اس کے سامنے آ گیا۔ وہ پلٹ کر واپس آئی اور ایک بڑے کتے کی شکل میں بلے پر حملہ آور ہوئی مگر اب بلے کی جگہ پر بچھ کر تھا۔ وہ پھر اپنی جگہ آ گئی اور اپنی اصل شکل میں بنیادی بن گئی۔ اس کا چہرہ پسینے میں تر تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی وہ بڑی مشکل سے بولی۔ ”تو کون ہے۔“
 ”میں انسان ہوں تو بھی اب اپنی شکل میں آ جا۔“ رولوکانے کہا۔

”مجھ پر رحم کر دے جانے دے۔“ وہ بولی۔
 ”رحم ان پر کیا جاتا ہے جو خود رحم کرتے ہیں تو نے کتنے نوجوانوں کی زندگی خراب کی ہے ان کی جان لی ہے تو رحم کس مھروسے پر مانگ رہی ہے اس منوں حویلی میں تو نے بہت ظلم کئے ہیں دیکھو یہ حویلی گر رہی ہے اور رولوکانے کے یہ کہتے ہیں چار دیواری کے علاوہ ساری حویلی گرنے لگی چار دیواری کے اندر ایک کمرہ بھی سلامت نہیں رہا۔“
 ”بس اب اس کو رہنے دے۔“ بنیادی زور سے بولی۔
 ”تاکہ تو اس کے اندر رہ کر پھر گھٹاؤ نہ کھیل رہا۔“ رولوکانے کہا۔

”میں وعدہ کرتی ہوں اب کچھ نہیں کروں گی۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”میں تیری کسی بات پر اعتبار نہیں کرتا تیرا وقت ختم ہوا۔“ اور اچانک بنیادی کے جسم میں آگ لگ گئی پہلے اس کا بدن کالا ہوا اور پھر آگ میں کوئلے کی طرح سرخ ہو گیا۔ سرخی سفیدی میں بدلی اور پھر اکھ ہو گئی اور حویلی کی

چھا گئی۔ پھر وہی بوڑھا آگے بڑھا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے ہم نے تیرا فیصلہ نہ لیا اب ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ آج رات اس حویلی میں ہمارا قبیلہ نہیں رہے گا۔ تیرا جودل کرتا ہے تو کرنا مگر یاد رکھنا تیرے لئے ہمارے قبیلے کے دروازے بند ہوں گے ہماری برادری کے کسی قبیلے والوں سے تو نہیں مل سکتی تیرا اور ہماری برادری کا رشتہ آج سے ختم تیرا برا انجام بہت قریب ہے تیرے سر پر تیرا برا انجام کھڑا ہے تو مینا ہے مگر میرا تجربہ بتا رہا ہے کہ تیرا وقت قریب آ چکا ہے۔“

”تو مجھے ڈرا رہا ہے، تو نہیں جانتا کہ میں صدیوں سے ہوں میں نے اپنی عمر ایسے ہی نہیں گزاری مجھ پر تیرے اور تیرے قبیلے کے ہونے نہ ہونے سے کچھ فرق نہیں ہوگا تم جانا چاہتے ہو تو ضرور جاؤ۔ میں تم سب پر بھاری ہوں۔“ بنیادی بیگم نے غرور سے کہا۔

سب لوگ چوہرے سے دور ہوتے گئے اور کچھ ہی دیر میں رولوکانے دیکھا کہ پوری حویلی خالی ہو گئی دربان اور بنیادی کی ملازمہ بھی چلی گئی۔ اب صرف بنیادی بیگم اکیلی تھی۔ اب وقت آ گیا تھا کہ رولوکانے نمودار ہو جائے اور وہ نمودار ہو گیا۔ بنیادی نے حیرت سے اس کو دیکھا تو بولی۔ ”تو کون ہے اور کس طرح یہاں پہنچا ہے۔“

”میں تیرے ساتھ بہت دیر سے ہوں تیرے قبیلے والے تجھے چھوڑ کر جب جا رہے تھے میں اس وقت بھی تھا تیرا ایک بوڑھا تجھے سمجھا رہا تھا اس وقت بھی میں تھا۔ تیرا غرور کا سر اتانا اوپر تھا کہ تجھے تیرے قریب بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ تو پھر مجھے تو کیا دیکھتی تھے تو تیرے اپنے نظر نہیں آ رہے تھے۔“ رولوکانے کہا۔

”تو کون ہے مجھے یہ سب کہنے والا۔“
 ”میں تیری وہ مصیبت ہوں جس کا ذکر تجھ سے تیرے بڑے نے کیا تھا۔“ رولوکانے کہا۔

”اس کو میرے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا اس لئے وہ یہ باتیں کر رہا تھا۔“ بنیادی بولی۔

”مگر میں جانتا ہوں تیرے بارے میں تیرے پاس صرف اتنی سی طاقت ہے کہ تو راہ فرار اختیار کرے مگر میں

چار دیواری ایک دھاک کے ساتھ اندر کی طرف گر پڑی۔
رولوکا پھر روپوشی اختیار کر گیا۔ صبح کے وقت حویلی
کے چاروں طرف ہزاروں لوگ کھڑے تھے اور حیران
تھے کہ اچانک اتنی مضبوط حویلی کس طرح گر گئی ہزاروں
زبانیں تھیں ہزاروں باتیں تھیں مگر رولوکا پھر وہاں نہیں رکا
اور سیدھا دلی کے لئے روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

”انسانی تاریخ میں اور کائنات میں دس، بیس ہزار
سال کی کیا حیثیت ہے اس دوران کبھی ایسا ہوا کہ سورج
اپنے وقت پر نہ نکلا ہو موسم اپنے وقت پر نہ آئے ہوں پہاڑ
اپنی جگہ ہیں تو پھر انسان اپنی جگہ قائم کیوں نہیں رہ سکتا
انسانی جسم کی ایک عمر ہے اس کو فنا ہونا ہے اور جب وہ فنا
ہو جاتا ہے تو پھر کیا باقی رہ جاتا ہے۔ ایسا تو نہیں ہوتا کہ کچھ
نہ باقی رہے اگر کچھ نہیں رہتا تو پھر حساب کتاب کا کیا
معاملہ ہے پھر ڈرناس سے ہے جو آج ہے یہی ہے مگر ایسا
نہیں ہے، جو انسان کا اصل ہے وہ تو باقی رہتا ہے اور وہ ہے
روح جو باقی رہتی ہے۔ یہی روح انسان کی اصل ہے جزا
اور سزا کے لئے اس سے ہی سوال جواب ہوتا ہے۔ نیک
عمل انسان کے کردار کو بلند کرتا ہے تو روح بھی بلند ی پر پہنچ
جاتی ہے اور انسان جب گناہ کرتا ہے دوسروں سے خود کو
افضل خیال کرتا ہے ان سے نفرت کرتا ہے انسانوں کو
نقصان پہنچانے لگتا ہے، تو خیالات برے کر لیتا ہے، اپنے
راستے سے ہٹک جاتا ہے تو پھر روح بھی ترقی نہیں کرتی اور
اس کا بھی مقام کم ہوتا جاتا ہے، اداس اداسی ہو جاتی ہے
اور وہ بھی فریاد کرتی ہے کہ مجھے اس گناہ کا جسم سے نکال۔
یہ بڑا خطرناک موڑ ہوتا ہے اس وقت اگر انسان کو
ہوش آ جائے تو وہ اپنے کئے پر بچتا ہے، گناہوں سے توبہ
کرے اور نیک ارادہ کر لے اور اس پر اڑا رہے اور اللہ
سے توبہ کر لے تو گرتے گرتے بھی سنبھل سکتا ہے توبہ کے
دروازے تو ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔“

حکیم وقار نے اپنی بات پوری کی تو رولوکا نے کہا۔

”میں یہ جانتا ہوں کہ انسان کی یہ خواہش تو رہی

پوچھا۔

ہے کہ وہ ہزاروں سال دنیا میں رہے۔ مگر یہ خواہش
میرے خیال میں نظام قدرت کے کام میں رکاوٹ کے
باعث ہوتی ہے، آپ بتائیں اگر لوگ نہ مریں تو پیدائش
کا عمل بھی روکنا ہوگا۔

اس لئے انسانی جسم کو ایک عمر دی گئی ہے، انسانی
اعضاء کی عمر ہے، انکھ کو کتنے عرصہ کام کرنا ہے، ناک کو کب
تک کام کرنا ہے، ہاتھ، پیر کب جواب دے جائیں گے، یہ
سب اعضاء جب اپنی عمریں پوری کریں گے تو جسم فنا
ہو جائے گا اور انسان کا اصل یعنی روح رہ جائے گی جسے نہ غذا
کی ضرورت ہے اور وہ نہ جگہ گھیرتی ہے، پھر دنیا میں اس کا
قیام بھی نہیں ہوتا سوائے ان کے جن کو اجازت ہو۔“
رولوکا نے کہا۔

”میرے خیال میں روح کے معاملے میں سب
مذہب کا ایک ہی عقیدہ ہے کہ روح ہوتی ہے اور وہ واپس
جاتی ہے فنا نہیں ہوتی جسم فنا ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔
”آپ نے درست کہا حکیم صاحب، سب اپنے
اپنے انداز میں یہی بات کرتے ہیں۔“ رولوکا نے کہا۔
”ہر روح کا ایک جسم ہوتا ہے اور ہر جسم کی ایک
روح ہوتی ہے۔ اور ہر روح کے لئے جسم ضروری ہے۔“
میں نے کہا۔

”آپ کی معلومات ٹھیک ہیں میں کسی عقیدے کی
مذہب پر کچھ نہیں کہتا اس لئے کہ ہر مذہب اچھی باتوں کو
سامنے لاتا ہے کسی مذہب نے خراب باتیں تسلیم نہیں کی ہیں۔
ریفارمر (Reformer) تو کسی ایک علاقے میں
نہیں آئے ان کو رب کائنات نے ساری دنیا میں بھیجا ہے۔
انہوں نے ساری دنیا میں پیغام پہنچایا ہے کہیں اس
کا اثر ہوا ہے کہیں نہیں؟ کہیں کم ہوا مگر ہوا تو ہے ہر جگہ
اچھے لوگ پائے جاتے ہیں اور آج بھی اچھے لوگوں کے
وجود کا احساس ہوتا ہے ان کے سامنے ہونے نہ ہونے
سے فرق نہیں پڑتا۔“ رولوکا نے کہا۔

”تم نے ہندوستان میں کیا محسوس کیا۔“ میں نے

جھوٹے آدمی کا علاج نہیں کرتا بات ذرا سخت ہے مگر میرا اصول یہی ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”میں آپ کے اصول کی قدر کرتا ہوں میں، جو آپ کو بتاؤں گا وہ وہی ہوگا جو مجھ پر گزرا ہے۔“ سری ناتھ نے کہا۔

”تو پھر بتائیے میں سن رہا ہوں۔“

”میرا نام سری ناتھ اور میرے پتا کا نام اودھے ناتھ تھا

ان کا دیہانت ہو چکا ہے میری چچی کا نام کانھی ہے میرے دو

لڑکے اور ایک لڑکی ہے لڑکی بڑی تھی اس کا میں نے ایک سال

ہوا بیاہ کر دیا ہے اور وہ اپنی سسرال میں ہے۔ میرا کاروبار

گاڑیوں کا ہے باپو کے زمانے میں بھی یہی تھا ہماری ٹیکسیاں

چلتی ہیں جو دوسرے شہروں میں جاتی آتی ہیں اب لاریوں کا

زمانہ آ گیا ہے تو میں نے لاریاں بھی چلانی شروع کر دی

ہیں۔ مگر جب سے میں نے لاریوں کا کاروبار کیا ہے میں برابر

گھائے میں جا رہا ہوں گاڑی اچھی حالت میں جانی ہے یوں

تو خود واپس ہی نہیں آتی باندھ کر لانا پڑتا ہے۔ آتی ہے تو بڑے

بڑے کام اس میں نکل آتے ہیں۔ میں کیا بڑے بڑے مستری

حیران رہ جاتے ہیں کہ خلاف توقع ان میں خرابیاں پیدا ہو جاتی

ہیں۔ مرمت تو کروانا ہوتی ہے وہ یہ بھی لگانا پڑتا ہے مگر پھر بھی

روڈ پر چلانا مشکل ہو رہا ہے۔ اس وقت بیس گاڑیوں میں سے

سات گیارہ میں کھڑی ہیں ملازم بے کار پھر رہے ہیں اور میں

ان پر خرچ کرتے کرتے تنک آ گیا ہوں۔ چھوٹی گاڑیوں کی

بھی یہی حالت ہے۔ میں نے ایک پنڈت سے اس کا کارن

پوچھا تو اس نے بتایا کہ تمہارے ستارے تمہارے کاروبار

سے اب میل نہیں کھا رہے ہیں تمہارے پیچھے کوئی لگا ہے اس

لئے یہ کام بند کرنا ہوگا میرا سارا سرمایہ ان پر لگا ہوا ہے میں کیسے

بند کروں اور اگر کروں تو پھر کیا کروں ہر طرف سے مایوس

ہونے کے بعد دلی آیا ہوں۔“ سری ناتھ نے کہا۔

”تمہارا ہیڈ کوارٹر تو فتح پور ہی ہوگا۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”ہیڈ کوارٹر بھی ہے اور یہاں پر میرا ورکشاپ بھی

ہے۔“ سری ناتھ بولا۔

”اور وہ پنڈت جس نے تم کو یہ بتایا وہ کہاں کا

”فیض تو یہاں بھی جاری ہے بلکہ ہر جگہ جاری ہے

اگر ایسا نہ ہو تو شیطانی وجود اس دنیا کو برباد کر دے مگر میں

ایسا محسوس ضرور کر رہا ہوں کہ اب شیطانی عمل بڑھتا جا رہا

ہے شہروں میں بھی لوگ شوقیہ شیطانی کام کی طرف راغب

ہو رہے ہیں، میرے خیال میں پچاس سے سو سال کے

اندر دنیا میں بہت کچھ تبدیلی آئے گی۔ مگر فتح شیطانی کی

پھر بھی نہیں ہوگی کیونکہ دنیا کا موجد اپنی ایجاد کو برباد نہیں

ہونے دے گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”میں باتوں میں بھول گیا ایک مریض کل آیا تھا

میں بہت مصروف تھا اور تم بدایوں میں تھے۔“ میں نے کہا۔

”تو آپ دیکھ لیتے اب تو آپ کو بھی بہت تجربہ

ہو گیا ہے۔“ رولوکا بولا۔

”میں نے سرسری نظر سے دیکھا تھا جسمانی صحت

سے وہ بڑا نہیں لگتا تھا۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر کب آئے گا وہ۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”آج اور ابھی آئے گا۔“ میں نے اس کو یہی وقت

دیا تھا۔“

کچھ دیر کے بعد رولوکا کے سامنے ایک شخص موجود

تھا رولوکا نے کہا۔ ”فرمائیے۔“

”میں کل آیا تھا حکیم صاحب نے آج کا وقت

دیا تھا۔“ وہ بولا۔

”پہلے اپنا تعارف کرا دیں۔“

”میرا نام سری ناتھ ہے میں فتح پور سے آیا ہوں۔“

یہ بڑا شہر نہیں ہے مگر پھر بھی ٹھیک ہے۔“

”آگے بتائیے۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”میں نے آپ لوگوں کی تعریف سنی تھی میں بھی

ایک پریشانی میں ہوں اس لئے آیا ہوں۔“ وہ بولا۔

”پریشانی تفصیل کے ساتھ بیان کریں اور خیال

رکھیں کہ کوئی بات غلط نہ ہو اپنی کمزوریوں کو بھی نہ چھپائیں

غلط بیانی آپ کا کام نہ ہونے دے گی۔ معالج کا سیدہ بڑا

کشادہ ہوتا ہے اس میں ہر راز راز ہی رہتا ہے اگر یہ

اطمینان آپ کو نہ ہو تو بے شک آپ جاسکتے ہیں میں کسی

ہے۔“ رولوکانے پوچھا۔

”وہ بھی فتح پور کا ہے۔“

”وہ پنڈت کیا کرتا ہے میرا مطلب ہے صرف پوجا پاٹ کرتا ہے یا کچھ اور بھی کرتا ہے۔“ رولوکانے کہا۔

”نہیں پنڈت گردھاری ناتھ کچھ اور نہیں کرتا ایک مندر میں رہتا ہے۔“

”ہر کاروبار میں کچھ نہ کچھ رقابت کسی نہ کسی سے ہوتی ہے تمہاری کوئی اس قسم کی رقابت کسی سے ہے۔“ رولوکانے پوچھا۔

”میرے پتا کے زمانے میں ان کے مقابلے کا آدمی فتح پور میں نہیں تھا کیونکہ سب سے زیادہ گاڑیاں اور ان کا اپنا ورکشاپ تھا۔ گاڑیاں وقت پر اور اچھی حالت میں ملتی تھیں سرکاری اور غیر سرکاری لوگ بڑے بھر سے ان سے رابطہ کرتے تھے اور دور دراز کا سفر کیا کرتے تھے۔ ان کے بعد وہی چلتا ہوا کاروبار میرے پاس آ گیا میں نے بھی وہی اصول قاعدے رکھے وہ ملازمین کو اچھی طرح رکھتے تھے ان کو بھرپور معاوضہ ادا کرتے تھے اس کے علاوہ تھوڑوں پر بھی ان کو نوازتے تھے وہ کہتے تھے یہی لوگ میرے ہاتھ پیر ہیں اگر یہ بھوکے ہوں گے تو چوری کریں گے پیٹ بھرا ہوگا تو چوری نہیں کریں گے چوری کرنا پیٹ سکھاتا ہے۔ میں نے لاریاں چلانا شروع کیں تو بھی میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا۔ اور بھگوں کی کرپا سے مجھے کبھی کسی آدمی کی بے ایمانی کی خبر نہیں ملی۔ میرا ایک بیٹا ورکشاپ میں اور ایک دفتر میں پیسے کا لین دین کرتا ہے۔

لاریوں کا زمانہ آتے ہی مسافر بھی اس سواری کی طرف راغب ہوئے جہاں ریل نہیں جاتی یا جو لوگ ریلوے کے اسٹیشن سے دور رہتے ہیں ریل سے سفر کریں تو دور اتارنا پڑتا ہے میں نے ان کے لئے ایسا انتظام کیا کہ لوگ ہماری گاڑیوں میں سفر کریں گے تو گاڑوں میں اتریں اس سے ہمارے مسافروں کی تعداد بڑھ گئی۔

ہمارے مقابلے پر اور لوگوں نے گاڑیاں چلائیں مگر شاید ایک دو گاڑیوں سے وہ ہمارا مقابلہ نہ کر سکے اور ان کے

پاس مرمت کی سہولیات نہیں تھیں بازاری کام تو بازاری ہوتا ہے اور وقت پر کام ہوتا بھی نہیں ہم نے تو صرف اپنے کام کو ورکشاپ بنایا تھا میری گاڑیاں بڑھتی رہیں اور کام آگے بڑھتا رہا میں رقم کو دبا کر رکھنے والا آدمی نہیں ہوں میرا سرمایہ تو روڈ پر رہتا ہے اس سے میرے ملازم روزی کماتے ہیں اور اندرونی گاؤں کے لوگ بھی فائدہ اٹھاتے ہیں کچھ علاقے ایسے ہیں کہ وہاں پر گاڑی چلا کر کوئی فائدہ نہیں ہوتا مگر میں نے وہاں پر بھی گاڑی چلائی صرف سیوا کرنے کو ہر جگہ تو کمائی نہیں ہوتی کچھ دینا بھی پڑتا ہے۔

میرے پتا نے کہا تھا میں کچھ لینا ہے تو دینا ہوگا نہیں دو گے تو نہیں ملے گا۔

اور میں اسی اصول پر چل رہا ہوں۔ بڑے روڈوں پر کئی نئی، نئی گاڑیاں آرہی ہیں انہوں نے ہمارے مقابلے میں کرائے بھی گرائے ہیں بعض، بعض نے تو اتنا کم کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے مگر ہم کو پتہ ہے یہ صرف چند روز کے لئے ہے۔ ہم نہ ہوں گے تو یہ کرایہ ڈبل کر کے اپنا نہ صرف سابقہ نقصان پورا کریں بلکہ ہمیشہ کمائیں گے ہم نے اپنا جو کرایہ طے کیا ہوا ہے وہی وصول کر رہے ہیں۔ پریشان تو اس لئے ہوئے ہیں کہ ہماری گاڑیاں چلتے چلتے ٹل ہو رہی ہیں۔“ سری ناتھ نے کہا۔

”تمہارا اپنا ذاتی خیال کیا ہے۔“ رولوکانے پوچھا۔

”مجھے شبہ ہے کہ یہ کام کوئی انسان نہیں کر رہا کوئی ہے جو کسی کے لئے یہ جادوگری کر رہا ہے۔ تاکہ میں اس کاروبار سے ہٹ جاؤں۔“ سری ناتھ نے جواب دیا۔

”تم نے جو کچھ بتایا ہے درست بتایا ہوگا اب تم یہ بتاؤ تمہارے پتا کے زمانے میں ان کا کوئی رقیب تھا جواب میداں میں آ گیا ہو۔“ رولوکانے پوچھا۔

”نظاہر کو تو نہیں تھا دو چار تھے مگر وہ بھی پتاجی سے مدد لیا کرتے تھے رقیب ان کو نہیں کہہ سکتے اور اندرونی طور پر ان کے دل میں میل تھا تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

سری ناتھ نے بتایا۔

”تمہارے کچے کچے عمروں کے ہیں۔“ رولوکانے پوچھا۔

”بڑا چوبیس سال کا ہے اس کی شادی کردی ہے، اس کا نام کرشن ناتھ ہے دوسرا بیس کا ہے۔ اس کی شادی میں نے طے کر دی ہے دونوں کام میں ٹھیک ہیں آہستہ آہستہ اور ٹھیک ہو جائیں گے۔ دونوں کسی غلط لائن پر نہیں، میں اپنے باپ کے نقش قدم پر چلا ہوں تو وہ لوگ میرے قدم سے قدم ملا کر چل رہے ہیں۔“ سری ناتھ بولا۔

سری ناتھ نے کسی پر شک نہیں کیا، کسی کو اپنا رقیب نہیں بتایا۔ مگر جو انوکھے حالات اس کے ساتھ پیش آرہے تھے ان سے وہ پریشان تھا۔

رولوکا نے کہا۔ ”سری ناتھ جی آپ جائیں مجھے اپنا فتح پور کا پیہ دے جائیں۔ میں عفریب آپ سے وہیں پر ملاقات کروں گا۔“

سری ناتھ بولا۔ ”میں آپ کی کیا خدمت کروں۔“

”سری ناتھ جی آپ نے ہمیں خدمت کا موقع دیا ہے اور خدمت کا کچھ معاوضہ لیا جائے تو وہ خدمت نہیں اپنی مزدوری بن جاتی ہے اور ہماری روزی کا دار و مدار اس پر نہیں ہے۔ آپ اپنے ذہن میں ابھی کچھ اکرانے کا خیال بھی نہ لانا۔ اس پر اگر کچھ خرچ بھی ہوا تو بھی ہم خود کریں گے آپ ہمارے پاس آئے تو کچھ سمجھ کر ہی آئے ہیں۔“

اور سری ناتھ حیران ہوتا ہوا چلا گیا۔

مجھے سارے حالات رولوکا نے سری ناتھ کے جانے کے بعد بتائے اور کہا۔ ”حکیم صاحب مجھے تو یہ رقابت کا چکر ہی لگتا ہے اس نے جو کچھ کہا ہے اس سے آدمی اصولی لگتا ہے اور اصولی آدمی کو اکثر لوگ اچھا نہیں کہتے۔“

حالانکہ وہ قابل تعریف ہوتا ہے کسی کو اس کے اصول سے نقصان ہو جائے تو بھی برا اور کسی کو فائدہ ہو جائے تو دوسروں کا برا، کوئی بڑا آفیسر رشوت نہیں لیتا اور وہ رشوت دینے والے کو سزاوار قرار دیتا ہے تو بھی اس کو لوگ برا کہتے ہیں اور اگر وہ رشوت لے لیتا ہے تو رشوت خور کہلاتا ہے میرے خیال میں یہ پہلی پوزیشن کا آدمی ہے اس کے ملازمین اس سے خوش ہوں گے اور ایمانداری سے کام کرتے ہوں گے اس کے رقیب ملازمین کو خوش نہیں رکھتے

ہوں گے اور وہ لوگ پوری آمدنی مالک تک نہیں پہنچاتے ہوں گے اس طرح ان کو نقصان ہو رہا ہوگا اور وہ اس کا ذمہ داری ناتھ کو سمجھتے ہوں گے اسی قسم کی رقابت لگتی ہے مجھے تو۔ میں تو اب فتح پور جاؤں گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”ہاں جاؤ تم اب ڈیوٹی پر سوار ہو گئے ہو۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”لت لگ گئی ہے کچھ نہ کروں تو اس کی طلب ہوتی ہے۔“ رولوکا ہنس کر بولا۔

”ٹرین میں سیٹ بک کرادوں۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں میری سواری تو میرے ساتھ رہتی ہے میں اس پر ہی جاؤں گا۔“ رولوکا بولا۔

سری ناتھ کے پہنچنے کے دو دن بعد رولوکا نے اس کے گھر پر ملاقات کی۔ سری ناتھ بہت خوش ہوا اور اس نے اس کے رہنے کا بندوبست کر دیا۔

”آپ نے میرے رہنے کا بندوبست کر دیا حالانکہ یہ بھی میرے اصولوں کے خلاف ہے مگر میں آپ کے خلوص کو ٹھکرا نہیں سکتا اس لئے قبول کر لیتا ہوں۔ مگر میرے کھانے، پینے کی آپ فکر نہیں کریں گے میں خود کھانے کے معاملے میں بڑا بے اصولا ہوں میرے کھانے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے جب اور جہاں بھوک لگی کھا لیا۔ دوسری بات یہ کہ میں کمرے میں چلا جاؤں تو کوئی میرے قریب نہ آئے نہ بلائے مجھے اگر کسی سے ملاقات کرنا ہوگی تو خود طلب کروں گا۔ میں جانتا ہوں آپ کو شاید میری بات اچھی نہیں لگ رہی ہوگی مگر کیا کروں میں اپنے اصولوں کا غلام ہوں۔“

رولوکا خاموش ہوا تو سری ناتھ نے کہا۔

”آپ میری وجہ سے اپنے اصولوں کو توڑیں میں بھی پسند نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اصولی لوگوں کو اپنے اصول کتنے پیارے ہوتے ہیں۔“

”آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے مزید وضاحت کے لئے نہیں کہا۔“ رولوکا بولا۔

رولوکا بستر پر آکر لیٹ گیا۔ دوسرے دن جب وہ

کمرے سے باہر آیا تو سہری ناتھ اس کے انتظار میں تھا رولو کا کوڈ دیکھتے ہی بولا۔ ”میں نے ابھی ناشتہ نہیں کیا ہے۔“

رولو کا زور سے ہنس پڑا اور بولا۔ ”دعوت دینے کا س سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے۔“

سہری ناتھ نے بھی اس کی بات کو سمجھ لیا اور پھر بولا۔ ”آپ نے ناشتہ کی بات نہیں کی تھی۔“

”تو میں ناشتہ آپ کے ساتھ ضرور کروں گا۔“ رولو کا نے جواب دیا۔ ”آپ کی گاڑیاں فتح پور سے آگے کس کس شہروں کو جاتی ہیں۔“ رولو کا نے پوچھا۔

”میری گاڑیاں پورے بھارت میں جاتی ہیں ہری گاڑیوں پر ناتھ بس سروس لکھا جاتا ہے۔ چھوٹی گاڑیوں پر بھی ناتھ سروس لکھا ہوتا ہے۔“ سہری ناتھ نے فاب دیا۔

”آئندہ بھی مجھے اگر کچھ پوچھنا ہوگا تو آپ سے رابطہ کر لوں گا۔“ رولو کا نے کہا۔

رولو کا سب سے پہلے ورکشاپ گیا یہاں پر اس کا ایبٹا دینا ناتھ اپنے دفتر میں موجود تھا مگر رولو کا نے خود کو لاہر نہیں کیا اور ورکشاپ میں چکر لگانے لگا۔

ایک گاڑی پر دو مہتری کام کر رہے تھے وہ ان کے اس چلا گیا۔ ”یار رام دین کیا اس گاڑی میں کوئی بھوت ٹھس گیا ہے کہ روڈ پر آتے ہی گڑبڑ کر جاتی ہے۔“

”ارے تیرے اندر بھوت ٹھس گیا ہے۔ ذرا ہوش بن رہ کر اچھی طرح سیٹنگ کر دے مالک کا بہت نقصان ہو رہا ہے آج کل۔“ رام دین نے کہا۔

”بھگوان کی سوگند بڑی بڑھیا گاڑی بنا کر دیتا ہوں پر وڈ پڑے ہی گڑبڑ کر جاتی ہے اور کچھ نہ ہوا تو فین بیٹل ہی ٹٹ جاتا ہے چلو دوسرا ڈال لے گا ڈرائیور وہ بھی ٹوٹ جاتا ہے

بہر چلی تو پھر کاربنیل میں کچر ایک بات ہے بھولا کاربنیل میں روڈ پر کچر اکون ڈال جاتا ہے۔ ٹائی راڈ کے بولٹ ڈھیلے کون کرتا ہے ایک ڈرائیور گھومتا تھا نے مجھے بتایا کہ اندھیری رات میں

گاڑی جارہی تھی اور ایک دم ہیڈ لائٹ بند ہو گئیں اس نے بلدی سے گاڑی روکی گاڑی کے اندر کی ساری بتیاں جل رہی

ہیں بیک لائٹ بھی جل رہی ہے اور مسافر سو رہے ہیں مگر ہیڈ لائٹ بند پڑی ہیں اس نے خود ہی ٹڈنگارڈ میں گھس کر دیکھا تو پتہ چلا دونوں تیتوں کے تار کٹے ہوئے ہیں بڑی مشکل سے اس نے تار جوڑے اور لائٹ جلا دی اور پھر آگے چلا۔ اب تو یہی بتا چلتی گاڑی میں تار کون کاٹ گیا۔“

”بات تو حیرت کی ہی ہے۔ پر اپنی سمجھ میں کچھ آتا نہیں ہے۔“ رام دین نے کہا۔

”سمجھ میں میرے بھی کچھ نہیں آیا۔ ہر کام اس سہری کا کر چکا ہوں مگر پھر بدنامی میری ہو رہی ہے۔“ اللہ دتا بولا۔ ”میرے محلے میں مولوی صاحب رہتے ہیں تو میرے ساتھ چلیو ایک تعویذ لا کر کہیں باندھ دیتا۔“ اللہ دتا نے کہا۔

”ارے بھائی وہ گاڑی کا بھوت ہے تیل میں بھیگا ہوا چکنا گھڑا اس پر کیا اثر کرے گا تعویذ بتا اور میں ان چکروں کو مانتا بھی نہیں ہوں۔“ رام دین نے کہا۔

”تو پھر کراتارہ اپنی بے عزتی۔“ اللہ دتا نے کہا۔ اور رولو کا آگے بڑھ گیا اور شام تک وہ وہیں رہا۔ شام کو گاڑی چیک ہو گئی اس کا کلیئرز اور ڈرائیور آگے انہوں نے اچھی طرح چیک کر لیا۔

ڈرائیور بولا۔ ”فین بیٹل بہت توڑتی ہے ایک دو اسپیر رکھ دینا استاد۔“

رام دین بولا۔ ”اب نہیں توڑے گی پھر بھی تم اسٹور سے لے کر رکھ لو تو اچھا ہے۔“

ڈرائیور نے سیلف لگایا اور گاڑی اسٹارٹ ہو گئی اور وہ گیٹ پر لے آیا۔ ”ارے اودوینو جا دو ڈکر میرے نام پر دو فین بیٹل لے آ۔“ کلیئرز دو ڈکر دو فین بیٹل لے آیا۔

رولو کا دو ڈکر اس پر سوار ہو گیا۔ اس کے سوار ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ کوئی اور بھی سوار ہوا۔ ورکشاپ میں گاڑی تھی تو اس کے اندر کوئی نہ تھا۔ روڈ پر آتے ہی بقول مہتری کے ایک بھوت اس میں سوار ہو گیا مگر رولو کا نے اس کو دیکھ لیا۔

گاڑی اڈے پر کھڑی ہو گئی اور رام گڑھ کی سواریاں بیٹھنے لگیں۔ رات کا وقت تھا سواریاں کم تھیں مگر

پھر بھی رواں لگی کے وقت تک بیس، پچیس سواریاں آگئیں
ان میں سات عورتیں اور چار بچے تھے۔

کچھ کو زیادہ دور نہیں جانا تھا اور کچھ راکم گڑھ کی تھیں۔
مقررہ وقت پر گاڑی روانہ ہوئی رولوکا کی نظریں اس
بھوت پر تھیں۔ بھوت اپنی جگہ سے اٹھا اور چھت پر چلا گیا
چھت پر مسافروں کا سامان رکھا تھا مگر پھر بھی جگہ باقی تھی۔
بھوت نے ایک پٹی اٹھائی اور سڑک پر پھینکنے ہی

والا تھا کہ رولوکا کے کارڈ سے نے اس پر چھن کر رکھ
دی۔ پھر اس نے ایک پتیل کا برسا (گلاس) پتیل کا مٹکا ہوتا
ہے) اٹھا کر سڑک پر پھینک دیا مگر وہ سڑک نہیں گیا اس
کو کسی نے دسمیان میں لپک لیا اور اپنی جگہ رکھ دیا بھوت
نے ہر سامان کو سڑک پر پھینکا مگر اپنی گاڑی آگے آئی
تھک کر بولا۔

”کون ہے رہے کام تابی کرنے دے رہا۔“
اس کے یہ کہتے ہی اس کے گال پر لپک کر ارہ چائنا
پڑا اور وہ ہنسنے لگا۔ ”اے سائے آکر بت کر پھر
بتاؤں توئے۔“ وہ بولا۔

رولوکا نے جواب دیا۔ ”تو بھی سائے آئے گا۔“
”میرا تو وہ ہی ہے جس سے سائے کیلے آؤں۔“
”تو بھی شرے شرے والوں کو ستانا ہے تک کرنا۔“
رولوکا نے کہا۔

”میں خود ایسا نہیں کرنا جو حکم دیا ہے وہ کرتا ہوں۔“
”جتنے کس نے حکم دیا ہے۔“ رولوکا نے پوچھا۔
”وہ میں بتانے سکوں گا کیونکہ بتانے کا حکم نہیں ہے۔“

”یہ تو تجھے بتانا ہی پڑے گا نہیں بتائے گا تو تیری
بہت بری حالت ہوگی پتہ تو میں چلا لوں گا مگر پھر تیری
بچت نہیں ہوگی بتادے گا تو پھر تجھے میں کچھ نہیں کہوں
گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”اول تو میرا کچھ کر ہی نہ سکے گا اور اگر کرے گا تو
گورو آ جاوے گا اور تیرا کلیان کر دے گا۔ بہت شکی مان
ہے یہ دیہان سے سن رکھو۔“ بھوت بولا۔

”تیرے ساتھ میں نے جو کرنا تھا کر دیا تو اسی

چھت پر قید ہو گیا۔ اب بتا سامان کیوں پھینک رہا تھا۔“
رولوکا نے کہا۔

”بدنامی کی خاطر کہ لوگوں کا سامان گم ہو جاوے تو
کون تاتھ کی گاڑی میں بیٹھے گا۔ بدنامی الگ ہوگی اور
(ڈنڈ) الگ بھرن پڑے گا۔“ بھوت بولا۔

”اس سے تجھے کیا فائدہ ہوگا۔“ رولوکا نے پوچھا۔
”ارے میں تو حکم کا غلام ہوں جیسا کہا ہے ویسا ہی
کر دوں گا۔“

”چھت پر جتنا تیرے اور کتنے ساتھی یہ کام کر رہے
ہیں۔“ رولوکا بولا۔

”یہ کون بتاؤں۔“ وہ بولا۔
”تو اس چھت پر پڑا ہے، تجھے یہ پسند ہے تو نہ
بتا۔“ اس نے جتنی کوشش کرے اپنا ہی پھنستا جائے

گا۔ رولوکا بولا۔
”میرے پانچ ساتھی یہ کام کر رہے ہیں۔“ بھوت بولا۔
”تم سب کس کے لئے کام کرتے ہو یہ بھی بتانا ہوگا۔“
”ہمارا گرہ پنڈت گردھاری تاتھ ہے۔“

پنڈت گردھاری تاتھ کے بارے میں مری تاتھ نے
بتا تھا کہ بندر میں رہتا ہے اور صرف پوجا پاٹ کرتا ہے مگر
وہ چھپا ہوا سٹری کا مٹھا آٹا لے اپنے گندے بیدری تاتھ
کی گاڑیوں پر چڑھ کر آئے تھے تاکہ اس کی گاڑیاں روڈ پر نہ
چل سکیں اس نے یہ کام بڑی مہارت سے کیا تھا۔

بھوت کو رولوکا نے وہیں پر قید کر دیا اور دوسری
گاڑیوں کی تلاش مکمل پڑا۔ اس کے برق رفتار ہر کارے
پر طرف پھیل گئے پورے ملک میں تاتھ کی گاڑیاں دوڑ رہی
تھیں سب کو چپک کر اتنا آسان نہ تھا پھر وہ گاڑیاں کس
شہر کس گاؤں میں تھیں کچھ خراب ہو کر راستے میں کھڑی
تھیں سارے بھوتوں کو ایک، ایک کر کے ان گاڑیوں کی
چھت پر قید کر دیا اور گاڑیاں ٹھیک ہو کر واپس آتی پور آگئیں
جن گاڑیوں پر بھوت سوار تھے ان کو درکشاپ میں الگ کھڑا
کر دیا گیا یہ سب رولوکا کے کہنے سے ہوا۔

”آدھا کام تو آپ کا ہو گیا ہے اب آدھا آپ

کے کہنے سے ہوگا۔ رولوکا نے سری ناتھ سے کہا۔
”میں سمجھا نہیں۔“ سری ناتھ نے پوچھا۔

”آپ سے میں نے پوچھا کہ پنڈت گردھاری ناتھ کچھ اور بھی کرتا ہے آپ نے بتایا تھا وہ صرف پوجا پاٹ کرتا ہے۔ آپ کی ساری پریشانیوں کی جڑ وہی پنڈت ہے آپ اس کے پاس جائیں اور اپنے طور پر بات کریں اس کو لالچ دیں پھر بھی نہ مانے تو ڈرائیں کہ وہ آپ کے خلاف کام کر رہا ہے تم اس کے خلاف رپورٹ کرو گے وہ تم سے ثبوت مانگے تو پھر آپ اس کو لے کر ورکشاپ آجائیں گے وہاں پر میں ہوں گا پھر جو تماشا ہوگا اس کو دیکھ کر آپ حیران رہ جائیں گے۔“

سری ناتھ مندر چلے گئے۔ پنڈت بڑے پیار سے ان سے ملا اور بولا۔ ”ارے بیٹھ جی آپ نے کا ہے کشت اٹھایا میں آجاتا۔“

”ارے نہیں پنڈت جی آپ کا رتبہ بلند ہے دھرم کے رکھوالے جو ہوئے ہیں آپ کو بلاؤں اور وہ بھی اپنے ذاتی کام سے ایسا بھی میں ادھر ہی نہیں ہوں۔“ سری ناتھ نے کہا۔
”خیر بات تیری ٹھیک ہے کام بتا کیا بات ہے۔“

پنڈت بولا۔

”میرا کاروبار ٹھپ ہوتا جا رہا ہے میرا کوئی دشمن میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے میری گاڑیاں قفل ہو رہی ہیں میری سادھ خراب ہو رہی ہے ایک مہینہ یہی حالت رہی تو کوئی میری گاڑی میں سفر نہیں کرے گا۔ میں نے آپ سے پہلے اس کا توڑ پوچھا تھا تو آپ نے کہا یہ کاروبار بند کر دوں کیونکہ میرے ستارے اس کاروبار سے میل نہیں کھاتے مگر میں نے جہنم کنڈلی پھر سے بنائی ہے۔ دلی کے بہت مشہور پنڈت سے، اس میں صاف لکھا ہے ستارے ٹھیک ہیں میرے لئے یہی کاروبار اچھا ہے اور آگے سو سال تک ٹھیک رہے گا۔ تم نے میرے خلاف بات کی ہے اب تو میرا شبہ تم پر ہی ہے کہ تم ہی میرے خلاف مندر میں بیٹھ کر ڈوری ہمارے ہو۔“ سری ناتھ نے کہا۔

”تو مورکھ ہے پنڈت پر الزام دھرتا ہے مجھے اپنے

کاموں سے فرصت نہیں ہے کہ میں ان چکروں میں پڑوں۔“ پنڈت غصے سے بولا۔

”میرا شبہ تو تم پر ہی ہے۔“ سری ناتھ بولا۔
”ارے جس کو مایا کا لوبھ ہوتا ہے وہ یہ کام کرتا ہے مجھے کیا کرتا ہے کہ میں یہ سب کروں۔“
”مایا کی ضرورت تو سب کو ہوتی ہے تم جتنا کہو گے دے دوں گا۔“ سری ناتھ بولے۔

پنڈت نے دو چار منٹ سوچا پھر بولا۔ ”میں لو بھی نہیں ہوں مگر ضرورت ہوتی ہی ہے مگر میں کیا کروں اب کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ میرا اس معاملے میں کچھ دخل نہیں ہے۔“
”ہرے پیلے لال نوٹ کی بات سن کر تمہارے چہرے پر نرمی آگئی میرا شبہ پکا ہو گیا کہ تم ہی سارے بگاڑ کے ذمہ دار ہو۔“ سری ناتھ غصے سے بولا۔
”ارے کا پاگل ہوا ہے اور اگر ہوں بھی تو کیا کرے گا۔“ پنڈت بھی لال ہو کر بولا۔

”اب تو کچھ کر ہی لوں گا۔“ سری ناتھ نے کہا۔
”ارے کیا کرے گا بلا ثبوت کے الزام دھرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا سب تم پر نہیں گے۔“ پنڈت بولا۔
”ثبوت بھی ہو ہی جائیں گے۔“ سری ناتھ نے کہا۔

”منہ کی کھائے گا جو تھوڑی رہ گئی ہے اس کو سنبھال اور کسی اور دھندے میں نکل جاتیرا اور تیرے باپ کا راج نہیں چل سکتا تو فتح پور میں راجہ بنے رہے گا۔“ پنڈت بولا۔
”آنے والا وقت بتائے گا کہ کس کی رہتی ہے اور کس کی جاتی ہے تو نے مندر بھی پوتر جگہ بیٹھ کر ایسا گندہ کام کرتا ہے سب کو پتہ چلے گا تو تیری کتنی رہ جائے گی تو نے سوچا ہے میں پولیس کچہری تک بھی تجھے نہیں چھوڑوں پنڈت ہو کر گندے کام کرتا ہے تجھے شرم حیا ہے جھکڑی پہن کر جیل یا تارا کو جائے گا تو سب دیکھیں تیرے منہ پر تھوکیں گے۔“

ارے پا کھنڈی تیری غلط حرکت سے دھرم کی اور دھرم کے رکھوالے پنڈتوں کی عزت لوگوں کے دلوں میں کتنی گھٹ جائے گی تو نے کبھی نہیں سوچا۔“ سری ناتھ بولے۔

”ارے میں نے کچھ کیا ہو تو تم خواندہ میری عزت پر حملہ کرتے جا رہے ہو۔“ پنڈت بولا۔

”تم کو اپنی بے گناہی کا ثبوت دینا ہوگا۔“ سری ناتھ نے کہا۔

”دے دوں کا ثبوت۔“ پنڈت بولا۔

”اگر تم زدوش ہوئے تو میں تم کو ایک لاکھ روپیہ دوں گا اور دوشی ہوئے تو بناؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔“ سری ناتھ نے کہا۔

”مجھے دوشی تم نے ثابت کر دیا تو تمہارا جو سن کرے سزا دے لیتا۔“

”تم کو میرے ساتھ چلنا ہوگا دور نہیں فتح پور میں ہی جانا ہے۔“ سری ناتھ بولے۔

”کب چلنا ہوگا۔“ پنڈت نے پوچھا۔

”ابھی اور اسی وقت۔“ سری ناتھ نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے میں چلا ہوں ذرا اپنا تھیلا لے آؤں۔“ پنڈت نے کہا۔

چند منٹ کے بعد پنڈت ایک تھیلا کاندھے پر ڈالے آگیا اور بولا چلو۔

مندر کے باہر سری ناتھ کی گاڑی کھڑی تھی گاڑی ان کو لے کر درکشاپ آگئی جہاں پر رولوکا اور سری ناتھ کا لڑکا ان کا انتظار کر رہے تھے اور سامنے ہی وہ پانچ گاڑیاں کھڑی تھیں جن کی چھت پر پنڈت کے سفلی بیرقید تھے۔

دونوں اتر کر رولوکا کے پاس آگئے۔ سری ناتھ نے کہا۔ ”میں نے اپنا کام کر دیا ہے حکیم صاحب۔“

رولوکا نے گہری نظر سے پنڈت کو دیکھا اور پھر کہا۔ ”پنڈت تیرے پاس صرف پانچ بیرقہ تھے یا کچھ اور

بھی ہیں اگر ہیں تو تھیلے میں سے نکال لے پھر نہ کہنا کہ دھوکے میں مارا گیا۔ میں دھوکا فریب دشمن کے ساتھ بھی

نہیں کرتا اس کو کر گزرنے کا پورا موقعہ دیتا ہوں۔ تو نے اب تک جو نقصان کیا ہے صرف روپیہ کمانے کو کیا ہے مگر

اب تیری سہائتا کو کوئی نہیں آنے والا جو تو نے کمایا ہے مندر میں تیری کھاٹ کے نیچے دبا رہے گا اور تیری چتا کی

دھول دریا برد ہو جائے گی۔ رولوکا نے کہا۔

”ارے تم لوگ بغیر ثبوت کے مجھے دوشی کا ہے کہہ رہے ہو۔“ پنڈت بولا۔

”تم ثبوت کے بغیر نہیں مانو گے اس وجہ سے ہی تم کو یہاں بلوایا ہے۔ لو پھر پہلا ثبوت۔“ رولوکا نے ایک

گاڑی کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ”بھوت نمبر 1 آ جا۔“ کسی کو کچھ نظر نہیں آیا رولوکا

اور پنڈت کو وہ نظر آ رہا تھا رولوکا نے کہا۔ ”بول تو کس کا غلام ہے۔“

بھوت نے پنڈت کی طرف انگلی اٹھا دی۔ پنڈت زور سے بولا۔ ”یہ جھوٹا ہے میرا غلام کیوں ہونے لگا۔“

رولوکا نے دوسری گاڑی کے بھوت سے بھی یہی سوال کیا۔ اس نے بھی یہی جواب دیا پنڈت پھر زور سے

بولا۔ ”یہ جھوٹا ہے۔“ پنڈت کی اور رولوکا کی بات چیت سب سن رہے تھے

صرف بھوت اور اس کی آواز ان کو نہیں آ رہی تھی پانچوں سفلی کے گندے بیروں نے پنڈت کی طرف اشارہ کیا۔

اور ہر دفعہ پنڈت نے انکار کیا۔ پھر اس نے بیروں سے کہا۔ ”میں تم سب کو آزاد

کردوں گا تم سب مل کر اس سے منواؤ کہ تم اس کے حکم پر کام کرتے تھے اگر یہ نہ مانا تو تم سب مارے جاؤ گے۔“ رولوکا

نے کہا اتنا کہنا تھا کہ پنڈت کی چیخ و پکار شروع ہوگئی۔ سامنے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا مگر پنڈت زمین پر ناچ رہا تھا اور

درد کے مارے بری طرح ڈکرا رہا تھا۔ ”ارے چھوڑ دے ہائے مار ڈالا ارے ذرا رک تو سانس تو لینے دے کہتا ہوں

ہاتھ تو روک۔“ مگر ان کے رکتے رکتے بھی پنڈت زمین پر بری طرح زخمی پڑا تھا۔ پھر پڑے پڑے خود بولا۔

”اب نہ کہتا ہوں ہاں یہ میرے ہی غلام ہیں مگر بے غیروں نے میری پٹائی کر دی ہے۔“

سب نے اس کا کہا ہوا سنا۔ رولوکا نے سری ناتھ سے پوچھا۔

”میں اگر یہ ڈرامہ نہ کرتا تو شاید آپ کے دھرم کے

بہت سے لوگوں کو یقین نہ آتا کیونکہ دھرم کے معاملے میں آدی جذباتی ہوتا ہے۔

میں پنڈت کو کوئی سزا نہیں دیتا اس کو مارا ہے تو اس کے غلاموں نے مارا ہے۔ میری سزا صرف یہ ہے کہ اس کی جو سختی ہے جھین لیتا ہوں اب یہ کبھی کوئی منکدہ علم حاصل نہیں کر سکے گا اور ہے اس کے یہ پانچوں غلام ان کو جیل کو لے کھا جائیں گے۔“

اور آسان پر چیل کو نظر آنے لگے۔

”آپ اگر اپنے طور پر اپنے دھرم کے اصولوں کے مطابق پنڈت کو سزا دینا چاہتے ہیں تو میں منع نہیں کرتا میرا کام ختم ہوا خرابی کی جزا کھڑی ہے۔“

رو لوکا کو بہت روکا گیا مگر وہ دلی روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

عین خان شاہ جہاں پور کے محلے لودھی پور میں رہتے تھے۔ ان کے باپ بساط خانے کا سامان ایک سائیکل پر لا کر فروخت کیا کرتے تھے ان کی سائیکل ایک چلتی پھری دکان تھی۔

ہینڈل کے اوپر ایک سلیب نما لکڑی لگا دی تھی اس پر ازار بند اور اسی قسم کی بہت سی چیزیں لٹکی رہتی تھیں کیر پر پر ایک چٹنی رکھی تھی اس میں موزے، بنیان، سوئی، دھماگے، رومال اور نہ جانے کیا کیا بھرا رہتا تھا۔ ان کی دکانداری عورتوں سے زیادہ تھی اس لئے ان کی ضرورت کی چیزیں زیادہ تھیں۔ وہ آواز نہیں لگاتے تھے۔ سائیکل میں انہوں نے ایک گھنٹی لگا رکھی تھی جو کہ اس کے اگلے پہیہ کے ساتھ منسلک تھی سائیکل چلتی تھی تو گھنٹی خود بخود ڈن ڈن کرتی تھی۔ وہ سائیکل پر بیٹھے بھی نہیں تھے کیونکہ سائیکل کی سیٹ پر بھی کچھ نہ کچھ دھرا ہوتا تھا۔ دور سے ہی نظر آتا تھا کہ سائیکل کیا ہے پوری دکان ہے آدی ایماندار تھے ادھار میں پڑتے نہیں تھے سب کام ان کے زبانی تھے کسی کو ادھار دے کر یاد رکھتے تھے لکھنا، پڑھنا ان کو آتا نہیں تھا مگر حافظہ ایسا کہ ایک، ایک پائی ان کو یاد رہتی تھی۔ عین کو انہوں نے بڑی کم عمری سے ساتھ رکھ لیا تھا۔ اس زمانے میں تعلیم کا رواج کچھ زیادہ نہ

تھا۔ دوسرے لودھی پور محلے میں تو یہ رواج بالکل ہی نہیں تھا۔ عین باپ کے ساتھ ساتھ رہتا، عورتوں کو سامان دکھاتا اور مال بیچتا۔ دس سال کی عمر کو آتے آتے وہ باپ کے سارے کام سیکھ گیا مگر باپ نے اس کو اپنے ساتھ ہی رکھا اور کاروبار کے گراس کو بتاتا رہا عورتوں کی نفسیات کے بارے میں بیٹے کو اس نے خوب اچھی طرح سمجھا دیا۔ ان سے بھاؤ کرنے اور وصولی کا طریقہ بھی بتا دیا، ادھار کس کو نہیں دینا ہے، کہاں سے وصول ہوگا کہاں پر نہیں یہ عین عین کے کورس میں شامل تھا۔ عین جب ذرا اور بڑا ہوا تو اس کو یہ بھی پتہ چل گیا کہ ادھار لینے کو کچھ عورتیں کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کرتی ہیں اور پھرتانے کو کیا کیا طریقہ استعمال کرتی ہیں۔

دکاندار کو بڑا ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے اگر وہ سب کو ادھار دے گا۔ اس کا سارا اثاثہ ادھار میں چلا جائے گا اور دکان خالی ہو جائے گی مال نہیں ہوگا تو پھر دکان کہاں رہے گی۔

عین کے باپ کی عمر بڑھ رہی تھی مگر عین جوان ہو گیا تھا اور باپ کا پورا کاروبار اس کی سمجھ میں آ گیا تھا اس نے اتنی ترقی کی کہ اپنے لئے ایک ٹھیلہ چار پہیوں کا بنوایا، اس پر ایک لکڑی کا کین بنایا اور اس میں دو دکان بنائی اس میں مال بھی زیادہ آ گیا اور مال واپس رکھنے کی محنت بھی کم ہو گئی۔ گھنٹی اس نے بھی لگائی کیونکہ وہ تو اس کی پہچان تھی۔ اس کے پاس بساط خانے کے سامان کے علاوہ اچھے قسم کے صابن، مین، تولیے اور بڑھیا قسم کا سامان جو عورتوں کے استعمال کا ہوتا وہ بھی تھا وہ دور دور جاتا تھا۔ جہاں پر اس کا باپ کبھی نہیں گیا وہ ان محلوں میں بھی چکر لگا تا تھا۔ قریب کا علاقہ اس نے باپ کے لئے چھوڑ دیا تھا اور اپنی دکانداری کا طریقہ بھی بدل دیا تھا وہ بہت کم ادھار دیتا تھا۔ زیادہ تر نقد مال فروخت کرتا تھا اگر ادھار ضروری ہو جاتا تو گھر بار دیکھ کر ادھار کرتا تھا اور باقاعدہ اپنے پاس اندراج کرتا تھا اور وصولی کی تاریخ لیتا تھا اور اس تاریخ پر وصول کرتا تھا۔

نئے نئے علاقے اس نے انتخاب کر لئے تھے کچھ ہی دن میں اس کی دکانداری چمک گئی۔ وہ ہر روز کسی محلے میں نہیں جاتا تھا اس نے دن مقرر کر لئے تھے کہ کس دن کہاں

جانا ہے۔ اس کے گاہک بھی اس کا انتظار کرتے تھے۔

اس کے علاوہ گھر میں اس کی ایک بہن شریا بھی اور ماں تھی۔ باپ بوڑھا ہو رہا تھا شام کو وہ جب واپس آتا تو بہت تھکا ہوا ہوتا تھا حالانکہ وہ زیادہ پھیری بھی نہیں کرتا تھا۔

عین کا کاروبار بڑھا گیا تھا گھر کا خرچ وہی دیتا تھا۔ وہ رات کو باپ کے بعد آتا تھا۔ باپ بہت کمزور ہو گیا تھا اس نے باپ سے کہا۔ ”اب تم اب پھیری نہ کیا کرو گھر پر آرام کرو میں سب کروں گا۔“

باپ نے یہ سنا تو اس کا سینہ چوڑا ہو گیا اس کا لگایا پودا پھل دینے لگا تھا۔

”مگر میری عادت ہو گئی ہے بیٹا میں گھر میں کیا کروں گا۔“

”اب تم آرام کرو تم نے بہت کام کر لیا۔“ عین نے کہا۔

”ابھی بہت کام باقی ہے، بیٹے کی شادی کرنی ہے، شریا کی شادی کرنی ہے۔“ باپ نے جواب دیا۔

”تو منہ کس نے کیا ہے کر لینا سب کام، میں جو کماد رہا ہوں۔ جتنی ضرورت ہوگی پورا کروں گا گھر پر ہوا آرام کرو اور کھاؤ پیو، اب تم کام نہیں کرو گے۔“ عین نے کہا۔

باپ کا دل باغ باغ ہو گیا وہ ہنس کر بولا۔ ”تیرا پیار مجھ سے بڑا ہو گیا ہے، میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ اپنے درخت کے پھل کھا رہا ہوں۔ تیری ماں کی ایک خواہش ہے میری بھی ہے بول پوری کرے گا۔“ باپ شکور نے کہا۔

”تم کھو کرو..... میں ضرور پوری کروں گا۔“ عین نے جواب دیا۔

”تیری ماں کہتی ہے، تیری شادی ہو جائے گھر میں بہار آ جائے گی۔“

”ابا میں انکار نہیں کرتا آپ جو مناسب سمجھو کرو مگر کم از کم مجھے دو سال کا وقت اور دو تا کہ میرے قدم ذرا اور جم جائیں۔ میرا ارادہ دکان کرنے کا ہے میں نے بات بھی کر لی ہے۔ بڑے بازار میں دکان مل گئی تو ٹھیلہ چلانے سے جان چھوٹ جائے گی۔ پھر اس دکان کو سیٹ کرنا ہے

چلانا ہے۔ تم کو تو پتہ ہی ہے ٹھیلے والے سے زیادہ عزت دکاندار کی ہوتی ہے۔ شادی پر خرچ ہو جائے گا تو یہ کام مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جائے گا شادی کے بعد اخراجات میں بھی اضافہ ہوگا پھر دکان کا خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔“

عین نے پوری بات بتادی۔

عین کا باپ شکور یہ سن کر بہت خوش ہوا بولا۔ ”بیٹا دکان کا خواب تو میرا بھی تھا مگر پورا نہیں ہوا اب تو پورا کر، میں روکوں گا نہیں، میں تیری ماں کو کہہ دوں گا لڑکی نظر میں رکھے مگر شادی کی جلدی نہ کرے، میں بہت خوش ہوں تو میری خواہش پوری کر رہا ہے۔“

عین کی محنت اور شوق نے آخر اس کو ایک دکان کا مالک بنا دیا۔ اس نے اس کو قاعدے سے بنوانا شروع کر دیا

مگر اپنی پھیری بھی جاری رکھی دکان کے بننے کے بعد اس نے اس میں آہستہ آہستہ مال ڈالنا شروع کر دیا۔ بازار میں

اس کا ہاتھ صاف تھا، لین دین میں کھرا تھا، اس لیے اس کی دکان بہت جلد بھر گئی اس میں زیادہ تر مال اس نے ادھار لیا

اور پھر اللہ نے شکور کو یہ دن بھی دکھایا کہ انہوں نے دوکان میں فاتحہ خوانی کرائی اور پورے بازار میں میٹھائی تقسیم کی گئی

اور عین میاں اچھی بڑی دکان کے مالک بن گئے۔ شکور کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

عین ہوشیار تھا اس نے دکان کا کام شروع ہوتے ہی اپنا ادھار وصول کرنا شروع کر دیا تھا اور دینا بند کر دیا تھا اس طرح

پھیری بند کرنے کے بعد اس کا کوئی خاص نقصان نہ ہوا۔ عین کو پھیری کرنے کی وجہ سے لوگ جانتے تھے عورتیں اور بچے بھی جانتے تھے۔ اب اس کے گاہک دکان پر آنے لگے اور چند

دنوں میں ہی دکان چمک گئی۔ شکور بھی گھر میں رہنے کی بجائے دکان پر آنے لگا اور دونوں باپ، بیٹوں کی محنت نے دکان کی

سیل خوب بڑھادی اور پھر عین کو ملازم رکھنا پڑے وہ مال خریدنے صبح ہی چلا جاتا شکور نوکروں کے ساتھ دکان پر رہتا

اور شام کو رات تک ان کی دکان گاہکوں سے بھری رہتی۔

شریا کا ایک بہت اچھا رشتہ سہارنپور سے آ گیا اور بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی کر دی گئی۔ پرانے مکان کو عین

کئے اس نے خود کو بڑی سحر انگیز مسکراہٹ کے ساتھ خود کو
عین کے حوالے کر دیا تھا۔ عین کے لئے پہلا تجربہ تھا وہ اس
کے جسم کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔

نرس کی آنکھوں میں شوخی اور لبوں پر ایک انوکھی
مسکراہٹ کھیل رہی تھی جیسے اس نے کوئی بہت سخت منزل
آسانی سے سر کر لی ہو اور عین کی نا تجربہ کاری نے اس پر
پردہ ڈال دیا ہو۔

نرس بہت خوش تھی۔ اس نے اپنی تراش خراش کا
ہمیشہ خیال رکھا تھا خود رو دھواڑوں کی طرح خود کو بدنما نہیں
ہونے دیا تھا۔ وہ خود کو بنائے رکھنے کے فن سے واقف تھی
اگر ایسا وہ نہ کرتی تو جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا اگر کسی
اور کے ساتھ ہوتا تو وہ اس غم میں گھلتے گھلتے ختم ہو جاتی۔ وہ
باہمت عورت تھی۔

چھ مہینے گزر گئے۔ عین کی آنکھ ایک رات کھل گئی پتہ
نہیں کیا وقت ہوا تھا۔ اس نے بیوی کی طرف دیکھا تو وہ
ابنی جگہ نہیں تھی وہ بڑا حیران ہوا، جائے گی کہاں اس وقت
غسل خانے کا بھی اس نے چکر لگایا مگر وہاں کوئی نہ تھا وہ
پھر بستر پر آ کر لیٹ گیا، کچھ دیر کے بعد آہٹ ہوئی اور
زینے سے اتر کر نرس بستر تک آئی اور لیٹ گئی۔

آج پہلی دفعہ یہ ہوا کہ شادی کے بعد اس کی آنکھ
رات میں کھلی تھی اور کھلی تو اس نے یہ نظارہ دیکھا نرس
آتے ہی بے خبر سو گئی مگر اس کی نیند اڑ چکی تھی۔ نرس کے
سونے کے بعد وہ چمت پر گیا مگر چاندنی رات میں اس
نے دیکھا کہ چمت پر کوئی نہیں تھا۔

چاند کی روشنی میں کوئی چیز چمک رہی تھی وہ اس کے
قریب چلا گیا تو پتہ چلا کہ وہ ہینٹل کی ٹرے تھی اور اس میں
دو گلاس رکھے تھے گلاسوں میں چند قطرے دودھ پیندے
میں نظر آ رہا تھا اس کے تن بدل میں آگ لگ گئی۔ مارے
غصے کے چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے چاہا کہ وہ دوڑ کر جائے
اور اس بے حیا عورت کو قتل کر دے۔ مگر پھر عقل نے اس کا
ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ ”اس کو مار کے تجھے کیا ملے گا تو قاتل
کہلائے گا ذرا انتظار کر، تیل دیکھ اور تیل کی دھار دیکھ، کبھی

نے فروخت کر دیا اور نیا مکان شاہ جہاں پور کے مین بازار میں
خرید لیا اور اس کو اور اچھا بنوایا۔ اب عین میاں عین سیٹھ ہو گئے
اور شکور بھی سیٹھ کہلانے لگے۔ بہت اچھے، اچھے رشتے خاندانی
لوگوں کے عین کے لئے آئے لگے اور پھر سبیل پور کے خلیل
خان کی لڑکی کے ساتھ عین میاں کا رشتہ طے پا گیا۔

خلیل خان سبیل پور کے مشہور آدمی تھے ان کے بہت
بڑے آدموں کے باغات تھے اور بہت زمین تھی خاندانی
آدمی تھے۔ روپے، پیسے کی کمی ان کو نہیں تھی شکور نے پہلی
ملاقات میں ہی کہہ دیا تھا۔ ”خان صاحب آپ خاندانی
رئیس ہیں اللہ کا دیسب کچھ ہے مگر میں تو بہت غریب پھیری
لگانے والا آدمی ہوں یہ سب جو آپ دیکھ رہے ہیں عین کی
محنت کا ثمر ہے میں خاندانی پیسہ والا نہیں ہوں آپ کو یہ بات
کسی اور ذریعہ سے پتہ ہوتی تو آپ کے دل میں بدگمانی پیدا
ہو جاتی اس لئے میں نے خود آپ کو بتا دی ہے۔“
خلیل خان یہ سن کر خوش ہوئے پرانے وضع دار
آدمی تھے بولے۔

”بھائی شکور مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ نے اپنی
حقیقت نہیں چھپائی۔ اگر آپ چھپاتے تو مجھی کبھی نہ بھی
پتہ تو چل جاتا اور اس وقت ضرور ملال ہوتا مگر اب نہیں
ہوا۔ میں نے لڑکے کی شرافت اور محنت کو دیکھ کر ہی رشتہ
منظور کیا ہے۔“

دونوں طرف شادی کی تیاریاں ہونے لگیں اور پھر
بڑے دھوم دھام سے بارات سبیل پور روانہ ہوئی اور نرس
بیگم رخصت ہو کر شاہ جہاں پور آ گئیں۔ نرس کی عمر عین
خان کے برابر ہی تھی عین چوبیس سال کے شادی کے وقت
تھے۔ دہن کی عمر بیس سال لکھوائی گئی تھی مگر وہ بھی چوبیس کی۔
عین میاں نے دکان پر آنے والی عورتیں ہی دیکھی
تھیں ان کے تصور میں جو نازک سی دہن تھی نرس ایسی نہ
تھی یوں دیکھنے میں اس میں کوئی کمی نہیں لگتی تھی۔

مگر جو شرم حیا دہن کا زیور ہوتی ہے اور خاص طور پر
سہاگ رات میں اس کی کمی عین میاں نے بری طرح
محسوس کی نرس نے روایتی دہنوں کی طرح ناز و نغمے نہیں

”میں دیکھ رہا ہوں تم بہت سنجیدہ موڈ میں ہو، ضرور وہ بات بھی ایسی ہی ہوگی مگر دل کے غبار کو باہر نکالنا ضروری ہوتا ہے اندر اندر تو یہ بہت خرابیاں پیدا کرتا ہے۔“ سالار بولا۔

”آج رات میری آنکھ رات کے شاید آخری پہر کھل گئی آج پہلی بار ایسا ہوا اور پہلی بار ہی میں نے دیکھا کہ بیوی بستر پر نہیں تھی، میں نے غسل خانے وغیرہ کو چیک کیا مگر وہ نہیں تھی، میں بستر پر آ کر خاموشی سے لیٹ گیا کچھ ہی دیر میں وہ زینہ سے اتر کر آ گئی، اتنی رات میں اس کو چھت پر جانے کی ضرورت کیا پڑ گئی وہ آ کر بستر پر لیٹ گئی اور کچھ ہی دیر میں بے خبر ہو گئی، اس کے سونے کے بعد میں چھت پر گیا وہاں کوئی نہیں تھا مگر چھت پر ایک ٹرے میں دو گلاس رکھے تھے جن کے پینڈوں میں دودھ کے قطرے موجود تھے ایک تو میرا مکان اس طرح کا ہے کہ کوئی چھت پر چڑھ کر آ نہیں سکتا پھر اگر کوئی آیا تو وہ واپس کدھر سے گیا زینے سے تو صرف نرس اتر کر آئی تھی۔ میں جتنا غور کر رہا ہوں اتنا ہی الجھتا جا رہا ہوں ہر کسی سے اس معاملے پر گفتگو نہیں کر سکتا بتاؤں میں کیا کروں۔“ عین نے پوچھا۔

”تم کو پورا یقین ہے کہ تم نے جو بیان کیا ہے وہی کچھ ہوا ہے۔“ سالار نے پوچھا۔

”مجھے پورا یقین ہے میں نے جو دیکھا تھا بیان کیا ہے۔“ عین نے جواب دیا۔

”معاملہ سنگین نظر آتا ہے مگر دماغ کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے جس انداز میں تم سوچ رہے ہو ہو سکتا ہے اس طرح نہ ہو بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کی پوری چھان بین کی جائے پھر کوئی قدم اٹھایا جائے۔“ سالار نے کہا۔

”تم بتاؤں میں کیا کروں۔“ عین بولا۔

”تم روزانہ کب سوتے ہو۔“ سالار نے پوچھا۔

”دکان سے آنے کے بعد کھانا وغیرہ کھا کر رات دس بجے اپنے کمرے میں جاتا ہوں کچھ دیر بیوی سے بات چیت کرتا ہوں پھر ایک گلاس دودھ پی کر بستر پر لیٹ

کبھی جو نظر آتا ہے وہ نہیں ہوتا اور جو نظر نہیں آتا وہ ہوتا ہے یہ کام تلی اور سکون سے کرنے کا ہے جلد بازی نقصان دے جائے گی کیونکہ تو عورت شاس نہیں ہے پہلے آگاہی کی ضرورت ہے پھر دوسرا قدم اٹھانا ہے۔“

عین پھر آ کر لیٹ گیا۔ اس نے نرس کی طرف دیکھا اور اس کو اس کی وارنٹی اور خود سپردگی یاد آ گئی اس کا حافظہ گزری راتوں کا نقشہ پیش کرنے لگا۔ یہ یادیں اس کے لئے اذیتناک تھیں اب اس کو بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا وہ چھ مہینے سے اس کے تصرف میں تھی۔

عین رات بھر بستر پر ناخوشگوار یادوں کے ساتھ پڑا رہا اور سویرے بہت جلد اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ مگر رات کا پورا واقعہ اس کے ذہن کے پروے پر منعکس ہوتا رہا۔ سارے دن اس کی وہی کیفیت رہی اب اس کو کسی ہمدم کسی دوست کی تلاش ہوئی آخر اس کو کسی سے مشورہ تو کرنا تھا اپنی دلی حالت تو بیان کرنا تھی اس کے اندر جو طوفان اٹھ رہے تھے ان کو باہر بھی تولانا تھا اگر اندر ہی اندر یہ طوفان رپڑا، اگے تو پھر ان کا رخ دماغ کی طرف ہو جائے گا اور پھر انسانی دماغ اس طوفان کا مقابلہ کب تک کرتے گا۔

وہ سالار میاں کے پاس چلا گیا۔ سالار کی دکان اس کے برابر ہی تھی۔ دونوں بے تکلف تھے مذاق بھی کر لیا کرتے تھے۔

”آؤ عین میاں کیا بات ہے چہرہ کچھ اترا اترا سا لگ رہا ہے خیریت تو ہے۔“ سالار بولا۔

”ہاں یار پریشان ہوں۔“ عین نے جواب دیا۔

”بولو کیا پریشانی ہے۔“ سالار نے پوچھا۔

”یار بات ایسی ہے کہ کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔“ عین نے کہا۔

”باروں سے شرم نہ کرو جو بات تم اپنے باپ سے نہیں کر سکتے وہ مجھ سے کر سکتے ہو۔“ سالار نے کہا۔

”یار کیا بتاؤں مگر میں تمہارے پاس آیا تو مشورہ کرنے ہی ہوں مگر میری زبان پر وہ بات آ نہیں رہی میرے لئے وہ بات بہت شرم کی ہے۔“ عین نے کہا۔

”میں ابھی نیند کہاں آئے گی۔“ عین نے جواب دیا۔
 ”اچھا میں تمہارا دودھ لے آؤں۔“ اور وہ کمرے سے نکل گئی کچھ ہی دیر میں وہ گلاس میں چچہ ہلاتی واپس آ گئی اور اس نے عین کے سر ہانے دودھ کا گلاس رکھ دیا۔
 دونوں باتیں کرنے لگے۔ عین نے دودھ کی طرف دیکھا بھی نہیں نرمس آ کر اس کے قریب بیٹھ گئی، عین نے بھی کروٹ اس کی طرف کر لی۔ ابھی شادی کو زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا تھا جسم میں گری تھی جذبات میں اپنچل تو پیدا ہوئی ضروری تھی اور پھر دونوں جذبات کی رو میں بہت آگے بڑھ گئے۔ جذبات جب ٹھنڈے ہوئے تو عین کو خیال آیا کہ آج مجھے جاگنا ہے وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ نرمس اب تک لیٹی تھی عین نے اس کی طرف دیکھا وہ چھت کی طرف دیکھ رہی تھی عین بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور دودھ کے گلاس کو اٹھا کر غسل خانے کی طرف چلا اور نہایت ہوشیاری سے اس کو تانی میں بہا دیا اور پانی ڈال دیا اور گلاس لاکر وہیں پر رکھ دیا اور یہ ظاہر کیا کہ اس نے دودھ پی لیا ہے۔ کچھ دیر کے بعد نرمس اٹھ گئی اس نے خالی گلاس دیکھ کر کہا۔ ”آج بڑی جلدی دودھ پی لیا۔“
 ”ہاں مجھے ذرا بھوک سی محسوس ہو رہی تھی۔“ عین نے جواب دیا۔

نرمس اٹھ کر غسل خانے میں چلی گئی اور عین نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ نرمس بھی بستر پر آ گئی اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی عین کی طرف اس کی پیٹھ بھی عین نے آنکھیں کھول لیں اس نے عین کو دیکھا کہ وہ دودھ پیتے ہی اس پر نیند کا غلبہ ہو جاتا تھا۔ مگر آج نیند نہیں آ رہی تھی دس، پندرہ منٹ کے بعد نرمس کے جسم میں حرکت ہوئی اور اس نے کروٹ بدل کر منہ عین کی طرف کر لیا مگر عین اس سے پہلے ہی آنکھیں بند کر چکا تھا۔ نرمس اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر سنگھار میز پر چلی گئی اور اسے نرمس نے سنگھار کیا۔ عین بے حرکت پڑا تھا مگر اس نے آدمی آنکھیں کھول کر نرمس کی پوری حرکت دیکھ لی تھی نرمس میز سے اٹھ کر عین کے قریب آئی اور اس کو کندھے سے ہلا کر دیکھا مگر عین بے خبر پڑا تھا۔ نرمس کو اطمینان ہو گیا کہ وہ سو رہا ہے اور وہ زینے کی طرف

جاتا ہوں اور بہت جلد سو جاتا ہوں اور رات میں میری آنکھ نہیں کھلتی یہ تو اتفاق تھا کہ میں اٹھ گیا تھا۔“ عین نے کہا۔
 ”اب تم دودھ پینے کے بعد سوؤ گے نہیں۔ مگر سونے کی اداکاری کرو گے۔“ سالار نے کہا۔
 ”مگر دودھ پیتے ہی مجھے نیند آنا شروع ہو جاتی ہے۔“ عین نے کہا۔
 ”تو پھر تم دودھ مت پیتا۔“ سالار نے کہا۔
 ”یہ تو شک کی بات ہو جائے گی روز پیتا ہوں اور آج نہ پیوں گا تو شک تو ہوگا۔“ عین نے کہا۔
 ”ممنوع مت کرنا کسی بہانے اس دودھ کو کہیں بہا دینا۔“ سالار بولا۔

”ٹھیک ہے میں کوشش کروں گا۔“ عین نے کہا۔
 ”تم کو دیکھنا ہے کہ وہ کب اوپر جاتی ہے اور کیا کرتی ہے۔“ سالار بولا۔
 رات کو حسب دستور کھانے کے بعد وہ ٹیبلے نکل گیا اور ٹھیک دس بجے واپس کمرے میں آ گیا نرمس کمرے میں موجود تھی اور سنگھار میز پر بیٹھی تھی اس نے سرخ رنگ کا جوڑا پہنا ہوا تھا۔ بالوں میں مٹھے کے پھول جوڑے میں لگے ہوئے تھے نرمس کو یہ پھول بہت پسند تھے روزانہ یہ پھول اس کو ایک مالی دیکر جاتا تھا عین نے اس کو دیکھا تھا عین نے اس کوئی دفعہ کچھ روپے بھی دیئے تھے۔
 ”آج تم نے سرخ جوڑا پہنا ہے کیا بات ہے دوبارہ دہن بن رہی ہو کیا۔“ عین نے چہرے پر خوشی لاتے ہوئے کہا۔ نرمس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

”تم کو اچھا نہیں لگ رہا کیا۔“
 عین بولا۔ ”اچھا تو لگ رہا ہے مگر عورت ایک بار ہی دہن بن کر جیتی ہے۔ بار بار نہیں۔“
 ”یہ آپ کا خیال ہے سب کا نہیں ہے۔“ نرمس نے جواب دیا۔
 عین بستر پر لیٹ گیا نرمس میز سے ہٹ گئی اور بولی۔ ”کیا نیند آ رہی ہے۔“

چل دی۔ عین نے اس کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھا وہ اوپر چلی گئی۔ اس کے پانچ منٹ کے بعد عین اپنی جگہ سے اٹھا اور نہایت ہوشیاری سے زینہ چڑھ کر اوپر پہنچا اور دیوار کی آڑ میں کھڑا ہو گیا چھت پر چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس چاندنی میں دوسرے بہت قریب قریب بیٹھے تھے ایک تو ٹرگس تھی دوسرا کون تھا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ فاصلہ زیادہ تھا ان کی باتیں کرنے کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔

وہ وہیں کھڑا رہا دونوں کے جسم آہستہ آہستہ ایک ہونے لگے تو وہ غصے میں واپس مڑ کر بستر پر آ گیا۔ اس کے ایک گھنٹے کے بعد ٹرگس بھی آ گئی۔ ٹرگس نے اس پر نظر ڈالی اور لیٹ کر سو گئی مگر عین کی نیند تو ہوا ہو چکی تھی وہ مرات بھر کر وٹیں بدلتا رہا کتنی بار اس کے دل میں آیا کہ وہ اس بے حیا عورت کو قتل کر دے اور خود بھی مر جائے۔

مگر وہ کچھ نہ کر سکا اور سویرے بہت جلد اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا اور ٹرگس کے اٹھنے سے پہلے ہی دوکان چلا گیا۔ سارے دن اس نے خود کو مصروف رکھا تاکہ گزری رات کا خیال اس کو نہ آئے وہ پہر کو سالار نے رپورٹ پوچھی تو اس کی حالت خراب ہو گئی مگر اس نے پوری بات بتادی نہ بتاتا تو کیا کرتا۔

سالار نے کہا۔ ”وہ جو کوئی بھی تھا چھت پر گیا کیسے؟ یہ سوچنے والی بات ہے۔“

”میں خود حیران ہوں زینہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ چھت پر باہر سے بغیر کسی لمبی سیڑھی کے پہنچا نہیں جاسکتا اس کے اوپر آنے کا ذریعہ کیا تھا؟“

دونوں اس پر غور کرتے رہے مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

شام ہو گئی اور دوکان بند کر کے عین گھر کی طرف چلا۔ گھر اور دوکان کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا اس لئے وہ پیدل ہی جایا کرتا تھا وہ اپنی سوچوں میں گم چلا جا رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے سامنے ایک جوان آدمی اس کے سامنے کھڑا تھا اس کا قد عین سے نکلا ہوا تھا بدن کسرتی او

رنگ گورا تھا اس کے بال بھورے تھے اس کے چہرے کے خدو خال ایرانی لگتے تھے۔ مجموعی طور پر وہ ایک حسین مرد تھا۔ عین اس کے مقابلے میں کچھ نہیں تھا۔

عین نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ”مجھے کچھ بات آپ سے کرنی ہے۔“ اس کی آواز بڑی متوازن تھی۔

عین نے کہا۔ ”ضرور کریں مگر پہلے اپنا تعارف تو کرادیں۔“

”بات ہوگی تو تعارف بھی ہو جائے گا۔“ وہ اعتماد سے بولا۔

عین اس کی شخصیت سے متاثر ہو رہا تھا بولا۔ ”فرمائیں میں حاضر ہوں۔“

”یہاں بازار میں وہ بات کرنے والی نہیں ہے آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“ وہ بولا۔

”چلے کتنی دور جانا ہوگا؟“ عین نے پوچھا۔

”میرے پاس سواری ہے میں آپ کو واپس آپ کی جگہ پہنچا دوں۔“ وہ بولا۔

اس نے اشارہ کیا تو ایک نہایت خوبصورت ٹم ٹم ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ دونوں اس میں سوار ہو گئے اور ٹم ٹم تیزی کے ساتھ روانہ ہو گئی۔ سفر کے دوران دونوں خاموش تھے۔ آدھے گھنٹے کے بعد ان کا سفر تمام ہوا اور دونوں باہر آئے۔

عین نے دیکھا یہ کوئی نئی جگہ تھی دور دور آ بادی نہیں تھی اور وہ جس عمارت کے سامنے کھڑے تھے وہ بھی بہت قدیم زمانے کی لگتی تھی اس کے چاروں طرف درخت اور جھاڑیاں تھیں اور کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ عین نے حیرت سے کہا۔ ”آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں۔“

”ہاں یہ جگہ آپ کے شہر سے بہت دور ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”مگر یہ تو ویران جگہ معلوم ہوتی ہے۔“ عین نے کہا۔

”یہ جگہ آپ کے لئے ویران ہے مگر یہی ویرانہ ہم کو پسند ہیں ہم لوگ ایسی جگہوں پر رہتے ہیں۔ مگر آپ

پریشان نہ ہوں یہ میرا گھر ہے آپ سے میں نے وعدہ کیا ہے کہ واپس پہنچاؤں گا۔ چند منٹ بات کروں گا آئیے اندر آجائیے۔“ وہ بولا۔

اندر آ کر عین کو احساس ہوا کہ باہر سے کھنڈر نظر آنے والی عمارت اندر کی شاندار محل کا منظر پیش کر رہی تھی پورے محل میں روشنی تھی جھاڑ فانوس لگے ہوئے تھے اور بھینی بھینی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سرخ پتھر کا ایک نہایت شاندار تخت پڑا تھا اس کے گرد بڑی نفیس کرسیاں رکھی تھیں وہ دونوں ان کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھے ہی کسی طرف سے ایک خادم ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

”آپ کیا شوق فرمائیں گے؟“ وہ بولا۔

عین کا دماغ ٹھکانے پر نہیں تھا اس کے ساتھ یہ واقعات جس انداز میں شروع ہوئے اور اس کا میزبان جواب تک معہ بنا ہوا تھا کیا میں کسی آسیب میں پھنس گیا ہوں وہ کمزور اعصاب کا مالک نہیں تھا مگر ان حالات میں وہ کیا کر سکتا تھا۔

بڑی مشکل سے اس کی زبان سے نکلا۔ ”نہیں۔۔۔۔۔“

ضرورت نہیں ہے۔“

”میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو ضرورت ہے۔“ اور اس نے خادم کو کچھ اشارہ کیا اور وہ چلا گیا۔ خادم کے جانے کے بعد میزبان بولا۔

”میرا نام انگولا ہے، جہاں تم اس وقت ہو یہ علاقہ پانی پت اور دلی کے درمیان کا ہے اور یہ محل باہر کا بنایا ہوا ہے۔ یہاں پر میری حکومت ہے مگر میرا واسطہ کسی انسان سے نہیں ہے۔ میرا تعلق جنات سے ہے، میں نے کسی انسان کو کبھی نہیں ستایا۔ مگر میری بھی کچھ کمزوریاں ہیں۔ میرا تعلق عورتوں سے ضرور رہا ہے یہ میرا شوق نہیں ضرورت ہے۔ تم میری خلوت میں آگئے میں نے برداشت کر لیا میں تمہاری خلوت میں کبھی نہیں گیا۔ تمہاری شادی زمرگس سے نہیں ہو سکتی تھی مگر میں چاہتا تو مگر میں نے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ زمرگس خود تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی مگر میں نے کہا تم شادی کرو، میں نے تم کو تمہارے کسی کام سے نہیں

روکا، تم اپنی بیوی سے ملنے رہے اس سے میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا دیوار کے پاس تم جاتے ہو مگر دیوار میرے پاس آتی ہے یہی تم میں اور مجھ میں فرق ہے۔ میرا تمہارا کوئی مقابلہ نہیں ہے مگر تم نے میری خلوت میں آ کر سخت غلطی کی ہے، میں اگر چاہتا تو تم کو اسی وقت سزا دے سکتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا اس لئے تم بھی زیادہ قصور وار نہ تھے مگر اب آئندہ خیال رکھنا معافی ہر دفعہ نہیں ملتی۔“

عین کی حالت پہلے سے بھی زیادہ ابتر تھی۔ چہرہ ہلکی کی مانند زرد تھا اور وہ خشک تنکے کی طرح کانپ رہا تھا۔ منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ”ذرومت میں تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“ انگولا بولا۔

مگر عین کے ارمان اب بھی خطا تھے۔

رنگولانے شربت کا گلاس اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور کہا۔ ”یہ پیو سکون ملے گا۔“ عین کی کچھ کچھ میں نہیں آ رہا تھا اس نے شربت کا گھونٹ لے لیا۔ ایسا انوکھے مزہ کا شربت اس نے زندگی میں پہلی بار پیا بہت سکون اس کو ملا اور وہ پورا گلاس خا کر کر گیا۔

”میری بات یاد رکھنا زمرگس تمہاری بیوی ضرور ہے

۔ مگر میری بھی پسند ہے۔ میں تم کو نہیں روکتا تم مجھے نہ روکو اگر تم کو یہ پسند نہ ہو تو بتاؤ، ابھی نہیں بتاتے تو زمرگس کو بتا دیتا۔ اس کے بعد بیٹھ کر فیصلہ کر لیں گے، میں زمرگس سے کچھ عرصہ اور ملوں گا اس کے بعد وہ تمہاری ہوگی پھر میں نہیں آؤں گا۔ آؤ میں تم کو چھوڑ آؤں اور ہاں تمہاری میری یہ ملاقات کسی پر ظاہر نہ کرنا، کر دے تو تم ہی نقصان اٹھاؤ گے۔ ہر بات تم کو بتا دی ہے پھر شکایت مت کرنا۔“

عین کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ یہ کیسا چکر ہے۔ یہ کیسا جن ہے میں نے تو سنا ہے جن جس عورت پر عاشق ہوتا ہے اس عورت کے ساتھ کسی مرد کو برداشت نہیں کرتا۔ پھر زمرگس نے مجھ سے شادی کر لی وہ دیکھتا ہاں اس نے کچھ نہیں کہا وہ میرے پاس بیوی کی حیثیت سے رہتی ہے وہ کچھ نہیں کہتا۔ اس کو رقابت نہیں ہوتی۔ وہ میرا دشمن نہیں بناسا نے ٹھیک کہا تھا وہ میری خلوت میں کبھی نہیں آیا۔ حالانکہ اس کا آنا مشکل نہ تھا۔

عین کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا انہونی ہو رہی تھی۔ اب تو وہ پابند کر دیا گیا تھا وہ یہ سب سالار کو بھی نہیں بتا سکتا تھا۔

سارے دن وہ دکان پر خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ شام کو گھر آ گیا۔ نرگس نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ آج تم کھلے کھلے سے لگ رہے ہو۔“

عین نے اس کی طرف دیکھا مگر جواب نہیں دیا۔ نرگس اس کے قریب بیٹھ گئی اور بولی۔ ”میں جانتی ہوں تم کیوں پریشان ہو؟“

عین نے حیرت سے اس کو دیکھا اور پوچھا۔ ”تم کیا جانتی ہو؟“

”تم میری وجہ سے پریشان ہو۔“ نرگس نے جواب دیا۔ عین سمجھ گیا کہ اس کو انگوٹا نے بتا دیا ہے مگر بولا کچھ نہیں۔

”میں متین نہیں ہوں عورت ہوں گوشت اور ہڈیوں کی بنی ہوئی جس طرح تم ہو، تم جان گئے ہو کہ انگوٹا انسان نہیں، وہ ایک جن ہے اور جن بھی اپنے علاقے کا مالک،

وہ اپنے قبیلے کا سردار بھی ہے اور اس کی بیوی بھی ہے۔ مگر وہ میرے پاس بھی آتا ہے اور میرے ساتھ جسمانی ملاپ بھی کرتا ہے مگر صرف ایک ماہ میں ایک دفعہ، وہ روز آتا ہے مگر

ملاپ صرف ایک دن ہوتا ہے اور وہ چاند کی چودھویں رات ہوتی ہے اس کے علاوہ وہ مجھ سے دور رہتا ہے۔ تم مجھ سے

اس رات دور رہنا، یہ انگوٹا کی رات ہوتی ہے، اس نے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ میں تم کو بتا دوں، مجھے نہیں پتہ کہ اس نے

یہ تاریخ کیوں مقرر کی ہے، اس نے میری تمہاری شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی، کسی کو پریشان نہیں کیا، تم کو بھی

پریشانی نہیں ہوئی، بس اتنا ہی مجھے پتہ ہے، تم بھی اس کو بہت جالو اور مزید کرید کرنے کی کوشش نہ کرو کیونکہ تم جو ہو

انگوٹا کا مقابلہ تم نہیں کر سکو گے اور اگر تم میرا اس سے ملنا برداشت نہ کر سکو تو مجھے چھوڑ دو، میں خود سے انگوٹا کو نہیں

چھوڑ سکتی، تم اس کو میری مجبوری سمجھ لو۔“

نرگس نے اس کو اور زیادہ پریشان کر دیا، ہر طرف سے اس کے راستے بند تھے وہ اپنا دکھ کسی کو بتلا نہیں

سکتا تھا۔ نرگس کا پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ خوشی سے انگوٹا کے

ساتھ تھی یا کسی مجبوری نے اس کو باندھا ہوا تھا۔ انگوٹا کا کردار بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کبھی وہ رحم دل نظر آتا، کبھی ظالم نظر آتا ہے، وہ کسی کی بیوی پر قابض تھا اور اس طرح کہ شاید کوئی یقین نہ کرے۔

نرگس نے اس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ سلسلہ شادی سے پانچ سال پہلے سے جاری ہے اس پر بھی وہ حیران تھا اور

بات تھی بھی حیرت کی انسان خاکی ہے اور جنات آگ سے بنائے گئے ہیں۔ ان دونوں کا ملاپ نہیں ہو سکتا اگر ہوگا تو

نقصان انسان کا ہی ہوگا۔ مگر نرگس اس کے سامنے تھی وہ اب بھی تندرست تو اتنا تھی شادی کے وقت جیسی تھی ویسی ہی اب

بھی تھی۔ عین کا دماغ ہر جگہ جا کر انک جاتا تھا۔ کسی سے مشورہ کرنا، کچھ بتانا انگوٹا کو ناراض کرنا تھا اور اس کی ناراضگی خطرناک تھی۔

دن گزرتے رہے ہر روز نرگس چھت پر اس کے سامنے جاتی رہی اب نرگس کو ضرورت نہیں تھی کہ دودھ میں

بے ہوشی کی دوا عین کو پلائے عین بھی جانتا تھا کہ وہ کہاں جاری ہے۔ وہ روز سولی پر چڑھتا تھا روز اذیتناک کانٹوں

پر سوتا تھا۔ دن بدن اس کی محنت خراب ہو رہی تھی کوئی دوا اس پر اثر نہیں کرتی تھی۔ آخر اس کو علاج کی غرض سے اس

کا باپ دلی لے گیا۔ یہاں پر بھی کئی حکیموں نے اس کا علاج کیا مگر فائدہ کچھ نہ ہوا کیونکہ اس کا مرض ہی پتہ نہیں

چلتا تھا اور آخر حکیم دقار کے مطب میں وہ آ گیا۔ حکیم صاحب نے اس کا معائنہ کیا مگر بیماری کا کچھ

پتہ نہیں چلا۔

مریض بہت لاغر تھا اس کے پیٹ میں خوراک نہیں جاتی تھی۔ مریض خاموش تھا اپنی زبان سے وہ کچھ نہیں کہتا

تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے ہوئے تھے اور آنکھیں غلاؤں میں گردش کرتی تھیں۔

میں نے رولو کا سامنے اس کو پیش کر دیا۔ رولو کا نے اپنے انداز سے اس کا معائنہ کیا اور کچھ دیر میں بولا۔۔۔۔۔

”اس کے اندر ڈر اور خوف بھرا ہے ایسا لگتا ہے اس کے ڈر کو نکالنا ہوگا۔“

میں تمہاری ہر طرح کی مدد کروں گا، انسان سے زیادہ کون طاقتور ہے انسان جن، بھوت، پریت سب پر حاوی ہے۔ ان سے ڈرنا کیا تم یہ خود انسان سے ڈرتے ہیں۔“

عن سب سن رہا تھا۔ مگر اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ رولوکا پھر بولا۔ ”تم مجھے وہ سب بتاؤ جو تم پر گزری ہے میں تم کو یقین دلانا ہوں کہ تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا یاد رکھو ڈرتے رہنے والوں کو ایک چوہا بھی ڈرا دیتا ہے اور ڈٹ کر کھڑے ہونے والوں سے شیر بھی ڈرتا ہے۔“

عن کے اندر بولنے کا حوصلہ ہوا اور اس کے لب پہلے۔ ”میں آپ کو بتاؤں گا۔“ اس نے انک انک کر یہ جملہ کہا۔

”شاباش تم کو ہمت کرنا ہوگا ورنہ دشمن تم پر حاوی ہو جائے گا۔“ رولوکا بولا۔۔۔۔۔

”میرا دشمن بڑا عجیب ہے۔“ عن نے کہا۔ ”پوری بات بتاؤ گے تو میں کچھ سمجھ سکوں گا۔“ رولوکا نے کہا۔

عن نے پوری کہانی رک رک کر آہستہ آہستہ بیان کر دی۔ رولوکا بھی اگولا کے کردار کے بارے میں حیران رہ گیا۔ مگر اس نے عن سے کچھ نہیں کہا۔

”تمہارے اندر کارا ز جو تم کو اندر ہی اندر بھسم کر رہا تھا نکل گیا ہے کھاؤ، پو اور آرام سے یہاں پر رہو اس چھت کے نیچے اگولا نہیں آ سکتا۔ اب میں جانو اور اگولا جانے۔“

پوری روداد مجھے رولوکا نے بتائی تو مجھے بھی حیرت ہوئی یہ تو عجیب بات ہے کہ اگولا نے اس کی عورت پر قبضہ بھی کر رکھا ہے اور مرلیض کو بھی کچھ نہیں کہتا حالانکہ اب تک یہی سنا اور دیکھا تھا کہ جن جس عورت پر قبضہ کرتے ہیں اس کے نزدیک کسی کو نہیں آنے دیتے اور اڑا کر لے بھی جاتے ہیں میں نے کہا۔

”دوسری عجیب بات یہ ہے کہ وہ عورت کچھ عرصہ میں ہی ختم بھی ہو جاتی ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”اور وہ عورت نارل زندگی نہیں گزارتی اس کے گرد ہر وقت جن منڈلاتا ہے مگر اس کی بیوی ٹھیک ہے اور اس سے بھی ملتی ہے اور رات کے علاوہ نارل رہتی ہے اور جسمانی

”میرے پاس تو کوئی دوا نہیں ہے ایسی۔“ میں نے جواب دیا۔

”مگر اس کی دوا تو ہے میں کچھ کرتا ہوں۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”اس کے ساتھ اس کا بوڑھا باپ آیا ہے یہ شاہ جہاں پور سے آئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”یہ آپ نے اچھا بتا دیا اس کو بلوایئے کچھ تو وہ بتائے گا۔“

رولوکا نے عن کے باپ شکور سے پوچھا۔ ”اس کی یہ حالت کتنے دن سے ہے۔“

”زیادہ نہیں ایک ڈیڑھ مہینہ ہو گیا ہے۔ اس کا کھانا، پینا چھوٹ گیا ہے ہر وقت پریشان سا رہتا ہے کسی کو کچھ بتاتا بھی نہیں۔“ شکور نے کہا۔

”شادی شدہ ہے۔“ رولوکا نے پوچھا۔ ”ہاں جی سات آٹھ مہینے پہلے شادی ہوئی ہے۔“

شکور بولا۔۔۔۔۔ ”بیوی سے خوش ہے۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”اس نے ابھی تک تو بیوی کی شکایت نہیں کی۔“ شکور بولا۔۔۔۔۔

”بڑے صاحب بات یہ ہے کہ معاملہ ذرا پے چیدہ نظر آتا ہے اس لیے اس کو ہم اپنے پاس رکھیں گے۔ اگر آپ کے پاس دلی میں ٹھہرنے کا ٹھکانا نہ ہو تو آپ بھی یہاں پر رہیں اور نگر نہ کریں علاج اس کا ہو جائے گا ہو سکتا ہے کچھ وقت لگ جائے۔“ رولوکا نے کہا۔

”مجھے تو کسی سرائے میں رکنا ہوگا۔“ شکور نے کہا۔

”تو پھر آپ بھی یہاں پر رہیں۔“ رولوکا نے کہا۔

اور عن کا علاج رولوکا نے اس طرح شروع کیا کہ پہلے اس کے جسم کے اندر تلاش کیا کہ کچھ ہے تو نہیں مگر اس کو کچھ نہیں ملا۔ اب وہ مرلیض کے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔

”عن میں تمہارا دوست ہوں تمہارا ہمدرد ہوں، میں جانتا ہوں تم خوف زدہ ہو مگر خوف کوئی چیز نہیں ہے انسان اگر ارادہ کرے تو خوف خود بخود دور ہو جاتا ہے۔ تم اکیسے نہیں ہو،

رولوکا نے نرگس سے پوچھا۔ ”تم انگولا کو جانتی ہو۔“
انگولا کا نام کسی اجنبی کی زبان سے سن کر نرگس
حیران ہوگئی۔ ”پریشان نہ ہوں میری بات کا جواب
دیں۔“ رولوکا بولا۔

”ہاں جانتی ہوں۔“ نرگس نے کہا۔

”وہ کون ہے تم کو پتہ ہے۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”ہاں وہ ایک جن ہے۔“ نرگس بولی۔

”میں کچھ باتیں کروں گا براہ امت ماننا یہ جن کے اور
تہمارے علاج کے لئے ضروری ہیں اگر کچ نہیں بتاؤ گی تو
یاد رکھو نہ جن کی زندگی بچے کی نہ تمہاری، تم دونوں جس
وبال میں گرفتار ہو اس کا علاج ہے مگر ضروری یہ ہے کہ مجھے
تم سچائی سے پوری بات بتاؤ۔“ رولوکا نے کہا۔

”میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔“ نرگس نے کہا۔

”تم اس جن سے مل کر خوش ہوتی ہو۔“

”نہیں میں اس سے مل کر خوش نہیں ہوتی۔“ نرگس

نے کہا۔

”تم اپنے شوہر سے خوش ہو۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”ہاں وہ ایک اچھا انسان ہے اس میں کوئی خرابی

نہیں ہے۔“ نرگس نے کہا۔

”پھر تم اس جن کے پاس روز رات کو کیوں جاتی

ہو۔“ رولوکا نے کہا۔

”انگولا میری زندگی میں شادی سے پہلے ہی آ گیا

تھا۔ مگر وہ ملاپ صرف چودھویں رات میں ہی کرتا تھا۔

شادی کی اجازت صرف اس شرط پر دی تھی کہ میں اس سے

روز ملوں گی مگر ملاپ صرف ایک ماہ میں ایک دفعہ ہوگا مجھے

اس کا راز اس نے نہیں بتایا تھا۔“ نرگس بولی۔

”اس کے ملاپ کے بعد تمہارے جسم میں کسی قسم کی

تبدیلی یا کمزوری یا کوئی اور خرابی کبھی ہوئی یا تم نے کچھ بھی

محسوس کیا۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”نہیں مجھے اب تک کچھ نہیں ہوا۔“ نرگس بولی۔

”یہ بات حیرت انگیز ہے تم خاکی اور وہ آتش اور تم

اب تک کوئی تبدیلی محسوس نہیں کرتی ہو۔ یہ بات بھی غلط نہ

ملاپ صرف چاندنی رات میں وہ کرتا ہے مانا کہ کم کرتا ہے مگر
پھر بھی عورت کو اب تک ختم ہو جانا چاہئے تھا کیونکہ اس کے
گرم اثرات اس کے جسم میں تو رہتے ہیں۔ میری نظر میں یہ
پہلا انوکھا کیس آیا ہے۔“ میں نے کہا ”آپ نے درست
کہا، اس میں بھی کچھ نہ کچھ لازم ضرور ہے۔“ رولوکا بولا۔

”تو اب پھر تمہارا ارادہ کیا ہے؟“ میں نے

پوچھا۔

”پہلے تو اس کہانی کے جو کردار ہیں ان سے

ملاقات کرنا ہوگی۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے تم انگولا سے بھی ملاقات کرو

گے۔“ میں نے کہا۔

”کروں گا مگر ابھی نہیں اس سے پہلے مجھے نرگس

سے ملنا ہوگا۔“ رولوکا بولا۔

دوسرے ہی دن رولوکا شاہ جہاں پور چلا گیا۔ جن کا

مکان تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی رولوکا کو پتہ تھا

کہ اس گھر کے دونوں مرد یعنی شکور اور جن تو دلی میں ہیں۔

دروازے پر ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔

اور بتایا کہ وہ جن کی ماں ہے رولوکا نے کہا۔ ”جن اور اس

کا باپ شکور دلی میں اس کے مطب میں ہیں، میں کچھ ضروری

معلومات کو آ یا ہوں اور وہ معلومات جن کی بیوی سے ہی حاصل

کرتی ہیں۔ ان معلومات کے بغیر جن کا علاج نہیں ہو سکتا

آپ پیٹلک ہمارے ساتھ رہیں مگر فاصلہ اتنا ہو کہ آپ کو ہماری

آواز نہ آئے آپ خیال نہ کریں معاملہ کچھ اور قسم کا ہے جس

کے بارے میں آپ کو وقت سے پہلے کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔“

جن کی ماں ذرا جھجکی مگر پھر راضی ہوگئی۔

”تو پھر آپ جن کی بیوی نرگس کو بلوالیں۔“ رولوکا

نے کہا۔

”میں بلا کر لاتی ہوں۔“ اور بڑی بی اندر چلی

گئیں۔ اتنی دیر میں رولوکا نے پورے گھر کی تلاشی لی

تھی۔ مگر گھر میں کسی قسم کا اثر نہیں تھا۔

نرگس بڑے کمرے میں آگئی اور بڑی بی دروازے

پر رک گئیں۔

سے سمجھ میں نہیں آتی تم یہ بتاؤ تم خوراک کیا کھاتی ہو؟“
رولوکا نے تجب سے پوچھا۔

”خوراک تو میں وہی کھاتی ہوں جو سب کھاتے ہیں ہاں انگولا ہر چودھویں رات ایک حلوہ نمونے کی چیز لایا کرتا ہے اور مجھے کھلاتا ہے اس کا مزاج عجیب سا ہوتا ہے مگر خراب نہیں ہوتا وہ خود نہیں کھاتا مجھے ہی کھلاتا ہے بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کھاتی۔“

”تم ایک کام کرو کسی طرح اس حلوہ کو ذرا سا بچا کر مجھے دے دینا میں دیکھوں گا کہ وہ کیا ہے اور اگر وہ تم سے صحت کے بارے میں پوچھے تو کہہ دینا اس کا باپ علاج کے لئے کہیں لے گیا ہے ابھی میرے بارے میں اس کو پتہ نہیں ہونا چاہئے۔“ رولوکا نے کہا۔

”حکیم صاحب کیا عین ٹھیک ہو جائے گا۔“ نرگس نے پوچھا۔

”وہ ضرور ٹھیک ہو جائے گا۔“ رولوکا بولا۔
”اور میری جان انگولا سے چھوٹ جائے گی۔“

نرگس بولی۔
”ضرور چھوٹ جائے گی میرے ساتھ تعاون کرو گی۔“
تو.....“ رولوکا بولا۔

”اس کو صبری اور آپ کی ملاقات کا پتہ نہیں چلے گا۔“ نرگس بولی۔

”نہیں پتہ چلے گا وہ تمہاری طرف سے بے فکر ہے میں نے دیکھا ہے تم پر اس کی پہرہ داری نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تم کو بے ضرر سمجھتا ہے۔ اب میں تم سے چاندنی رات کے بعد ملاقات کروں گا اور رولوکا واپس دلی آ گیا اور سارے حالات مجھے آ کر بتائے۔

”میرے خیال میں جو حلوہ نما چیز وہ کھلاتا ہے وہی چیز نرگس کو بچائے ہوئے ہے۔“ میں نے کہا۔

”آپ کا خیال درست ہے مگر میں پہلے اس کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”صحت کا علاج دواؤں سے کم اور نفسیاتی زیادہ ہے مگر میں کوشش کر رہا ہوں کہ وہ اس نفسیاتی دباؤ سے باہر

آجائے۔“ میں نے کہا۔

”میرے خیال میں اس کو بھی ٹھنڈی دوا میں استعمال کروائیں نرگس کے اثرات اس پر بھی آ سکتے ہیں مگر پہلے اطمینان کرنا ہوگا۔“ رولوکا بولا.....

”میرے خیال میں تو اس کی جسمانی حالت اتنی بری نہیں ہے کمزوری ہے مگر وہ بھی ذہنی دباؤ کی وجہ سے اس کا مددہ متاثر ہوا ہے اور پوری طرح خوراک ہضم نہیں ہو رہی اس کا علاج زیادہ مشکل نہیں ہے، میں کر لوں گا۔“ میں نے کہا۔ پندرہ دن گزر گئے۔ چودھویں رات گزر گئی اور رولوکا نرگس کے پاس پہنچ گیا۔

نرگس نے ایک کافذ میں لپٹا چھوٹا سا پیکٹ اس کے حوالے کر دیا اور کہا۔

”یہی وہ حلوہ ہے، میں نے بڑی ہوشیاری سے اس کو بچا لیا تھا۔“

”تم پر اس نے کسی قسم کے شک کا اظہار تو نہیں کیا۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”نہیں وہ صرف عین کی خیریت پتہ کر رہا تھا اور وہ کہاں ہے یہ پتہ کر رہا تھا۔“ نرگس بولی۔

”ٹھیک ہے میں تم سے پھر ملوں گا۔“ رولوکا وہ پیکٹ لے کر واپس آ گیا۔

میرے سامنے اس نے اس پیکٹ کو کھولا اس حلوے کا رنگ دودھیا تھا اور اس پر باریک چڑی جی ہوئی تھی، ڈلی کو تو ڈر دیکھا تو اس میں کچھ میوہ جات بھی نظر آئے اور سرخ مفید ذات بھی چمکتے نظر آ رہے تھے۔

رولوکا نے ایک چھوٹا سا برتن لیا اور اس میں اس کو ڈال کر آگ پر رکھ دیا۔ چند منٹ میں ہی وہ گھل گیا اور سارے اجزاء الگ الگ نظر آنے لگے۔ پھر اس نے ایک چھنی میں اس کو چھان کر الگ الگ کر دیئے اور ان کو الگ رکھ دیا۔

چند منٹ کے بعد ہی چھتا ہوا پانی بھر جم گیا۔ رولوکا نے اس کو اپنی زبان پر ذرا سالے کر رکھا اور مسکرا کر بولا۔
”یہ تو وہی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”وہی کیا؟“

اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ میں نے یہ سب خوب دیکھ لیا ہے میں اب اس کے ساتھ اس کے ٹھکانے پر جاؤں گا اور اس سے وہیں پر ملاقات کروں گا..... رولو کا نے کہا۔

”تمہارے خیال میں وہ کوئی خطرناک جن لگتا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں ایسا نہیں ہے اور اگر ہوا تو میں اس کو اس کے گھر میں اس کی طاقت کا اندازہ کراؤں گا۔“ رولو کا نے کہا۔

رولو کا رات میں روپوشی کی حالت میں چھت پر نرمس کے آنے سے پہلے ہی آ گیا تھا۔

چھت پر کوئی نہیں تھا پھر رولو کا کو ایک کڑیل جوان نظر آ گیا اور اس کے آنے کے چند منٹ کے بعد نرمس بھی آ گئی۔

”جوان نے پوچھا کیسی ہونرمس۔“

نرمس نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہوں۔“

دونوں زمین پر بڑی چٹائی پر بیٹھے گئے رولو کا ان کے بہت قریب ہی رہا۔ ”نرمس تم پہلی عورت ہو جس نے مجھ سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔“ انگولا بولا۔

”مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑی..... میرا شوہر میری ضرورت پوری کر دیتا ہے۔“ نرمس بولی۔

”تم مجھ سے خوش نہیں ہو۔“ انگولا بولا۔

”تمہارے سامنے میری خوشی کیا معنی رکھتی ہے اگر نہ خوش ہوں تو بھی تم اپنی ضرورت پوری کرو گے اس لئے میری مرضی کا سوال نہ کرو۔“ نرمس نے کمال جرات سے جواب دیا۔

”تم نے درست کہا ہے مگر میری ضرورت میری مجبوری ہے میں تم کو اس کے بارے میں بتا بھی نہیں سکتا مگر تم مجھے مجبور سمجھ کر معاف کر دینا۔“ انگولا بولا۔

”وہ تو میں ایک عرصہ سے کرتی آرہی ہوں۔“

نرمس نے کہا۔

”کچھ دن اور برداشت کرنا ہوگا پھر میں تم کو آزاد کردوں گا۔“ انگولا بولا۔

رولو کا بولا۔ ”وہی جو میں کچھ دن پہلے ایک پھل لایا تھا اور اس کے گودے کی بالٹ مریش کے جسم پر اس کے جسم کی گرمی ختم کرنے کوئی تھی۔ اس میں فرق صرف یہ ہے کہ میں کچا پھل لایا تھا اور پکے ہوئے پھل کا گودا ہے اس کی تاثیر اور اس کی تاثیر میں ذرا سا فرق ہوتا ہے یہ فوری اثر کرتا ہے اور وہ ذرا دیر میں اثر کرتا ہے خاصیت دونوں کی ایک ہی ہے۔ مگر انگولا نے اس کا حل وہ اس طرح بنایا ہے کہ یہ قابل استعمال ہو گیا ہے۔ گرمی کے اثرات کو اس نے بڑی حکمت سے زائل کیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے نرمس کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہا ہے۔ مگر بات ابھی بھی صاف نہیں۔“ رولو کا بولا.....

”اگر وہ اتنا ہی نیک نفس ہے کہ وہ نرمس کو اور اس کے شوہر کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تو پھر اس نے نرمس سے تعلق ہی کیوں رکھا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لئے میں نے کہا ہے کہ بات ابھی صاف نہیں ہوئی ہے۔“ رولو کا بولا.....

”میرا خیال ہے تمہاری زندگی کا یہ انوکھا کیس ہے کہ تمہارا مد مقابل دشمن نہیں لگتا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں اور اس لئے اس کے خلاف ابھی کچھ کرنے کو دل نہیں کرتا۔“ رولو کا بولا.....

”پھر تم کیا کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔

”دو فریق سے ملاقات تو میں نے کر لی اب تیرا اور اہم فریق انگولا ہے، میں اس کے بارے میں تحقیق کروں گا اور اس سے ملاقات کروں گا پھر کچھ صورت نظر آئے گی ہو سکتا ہے میں نے اور آپ نے جو قیاس کیا ہے معاملہ اس کے برعکس ہو۔“ رولو کا بولا.....

”اب کیا پروگرام ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے پوری طرح چیک کر لیا ہے وہ رات ایک اور دو بجے کے درمیان آتا ہے نرمس اس کے پاس چلی جاتی ہے۔ دونوں زیادہ ماث نہیں کرتے صرف وہ نرمس کے رانوں پر سر رکھ کر لیٹا رہتا ہے اور پھر ایک گھنٹے کے بعد

”تم نے اس غلطی کے بارے میں مجھے کبھی نہیں بتایا۔“ بیگم بولی۔

”اس لئے نہیں بتایا کہ وہ میرا قابل تعریف فعل نہیں تھا۔“ انگولا بولا۔

”تمہاری اس غلطی کی سزا میں کب تک برداشت کروں گی۔ تو بتا دو۔“ بیگم نے کہا۔

”میں تم سے شرمندہ ہوں کہ میرا خیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ میں تم کو وہ غلطی بھی بتا دوں۔ میں تم سے اب زیادہ پردہ رکھنا نہیں چاہتا۔“ انگولا بولا۔

”بتاؤ میں سن رہی ہوں.....“

”تم کو پتہ ہے کہ ہماری قوم کے کچھ قبائل ایسے ہیں کہ وہ جہاں رہتے ہیں وہاں پر ہم لوگ نہیں رہ سکتے کچھ اتنے سرد علاقوں میں برف پوش پہاڑوں پر رہتے ہیں کہ ہمارا گزر وہاں نہیں ہے۔ کچھ آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں میں رہتے ہیں۔ ان میں گرمی کی قوت برداشت کمال کی ہوتی ہے۔ والد کے زمانے میں، میں سیلانی تھا جہاں جہاں ہماری آبادیاں تھیں میں وہاں جایا کرتا تھا۔ تو ایک دفعہ میں جاوا سائرا کے آتش فشاں کے دہانوں تک چلا گیا۔ میں حیران تھا کہ ہماری قوم کے لوگ ان دہانوں میں آباد تھے۔

میری مصیبت کا آغاز بھی وہاں پر ہی ہوا۔ میں نوجوان تھا مجھ پر کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ اس گرم ترین دہانے کی حسین ترین دوشیزہ سے میری مڈ بھیڑ ہو گئی میں اس کے حسن کا دیوانہ ہو گیا اور اس کے گرد پروانے کی مانند چکر لگانے لگا اور پھر میرا اس سے ملاپ ہو گیا مگر اس ملاپ کے بعد میں اس بستی میں نہ رہ سکا۔ وہاں کے دستور کے مطابق مجھے اس کے ساتھ رہنا تھا مگر میرے جسم میں آگ جل چکی تھی اس حینہ کے جسم کی گرمی نے میرے اندر آگ کا لاؤ روشن کر دیا تھا۔ میں پہلی فرصت میں وہاں سے نکل بھاگا اور اپنے گھر آ گیا میرے والد مرحوم نے میری حالت دیکھی تو وہ سارے معاملے کو سمجھ گئے۔ انہوں نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا اور وہ مجھے ایک حکیم کے پاس لے گئے۔

”یہ تم سالوں سے کہہ رہے ہو مگر مجھے اب پرواہ نہیں مجھے فکر صرف اپنے شوہر کی ہے۔ کون مرد ہوگا جو یہ سب برداشت کرے گا، جو وہ کر رہا ہے اس غم نے اس کو بیاہ کر دیا ہے۔“ نرسنگ نے اداسی سے کہا۔

”تم کو میں کیا بتاؤں ہر کوئی اپنی اپنی جگہ مجبور ہے میں بھی اور تم بھی.....“ انگولا بولا۔

اس قسم کی باتوں میں ایک گھنٹہ گزر گیا اور انگولا اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”اب میرے جانے کا وقت ہوا، میں جاتا ہوں۔“ اور وہ چھت سے کود گیا۔

مگر رولوکا اس کے بہت قریب ہی رہا۔ چند منٹ کے سفر کے بعد وہ ایک ویران محل کے سامنے کھڑے تھے، اس کو دیکھتے ہی محل کا بڑا دروازہ کھل گیا اور وہ اندر داخل ہوا مگر اس کے ساتھ رولوکا بھی تھا اس کا اندازہ کہی کو نہ تھا۔

اندر روشنی تھی وہ سیدھا ایک کمرے میں گیا وہ کمرہ بھی روشن تھا۔ ایک بہت بڑے پٹنگ پر ایک نہایت حسین عورت بیٹھی تھی۔ اس کے مقابلے میں نرسنگ کچھ نہیں تھی۔ انگولا کے اندر جاتے ہی اس عورت نے کہا۔

”یہ سلسلہ کب تک چلے گا، میں کب تک جلتی کوہتی تمہارا انتظار کروں گی اگر کسی روز غصہ آ گیا تو اس بد بخت کو اس کے گھر جا کر چبا جاؤں گی۔“

”ذرا صبر کرو بیگم، تم میری مجبوری جانتی ہو پھر بھی اتنا غصہ کرتی ہو۔“ انگولا بولا۔

”آخر میرا بھی تم پر حق ہے..... میں بھی جذبات رکھتی ہوں۔“ بیگم بولی۔

”بالکل تمہارا حق ہے، میں تمہارے جذبات کا بھی احترام کرتا ہوں مگر تم میری مجبوری بھی جانتی ہو پھر تو اتنا غصہ نہ کرو۔“ انگولا نے جواب دیا۔

”کتنے سال گزر گئے کب تک یہ سلسلہ چلے گا۔“ بیگم بولی۔

”میں نے زندگی میں ایک غلطی کی تھی اس غلطی کی سزا بھگت رہا ہوں۔“ انگولا بولا.....

حکیم نے میری حالت دیکھی اور ایک پھل میرے والد کو لانے کو کہا۔ ”وہ کہاں سے ملے گا۔“ اس کا پتہ بھی ان کو بتادیا اور میرا علاج شروع ہوا۔

کچھ روز کے بعد اتنا ہوا کہ میرے اندر آگ کی جو حدت تھی وہ کم ہونے لگی اور پھر آگ کی حدت ختم ہو گئی مگر حکیم صاحب نے بتادیا کہ یہ اب بھی شادی کے قابل نہیں ہوا ہے اب بھی جو عورت اس کے قریب آئے گی وہ اس کے اندر کی گرمی برداشت نہ کر سکے گی۔

دس سال میرا علاج ہوتا رہا، میری دوائیں وہی حکیم بناتے تھے اور والد وہ دوائیں لاتے تھے۔ دس سال کے بعد انہوں نے کہا۔

”اب اس کی آزمائش کرنا ہوگی۔“ اس آزمائش کے لئے انہوں نے مجھے آزاد کر دیا کہ میں آدم زاد کی عورت پسند کروں مگر حکیم صاحب نے کہا۔

”آدم زاد کے لئے تو تم سخت خطرناک ہو ایک تو تم آتش اور پھر تمہارے اندر زائد گرمی وہ عورت اس گرمی کو برداشت نہ کر کے اپنی زندگی کھو دے گی۔“ اس کے لئے انہوں نے ایک حلوہ نمادادی کہ اس عورت کو یہ دوا کھلائی جائے۔ اس کے کھانے سے عورت کا بدن برف کی مانند

ہو جائے گا تمہاری گرمی اس پر اثر انداز نہ ہوگی۔ میں نے اس دوا کو استعمال کیا وہ دوا کارگر تھی اور تم سے شادی کر لی۔

حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ میں پہلے اس عورت کے برف جیسے جسم کو اپنے قریب کروں پھر تمہارے پاس آؤں اور چاند کی ٹھنڈی روشنی میں اس دوا کے کھلانے کے بعد اس کے ٹھنڈے جسم کی قربت ضرور کروں اس طرح تم ہر خطرے سے دور ہو جاتی ہو میں نے تم کو یہ اب تک نہیں بتایا تھا میں مانتا ہوں کہ میری ایک غلطی نے مجھے بہت بڑی سزا دی ہے۔ میرے ساتھ آدم زاد کی اس

عورت کو بھی پریشانی ہوئی اس کے شوہر کو صدمہ پہنچا، تم نے مجھ پر شک کیا اور میں والد مرحوم کے سامنے شرمندہ ہوا۔ مگر میرے والد نے میری قوم کے سامنے مجھے شرمندہ نہیں ہونے دیا۔“

”اب تم کیا کرو گے..... اس آدم زاد کے پاس جاؤ گے۔“ بیگم نے پوچھا۔

”ہاں جاؤں گا اس کا شکریہ ادا کرنے میں نے اس کو جو دکھ دیا ہے اس کا ازالہ کرنے، شوہر کے دکھ تو میں دور نہیں کر سکتا اس پر میں ہمیشہ شرمندہ رہوں گا۔“ انگولا بولا۔

”تم خود کو اب کیسا پاتے ہو۔“ بیگم نے پوچھا۔

”بہت بہتر ہوں، اب مجھے آدم زاد کی ضرورت نہیں صرف دوائیں اور تم میرے لئے بہتر ہو۔“ انگولا بولا.....

انگولا اپنی بیگم کی طرف بڑھا اور رو لو کا کرے سے باہر آ گیا۔

واپس آ کر اس نے نرمس کو بتادیا کہ ”اب انگولا جن تمہارے پاس نہیں آئے گا۔ تم اگر جسم میں قوت یا کسی قسم کی پریشانی محسوس کرو تو میرے پاس آ جانا۔“

رو لو کا دلی آ گیا اور عین کو خوشخبری دے دی۔

اب وہ جن نہیں آئے گا تم بالکل صحت مند ہو پھر بھی میری ضرورت ہو تو ضرور یاد کرنا۔“

رو لو کا نے پوری روداد سنائی تو میں حیران رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

امام دین گاؤں کا خدمت گار تھا۔ چوہدری کی حویلی کا ہر شخص اس پر حکم چلاتا تھا اور وہ سب کی خدمت کرتا تھا اس کا پیشہ ہی خدمت کرنے کا تھا۔ بات خوشی کی ہو تو امام دین کو بلایا جاتا کہ چل، بھی سب عزیزیوں، رشتہ داروں کو نیٹا پہنچا اور امام الدین گاؤں گاؤں پیدل کبھی سانگل پر سارے دن پھر تار جتا دہ پورے گاؤں کے لوگوں کے رشتہ داروں کو جانتا تھا اس کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ کہاں کہاں جانا ہے اور اگر خبر موت میت کی پہنچانا ہو تو بھی امام دین کی ڈیوٹی شروع۔

یہی خدمت اس کی روزی تھی اس خدمت کے بدلے اس کو سال بھر کے لئے اناج مل جاتے تھے اور خوشی کے موقع پر کپڑے بھی بن جاتے تھے وقت کام کا ہو اور امام دین نہ آئے یہ کسی کو برداشت نہیں تھا امام دین

انسان تھا بیمار وہ بھی ہو سکتا تھا گھریلو پریشانی اس کو بھی ہو سکتی تھی مگر یہ کسی کو پسند نہیں تھا کہ امام دین کام کے وقت ان کے پاس نہ ہو۔

امام دین کے بھی بچے تھے۔ اس کی بیوی بھی خدمت کرتی تھی۔ بچے ذرا ہوشیار ہوئے تو وہ بھی خدمت کرنے لگے۔ یہ گاؤں کی زندگی کا لازمی حصہ ہے کہ ایک نہ ایک گھر انہ ایسا ہوتا ہے جو پورے گاؤں کی خدمت کرتا ہے تو امام دین بھی اپنے گاؤں کا ایسا ہی خدمت گار تھا۔ یہ گاؤں پنجاب میں منڈی بہاؤ الدین کے قریب تھا۔

اس گاؤں کے چوہدری عمر دراز خان تھے۔ بہت مشہور آدمی تھے اور دیگر چوہدریوں کے مقابلے میں رحم دل بھی تھے مگر تھے تو چوہدری اپنا رعب رکھنے کو بہت سے کام کرتے تھے۔ ان کی اولاد میں ان کا ایک بیٹا خورشید تھا جو کہ زیادہ تر لاہور میں رہا کرتا تھا اور اس سے چھوٹا گاؤں میں رعب جھاڑتا رہتا تھا۔ باپ کے مقابلے میں یہ بہت پدماغ تھا اس کے اندر چوہدری کاٹھ کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

چوہدری کے در پر امام دین کی روز حاضری لگتی تھی اور جو کام ہوتا کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ گاؤں کے اور لوگوں کے کام الگ تھے۔

امام دین کا باپ بھی یہی کرتے کرتے مر گیا تھا۔ اس کی جگہ اس نے لی گئی اور اس کے بعد اس کے بچے بھی یہی کریں گے اس لئے اس نے اپنے دونوں لڑکوں کو ابھی سے ساتھ رکھنا شروع کر دیا تھا۔ آخر میرے بعد ان کو بھی میری جگہ لینی ہے۔

گاؤں میں مغرب کے بعد رات ہو جاتی ہے، صبح لوگ جلدی اٹھتے ہیں اس لئے سوتے بھی جلدی ہیں۔ مگر موت تو نہ رات دیکھتی ہے نہ دن شہر دیکھتی ہے نہ گاؤں۔ رات آٹھ بجے کسی نے امام دین کا دروازہ پیٹ ڈالا..... امام دین کی ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ وہ بڑا کر اٹھ گیا۔ دروازہ کھول کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

چوہدری صاحب کا نوکر اس کے سامنے کھڑا تھا بولا۔ ”جلدی چل چوہدری نے بلایا ہے۔“ امام دین گھبرا کر بولا۔ ”کی گھل ہے اس ویلے خیر تو ہے۔“

نورا بولا۔ ”مجھے پتہ نہیں تو جلدی کر۔“ امام دین اس کے ساتھ چل پڑا۔ حویلی کے دروازے پر آ کر بولا۔

”تو اندر چل چوہدری بیٹھا ہے۔“ امام دین اندر چلا گیا بڑے کمرے میں چوہدری بیٹھا تھا۔ امام دین کو دیکھ کر بولا۔.....

”اوائے امو چل نس کے جا، تو دوائی سوداں کو جانتا ہے۔ اس کو جلدی لے آہست ضروری کام پڑ گیا ہے۔“ امام دین نے کہا۔ ”ٹھیک ہے جی جاتا ہوں پر اس کا پنڈ سات کوس پر ہے، سائیکل مل جاتی تو سوداں کو بھی اس پر بٹھا کر لے آتا۔“

”اوائے تجھے سواری کی عادت بری پڑ گئی ہے جدھر بھی جاتا ہے پہلے سواری مانگتا ہے۔“ چوہدری بولا۔..... ”نہیں جی میں اپنے واسطے نہیں مانگتا مائی کو بھی تو لانا ہوگا۔“ امام دین ڈرتے ڈرتے بولا۔.....

”چل ٹھیک ہے فشی کو کہہ دے وہ کر دے گا بندوبست چل اب جلدی چلنے والی گل کر۔“

امام دین حویلی سے باہر آیا تو نورا کھڑا تھا وہ بولا۔ ”نورا فشی کہاں ہے۔“

”فشی تو کھر چلا گیا۔“ نورا بولا۔..... چوہدری نے کہا ہے۔ ”وہ سائیکل کا بندوبست کر دے گا۔ دور جانا ہے ابھی۔“ امام دین بولا۔

”تو فشی کے بھروسے نہ رہنا وہ تیری رات خراب کر دے گا اور سر پر تیری آجائے گی۔ چوہدری کو کہہ دے گا تو اس کے پاس سائیکل کو آیا ہی نہیں ساری بلاتیرے سر آجائے گی میری مان تو خود کچھ کر لے اگر نہ ہو تو پیدل نکل لے سویرے تک تو آ ہی جائے گا۔“ نورانے بتایا۔ ”میرا یں کس کو بولوں گاؤں بھر میں دو تین تو سائیکل

ہیں وہ مجھے کیوں دیں گے؟“ امام دین بولا۔

”تو پھر بھول جاسا نیکل کو اور چل پڑا، اللہ کا نام لے کر۔“ نورانے کہا۔

اور امام دین چل پڑا۔ دو گاؤں اور ایک نہر کراس کرنے کے بعد مائی سواں کا گاؤں تھا رات بھی اندھیری تھی اور گاؤں کے باہر آتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ بیٹا آج برے پھنسے سائیں سائیں کرتی رات میں وہ گڈنڈی پر چلا جا رہا تھا ہاتھوں میں اس کے ایک لٹھی تھی۔ امام دین بزدل نہیں تھا گاؤں کا رہنے والا تھا مگر آج اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ ضرور کچھ ہونے والا ہے اس کی چھٹی حس اس کو بیدار کر رہی تھی اور وہ بڑا چوکنا تھا۔

گڈنڈی کے دونوں طرف کھیت تھے اس وجہ سے اندھیرا کچھ اور گہرا ہوا تھا۔ اس کی رفتار بھی تیز تھی کیونکہ اس کو واپس بھی آنا تھا اور وہ بھی ایک عورت کے ساتھ اگر وہ آہستہ چلے گا تو صبح تک بھی واپس نہیں جاپائے گا۔

گاؤں کی حد سے وہ آگے چلا گیا کچھ کیکر کے جھنڈ تھے اور اس کو ان میں سے ہی گزرنا تھا۔ اس کے بعد پھر راستہ صاف تھا۔ کیکر کے جھنڈ گھپ اندھیرے میں تھے اور راستہ ان کے اندر سے ہی تھا اس اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ نظر نہیں آتا تھا۔ مگر امام دین اس راستہ پر جھنڈوں میں گھس گیا اس کے اندر جاتے ہی کچھ جانور ادھر ادھر بھاگے وہ بھی چونک پڑا مگر کان نہیں۔

اس کے قدم بہت تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ تین چار منٹ میں وہ کیکروں سے باہر آ گیا باہر آ کر اسے ذرا روشنی کا احساس ہوا مگر فو رانی وہ چونک پڑا۔ کسی نے اس کا نام لے کر آواز دی تھی اور آواز کسی عورت کی تھی آواز کیکروں میں سے آ رہی تھی۔

امام دین نے اور تیز قدم اٹھانا شروع کر دیئے۔ مگر آواز اس کو آتی رہی۔

امام دین رکنا نہیں چلتا رہا۔ پھر آواز سنائی دی۔ ”امام دین ذرا مکمل تو سن لے ارے دیکھ تو میں

کسی ہوں ایک منٹ تو رک جائیں کب سے تیرے لئے تڑپ رہی ہوں۔“ مگر امام دین کی چال میں فرق نہ آیا اور وہ آگے بڑھتا رہا۔ جب وہ کافی دور نکل گیا تو پیچھے سے آنے والی آواز سے جان چھوٹ گئی۔ لیکن جب وہ کچھ اور آگے بڑھا تو پھر آواز آئی۔ ”اوئے ظالما میری گل تو سن لے۔ ہائے میں تیری خاطر در بدر ہو رہی ہوں ایک باری تو دیکھ لے۔“ مگر امام دین نے مڑ کر نہیں دیکھا وہ جانتا تھا کہ مڑ کر دیکھنا اس کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔

رات کے سنٹائے میں عورت کی آواز صاف آ رہی تھی وہ برابر بین کر رہی تھی فریاد کر رہی تھی رو رہی تھی اس نے پورے ڈرامے کر لئے مگر امام دین پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اب نہر کا پل آنے والا تھا عورت کی آواز میں بڑا درد پیدا ہو گیا تھا اس کے رونے کی آواز اب بھی آ رہی تھی اس کا انداز بالکل ایسا تھا اس کا شوہر ناراض ہو کر اس کو چھوڑ کر جا رہا ہے۔

آخر نہر کا پل آ گیا پل کے پاس ایک بڑا بگد کا درخت تھا اس درخت کے نیچے پل کا چوکیدار سو رہا تھا امام دین اس کے پاس پہنچا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”اوئے تو کون ہے اور اس ویلے کیوں آیا ہے؟“

امام دین بولا۔ ”میں امام دین ہوں اور ضروری کام سے نہر کے پر لے ایک گاؤں جا رہا ہوں۔“ یہ سن کر چوکیدار بولا ”وہ تیرے نال جو عورت تھی وہ کدھر ہے۔“

امام دین بولا۔ ”میں تو اکیلا ہوں یا میرے پیچھے پتہ نہیں کون لگی ہے جان نہیں چھوڑتی۔ تو مجھے ادھر نکال دے اس کو نہ آنے دینا۔“

”میرے ساتھ خول نہ کر تو ضرور کسی عورت کو لے کر بھاگ رہا تھا۔“ چوکیدار بولا

”تو پھر وہ میرے ساتھ نہ ہوتی تو اس کو اپنے پاس رکھ لے۔ مجھے جانے دے ضروری کام ہے اور یہ کام چوہدری کا ہے، واپس بھی آنا ہے۔“ امام دین بولا۔

”اچھا ٹھیک ہے تو چلا جا۔ اس کو میں نہیں چھوڑوں گا۔“ چوکیدار بولا۔

اور امام دین پل پار کر گیا اس کے بعد اس کو آوازیں نہیں آئیں اور وہ مائی سوواں کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے چوہدری کے پیغام اس کو دیا اور کہا۔ ”ابھی تجھے میرے ساتھ چلنا ہے۔“

مائی سوواں کے گھر میں ایک لائٹن جل رہی تھی اور اس کی روشنی بہت کم تھی۔ امام دین نے دیکھا مائی سوواں جوان عورت تھی۔ قد لمبا اور جسم بھرا ہوا تھا۔ مگر کم روشنی میں اس کے نقوش صاف نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے نیند بھری آواز میں کہا۔ ”تو ایسا کر ادھر ہی رک جا سویرے چلیں گے۔“

امام دین بولا۔ ”چوہدری کا حکم ہے ابھی جانا ہے میں رک نہیں سکتا تجھے پتہ ہے کتنی مشکل سے یہاں تک آیا ہوں۔“

”اچھا تو پھر چل۔۔۔۔۔“ وہ تیار ہو گئی اس نے باہر آ کر دروازے کو ٹالا لگایا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ اس کے پیچھے چل رہی تھی، امام دین کی رفتار بہت تیز تھی کبھی کبھی اس کو رک کر مائی کا انتظار بھی کرنا پڑتا تھا۔ گاؤں کے باہر آتے ہی وہ بولا۔ ”تو میرے ساتھ چل پیچھے نہ رہ جا۔“

”میں تیری چال کا مقابلہ کیسے کروں تو تو بھاگ رہا ہے۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”تو پھر تو ابھی بھاگ میرے ساتھ۔“ امام دین بولا۔

”تو ذرا آرام سے چل اتنی جلدی کیا ہے۔“ وہ بولی۔

”جلدی مجھے نہیں چوہدری کو ہے۔۔۔۔۔ دیر ہو گئی تو مصیبت کھڑی کر دے گا۔“ امام دین بولا۔

”میں اور زیادہ تیز نہیں چل سکتی۔“ وہ بولی۔

”میرا ساتھ تو چل تجھے نہیں پتہ کہ نہر کے پار ایک نئی فٹ ملے گی۔“ امام دین بولا۔

”لے تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔“ سوواں نے کہا۔

”بات ڈرنے کی تو ہے مگر فکر نہ کر میں تیرے ساتھ ہوں۔“ امام دین بولا۔۔۔۔۔

”ارے اتنی رات میں زمیندار کو کیا مصیبت پڑ گئی سویرے بلا لیتا۔“ سوواں نے کہا۔

”مجھے کیا خبر کیا مصیبت پڑ گئی میں تو حکم کا بندہ ہوں۔“ امام دین بولا۔

”تو پھر سائیکل لے آتا۔“ سوواں بولی۔

”کہاں سے لے آتا۔“ امام دین بولا۔۔۔۔۔

”لے وہ نہر والا پل تو نیڑے آ گیا ہے۔“ سوواں بولی۔

پل پر آتے ہی امام دین نے چوکیدار کو آواز دی۔

چوکیدار جاگ رہا تھا بولا۔ ”آ گیا ہے، تو ٹھہر جا، دروازہ کھولتا ہوں۔“

چوکیدار نے دروازے کھول دیا اور سوواں کو دیکھ کر بولا۔ ”اُوئے تو تو کیلا گیا تھا۔ یہ کون ہے؟“

”یہ سوواں دانی ہے چوہدری نے اس کو لینے تو بھیجا تھا کچھ ضروری کام ہے۔“ امام دین بولا۔

”اچھا ٹھیک ہے، چوہدری کو کہہ دینا میں جاگ رہا تھا۔“

”اچھا کہہ دوں گا۔“ امام دین بولا۔۔۔۔۔

”دو چار منٹ دم لے لے، بلکہ حقہ گرم ہے لگا لے دو چار سوٹے۔“ چوکیدار بولا۔۔۔۔۔

”نہیں وقت نہیں ہے سویرے سے پہلے پہنچنا بھی ہے۔“ وہ بولا۔

اور امام دین رکنا نہیں اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ سوواں بھی اس کے پیچھے چلی مگر اس کی تیزی کا ساتھ نہ دے سکی اور پیچھے رہ گئی اندھیرے میں کچھ سمجھائی نہیں دیتا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد امام دین نے مڑ کر دیکھا اور بولا۔ ”جلدی کر مائی میرے لئے کیا مصیبت کھڑی کرنے لگی ہے۔“ اور وہ کھڑا ہو گیا۔

سوواں جلدی جلدی اس کے قریب آ گئی۔ مگر کچھ

بولی نہیں۔ ”میرے نال چل: ب خطرہ شروع ہونے کو ہے اور کوئی آواز آئے جواب نہیں دیتا ہے پلٹ کر نہیں دیکھنا ہے سمجھ گئی نا.....“ امام دین بولا۔

”ٹھیک ہے..... تو چل میں تیرے نال چلوں گی۔“ سوداں بولی۔

اور سوداں اس کے پہلو میں چلنے لگی۔ اندھیری رات میں سوداں کا چہرہ امام دین کو نظر نہیں آ رہا تھا مگر اب اس کی جال بہت تیز تھی پھر وہ اس کے پیچھے نہیں رہی اور کسی قسم کی آواز بھی نہیں آئی ایک گاؤں قریب آ گیا تو وہ بولی۔

”ذرا دور دور اور اندھیرے میں چل کتوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔“ سوداں نے کہا۔

”اے لے کتوں۔ سے کیا ڈرنا میرے پاس لاشی ہے۔“

گاؤں کے قریب آ کر وہ پھر بولی۔ ”ذرا دور دور چل.....“

”ارے تو فکر مت کر.....“ مگر کتوں نے بھی شاید یہ سن لیا تھا وہ ٹولی کی شکل میں کھڑے ہو گئے اور منہ سے بڑی خوفناک آوازیں نکالنے لگے۔ مگر قریب نہ آئے سب ایک جگہ ہی رہے اور وہ دونوں دور ہوتے گئے اور کتوں کی آوازیں کم ہوتی گئیں دوسرے گاؤں میں بھی یہی ہوا اور وہ اس سے بھی گزر گئے امام دین حیران تھا جاتے وقت اس کو جو آوازیں آئی تھیں وہ آواز آتے وقت بالکل نہ آئی اور وہ رات چار بجے واپس آ گیا اور سیدھا حویلی کے دروازے پر پہنچا چونک کر وہ پتہ تھا وہ بولا.....

”آ گیا امامو سب ٹھیک ہے نا۔“

امام دین بولا..... ”ہاں سب خیر ہے، یہ مائی سوداں ہے اس کو اندر پہنچا دے اور میں چلا گھر کو۔“

چونکدار بولا۔ ”ٹھیک ہے تو گھر جا میں اس کو اندر پہنچا دوں گا۔“

حویلی کے اندر مائی سوداں کا انتظار ہو رہا تھا۔ بڑی

بالکن کی حالت خراب تھی وہ بے چینی سے بستر پر تڑپ رہی تھی دو تین عورتیں اس کے قریب کھڑی تھیں بڑی عمر میں ماں بننا اس کے لئے بڑا تکلیف دہ تھا۔ زمیندار الگ پریشان چکر لگا رہا تھا۔

مائی سوداں زمیندارنی کے پاس گئی تو عورتیں دور ہو گئیں۔ سوداں نے اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھا اور زمیندار سے بولی۔ ”بہت دیر کر دی، اب میں کیا کروں، بچہ تو مر گیا ہے۔“

”تجھے اتنی جلدی پتہ چل گیا۔“ زمیندار بولا.....

”یہی کام ہے میرا۔“

”اب تو زمیندارنی کی فکر کر دیکھ اس کا چہرہ نیلا پڑ رہا ہے۔“

”زہر اس کے بدن میں پھیل گیا ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتی۔“ سوداں نے کہا۔

”کچھ تو کر اس کی جان تو بچانی ہے۔“ زمیندار بولا۔

”کچھ نہیں ہوگا زمیندار جی زہر نے کام کر دیا ہے۔“

اور سویرہ ہونے سے پہلے زمیندارنی مر گئی۔ زمیندار کی حویلی پر اداسی چھا گئی۔ پورے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی اور لوگ آنے لگے اور امام دین کفن کفن کے انتظامات میں لگ گیا۔ شام کو وہ کچھ فارغ ہوا تو نئے کام ڈسے لگ گئے۔ دور دور سے لوگ آئے تھے ان کے کھانے کا انتظام کرنا تھا۔

فخر شیر بھی آچکا تھا اور چھوٹا فاروق بھی اداس اداس نظر آتا تھا۔ زمیندار کے پاس بہت لوگ موجود تھے کھانے، پینے کا انتظام یوں تو امام دین کے پاس تھا مگر فاروق بھی آتے جاتے نظر مار لیتا تھا۔

”امامو! ذرا جلدی کر سب نے واپس بھی جانا ہے۔“ فاروق بولا۔

”فکر نہ کرو جی! بس تیاری ہے، آپ جب بولو کھانا تیار ہے۔“ امام دین نے کہا۔ رات تک کھانے کا سلسلہ

چلتا رہا گاؤں کے لوگوں نے بھی کھانا کھالیا، امام دین کھانا تیار کروا تا رہا۔

امام دین نے بھی کھانا کھالیا اور گھر والی کو بھی بھیج دیا۔ اس کے بعد وہ دیگر کاموں میں لگ گیا۔ حویلی میں سب سو گئے دروازے پر چوکیدار بھی اٹھ رہا تھا مگر امام دین اپنا کام کر رہا تھا نہ کرتا تو زمیندار اس کا سب کھایا پیا نکال دیتا۔

”سارے کام تو کلا ہی کرتا ہے۔“ اس کے کان میں کسی عورت کی آواز آئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا تو اندھیرے میں ایک عورت کھڑی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون ہے بولا ”تو کون ہے۔“

”تو اتنی جلدی بھول گیا میں سوداں ہوں تیرے نال تو آئی ہوں۔“

”تو پھر اندھیرے میں کیوں کھڑی ہے ادھر آ جا روشنی میں، میں نے تو تیری صورت اب تک نہیں دیکھی۔“ امام دین بولا۔

سوداں لائین کے پاس آ کھڑی ہوئی اور بولی۔

”تیرے بڑے کام ہیں تو تھکتا نہیں۔“ امام دین نے لائین کی روشنی میں اس کو دیکھا سوداں تیس یا اس سے کچھ اوپر کی لگتی تھی..... اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی امام دین نے کبھی کسی عورت پر بری نیت سے نگاہ نہیں ڈالی تھی کیونکہ اس کو اپنی حیثیت کا احساس تھا مگر سوداں کے چہرے کو دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ اس کو اتنی حسین نظر آئی کہ وہ مسلسل اس کو دیکھتا رہا۔ اس نے اتنی حسین عورت زندگی میں نہیں دیکھی تھی اس کے حسن نے امام دین پر جادو سا کر دیا اور وہ ارد گرد کے ماحول سے بے خبر ہو گیا۔ وہ جذبات کے اندھے کنوئیں میں اتر گیا۔ اس کی عقل اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی وہ بھی اس کے پھرے جذبات کا پورا پورا ساتھ دے رہی تھی۔ سوداں کی خواہش پر، وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ جب شیطان الگ ہوا تو امام دین کی عقل بھی

لوٹ آئی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”یہ کیا ہو گیا کسی نے دیکھ نہ لیا ہو۔“

سوداں پڑے پڑے بولی۔ ”کسی نے نہیں دیکھا تو فکر نہ کر.....“

”اچھا تو اب جا کوئی آ گیا تو مشکل ہو جائے گی۔“ امام دین بولا۔

”تو مت ڈر کچھ نہیں ہوگا ادھر کوئی نہیں آئے گا۔“ سوداں نے کہا۔

”مجھے بہت کام کرنا ہے گھر بھی جانا ہے۔“ وہ بولا۔

”میں تیرا کام کرتی ہوں جلدی ہو جائے گا۔“ سوداں نے کہا۔ اور امام دین کے ساتھ وہ بھی کام کرنے لگی سارے برتن اندر پہنچا دیئے۔

اور امام دین بولا۔ ”اچھا تو جا میں بھی چلتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے کل ضرور آنا۔“ سوداں بولی۔

امام دین تو اس کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا بولا۔ ”ٹھیک ہے۔“

سوداں اندر چلی گئی۔ چوکیدار بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ وہ سیدھی فاروق کے کمرے میں گئی۔ وہ بڑے سے پلنگ پر بے خبر سو رہا تھا۔ وہ اس کے پاس جا کر لیٹ گئی اس کے جسم کی گرمی نے فاروق کو اٹھا دیا اس نے دیکھا کہ ایک نہایت خوبصورت عورت اس کے پاس لیٹی ہے، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

”تو کون ہے اور یہاں کیوں آئی ہے؟“ عورت نے اٹھڑائی لے کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرائی اس کی مسکراہٹ دعوت گناہ تھی۔ فاروق کا دماغ بھک سے اڑ کر آسمانوں پر چلا گیا، اس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ کئی پتنگ کی طرح اس کے ہاتھ آ گئی، فاروق دیوانہ وار عورت کی خوش میں خوش ہو گیا۔ اور پھر صبح تک سوداں اس کے بستر پر رہی۔

جاتے وقت فاروق نے پوچھا۔ ”تو کون ہے؟“ تو وہ بولی۔ ”میں سوداں ہوں۔“

”اب کب آئے گی۔“ فاروق نے پوچھا۔

”میں یہیں ہے ہوں جب بولے گا آ جاؤں گی۔“ وہ بولی۔

تین دن کے بعد فخر شیر لاہور چلا گیا اور جو مہمان آئے تھے وہ بھی سب روانہ ہو گئے۔ حویلی میں گنتی کے لوگ رہ گئے، فاروق کے پاس سوداں روز آتی رہی۔ کبھی کبھی امام دین بھی اس سے ملتا رہا۔ کچھ دنوں کے بعد فاروق بیمار ہو گیا اور اس کو لاہور جانا پڑ گیا۔ اس کا جسم بہت کمزور ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے جسم کا خون کسی نے نکال لیا ہے۔

لاہور میں اس کا علاج ہونے لگا۔

اس کے جانے کے بعد سوداں کا رخ زمیندار کی طرف ہو گیا۔ زمیندار بیوی کے مرنے کے بعد تنہائی کی زندگی گزار رہا تھا۔

سوداں ایک رات زمیندار کے پاس جا کر لیٹ گئی۔ چند منٹ کے بعد زمیندار کی آنکھ کھل گئی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اس نے سوداں کی طرف دیکھا جو آنکھیں بند کئے اس کے قریب لیٹی تھی اور اس کے لیٹنے کا انداز اس قدر ہوش رہا تھا کہ زمیندار کے پیرا کھڑ گئے اور وہ گناہ کے لئے کمر بستہ ہو گیا اور وہ اس پر جھک گیا۔

زیادہ نہیں صرف تین ماہ گزرے کے زمیندار کی حالت فاروق سے بدتر ہو گئی اور اس کو بھی لاہور جانا پڑ گیا۔ فخر شیر جیران تھا ابھی فاروق ٹھیک نہیں ہوا کہ اب بھی ایسا ہی مریض بن کر آ گیا۔ فاروق جو ان تھا برداشت کر گیا اور کچھ بہتر ہو گیا۔ مگر زمیندار کا انتقال لاہور کے اسپتال میں ہو گیا۔

فخر کالاہور میں اب رہنا مشکل تھا۔ کیوں کہ باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ فاروق کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ وہ گاؤں میں رہے لاہور میں اس کا علاج چل رہا تھا۔

فخر شیر بڑا سمجھ دار تھا، زیادہ تر لاہور میں رہا تھا۔ گاؤں والوں کی سادگی اس میں نہیں تھی، فاروق کی حالت دیکھ کر ہی وہ ٹھک میں پڑ گیا تھا۔ اس کے بعد ابا کی بھی وہی حالت اس نے دیکھی۔ دونوں کی بیماری ایک جیسی تھی

کہ ان کے جسم میں خون نہیں تھا۔ اس نے گاؤں جانے کی جلدی نہیں کی اس کا ایک دوست دلی سے آیا ہوا تھا، رہنے والا تو وہ لاہور کا تھا مگر دلی گیا تو وہیں کا ہو گیا تھا۔ وہ اس کا بڑا بے تکلف دوست تھا۔ فخر اس کے پاس چلا گیا امرت سنگھ گھر پر ہی تھا وہ فخر کو دیکھ کر خوش ہو گیا بولا.....

”میں تیرے پاس آنے والا تھا اچھا ہوا کہ تو خود آ گیا۔“

”اے شعل دیکھ کر باتیں کرتا ہے، تو نے نہیں آنا تھا مجھے پتہ ہے۔“

”نہیں یار مجھے آنا تو تھا مگر آتے ہی جائیداد کے جھگڑے میں پھنس گیا ہوں۔“ امرت سنگھ بولا۔

”اور میں تجھ سے بھی بڑی مصیبت میں ہوں۔“ فخر بولا.....

”پہلے تو بول کیا چکر ہے۔“ امرت نے پوچھا۔ ”یاد بات یہ ہے کہ گاؤں سے چھوٹا بھائی آیا تھا وہ بڑا سخت بیمار تھا۔ اس کے بدن میں خون نہیں تھا ایسا لگتا تھا کہ کسی نے اس کا خون نچوڑ لیا ہے بہت بری حالت میں آیا تھا، یہاں پر اس کا علاج کرایا اور ابھی تک اسپتال میں ہے چار مہینے ہونے کو آئے، اب بھی اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے، علاج جاری ہے۔ اس کے آنے کے بعد تین مہینے بعد والد بھی آ گئے، والدہ کے انتقال کے وقت وہ ٹھیک تھے ان کی صحت بہت اچھی تھی کسی قسم کی بیماری نہیں تھی مگر فاروق کے بعد وہ لاہور آئے تو ان کی حالت بہت خراب تھی جسم ہڈیوں کی مالا تھا اور جسم میں خون کی سخت کمی تھی ڈاکٹروں نے انہیں خون دیا اور ہر طرح کا علاج کیا مگر ان کی کمزوری دور نہ ہوئی اور وہ انتقال کر گئے۔“

ڈاکٹروں نے بتایا کہ حیرت انگیز طور پر ان کی اور فاروق کی بیماری ایک ہی تھی۔ فاروق جو ان ہے بیماری کا مقابلہ کر رہا ہے، ایسا لگتا ہے جسم کا خون نچوڑ لیا گیا ہے۔ نذوالد نے کچھ بتایا نہ فاروق کچھ بتاتا ہے اور ڈاکٹر اس راز کو سمجھ نہیں پائے۔ میرا خیال ہے دونوں کے ساتھ کچھ نہ

”میری کیا فکر ہے امامو، ذرا بتا تو۔“ فخر نے پوچھا۔

امام دین اس کے قریب آ گیا اور بولا.....
”حویلی میں کچھ گڑبڑ ہے۔ میری مانو تو آپ حویلی میں نہ رہنا۔“ امام دین بولا.....

”میری سمجھ میں بات پوری طرح نہیں آئی ہے، پوری بات بتا۔“ فخر نے کہا۔

”کوئی بدروح لگتی ہے۔ اس کا اثر جس پر ہوتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے اور کیا بتاؤں وہ بلا میں ہی ساتھ لایا ہوں۔“ امام دین بولا.....

”تو کیوں لایا تھا۔“ فخر نے حیرت سے پوچھا۔
اور پھر امام دین نے پوری کہانی بیان کر دی اور اس کے ساتھ جو گزری وہ بھی بتا دیا۔

”میں تو اس لئے بچا ہوا ہوں کہ میں اب حویلی میں بہت کم آتا ہوں اور دن دن میں چلا جاتا ہوں مجھے پورا شبہ ہے کہ میرے ساتھ جو سوداں مانی آئی تھی وہی ساری خرابی کی جڑ ہے۔ اس نے اس حویلی کے بہت سے مردوں کو خراب کیا ہے جس میں، میں بھی شامل ہوں۔ جو رات کو حویلی میں رہتا ہے وہ اس کو چھانٹ لیتی ہے۔“

”تو پتہ کر مانی سوداں کہاں ہے اگر وہ اپنے گھر پر تجھے ملے تو اس سے کچھ نہ کہنا بل کر پہلے آنا اور نہ ملے تو پتہ کرنا کہ کہاں ہے۔“ فخر نے کہا۔

”مگر تم دونوں حویلی میں ہرگز نہ سونا کہیں اور انتظام کر لینا۔“ امام دین نے مشورہ دیا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح امام دین مانی سوداں کے گاؤں سائیکل پر چل پڑا۔ بارہ بجے وہ مانی کے دروازے پر تھا مگر دروازے پر تالا لگا ہوا تھا گاؤں والوں نے بتایا کہ مانی نہر کے چوکیدار کے گھر ملے گی مگر اس نے دانی کا کام کرنا چھوڑ دیا ہے اور چوکیدار سے نکاح کر لیا ہے۔“

امام دین پھر واپس پلٹا اور نہر کے پاس چوکیدار کے دروازے پر آواز لگائی۔ اندر سے کسی عورت نے پوچھا۔
”کون ہے؟“ امام دین نے بتایا کہ ”میں امام دین ہوں

کچھ حادثہ ضرور ہوا ہے میں گاؤں جاؤں اور پھنس جاؤں نہیں چاہتا اب تو بتا کیا کروں۔

”یار یہ تو کچھ اور ہی پتھر لگتا ہے میرا خیال ہے ابھی تو گاؤں نہیں جا۔“ امرت بولا.....

جانا تو پڑے گا، کب تک نہیں جاؤں گا، ساری زمینداری برباد ہو جائے گی۔ فخر نے کہا۔

”ضرور جانا مگر جانے سے پہلے اپنی جان کا بندوبست کر لینا۔“ امرت بولا۔

”صاف صاف بتا کیا کرنا ہے؟“ فخر نے پوچھا۔
”مجھے یہ تو کوئی ہوائی معاملہ لگتا ہے، کسی بندے

سے کوئی بندوبست کرانا پڑے گا کہ اگر کوئی ہوائی چیز ہے تو وہ تیرے نیڑے نہ لگے اور دوسری کسی بھی چیز کا مقابلہ تو بندہ کر لیتا ہے مگر کسی پر اسرار اور نظر نہ آنے والی چیز کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس کا مقابلہ تو کوئی علم والا ہی کرتا ہے۔ تو میرے ساتھ چل ایک مانی ہے وہ تجھے تعویذ وغیرہ دے دیگی تو ہوائی چیز تیرے قریب نہیں آئے گی۔“ دوسرے دن فخر امرت دونوں مانی رقتہ والی کے گھر چلے گئے۔
اور فخر نے سب حالات بتائے تو وہ بولی۔

”ہوتا ہے پتر دنیا میں نہ معلوم کیا کیا ہے؟ سب کچھ تو ہماری نظر میں نہیں آتا تو بیشک گاؤں جا ہوائی چیز تیرا کچھ نہیں کر سکے گی اور ایک تعویذ اس کو دے دیا، اس کو پاس رکھنا جدا نہ کرنا۔“ امرت سنگھ کے ساتھ وہ گاؤں روانہ ہوا۔

حویلی میں سب اس کا انتظار کر رہے تھے۔
منشی نے بتایا کہ ”سارے کام تو ٹھیک ہیں مگر سر پر مالک نہ ہو تو جو خرابیاں ہوتی ہیں وہ وہی رہیں۔ آپ آگئے ہوتو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

امام دین پرانا خادم تھا وہ بھی فخر کے پاس آ گیا فخر نے پوچھا۔ ”امامو ٹھیک تو ہے تو بھی کچھ کمزور سا لگ رہا ہے۔“

”میری فکر نہ کریں سرکار، مجھے آپ کی فکر ہے۔“ امام دین بولا.....

تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

”مگر میرے گھر والے کو آنے دے اس کے سامنے بات کرنا۔“ اندر سے آواز آئی۔

امام دین باہر ہی سائیکل کھڑی کر کے بیٹھ گیا۔

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد چوکیدار آ گیا امام دین کو دیکھ کر بولا۔

”اوئے اما مکیے آیا بھی خیر تو ہے۔“

”خیر نہیں ہے، تو نے مائی سوداں سے نکاح کر لیا ہے۔“

”آہو کر لیا ہے۔“ چوکیدار بولا۔

”تو نے چنگا کیا مگر تو یہ بتا یہ مائی سوداں تجھے کہاں اور کب ملی۔“ امام دین نے پوچھا۔

”اوئے تو بھول گیا جب تو اندھیری رات میں تو میرے پاس آیا تھا اور نہر کے پار گیا تھا، تو نے نہیں بتایا تھا

کہ تو کیوں ادھر جا رہا ہے پر جب واپس آیا تو ایک عورت تیرے نال تھی یاد ہے تجھے۔“

چوکیدار بولا۔

امام دین نے جواب دیا۔ ”میرے نال مائی سوداں تھی میں اس کو زمیندار کے بلانے پر حویلی لے کر

جا رہا تھا۔

”تو نے پھر دروازہ کھلوا یا اور نہر کے اس طرف آ گیا اور تم دونوں واپس روانہ ہوئے۔ مگر سوداں تیرے

ساتھ نہیں گئی وہ بے ہوشی میں مجھے سویرے ایک جھاڑی میں پڑی مل گئی۔ اس کو نہیں پتا کہ وہ کس طرح وہاں پڑی

تھی، میں نے اس کو اٹھا کر گھر پہنچا دیا اور پھر مجھے وہ بھاگ گئی، وہ بھی اکیلی تھی اور ہم دونوں نے دد بول

پڑھائے اور ساتھ ساتھ ہیں۔ اب تو سن آگے کیا ہوا۔“

”آگے کی گل نہ پوچھ چٹکی نہیں ہے۔“ امام دین

بولا۔

”کچھ بتا تو پتہ چلے۔“ چوکیدار بولا۔

”میرے نال اس رات سوداں گئی تھی، پر تو کہتا ہے سوداں تجھے جھاڑی میں پڑی ملی تھی، تو جو میرے ساتھ گئی

وہ کون تھی؟ میں نے اس کو حویلی میں پہنچا دیا۔ اس نے

جاتے ہی یہ کام دکھایا کہ زمیندار کی گھر والی کو مار ڈالا اس کے بچے کو مار ڈالا۔ اس کے بعد اس نے مجھ پر اپنا جادو

چلا یا اور پھر فاروق کے ساتھ لگ گئی اس غریب کو اس نے موت کے دروازے پر پہنچا کر دم لیا۔ فاروق کے بعد

زمیندار کا اس نے حشر نشر کر دیا اور وہ مر گیا، اب فخر آیا ہے پتہ نہیں اس کا کیا بنے گا کیونکہ وہ اب تک سوداں کے

روپ میں حویلی کے اندر ہے اور تجھے سن کر حیرت ہوگی کہ وہ شکل تو سوداں کی رکھتی ہے اور نام بھی اس کا ہی رکھا ہے

مگر ہے بڑی کڑیل، مرد اس کو دیکھ کر دیوانہ سا ہو جاتا ہے۔ میں اس کے منہ دو چار دفعہ ہی لگا ہوں مگر میں نے

تو بہ کر لی، برسوں کا کیا ہو جاتا ہے آدمی، بس دعا کرنا اب اس کے نیڑے کوئی نہ جائے۔“ امام دین بولا۔

”ارے تو کیا حویلی مردوں سے خالی ہوگی ہے سب کہاں گئے۔“ چوکیدار نے پوچھا۔

”سب کی حالت میرے سامنے ہے، سب بیزار ہیں مگر اس کے بچے میں ہیں بولیں تو مارے جائیں اور نہ

بولیں تو بھی مارے جائیں گے۔“

”یہ تو تو نے بہت بری سنائی۔“ چوکیدار بولا۔

”اچھا اب میں چلتا ہوں فخر شیر کو سب بتانا ضروری ہے۔“

اور پھر شام کو حویلی کے باہر امرت اور فخر کو امام دین نے پورے حالات بتا دیے۔ اس کے جانے کے بعد امر

ت نے کہا۔

”یہ کوئی بہت بری چیز لگتی ہے اس کا علاج کرنا پڑے گا نہیں تو یہ سارے لوگوں کو برباد کر دے گی ابھی تو

بات حویلی تک ہے جب حویلی میں اس کو خوراک نہیں ملے گی تو وہ باہر آ جائے گی اور اس صورت میں خطرہ زیادہ

ہو جائے گا جگہ بدنام ہوگی اور لوگ گاؤں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔“

”تو پھر میں کیا کروں۔“ فخر بات کاٹ کر بولا۔

”اب یہاں رکتا بے کار ہے، تو میرے ساتھ دلی

چل اس کا علاج وہاں پر ہے۔“ امرت نے کہا۔

”اے مرض یہاں ہے اور علاج دلی میں ہوگا یہ کیسے؟“ فخر نے پوچھا۔

”وہ ایسے کہ وہاں پر ایک بندہ ایسا ہے کہ وہ اس کا علاج کر دے گا۔“ امرت بولا۔

”وہیں علاج کر دے گا۔“ فخر نے پوچھا۔

”ضرورت پڑی تو وہ آئے گا اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اس قسم کے علاج کا کچھ نہیں لیتا۔ اور آنے جانے کا خرچ بھی خود کرتا ہے، تم اس سے لین دین کی کوئی بات ہرگز نہ کرنا۔ دلی میں اس کا بہت اچھا مطب ہے اور دور دور سے لوگ اس کے پاس علاج کو آتے ہیں میں تو کہتا ہوں فاروق کو لاہور سے دلی لے چلتے ہیں۔ اس کو بھی وہ دیکھ لے گا۔“ امرت بولا۔

”بات تو تیری درست ہے، پھر چلنے والی بات کر، میں منشی کو بھجوادوں۔“ دونوں فوراً روانہ ہو کر لاہور آ گئے اور دوسرے ہی دن وہ دلی روانہ ہو گئے۔ دلی میں امرت سنگھ کا مکان تھا، رات کو گاڑی نے ان کو دلی چھوڑا تھا رات گزار کر صبح کے وقت ایک ٹانگے پر فاروق کو لے کر وہ حکیم وقار کے مطب میں پہنچ گئے۔

اپنے نمبر پر وہ حکیم وقار کے سامنے بیٹھے تھے حکیم وقار نے فاروق کا معائنہ کیا اور کہا ”ان کی یہ حالت کب سے ہے؟“

فخر نے کہا۔ ”حکیم صاحب تفصیل ذرا لمبی ہے اگر آپ سنا پسند کریں تو بیان کروں۔“

”بڑی خوشی سے آپ بیان کریں جب تک کسی کیس کی ہسٹری پتہ نہ ہو علاج نہیں ہونا مگر چند منٹ آپ انتظار کریں میرے ساتھی حکیم کامل کا ہونا ضروری ہے وہ ابھی آتے ہیں ان کے سامنے پوری تفصیل پوری سچائی کے ساتھ بیان کر دیں۔“

چند منٹ کے بعد رولو کا کے سامنے تھا۔

”حکیم وقار نے کہا یہ میرے ساتھی حکیم کامل

ہیں۔ اب آپ بیان کریں اور چھوٹی سی حقیقت بھی نہ

چھپائیں کیونکہ بعض دفعہ بہت چھوٹی بات بھی بہت بڑا سراغ دیتی ہے۔“

فخر شیر نے پوری کہانی بیان کر دی۔ امام دین کی رپورٹ بھی بتادی اس کے خاموش ہوتے ہی رولو کا نے کہا۔ ”آپ تو حویلی میں رہ سکتے تھے کیوں کہ آپ کو میں بہت وزنی دیکھ رہا ہوں، وہ جو بھی ہے آپ کے نزدیک نہیں آتی۔ مگر سب لوگ محفوظ نہیں۔“

خیر کوئی بات نہیں، آپ کا مریض تو یہاں رہے گا اس کا علاج ہو جائے گا۔ آپ دونوں کو واپس وہیں پر جانا ہوگا کیونکہ جو کچھ ہوگا وہ آپ کے سامنے ہو تو زیادہ بہتر ہے میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا مگر فکر نہ کریں، پہنچ ضرور جاؤں گا۔“ رولو کا نے کہا۔

”تو ہم لوگ جائیں۔“ امرت نے پوچھا۔

”ہاں آپ لوگ بے فکر ہو کر وہاں جائیں اور حویلی میں قیام کریں میں بھی آ رہا ہوں۔“

اور فخر اور امرت پھر واپس لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔

امرت اور فخر شیر سیدھے گاؤں آ گئے اور ان دونوں نے اپنے قیام بھی حویلی میں کر لیا۔ دونوں نے ایک ہی کمرے میں رہنے کا پروگرام بنایا۔

رات کے کھانے پر ان کے ساتھ سوداں تھی۔ دونوں نے پہلی بار سوداں کو دیکھا تھا سوداں ایک پرکشش اور جوان عورت تھی۔ چہرہ سرخی مائل سفید تھا اور بدن نہایت شاداب نظر آتا تھا۔

اس کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ نظر آتی تھی مگر اس کی آنکھیں کچھ اور ہی کہانی بیان کرتی نظر آتی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی خوفناک چمک اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ جو نظر آتی ہے وہ نہیں ہے، ہونٹوں کی مسکراہٹ اس کے پختہ ارادے کو ظاہر کرتی تھی۔ وہ ارادے کی پکی اور ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی عادی لگتی تھی، وہ کوئی نادیہ قوت ہے ایسا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

”نسی لاہور چھڑ دیو، ادھر ضرورت ہے۔“ سوداں

نے فخر شیر کو کہا۔

”تمہاری بات درست ہے اور میرا رادہ بھی یہی ہے۔“

”گل یہ ہے کہ زمینداری بڑی ہے تمہارے باپ زندہ نہیں رہے فاروق بیمار ہے۔ اب تم ہی اس بڑے کام کو دیکھو۔“ سوداں نے کہا۔

”اب میں رہنے ہی آیا ہوں۔“ فخر شیر نے کہا۔
رات کو فخر شیر اور امرت سنگھ ایک کمرے میں بیٹھ کر سوئے آگئے اور دونوں الگ الگ پلنگ پر لیٹ گئے اور دروازہ بند کر لیا۔

رات میں فخر کی آنکھ کھل گئی، امرت پلنگ پر بے خبر سو رہا تھا وہ بھی دوبارہ لیٹ گیا مگر آنکھ نہیں لگی دروازہ اندر سے بند تھا مگر اس نے دیکھا کہ اچانک دروازہ خود بخود کھل گیا اور ایک عورت اندر آ گئی اندر آنے والی عورت سوداں ہی تھی۔

وہ اب بھی مسکرا رہی تھی وہ امرت کے پلنگ کے پاس ایک منٹ کور کی اور پھر فخر کے سرہانے آ کھڑی ہوئی اور اس نے اپنا ہاتھ فخر کے سر کی طرف بڑھایا مگر فخر کے سر سے جیسے ہی ہاتھ لگا وہ چونک کر دوڑ ہٹ گئی اور زور سے فخر کی طرف دیکھنے لگی۔ چند منٹ کے بعد وہ پھر آگئے بڑی مگر اس دفعہ اس کا رخ فخر کے پیروں کی طرف تھا۔ فخر اس کو دیکھ رہا تھا وہ پیروں کے پاس بیٹھ گئی اور اس نے فخر کے پیروں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

مگر ایک زوردار جھٹکا اس کو لگا اور وہ دوڑ کھڑی ہو گئی اور حیرت سے فخر کو دیکھنے لگی مگر اس کے قریب نہ آئی، کچھ دیر کھڑی رہنے کے بعد وہ امرت کی طرف چلی اور اس کے قریب پہنچ کر اس نے اپنا ہاتھ امرت کے ماتھے پر رکھ دیا امرت بے ہوش کی نیند سو رہا تھا۔ سوداں کو کچھ نہ ہوا اور وہ بڑے اطمینان سے اس کے بستر پر بیٹھ گئی اور امرت کے بدن پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ امرت نے آنکھیں کھول دیں اور حیرت سے سوداں کو دیکھا تو ہڑبڑا کر وہ بستر پر بیٹھ گیا اور پھر وہ سوداں کو دیکھتا ہی رہ گیا، سوداں نے مسکرا کر اس کو دیکھا اور بولی۔

”کی دیکھنا ہے اور وہ بستر پر لیٹ گئی۔ امرت اس کے جسم کی بھولی بھیلیوں میں گم تھا اس کی نظریں سوداں کے جسم پر جمی ہوئی تھیں وہ کسی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس پر مدھوشی کی کیفیت طاری تھی۔

فخر یہ سب دیکھ رہا تھا مگر بستر سے اٹھنے کی ہمت اس میں بھی نہیں تھی۔

کمرے میں صرف ایک لیپ جل رہا تھا اس کی دھیمی روشنی میں فخر کو سب کچھ نظر آ رہا تھا آخر اس نے ہمت کی اور وہ بستر سے اٹھ کر امرت کے پلنگ کی طرف گیا اور اس نے سوداں کے پیروں کو صاف نظر آ رہے تھے پکڑ لئے سوداں زور سے چلی اور امرت کے نیچے سے نکل کر سرہانے بیٹھ گئی اور بولی۔

”اوتو بندہ ہے کہ آگ، دور ہٹ، پرے کھڑا ہو، میرے نال نہ آ۔“

فخر کو روکوا کا جملہ یاد آ گیا۔ امرت بھی اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔۔۔۔۔

”کی کر رہا ہے تو اپنی خیر کر کیا کر رہا ہے۔“ فخر بولا۔۔۔۔۔

”میں کچھ کروں تجھے کیا تو جا۔“ امرت ناگواری سے بولا۔

”تو جو کرنے لگا ہے تجھے پتہ ہے۔“ فخر نے کہا۔

”میں جو کر رہا ہوں، ٹھیک ہے۔“ امرت بولا۔

”تیرا داغ ٹھکانے پر نہیں لگتا۔“ فخر نے کہا۔

فخر کے جواب دینے سے پہلے ہی سوداں بولی۔

”تیرے نصیب میں نہیں ہوں پھر اس کو کیوں تنگ کرتا ہے جا سوجا۔“

فخر فخر وہیں کھڑا رہا اور بولا۔ ”دیکھ سوداں اب یہ کام نہیں ہوگا، مجھے پتہ ہے تو نے اس کے داغ کو قابو کیا ہوا ہے مگر میں تو ہوش میں ہوں تو اگر نگئی تو میں تجھ سے لپٹ پڑوں گا۔“

”دور رہ۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”تو بندہ تو لگتا ہی نہیں۔“

”تو پھر تو جا میں تجھ سے کچھ نہیں کہتا۔“

”تو بڑا غلام ہے تیرا کیا جاتا ہے میں تیرے نیڑے نہیں آؤں گی۔“ وہ بولی۔

”اب یہ کھیل اس گھر میں نہیں ہوگا تو نے بہت من مانی کر لی۔“ فخر نے کہا۔

”تو مجھے نہیں جانتا میں تیری حویلی کو کھنڈر کر دوں گی تو میرا کیا کر لے گا۔“ وہ بولی۔

”تو اگر خود چلی جائے تو تیرے لئے اچھا ہے ورنہ تیرا حشر بہت برا ہوگا۔“ فخر بولا.....

”ارے جاتو کیا جانے میں کتنے زمانے سے حویلی میں آنے کا پروگرام بنائے تھی اب آگئی ہوں تو ایسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی اس کو بھی ٹھیکر کے جھنڈ بنا کر چھوڑوں گی۔“ وہ بولی۔

فخر اس کی طرف بڑھا تو درمیان میں امرت آگیا اور بولا۔ ”اس کو کچھ نہ کہنا فخر، میں نے کہہ دیا ہے۔“

”میں جانتا ہوں تجھ پر اس کا اثر ہے۔“ فخر نے کہا۔

”اوئے کوئی اثر ڈر نہیں ہے جاتو سو جا۔“ امرت بولا۔

مگر وہ کھڑا رہا اور سوداں کو مخاطب کر کے بولا۔ ”تیری خواہش پوری نہیں ہوگی میں کھڑا ہوں۔“ فخر نے کہا۔

”کیوں ایسا ظلم دونوں پر کرتا ہے میں تیری غنتی کرتی ہوں۔“ سوداں بولی۔

اور اس بحث بھگرا میں رات گزر گئی۔ مگر سوداں کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ صبح ہوتے ہی سوداں چلی گئی اور فخر بستر پر آکر لیٹ گیا اور امرت بھی لیٹ کر سو گیا۔

سارے دن سوداں ان کے قریب نہ آئی، شام چار بجے فخر اٹھ گیا۔

کسی نے بتایا کہ ایک بندہ دلی سے آیا ہوا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ضرور حکیم کامل ہوں گے۔ حکیم کامل کو دیکھ کر وہ بولا..... ”اچھا ہوا آپ آگئے ایک رات ہی میرے لئے بہت بھاری پڑ گئی۔“

رولوکانے پوچھا۔ ”کیا ہوا رات کو؟“

”ہم دونوں ایک کمرے میں لیٹے تھے۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ امرت کی مجھے فکر تھی مگر وہ اتنی دیدہ دلیر ہو گئی ہے کہ پھر بھی آگئی میرے تو قریب نہ آئی مگر امرت کو لیٹ گئی، میں نے اس کو موقع نہ دیا مزے کی بات یہ کہ امرت بھی اس کا طرف دار بن گیا اور صبح ہو گئی۔“ فخر نے بتایا۔

”امرت تو اس کے اثر میں آگیا ہوگا اس لئے وہ اس کی طرف داری کر رہا ہوگا میں نے تم کو کہا تھا کہ تم بہت بھاری ہو۔ بہر حال اب فکر نہ کر میں اس کا انتظام کروں گا۔“ رولوکا بولا.....

رولوکانے حویلی کے چپے چپے پر اپنے کڑے پہرے دار کر دیئے یہ پہرے دار ایسے تھے جو کسی کو نظر نہیں آتے تھے۔

رات کے کھانے پر سوداں نہیں تھی۔ رولوکانے پوچھا۔ ”وہ آئی نہیں۔“

فخر شیر نے جواب دیا۔ ”پتہ نہیں کیوں نہیں آئی کل تو تھی۔“

”تم اس کو بلا کر لاؤ۔“ رولوکانے کہا۔

فخر شیر اٹھ کر سوداں کے کمرے کی طرف چلا اور اس کے بعد دروازے پر دستک دی۔ مگر جواب نہیں آیا اس نے فوراً دروازے کو بجایا تو پھر اندر سے کسی نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”میں فخر شیر ہوں۔ دروازہ کھولو۔“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے کسی سے نہیں ملتی تو جا۔“ سوداں اندر سے بولی۔

”تو دروازہ کھول طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔“ فخر نے کہا۔

”ارے جا میری جان چھوڑ میں تجھ سے بھی نہیں ملتی۔“ سوداں بولی۔

”امرت کو بھیج دوں پھر دروازہ کھولے گی۔“ فخر نے پوچھا۔

☆ ☆ (135) ☆ ☆

”ہاں اس کو بھیج دے۔“ اندر سے کہا گیا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ فخر واپس چلا آیا اور پوری

بات رولو کا کوتاہی۔

امرت نے کہا۔ ”میں اس کے پاس کیوں

جاؤں۔“

”تم اس کے پاس جاؤ میں تمہارے ساتھ چلوں

گا۔“ رولو کا نے کہا۔

”ہاں پھر ٹھیک ہے۔“ امرت نے کہا۔

امرت اٹھ کر سوداں کے کمرے کی طرف بڑھا

رولو کا اس کے ساتھ تھا۔ امرت نے دروازے پر سوداں

کو آواز دی تو دروازہ کھل گیا مگر امرت کے اندر جانے

سے پہلے رولو کا اندر تھا۔

سوداں غصے سے بولی۔ ”تو کون ہے؟ میں تو امرت

نوں بلایا سی۔“

رولو کا نے کہا۔ ”وہ بھی نال ہے۔“

”اندر آ جا امرت۔“ رولو کا نے امرت سے کہا۔

”تو کیوں آیا ہے باہر جا۔“ سوداں بولی۔

”میرا آنا بھی ضروری تھا۔“ رولو کا بولا۔

”چل چپ کر کے نکل جا۔۔۔۔۔ اپنی شکل میں آگئی تو

کپڑے خراب ہو جائیں گے تیس مارخان نہ بن۔“

سوداں بولی۔

”اور تو اپنی شکل میں نہ آئی تو میں تجھے لے آؤں

گا۔“ رولو کا بولا۔

”بہت زور ہے تجھ میں۔۔۔۔۔ میں تجھے بڑی کمزوری

عورت نظر آتی ہوں اس لئے اکڑ رہا ہے۔“ وہ بولی۔

”مجھے پتہ ہے تو جو نظر آ رہی ہے وہ نہیں ہے،

دو چار سو سال پرانی چڑیل ہے، انسانوں کا خون تیرے

منہ لگ گیا ہے اور تو انسانوں میں آگئی ہے۔“ رولو کا بولا۔

”ہاں آگئی ہوں، تو کیا کرنے گا میری ایک جھپٹ

کا نہیں ہے۔“

”آ تو گئی ہے مگر واپس نہیں جائے گی۔“ رولو کا بولا۔

”ارے جا بڑا طرم خان ہے تو، میں جب چاہوں

جہاں چاہوں چلی جاؤں گی۔“ سوداں بولی۔

”تو پھر تو بے قوف بھی ہے تیرے سارے راستے

بند ہیں اور تو جانتی بھی نہیں۔“ رولو کا بولا۔

سوداں نے چاروں طرف دیکھا اور ایک دو منٹ کو

نظروں سے اوجھل بھی ہو گئی مگر پھر وہیں پر واپس آ کر

بولی۔

”تو نے فریب کیا ہے، مجھے قید کر دیا اس لئے بڑی

بڑی باتیں کر رہا ہے۔“ وہ بولی۔

”تو کیا کر رہی تھی اب تک، تو نے جو کچھ کیا ہے

تجھے یاد ہے۔“ رولو کا بولا۔

”معاف کروے مجھے میں جانتی ہوں کہ میں نے

انسانوں کے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے۔“ وہ بولی۔

”جو کیا ہے اس کی سزا تو کچھ ملے گی۔“ رولو کا نے

کہا۔

”میں وعدہ کرتی ہوں اب کبھی انسانوں میں نہیں

آؤں گی مجھے جانے دے۔“ سوداں بولی۔

”تو نے جو کیا ہے اس کی سزا کون بھگتے گا۔۔۔۔۔“

رولو کا بولا۔

سوداں رحم طلب نگاہوں سے رولو کا کو دیکھتی رہی

لیکن کچھ بولی نہیں۔

”تیری سزا یہ ہے کہ تجھے ختم کر دیا جائے۔“

دروازے پر ایک زوردار بجلی چمکی اور اس کی آگ

سوداں کی طرف بڑھی سوداں ایک بیسٹا چمک مار کر کھڑکی

کی طرف بڑھی مگر وہاں پر بھی آگ کا گولہ موجود تھا۔ سوداں

کی رنگت بدلنے لگی وہ کمرے میں دوڑتی رہی اس کے جسم

کے کپڑے جل گئے اندر سے کالا سیاہ جسم نظر آنے لگا۔

پھر اس پر سے کھال اترنے لگی اور سوداں کی

بیسٹا چمک پکار کو بجنے لگی۔

کھال کے بعد اس کی ہڈیاں نظر آنے لگیں۔ چہرہ

غائب ہو گیا اور ایک ڈھانچہ کمرے میں ڈرانے لگا مگر

آگ نے اس کو بھی سوکھی لکڑی کی طرح جلا کر رکھ کا ڈھیر

بنادیا۔

آگ ختم ہوگئی تو کھڑکی کے راستے ایک زوردار ہوا کا جھونکا آیا اور ساری راگھ اڑ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ اسرت نے پورا کھیل اپنی آنکھوں سے دیکھا اور حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا۔

رولوکانے کہا۔ ”تم نے جو دیکھا یہ خواب تھا بھول جاؤ اس کو۔“ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر فخر کے پاس لے آیا اور بولا۔ ”اس حویلی کی بلا ختم ہوگئی۔۔۔۔۔ اب مجھے اجازت دو۔“

☆.....☆.....☆

حکیم وقار کا مطب دلی شہر کا ایک مشہور اور بڑا مطب بن چکا ہے۔ چاندنی چوک کے مین چوراہے پر ایک بورڈ ایک بڑی سی حویلی پر لگا ہے۔ یہ مطب جس حویلی میں ہے اس کی بھی ایک کہانی مشہور تھی کہتے ہیں یہ حویلی بہادر شاہ ظفر کے کسی وزیر یا مشیر کی تھی، بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے بعد اس حویلی کے مینوں پر بھی زوال آ گیا اور انگریزوں نے ان سب کو حویلی کے اندر ہی قتل کروادیا اور حویلی کو سیل کر دیا کچھ عرصہ کے بعد کسی سرکاری ادارے نے اس کو لے لیا اور صفائی کروا کر اپنا دفتر قائم کر دیا مگر مشکل سے چند ماہ وہ اس دفتر میں رک سکے اور پھر وہ بھاگ گئے۔

حویلی پھر بند ہوگئی اور کئی سال بند رہی پھر کسی سرکاری ضروریات کے تحت اس کو کھولا گیا اور دفتر بنایا گیا مگر اس دفعہ تو چند یوم میں ہی دفتر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی اور سرکاری طور پر اس کو آسیب زدہ قرار دے دیا گیا۔

مگر اس کے باوجود بھی اس پر لوگوں کی نظریں تھیں کیونکہ یہ بڑے موقعے کی جگہ تھی حویلی لال پتھر کی بڑی خوب صورت عمارت تھی پھر کسی ہندو نے کوشش کر کے اس کو حاصل کر لیا آدی چالاک تھا اور حویلی کے حالات جانتا بھی تھا اس نے اس میں رہائش نہیں کی بلکہ اس کے بڑے کمروں کو اور کھلے میدان کو گودام کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔

ایک ہفتہ میں ہی اس کو اندازہ ہو گیا کہ اس نے غلطی کر دی ہے۔ اس کا مال بوریوں میں رکھا جاتا تھا وہ ہر قسم کا ہوتا تھا۔ اناج سے لے کر برتن اور نہ جانے کیا کیا، وہ ایک بڑا کاروباری تھا، جو سامان یہاں رکھا گیا اس کا اس کو نقصان اٹھانا پڑا بوریاں خالی ہو جاتیں، مال غائب، برتن ٹوٹ جاتے چوکیدار رات کو اندر نہیں جاتے اور جو اندر جاتا اس کے ہاتھ پیر سلامت نہ رہتے ہزاروں کا نقصان کرنے کے بعد اس کو بند کر دیا گیا۔ اور اس کی نیلامی کا اعلان کر دیا گیا مگر خریدار کوئی نہ آیا کیونکہ اس حویلی کی شہرت اتنی خراب تھی کہ کون آتا۔ مگر وقت مقررہ پر حکیم وقار احمد پہنچ گئے۔

حویلی کے باہر شامیانہ لگایا گیا تھا تاکہ بولی لگانے والے لوگ یہاں بیٹھیں، کرسیاں ڈالی گئی تھیں۔ شامیانے میں ایک آدی بھی نہ تھا۔ حکیم صاحب تاگلے سے اترے مگر یہ سمجھ کر کہ شاید نیلامی نہیں ہوگی پلٹ کر تاگلے کی طرف آنے لگے تو کسی نے آواز دی۔ ”آئیے صاحب آئیے۔“

حکیم صاحب نے پلٹ کر دیکھا تو شامیانے کے دروازے پر ایک آدی کھڑا نظر آیا۔ وہ اس کی طرف بڑھے وہ آدی سفید کرتے اور سفید دھونی میں ملبوس تھا۔ حکیم صاحب قریب گئے تو وہ بولا۔ ”میرا نام گوبردھن ہے۔ آج تک میں ہی اس حویلی کا مالک ہوں اور میں نے ہی نیلامی کا اعلان کیا تھا مگر خریداروں کا پتہ نہیں ہے صرف آپ آئے ہیں۔“

”اور میں بھی یہ سمجھ کر شاید نیلامی نہیں ہوگی۔ واپس جا رہا تھا۔“ حکیم صاحب نے کہا۔

”اتنی بڑھیا حویلی کے خریدار دلی میں نہیں، حیرت ہے۔“ گوبردھن بولا۔

”خریدار تو بہت ہیں مگر ہمت نہیں ہے۔“ حکیم صاحب نے کہا۔

گوبردھن کاروباری ذہن رکھتا تھا سمجھ گیا کہ حکیم صاحب کو سب پتہ ہے۔ بولا۔ ”اڑانے والے بھی خوب

اڑاتے ہیں آپ نے پر تپتے نہیں کرایا شری مان۔“
”میں حکیم وقار احمد ہوں شاید آپ نے نام سنا ہو۔“ حکیم صاحب بولے۔

”ارے واہ دلی میں رہتا ہوں آپ تو دلی کی آن ہیں مگر دشمن پہلی مرتبہ کر رہا ہوں۔“ وہ بولا۔

”اب آپ نیلا می تو کرنے سے رہے اب کیا ارادہ ہے۔“ حکیم صاحب نے پوچھا۔

”اگر آپ خریدنے کا ارادہ لے کر آئے ہیں تو ہم دونوں بات کر لیتے ہیں۔“ گوبردھن بولا۔

”ٹھیک ہے آپ مجھے اپنی مانگ بتادیں میں اس پر غور کروں گا۔“ حکیم صاحب بولے۔

”سچ بات تو حکیم صاحب یہ ہے کہ میں نے جس مطلب سے حویلی کو خریدنا تھا اس میں کامیاب نہیں ہوا اور اپنا ہزاروں کا نقصان اٹھانا پڑ گیا۔ مگر میں اس نقصان کی

بات نہیں کرتا میں نے اس حویلی کی خریداری پر جو رقم دی ہے وہی اگرتل جائے تو میں حویلی آپ کو دے دوں گا اور وہ سرکاری کاغذات میری سچائی کی گواہی دیں گے۔ میں

ہرگز ہرگز اس کو فروخت نہ کرتا مگر انسان انسانوں سے لڑ سکتا ہے۔ ہوائی چیزوں سے کون مقابلہ کرے گا۔ میں

پھنسا ہوا ہوں مگر آپ بھی اسی شہر کے مشہور آدمی ہیں، میں صاف صاف بتا دوں کہ اس حویلی میں رہنا کسی انسان

کے بس کی بات نہیں، میرے آدمیوں نے بتایا ہے کہ اس کے اندر کوئی ایک نہیں بلکہ نامعلوم کتنی بلائیں رہتی ہیں۔

اب آپ غور کریں، قیمت کی بات نہیں ہے کم بڑھ سکتی ہے مگر یہ گلے کا پھندا ہے ابھی تو یہ میرے گلے میں ہے، میں

اس سے جان چھڑانے کی فکر میں ہوں سوچ لیں غور کر لیں۔“ گوبردھن بولا۔

گوبردھن کی بات سے حکیم صاحب متاثر ہوتے ہوئے بولے۔ ”حویلی کی بلاؤں سے تو میں دوستی کر لوں گا

آپ اپنی مانگ بتائیں۔“

”میں نے سرکار کو دس ہزار دیئے تھے کچھ اور پر خرچ ہوا تھا مگر میں اس کا ذکر نہیں کرتا آپ صرف دس ہزار میں

اس کو لے سکتے ہیں۔“ گوبردھن بولا۔

”تو پھر آپ میرے مطب میں کل آجائیں سارے کاغذات وغیرہ لے کر، آگے بات دہیں پر ہوگی

اور سودا بن گیا تو ادائیگی کر دی جائے گی اور رجسٹری وغیرہ کرائیں گے۔“ حکیم صاحب بولے۔

دوسرے دن گوبردھن ایک وکیل کے ساتھ کاغذات لے کر آگئے اور بولے۔ ”آپ کی آگیا کے

مطابق حاضر ہوں یہ میرا وکیل ہے یہ سب رجسٹری وغیرہ کرائے گا۔“

حکیم صاحب بولے۔ ”میرے ایک ساتھی ہیں حکیم کامل آنے والے ہیں پھر بات کرتے ہیں۔ آپ

جب تک شرت بتائیں۔“

”اس کی آپ نے زحمت کیوں کی۔“ گوبردھن بولا۔

”آپ میرے گھر آئے ہیں کیونکہ مطب میرا گھر بھی ہے کچھ تو خدمت مجھے کرنا ہے۔“ حکیم صاحب

بولے۔ ”حکیم کامل کچھ ہی دیر میں آگئے تعارف ہوا اس کے بعد حکیم کامل نے دس ہزار روپے کی ایک قسط گوبردھن

کے سامنے ڈال دی اور بولے۔ ”آپ کی ڈیمانڈ اس میں ہے۔ وکیل صاحب کاغذات تیار کریں سودا کا ہوا۔“

گوبردھن اور وکیل نے حیرت سے حکیم کامل اور حکیم وقار کو دیکھا اور پھر چند منٹ کے بعد گوبردھن بولا۔

”حکیم صاحب یہ تو بتائیں آپ وہاں کیا کریں گے؟“

”وہ حویلی درمیان شہر ہے اور ہمارے کام یعنی مطب کے لئے نہایت مناسب ہے مطب ہی بنائیں گے۔“ حکیم وقار بولے۔

”بے شک اس کے بڑے بڑے کمرے اور ہال ایسے ہیں کہ آپ کے کام کے لئے بہترین انتخاب ہے پر

یہ کام آپ وہاں کر سکیں گے۔“ گوبردھن بولا۔

حکیم کامل نے کہا۔ ”سیٹھ آپ کا شکر ہے کہ آپ نے اس حویلی کے بارے میں کچھ نہیں چھپایا۔ آپ کی درد

اور ان انگریزوں کی گردنیں اس نے پکڑ لیں۔
وہ پھڑ پھڑاتے رہے مگر وہ کارندہ ان کو لے کر
اڑ گیا۔ عورت پر ظلم بند ہوا تو وہ حیرت سے چاروں طرف
دیکھنے لگی۔

رولوکا نے اس پر ایک بستر پر پڑی چادر جو کہ نہایت
بوسیدہ تھی ڈال دی۔ اور بولا۔ ”تیرے ساتھ روز یہ ظلم ہوتا
ہے۔“

”ہاں نواب صاحب کے مرنے کے بعد اس حویلی
میں روز یہ ہوتا ہے۔ زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی
ہم قیدی ہیں۔ ہر روز یہی ہوتا ہے۔“ عورت بولی۔
”تیری طرح اور کتنی عورتیں ہیں یہاں پر۔“ رولوکا
نے پوچھا۔

”عورتیں کہاں ان کی روحیں ہیں اور ہر روز ان پر
ایسا ہی وقت آتا ہے۔“ عورت بولی۔

”نواب کے خاندان کی دس بارہ ہیں کچھ لونڈی
باندیاں ہیں کل بیس سے اوپر ہی ہیں۔“

”اور مرد کتنے ہیں۔“ رولوکا نے پوچھا۔
”مرد تو بہت ہیں ان کا شمار کیا تباؤں۔“ عورت
بولی۔

”سب کی روحیں ہیں یہاں پر۔“ رولوکا بولا۔
”نہیں سب نہیں ہیں۔“ عورت بولی۔

”تو مسلمان ہے۔“ رولوکا بولا۔
”میں ہندو تھی تو اب کے پاس آئی تو مسلمان ہو گئی
میں لونڈی تھی۔“ وہ بولی۔

”تو یہاں سے آزادی چاہتی ہے۔“ رولوکا نے
پوچھا۔

”کون روز روز ایسی اذیت برداشت کرتا ہے۔“
عورت نے کہا۔

”آ میرے ساتھ کھڑی ہو جا۔“ وہ مین گیٹ کے
پاس آیا اور بولا۔ ”جا چلی جا اب پھر کبھی دنیا میں نہ آنا۔“

وہ دوڑتی ہوئی بند دروازے سے باہر چلی گئی اور رولوکا اندر
کی طرف چلا، اندر بڑے بھیانک مناظر اس کے سامنے

سری اب ہماری دروسری ہے ہم اس کو آباد کرنے کی ضرور
کوشش کریں گے اور اگر ہم کامیاب ہوئے تو آپ کو ضرور
بتائیں گے۔“

ان کے جانے کے بعد حکیم وقار بولے۔ ”اب بتاؤ
تم نے ایک دم سودا پکا کر دیا۔“ کیوں؟“

”میں حویلی میں پکڑ لگا آیا ہوں۔ وہاں جو کچھ ہے
وہ اتنا خطرناک نہیں ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”ہے کیا آخر۔“ حکیم صاحب بولے۔
”اس حویلی میں قتل عام ہوا تھا بچے بوڑھے جوان
عورت مرد سب قتل کیا گیا تھا اس قتل عام میں حویلی کے
مکینوں نے کچھ انگریزوں کو بھی قتل کیا تھا۔ ان مظلوموں
کی روحیں اور ان انگریزوں کی روحیں ہیں وہی اس حویلی
کے اندر منڈلاتی رہتی ہیں۔“ رولوکا بولا۔

”پہلے تو اس کی صفائی کرانی ہے اور رنگ روغن کرانا
ہے مرمّت کرانی ہے دروازے ہڑکیاں سب کو چیک کرنا
ہے۔“ حکیم صاحب بولے۔

”تین چار دن رک جائیں اس کے بعد یہ سب
کریں گے۔“ رولوکا بولا۔

رات کو رولوکا حویلی کی طرف چلا گیا۔ ہمیشہ کی
طرح مین گیٹ بند تھا اور پوری حویلی اندھیرے میں ڈوبی
ہوئی تھی۔ مگر رولوکا اندر چلا گیا۔ مین گیٹ سے اندر آتے
ہی ایک بڑا کمرہ دائیں طرف اور ایک بائیں طرف بنے
تھے۔ وہ دائیں طرف کے دروازے کے اندر چلا گیا۔ اس
کمرے میں ایک عورت کی کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں
ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کو مارا جا رہا تھا اس پر ظلم ہو رہا
تھا۔ وہ اس طرف چلا جہر سے آوازیں آرہی تھیں۔ اس
نے دیکھا زمین پر ایک مردہ عورت پڑی تھی اور اس کے
اطراف میں کچھ گورے کھڑے تھے وہ اس کے بدن کے
نازک حصوں کو ٹھیکوں سے چھیڑ رہے تھے اور عورت تڑپ
رہی تھی اور رورہی تھی ہاتھ جوڑ رہی تھی اور وہ لوگ دانت
نکال کر ہنس رہے تھے۔ بڑا دردناک اور وحشیانہ منظر رولوکا
کے سامنے تھا رولوکا نے اپنے ایک کارندے کو اشارہ کیا

آئے اس نے ظالم کو کارندے کے حوالے کر دیا اور مظلوم کو حویلی کے باہر کر دیا۔ حویلی کے بہت سارے مقامات پر سخت تعفن بھی تھا یہاں پر غلاظت کے ڈھیر تھے۔ یہ غلاظت کون لایا تھا، اس کا پتہ نہ تھا مگر پوری رات میں رولو کا نے آدھی آتماؤں کو آزاد کر دیا اور پھر وہ واپس آ گیا۔

دو پہر کے بعد دن میں وہ پھر حویلی کے اندر تھا۔ اندر سناٹا تھا جگہ جگہ جنگلی جھاڑیاں کھڑی تھیں اور چگاڈوں کے غول کے غول نظر آتے تھے چگاڈوں کی آنکھیں اس پر تھیں کہیں کہیں سانپ اور دوسرے ریگنے والے زہریلے جانور بھی نظر آتے کمروں میں قدیم زمانے کے فرنیچر ٹوٹا پھوٹا بھرا تھا اس پر منوں دھول مٹی جی کمی کچھ کمرے صاف بھی تھے یہ وہ کمرے تھے جن کو گوبر دھن نے استعمال کیا تھا وہ جہاں گیا بڑی بڑی چگاڈیں اس کے سر پر منڈلاتی رہیں کمروں کے بعد ایک کھلا میدان تھا اور اس کے درمیان ایک کنواں تھا رولو کا نے اس میں جھانک کر دیکھا کنواں بہت گہرا تھا پانی نظر نہیں آتا تھا مگر اس کے جھانکتے ہی بہت ساری چگاڈیں پھڑ پھڑا کر اوپر آئیں اور پہلے سے اڑتی چگاڈوں میں شامل ہو گئیں۔

رولو کا جانتا تھا کہ یہ سب کون ہیں۔ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ جدھر اس نے اشارہ کیا تھا وہاں سے ایک ایک بادل سا اٹھا اور چگاڈوں کے اوپر آ گیا اس بادل کے آتے ہی چگاڈوں میں بے چینی پیدا ہو گئی اور وہ راہ فرار تلاش کرنے لگیں کچھ کنویں کی طرف آئیں مگر کنویں سے دھواں خارج ہو رہا تھا اس میں تیز آگ جل رہی تھی بادل اپنی جگہ ان کو گھیرے کھڑا تھا۔

اچانک ایک گونج دار آواز حویلی کے درمیانی میدان میں ابھری یہ آواز رولو کا کی تھی۔ ایک سیاہ کالا آدمی کنویں کے پاس کھڑا تھا اس کا قد چھ فٹ سے زیادہ تھا اوپر ہی بدن نکلا تھا اور اس کے بدن کی پمچھلیاں نمایاں تھیں سر پر ایک پروں کا تاج تھا اور گلے میں ہڈیوں کی مالا

پڑی تھی آنکھیں جیسے بلب جل رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ”تم سب کو جانا ہے تمہارا یہاں قیام مناسب نہیں ہر آتما کو واپس جانا ہے جو نہیں جائے گا ضد کرے گا اس کو بھی جانا ہوگا میں موقع دے رہا ہوں یہ آخری موقع ہے جو نہیں گیا وہ نقصان میں رہے گا۔“ اس کے کہتے ہی بادل ایک طرف سے ہٹ گیا، نور چگاڈیں کم ہونے لگیں اور کنویں کی آگ کم ہوتی گئی اور پھر ایک بھی چگاڈہ نہ رہی غلاظت میں آگ لگ گئی اور سب جل گئی۔ کنویں میں پانی نظر آنے لگا اور رولو کا میں تبدیلی آئی اور وہ حکیم کامل نظر آنے لگا۔ اس نے ایک چکر حویلی کا لگایا حویلی کے باہر آ گیا اور شام سے پہلے وہ حکیم دقار کے سامنے تھا۔

”سناؤ کیا خبر ہے۔“ حکیم دقار نے پوچھا۔ ”خبر اچھی ہے اس حویلی میں اب کچھ نہیں ہے آپ اس کی مرمت کا کام کروا سکتے ہیں۔“ رولو کا بولا۔ ”ارے تم نے اتنی جلدی یہ کام کر دیا۔“

”وہ روجس وہاں پر قید تھیں ان میں ظالموں کی روجس بھی تھیں مگر یہ سمجھ نہیں آ یا کہ ان کو قید کرنے والا کون تھا اور اس نے ان کو کیوں قید کیا تھا؟ ان سے اس کو کیا فائدہ تھا۔“ رولو کا بولا۔

”ہوگا کچھ زیادہ کرید کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔“ حکیم دقار بولے۔

”ضرورت تو شاید پڑ جائے کیونکہ کوئی چیز بے وجہ نہیں ہوتی۔ اس حویلی میں ایک مدت تک ان روجوں کو روکے رکھنا بے وجہ تو نہیں ہو سکتا۔“ رولو کا بولا۔ ”یہ تمہارا کام ہے تم ہی بہتر طور پر جانتے ہو۔“ حکیم دقار نے کہا۔

اور پھر مرمت اور چونا کاری کے مزدور لگا دیئے گئے۔ اس روجو حویلی کو بنایا اور بنایا گیا مریضوں کے بیٹھنے کی جگہ اور حکیموں کے معائنے کی جگہ بنائی گئی دواؤں کے رکھنے کے گودام بنائے گئے دروازے کھڑکیوں کی مرمت کی گئی اور ہزاروں من کوٹا کرکٹ باہر ٹرکوں میں لا کر پھینکا گیا لوگوں نے حیرت سے یہ سب دیکھا گوبر دھن نے کہا

میں پریشانی ہو رہی ہے۔“

گوبردھن نے گردن ہلائی اور کھڑا ہو کر ہاتھ ملایا اور چلا گیا مگر اس کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ حکیم صاحب کے جواب سے مطمئن نہ تھا۔

حکیم وقار کے پاس اب بڑے بڑے کیس آتے تھے جو دوسرے حکیم ان کے پاس لاتے تھے۔ حکیم کامل اور وہ ان کیسوں کو حل کرتے تھے۔ حکیم اشرف اور عشرت کے علاوہ بھی کئی حکیم مطب میں کام کرتے تھے کیونکہ روزانہ سینکڑوں کے حساب سے مریض آتے تھے اور دور دور سے آتے تھے، دوسرے شہروں سے آنے والوں کے لئے میدان میں کمرے بنادیے تھے وہاں قیام بھی کرتے اور اس قیام کا کچھ ان سے نہیں لیا جاتا تھا۔ مریض کی حیثیت کے مطابق اس سے طلب کیا جاتا تھا۔ آتے ہی ایک آدمی مریض کا فارم بھرتا تھا اس کی آمدنی اور اس کے گھریلو حالات لکھتا تھا اس کی روشنی میں اس کا بل بنایا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد تمام لوگ سمجھ گئے تھے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کچھ مریضوں کا علاج پورا ہوتا تھا مگر بل نہیں ہوتا تھا۔ دوائیں بھی مفت دی جاتی تھیں اور کچھ کے بل زیادہ بنتے تھے مگر اس پر کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا، جو اتنا ہے آئے نہ آتا ہے نہ آئے۔ حکیم وقار کی پالیسی یہی تھی یہ پالیسی حکیم کامل اور حکیم وقار نے بنائی تھی اور اس پر بڑی پابندی سے عمل ہو رہا تھا۔ باہر کے مریض کو مفت کے کمروں میں رکھا جاتا تھا اور ان کی پوری دیکھ بھال ہوتی تھی اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی مطب نقصان میں نہیں تھا۔ یہ خدا کی رحمت تھی۔ ان کی شہرت اتنی تھی کہ وہ اگر چاہتے تو ہزاروں روپے روز کماتے مگر نہیں کماتے تھے، خدمت کرتے تھے، بہت کم لوگ جانتے تھے کہ حکیم وقار دلی کے قدیمی باشندے نہیں ہیں، سہارنپور کو حکیم صاحب خود بھی بھول چکے ان کے مطب میں حیرت انگیز پیچیدہ علاج بھی ہوتے تھے اور مزے کی بات یہ کہ اس پر کچھ خرچ بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہی بات ان کے ہم پیشواؤں کے لئے پریشانی کا باعث تھی، بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ کسی وید نے یا حکیم نے

ہائے بھارہ حکیم کتنا خرچ کر رہا ہے مگر بھاگے گا دو چار دن میں۔ لوگوں نے حکیم وقار کا مذاق بھی اڑایا۔ مگر ایک ماہ کی محنت نے حویلی کا نقشہ بدل دیا اور پھر بڑی شان سے حویلی کے دروازے پر بورڈ آویزاں کر دیا گیا۔ جس پر حکیم وقار کے ساتھ حکیم کامل کا نام بھی نمایاں تھا۔

ان دونوں کے بعد دو نام اور لکھے تھے وہ نام تھے حکیم اشرف اور حکیم عشرت یہ دونوں حکیم وقار کے بیٹے تھے اور اپنی تعلیم پوری کر کے اپنے خاندانی پیشے کی طرف آگئے تھے۔ ان کی تربیت ان کے باپ نے اور حکیم کامل نے کی تھی اور دونوں کے دلوں میں خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ ان کی زبان میٹھی اور آواز میں محبت کی چاشنی تھی۔

لوگوں کی قیاس آرائیاں دم توڑ گئیں، گوبردھن کے خدشات پورے نہ ہوئے تو وہ ایک دن حکیم وقار کے پاس آ گیا اور بولا۔

”حکیم صاحب تعجب ہے آپ نے اس حویلی کو بدل کر رکھ دیا آپ کا کچھ نہ ہوا، میں نے تو بڑی کوشش کی تھی مگر بڑے بڑے دلی کے مانے ہوئے کرو لوگوں نے ہاتھ اٹھا لیا تھا کہتے تھے ارے ایک ہوتا تو لیں یہاں تو فوج ہے پوری، کس کس کو قاپو کریں گے مگر آپ نے کیا جادو کیا کہ سب دور ہو گئیں۔“ حکیم وقار مسکرائے اور بولے۔

”میں نے کچھ نہیں کیا سب اللہ نے کیا ہے میں خدمت گار ہوں اللہ کے بندوں کی خدمت میرا پیشہ ہے میری نیت خدمت کرنے کی تھی اور ہے، تو اللہ نے اپنا کرم کر دیا ہے بس۔“

”یہ بات تو درست ہے مگر بغیر دوا کے مریض اچھا نہیں ہوتا کچھ تو دوا دی ہوگی۔“ گوبردھن بولا۔

”ارے صاحب، آپ کس پھیر میں پڑ گئے بہت سے علاج دوائے نہیں ہوتے۔“ حکیم صاحب بولے۔

”میرے لئے تو یہ بہت تعجب کی بات ہے حکیم صاحب۔“ گوبردھن بولا۔

”آپ کا ذہن کاروباری ہے اس لئے آپ کو سمجھنے

ان کے پاس ایسے کیس بھیج دیئے جو ان کے بس سے باہر تھے مگر حکیم وقار کی حیرت انگیز دواؤں سے وہ ٹھیک ہوئے اور یہ دوائیں رو لکوانے ان کو لادیں۔

حکیم وقار کی شہر اور نیک نامی ان کے پرانے دشمن گنگا دھر کو بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ گنگا دھر نے حکیم وقار کے ہاتھوں بڑی زک اٹھائی تھی، ہر موقع پر اس کو بے عزتی ہوئی تھی وہ دلچھ گڑھ کے گیانی بھیم ناتھ کے قتل کو نہیں بھولا تھا۔ گیانی بھیم ناتھ اپنے وقت کا بہت بڑا جادوگر تھا۔ اس کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلتا تھا۔ مگر اس کی موت کتنی خوفناک تھی دو بندروں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ گنگا دھر نے اس کیس کو ہندو مسلم کا جھگڑا بنانے کی کوشش کی مگر عدالت نے قاتل بندروں کی تلاش کا حکم دے کر اور گنگا دھر اور وکیل رام موہری کے پلان کو ختم کرادیا۔ مگر ان دونوں کے دلوں میں حکیم وقار کے لئے نفرت تو اب بھی تھی اب تک ان کو کوئی موقع ایسا نہیں ملا تھا کہ وہ حکیم وقار کے خلاف کچھ کریں اب حکیم وقار کی شہرت اور نیک نامی کے چرچے سن کر گنگا دھر اندر ہی اندر ٹپ رہا تھا۔ وہ ایک دن وکیل رام موہری کے دفتر چلا گیا۔ وکیل نے اس کو دیکھ کر کہا۔ ”پتھارو دیدی جی خیر تو ہے کیسے کشت اٹھایا۔“

ویداس کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔

”میرے اندر ایک انگلی کا دریا پھوٹ پڑا ہے ارے ہم دلی کے، ہمارے دادا پر دادا دلی کے، اور دلی میں نام وہ باہر سے آیا ملیچھ کما رہا ہے، ارے جس کو دیکھو اس کی تعریف کر رہا ہے اور تو اور ہندو بھی اس کے گن گار رہے ہیں، بھلا بتاؤ۔“

”سچ بات تو یہ ہے کہ اس کے کام ایسا کر دار ہے ہیں۔“ وکیل رام موہری بولا۔

”تم بھی اس کے گن گانے لگے۔“ وید گنگا دھر بولا۔

”ارے نہیں وید جی یہ بات نہیں ہے میرے دل میں اس کے خلاف بڑی نفرت ہے گیانی بھیم ناتھ جیسے مہا

پش کش قتل میں نہیں بھولا پر کیا کروں نہ وہ بندر ملے اور نہ کیس آگے چلا۔ میں تو حیران ہوں کہ ایک آدمی دلی اور دلچھ گڑھ دونوں جگہوں پر کیسے پایا گیا۔“ وکیل بولا۔

”یہ پرانی کٹھا کب تک یاد رکھو گے، کچھ سوچو وہ تو بڑھتا ہی جا رہا ہے۔“ گنگا دھر نے کہا۔

”یہ تو آپ ہی سوچو ان کاموں میں آپ ہی ہوشیار ہو۔“ وکیل نے کہا۔

”تم میرا ساتھ دو گے، ارے دھرم کے نام پر ہی ساتھ دے دینا۔“ گنگا دھر نے کہا۔

”وید جی چتا نہ کرو گلے گلے پانی میں بھی ساتھ دیں گے، دھرم کے معاملے میں کون ہندو جاتی ساتھ نہ دے گا۔“ وکیل بولا۔

”خوش کر دیا وکیل صاحب اب میں چلتا ہوں۔ کچھ بات آگے چلی تو آؤں گا۔“

”ضرور آؤں مگر جو کام کریں پورے بندوبست سے کریں۔ پہلے آپ کئی چوٹ کھا چکے ہو۔ میری بھی سکی ہو چکی ہے آخر میرا بھی کچھ تو بھرم ہے اس شہر میں، میں کسی کمزور کیس پر ہاتھ نہیں رکھوں گا۔“ وکیل نے صاف صاف کہہ دیا۔

”میں کچھ ایسا کرنا چاہتا ہوں کہ کچھری عدالت کا چکر نہ ہی چلے اور کام ہو جائے۔“ وید نے کہا۔

”یہ کام بھی دیکھ بھال کے کرنے کی ضرورت ہے۔“ وکیل بولا۔

”ارے تم بھوانی اور کالی کے دیوانوں کو اتنا کمزور بھی نہ جانو، بس ذرا کوئی مل جائے پورا، پہلے ہم سے یہی غلطی ہوئی کہ کمزور آدمی پر بھروسہ کر کے رہا ہے اب کے ایسا نہیں ہوگا۔“

وید گنگا دھر بوڑھا ہو گیا تھا عمر کے ساتھ ساتھ حکیم وقار کے خلاف نفرت میں بھی اضافہ ہوا تھا اس نے اپنے ہم خیال بندوں سے ملاقاتیں کرنا شروع کر دیں۔ جیون گردھاری بھی مسلمانوں کے لئے نفرت کی علامت تھا۔ گنگا دھر اس کے پاس چلا گیا۔ وہ بولا۔ ”ارے وید جی

”ایک آدمی میری نظر میں ایسا ہے تو مگر کہہ نہیں سکتا کہ وہ یہ کام کرے گا کہ نہیں۔“

”ارے تم بتاؤ تو میں راضی کر لوں گا۔“ وید نے بے صبری سے کہا۔

”تم نے پھلیر ا دیکھا ہے۔“ جیون بولا۔

”نہیں! دیکھا تو نہیں! مگر زیادہ دور بھی نہیں ہے۔“ وید بولا۔

”وہ آدمی وہیں کا رہنے والا ہے مگر اب کہاں ہے مجھے اس کا پتہ نہیں پھلیر اجا کر ہی اس کا پتہ چلے گا۔“

جیون بولا۔

”میں آدمی بھجوائے دیتا ہوں پتہ ہو جائے گا مگر اس کا نام پتہ بتاؤ۔“ وید بولے۔

”پہلے تو وہ پھلیرے کے ایک مندر میں رہتا تھا وہ مندر کالی کا تھا اور شہر سے باہر تھا اس کا نام موہن مہاراج ہے، میں نے جب دیکھا تھا اس وقت ساٹھ کے قریب تھا تم پتہ کراؤ مگر وہ راضی نہ ہوا اور نہ ملا تو مجھے دوش مت دینا۔“ جیون بلا۔

”تم نے اور شک میں ڈال دیا مگر خیر کام تو کرتا ہے جو کھم تو اٹھانا ہی ہوگا۔“ وید بولا۔

”اور اگر وہ مل جائے تو مجھے ضرور بتانا میں بھی تمہارے ساتھ ہوں چٹانہ کرتا۔“ جیون بولا۔

وید گنگا دھرنے پھلیرے ایک آدمی روانہ کر دیا اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔

وہ آدمی پندرہ دن کے بعد واپس آیا وید گنگا دھرتو بھرے بیٹھے تھے بولے۔

”ابے تو گیا تو بیٹھ کے ہی رہ گیا کیا خبر ہے جلدی سے سنا۔“

”میں پھلیرے کے کالی مندر میں گیا تھا مگر وہاں پر پتہ چلا کہ موہن مہاراج وہاں سے چلے گئے پھر بڑی بھاگ دوڑ کے بعد پتہ چلا کہ وہ اٹھنیرے گئے ہیں میں اس طرف کو دوڑا مگر پتہ نہ چلا وہاں پر ایک مندر میں ایک پجاری نے بتایا کہ یہاں سے قریب ہی ایک گاؤں ہے

آپ کے بڑے دنوں کے بعد درشن ہوئے۔“

”ارے کا ہے کے درشن ہمارے سنے سینے پر تو ایک لٹچہ موگ دل رہا ہے۔“ وید گنگا دھرتو بولے۔

”ارے تو زمین پر دے مار دوسرے کو۔“

”اسی کارن تو آئے ہیں تمہارے پاس ہمارے بس کا تو وہ ہے نہیں۔“ وید نے کہا۔

”کیسی کمزور بات کرتے ہو وید جی۔“ جیون بولا۔

”کمزور نہیں ہے، یہ حقیقت ہے تم نے حکیم وقار کا نام تو سنا ہوگا آج کل دلی میں اس کا ہی ڈکانچ رہا ہے۔

جب بنایا تھا، ہم نے اس وقت ہی اس کے پیر اکھاڑنے کی کوشش کی تھی اس کے آٹھاراس وقت بھی ہندو جاتی کے لئے اچھے نہیں لگتے تھے۔ مگر بھیا کیا بتائیں اس نے تو ہماری ایسی کی تپسی کر دی اور ہمارے ہی پیر دھرتی سے اوپر کر دیے۔ بڑے سے بڑا وکیل کچھ نہ کر سکا ہم نے بہت بھاری کیس بنایا مگر کچھ نہ ہوا اس کے پاس نہ جانے کیا گیان ہشتی ہے کہ اس کا کچھ ہوتا ہی نہیں اب تو دلی کے بیچ میں بڑا بھاری دودا خانہ بنائے بیٹھا ہے اور سینکڑوں مریض آرہے ہیں اور موج اڑا رہا ہے ارے ہندو جاتی کے لئے کیا ڈوب مرنے کا مقام نہیں، میں تو کہوں ہوں کہ کوئی ایسا مل جائے جو اس کی بنی بنائی عزت کو خاک کر دے۔“ وید بولے۔

”ارے تو یہ کون سا مشکل کام ہے بھیج دو کوئی مرنا آدمی اس کے پاس مرجائے تو الزام اس کے سر دھر دو اور چلا دو قتل کا کیس خود دماغ ٹھکانے آ جائے گا۔“ جیون بولا۔

”تم نے کہہ دیا اور ہو گیا ایسا، ارے تم نے اس کو پرکھا نہیں ہے ارے وہ اس مرتے آدمی کو بھی ٹھیک کر لے گا اور وہ آدمی بھی اس کے گن گانے لگے گا۔“ وید بولا۔

”تو پھر کسی ایسے کو تلاش کرو جو اپنے جادو سے اس کا دھڑن تختہ کر دے۔“ جیون بولا۔

”ارے ایسا کوئی ملے تو، میں اسی کی کھوج میں ہوں۔“ گنگا دھرتو بولا۔

گوپی چند میں گاؤں گوپی چند، کی طرف گیا، وہاں پر ایک بہت پرانا گراہڑا سا کالی کا مندر ہے اور آبادی سے بھی دور ہے، میں ڈرتے ڈرتے وہاں گیا کیونکہ گاؤں کے آدمی ادھر نہیں جاتے مندر خالی پڑا تھا مندر کے چاروں طرف جنگلی جھاڑیاں ہیں ان کے بیچ یہ مندر ہے مگر مندر کیا ہے ایک ذرا سا مکھٹ تھا اس میں کالی کی مورتی رکھی تھی۔ مورتی پر گیندے کے تازہ پھول پڑے تھے اور لوہان سنگ رہا تھا، میں بڑا حیران ہوا، آدمی تو کوئی نظر نہیں آتا پھر تازہ پھول کون ڈال گیا۔ میں پلٹ کر آنے ہی والا تھا کہ کسی کا بھاری ہاتھ میرے کاندھے پر آ گیا، میں نے گھوم کر دیکھا تو ایک طویل قامت آدمی کھڑا تھا، اس کا بدن نکا تھا نچلے دھڑ پر ایک لنگوٹی تھی چہرے پر غصے کے آثار تھے اس کی شکل و شبہت سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی غیر معمولی چیز ہے۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے آنکھیں چمکدار تھیں اور ان میں غصہ بھرا صاف نظر آتا تھا۔

ڈر کے مارے بری حالت تھی، میری سمجھ میں نہ تھا کہ میں اس کے چرنوں میں بیٹھ گیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”معاف کر دو گرو میں خود سے نہیں آیا آپ کے پاس بھیجا گیا ہوں، موبہن مہاراج نے اپنی گرجتی آواز میں کہا۔ ”کھڑا ہو جا۔“

میں فوراً کھڑا ہو گیا وہ ایک طرف کو چلے اور بولے۔ ”میرے ساتھ آ۔“

میں ان کے پیچھے چلا انہوں نے ایک چکر مندر کے گرد لگایا اور ایک گھپا میں چلے، میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ تعجب تھا ادھر ایسی وحشتانہ جگہ مگر گھپا صاف ستھری تھی ایک مٹی کا چوڑا بنا تھا اس پر وہ بیٹھ گئے اور بولے۔

”اب بتا کیوں آیا ہے اور کس کا سندیہ ہے؟“

میں نے کہا۔ ”مہاراج دلی میں ایک وید ہیں ان کا نام گنگا دھر ہے ان کو آپ کی ضرورت پڑ گئی ہے کچھ کام ہے مگر کام کا مجھے اندازہ نہیں ہے۔“

”وید ہے کتاب روید کے لئے خود نہ آیا اور تجھے بھیج

دیا مروانے کو، وہ تو تیری زندگی تھی جس سے تو وہاں پہنچا اس سے دیوی موجود نہیں تھی اگر ہوتی تو تیرا کلیان ہو چکا ہوتا اس حرامی وید کو چاکر کہہ دے ہم اس کے نوکر ہیں کہ اس کے حکم پر اس کے پاس دوڑے چلے جائیں گے، کام ہے تو خود آئے پھر سوچیں گے اور تو سن لے اچھی طرح اب ادھر گاؤں گوپی چند کبھی مت آئیو، جا دوڑ جا۔“ اور میں جو وہاں سے دوڑا ہوں تو اچھیرہ میں سانس لی۔ ”وہ بولا۔“

”اچھا ٹھیک ہے اب تو جا تیرا کام ختم ہوا۔“

وید گنگا دھر دوڑے جیون کی طرف اور اس کو پوری کتھانا کر بولے۔

”اب بتاؤ جیون جی کیا کریں؟“

”ہمت کرو وید جی اور اچھیرہ چلے جاؤ۔“ جیون نے مشورہ دیا۔

”تم نے خوب کہی میں بوڑھا آدمی اکیلا کیسے جاؤں اور کسی کو ساتھ لے جانے کا مطلب ہے ہمارے راز میں ایک اور سانچے دار ہو گیا اور میں یہ ہرگز نہیں کروں گا پہلے بہت چوٹ کھا چکا ہوں تم کو تو سب پتہ ہے تم نے خود بھی کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تو میں تم سے نفی کرتا ہوں میرا ساتھ دو دیکھو لو دھرم کا کام ہے تمہارا اور میرا دھرم الگ الگ تو ہے نہیں۔“ وید بولے۔

”وید جی بات یہ ہے کہ میرا ہاتھ ذرا تنگ ہے، اس لئے اکیلے جاؤ۔“ جیون نے بہانہ بنایا۔

وید گنگا دھر ترنت بولے۔ ”ارے اس کی تم نے

بڑی فکر کری میں سب کروں گا تم اب چلو بس۔“

اب جیون کے پاس ہاں کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا بولے۔

”تو ٹھیک ہے وید جی آپ کو اکیلا بھی تو نہیں چھوڑ

سکتا اور دھرم کا معاملہ ہے۔ بتاؤ کب چلو گے۔“

”آج کا دن تو گیا اچھیرے کا راستہ چار گھنٹے کا تو

ہے کل سویرے کی گاڑی پکڑ لیتے ہیں، دوڑھا لی بجے تک

پہنچ جائیں گے موقع ہوا تو اسی دن نہیں تو دوسرے دن

گوہنی چند گاؤں چلے جائیں گے اور موہن مہاراج سے ملاقات کر لیں گے۔“

دوسرے دن دونوں اچھنیرہ روانہ ہو گئے۔ ساڑھے تین بجے یہ اسٹیشن پر اتر گئے اور اسٹیشن سے باہر آ گئے۔ اچھنیرہ کوئی بڑی جگہ نہیں ہے ایک قصبہ ہے زیادہ آبادی نہیں ہے زیادہ تر لوگ زراعت پیشہ ہیں۔ وقت زیادہ ہو گیا تھا آج تو گاؤں گوہنی چند نہیں جاسکتے تھے رات گزرنی تھی۔ ایک حلوائی سے انہوں نے پوچھا۔ ”بھائی ہمیں آگے جانا ہے رات گزرنے کی جگہ کہیں مل جائے گی۔“

حلوائی بولا..... ”دھرم شالہ ہے تو ایک پر اس کا پنڈت بڑا خزانہ ہے چلے جاؤ شاید جگہ دے دے اور ہاں اگر آئیں بائیں سائیں کرے تو اس کی تھیلی پر پانچ کا نوٹ رکھ دیتا مان جائے گا مگر کھاپی کے جانا بھیا وہ کچھ نہیں دے گا۔“ حلوائی بولا۔

حلوائی نے جو بتایا تھا پنڈت اس سے دو جوتے آگے تھا۔ بولا۔

”ارے یہ دھرم شالہ ہے مسافر خانہ نہیں ہے اور روز چوری چکاری ہو رہی ہیں۔ میں تم پر بھروسہ کر لوں اور تم رات کو کام دکھا دو تو میں کیا کر لوں گا بولو۔“

”یہ سن کر وید جی بولے۔“ پنڈت جی ذرا دیکھو تو میری عمر کیا ہے اور یہ جیون جی ان کی عمر دیکھو، نہ ہم تیز چل سکیں نہ بھاگ سکیں بھلا چوری کیا کریں گے۔“ پنڈت نے دونوں کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ”پھر بھی جو کھم تو ہے۔“

وید جی نے ایک پانچ کا نوٹ اس کی تھیلی پر دھر دیا اور بولے۔ ”اب جانے بھی دو۔“

پنڈت نے نوٹ دیکھا اور بولا۔ ”آدی دونوٹ ایک یہ خوب رہی۔“

وید گنگا دھر سمجھ گیا کہ آدی سخت لالچی ہے اس نے ایک نوٹ اور دے دیا۔

پنڈت بولا۔ ”چلو ٹھیک دھرم کی سیوا بھی ضروری

ہے وہ دو کھٹ پڑی ہیں پڑ کر سو جاؤ میں سویرے آؤں گا تو اٹھا دوں گا اور ہاں اگر اور رکنا ہو تو یہ ریٹ ہوگا۔“

جیون اور وید کو غصہ تو آیا مگر کیا کرتے نئی جگہ تھی اور رات سر پر کھڑی تھی۔ سویرے چھ بجے ہی پنڈت نے ان کو اٹھایا اور بولا۔

”رات تو گزر گئی اور رکو گئے یا جاؤ گے۔“ جیون نے کہا۔ ”ارے پنڈت جی ہم کام سے آئے ہیں آگے ایک گاؤں ہے اس کا نام گوہنی چند ہے وہاں جانا ہے واپس آویں گے تو بتائیں گے۔“ ”میں گوہنی چند گاؤں کا ہوں وہاں کس سے ملنا ہے بتاؤ۔“ پنڈت بولا۔

”گاؤں سے ذرا دور ایک مندر ہے کالی کا، وہاں جانا ہے۔“ وید بولے۔

”رام رام ایسی غلطی بھی نہ کرنا۔ ارے وہ تو بڑی خطرناک جگہ ہے کوئی ادھر جاتا نہیں۔“ پنڈت بولا۔

”وہاں پر ایک مہان پرش ہے اس سے ملنا ہے۔“ جیون نے کہا۔

”وہاں کوئی نہیں ہے کسی نے تم کو غلط بتایا ہے۔“ پنڈت بولا۔

”دو چار دن پہلے ایک آدی اس سے مل کر گیا ہے۔“ وید بولے۔

”تو پھر جاؤ مجھے تو جو پتہ تھا بتا دیا آگے تم جانو۔“ پنڈت چلا گیا اور دونوں کو تذبذب میں گرفتار کر گیا

دونوں خاموش تھے دونوں سوچ رہے تھے کہ اب کیا کریں۔ چند منٹ خاموشی رہی پھر وید جی بولے۔

”اب اوکھلی میں سر تو دے ہی دیا ہے تو دھکیوں سے کیا ڈرنا۔“

”بات تو وید جی ٹھیک ہے۔ جانا تو پڑے گا۔“ ”تو پھر تیاری کر دھرم شالہ کے باہر یہ کچھ کھائیں گے اور پھر چلیں گے۔“

”گاؤں سے زیادہ نہیں صرف ایک میل پر یہ مندر تھا مگر اس مندر کے اطراف کوئی کھیت نہیں تھا اور

ایسا بھی کوئی نشان نہیں جس سے ظاہر ہو کہ یہاں کوئی آتا ہے مندر کا زیادہ حصہ تو گرا ہوا تھا اس کے چاروں طرف کانٹے دار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں مندر تک جانے کے لئے کوئی راستہ نہیں تھا ان جھاڑیوں کے اندر سے ہی جانا تھا۔

جیون نے کہا۔ ”وید جی مندر تک تو جانا ہے..... اور جھاڑیوں سے ہی گزرتا ہے۔ بولو آ جاؤ گے۔“

”اب تو یہ کرتا ہی پڑے گا۔“ اور دونوں جھاڑیاں ہٹاتے مندر تک جانے لگے دونوں کے ہاتھوں میں کانٹے چھ گئے وہ مندر کے سامنے جا کھڑے ہوئے مندر میں وہی جگہ ٹھیک تھی جہاں پر کالی کی مورتی رکھی مورتی پر آج بھی گیندے کے پھول پڑے تھے اور تازہ تھے دونوں کو حیرت ہوئی دور دور کوئی نظر نہیں آتا آنے کے آثار نظر نہیں آتے پھر یہ تازہ گیندے کے پھول کون ڈال گیا۔ مگر ان کو اس پر زیادہ سوچنے کی مہلت نہ ملی۔

ان دونوں کی گردنیں کسی کے مضبوط ہاتھ میں تھیں وہ اپنی کھر کھراتی آواز میں کہہ رہا تھا۔
”کون ہو تم دونوں۔“

”وید نے ہمت کی اور بولا۔ ”مہاراج موہن کے درشن کو آئے ہیں۔“

”کیوں آئے ہو؟“ پوچھا گیا۔

”مہاراج نے حکم دیا تھا کہ میں خود آؤں میرا نام وید گنگا دھر ہے۔“ وید بولا۔

”اچھا تو وہ تیرا بھیجا آدمی تھا۔ چل ٹھیک ہے۔“
گیا آؤ میرے ساتھ۔“

اور وہ ان کو اسی گھپا میں لے آیا اور بولا۔

”بول کا ہے کو آ یا ہے جو بات ہے سچ سچ بتادے۔“

وید گنگا دھر نے پوری روداد سنا دی اور چپ ہو گیا تو

موہن بولا۔

”تیری اور اس حکیم کی لڑائی ہے تو اس میں دھرم کو

لے آیا ہے۔ تیرے دھرم کو اس حکیم نے بھی پیچھا ہے پھر

دھرم کی بات نہ کر۔“

”میرے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ اس کے خلاف کچھ کرو وہ صاف بچ جاتا ہے۔ ضرور اس کے پاس کوئی شکستہ تیرے تیری یہی بات مجھے اپیل کرتی ہے باقی سب تیری ذاتی لڑائی ہے اور حسد ہے تو جا میں جانو اور وہ حکیم جانے۔ میں خود تیرے پاس آؤں گا، تو ہرگز ہرگز اب ادھر نہ آنا، میری بات پلے باندھ لے اور میرا انتظار کرنا اور تو خود بھی حکیم کے سامنے نہیں جائے گا۔“

وید گنگا دھر کو لگا اب ملا ہے کام کا آدمی مگر خراٹ ہے پوری بات بھی نہیں سنتا وہ وکیل رام مورتی کے پاس دوڑا۔

رام مورتی وکیل نے کہا۔ ”وید جی تم جانو ہمارا سے کتنا قیمتی ہوتا ہے تم ہر وقت آتے رہو گے تو میرا کتنا کام خرچ ہوگا۔“

”مجھے پتہ ہے وکیل صاحب پر میں بے وجہ تو نہیں آتا آپ چونکہ ہمارے پرانے متر ہیں اور ساری کٹھا آپ کو پتہ ہے گیانی تہواڑی کا قتل اور دو بندرجن کے بارے میں اب تک پتہ نہیں چلا پوری رام کہانی آپ کے سامنے ہوئی کسی نئے وکیل کو کیا پتہ پہلے تو وہ یقین ہی نہیں کرے گا اور کرے گا بھی تو ایک دم اس کی سمجھ میں یہ سب گورکھ دھندہ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ آگے چل کر شاید کورٹ کچہری کی نوبت آجائے اس لیے آپ کا ساتھ ہونا بھی ضروری ہے موجودہ حالات آپ کے سامنے رہیں گے تو آپ کو سمجھنے میں آسانی رہے گی اس کارن آپ کے پاس میں آتا ہوں میرا من کسی اور وکیل پر جتا بھی نہیں پر، وید گنگا دھر بولے۔

اب سمجھ میں آئی تا بات پہلے بتا دیتے پر ذرا تم یہ بھی تو خیال کرو مہنگائی بڑھ گئی ہے ہمارے بھی اخراجات تو ہیں بچے بھی زیادہ ہو گئے بے فائدہ اپنا سے خراب تو نہیں کر سکتا میں تو بہت خوش ہوں کہ پرانی کتھی شاید اب حل ہو جائے اور پھر یہ معاملہ دھرم کا بھی ہے مگر وید جی۔ یہ ظالم پیٹ بری بلا ہے یہ سمجھ لو۔“ رام مورتی نے وید کا داؤد وید پر ہی مار دیا۔ وید گنگا دھر بھی پرانے کھلاڑی تھے سمجھ گئے بولے۔

”ارے تم فیس کی تو فکر نہ کرو کیس شروع ہوا تو ضرور ملے گی۔“

”اور اگر نہ ہوا تو ہم بے کار اپنا وقت برباد کر کے دھرم کی سیوا کریں گے۔ وید جی میں وکیل ہوں بڑے رنگ روز دیکھتا ہوں صاف بات یہ ہے کہ مجھے ساتھ رکھنا ہے تو فیس آج سے ہی لوں گا ویسے مجھے لگا نہیں ہے کہ کورٹ کچہری کا معاملہ ہوگا۔ عین وقت پر آ جاؤ تو بھی میں کام تو کروں گا مگر مجھے کیس سمجھنے میں وقت تو لگے گا۔“

رام مورنی بولا۔

”آپ کی آخری بات میں بہت وزن ہے۔“ وید جی بولے۔

”تو پھر اپنی جیب کا وزن کچھ کم کرو اور پانچ سو روپے یہاں دھرو۔“ رام مورنی نے کہا۔

”پانچ سو کیوں پہلے تو سو روپے لیتے رہے ہو۔“ وید بولے۔

”وہ زمانہ گزر گیا اب حالات دوسرے ہیں فیس بھی بڑھ گئی ہے۔“ رام مورنی بولے۔

وید نے ذرا سامنے بنایا اور پانچ سو روپے گن کے رام مورنی کے حوالے کر دیے اور بولے۔ ”آپ گمانی

تکواڑ کے قتل کیس پر بھی ذرا غور کر لینا شاید حوالے کی ضرورت پڑ جائے۔“

”ارے اب تم چتا ہی نہ کرو اب کے حکیم میرے ہاتھ آ گیا تو بھگوان کی سونگندہ رنگ دکھاؤں گا کہ دلی

چھوڑ کے پھر سہارنپور بھاگے گا۔“ وکیل رام مورنی نوٹ

ملنے ہی جوش میں آ گیا۔ ”اچھا اب چتا ہوں موہن مہاراج، آویں گے تم سے ملاقات کروں گا۔“ وید

بولے۔

مطب میں کئی حکیم علاج کرتے تھے حکیم عشرت کے پاس ایک مریض آ گیا مریض کے ساتھ ایک عورت

تھی یہ لوگ بھرت پور سے آئے تھے مریض کے جسم پر آبلے تھے اور یہ آبلے روز پیدا ہوتے اور سفید پانی سے بھر کر خود پھوٹ جاتے اور زخم پیدا ہو جاتا اور مریض کے جسم

میں جلن پیدا ہو جاتی اور سخت اذیت میں مبتلا ہو جاتا بھرت پور میں علاج کرایا مگر فائدہ نہیں ہوا پھر آگرہ گئے کچھ نہ ہوا آگرہ میں کسی نے دلی کا پتہ دیا اور عورت اس کو لے کر یہاں آ گئی حکیم عشرت نے علاج شروع کر دیا مگر دو روز تک کچھ فرق نہ پڑا تو اس نے مریض کو اپنے والد حکیم وقار کی خدمت میں پیش کر دیا اور جو دوائیں اب تک دی تھیں اس کی تفصیل بھی بتادی۔

”دوا تو تم نے ٹھیک دی ہیں چلو میں دیکھتا ہوں۔“ حکیم وقار نے مریض کا اچھی طرح معائنہ کیا ایسے

مریض کے جسم میں حدت زیادہ ہوتی ہے۔ دواؤں پر غور کیا ان حالات میں درست دوائیں تھیں مگر فائدہ ذرا نہیں

ہوا، چند منٹ کے بعد رولو کا ان کے پاس کھڑا تھا۔ وہ بولے۔ ”چکر ادا ہے ذرا دیکھو تو.....“

رولو کا مریض کے سر ہانے کھڑا ہو گیا اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا چند منٹ کے بعد بولا۔

”یہ کیس میرا ہے ٹھیک ہو جائے گا۔“ مریض اٹھ کر بیٹھ گیا بولا۔ ”تو کون ہے میں تجھ سے

علاج کرانے نہیں آیا۔ میرا علاج یہ کریں گے۔“ ”تجھے علاج کرانا ہے کوئی بھی کرے۔“ حکیم وقار

نے کہا۔

”یہ مجھے مار ڈالے گا۔“ مریض بولا۔

”یہ تو ہوگا سونگندی کے چیلے۔“ رولو کا بولا۔

”میں سونگندی کا چیلہ نہیں ہوں تو جھوٹ بولتا ہے۔“ پاکھنڈی مریض غصے سے بولا۔

”پڑا رہا اب تو یہیں رہے گا تو یہ بتا یہاں کیوں آ ہے؟“ رولو کا بولا۔

”حکیم کا کلیان کھانے اس نے بڑا نام کمایا ہے اس کو ملیا میٹ کرنے آیا تھا۔“

”مگر خود پکڑا گیا حیران اور تو سونگندی ہے پھر سونگندی کا حکیم صاحب سے کیا لینا دینا تو کا ہے آیا۔“

”گورو نے میرا ہاتھ موہن مہاراج کے ہاتھ میں دے دیا ہے اس کے حکم سے آیا ہوں۔“

ایک منٹ کے بعد وہ دیا خود بخود بجھ گیا اور رولو کا
نے دوسرا دیا اس پہلے دیئے پر رکھ دیا اور دھاگہ باندھ
دیا۔ مریض کے آبلے مر جھائے اور اس کو سکون آ گیا۔

”اب یہ ٹھیک ہے ایک دو روز طاقت کی دوائیں
دیں۔“ رولو کا بولا۔

”یہ سارا ماجرہ حکیم وقار کے سامنے ہوا۔ ان کو ذرا
حیرت نہیں ہوئی اکثر اس قسم کے علاج رولو کا نے ان کے
سامنے کئے تھے حیرت صرف اس بات کی تھی کہ یہ موبن
مہاراج ان کا دشمن ہو گیا ہے یہی سوال انہوں نے رولو کا
سے کر دیا۔

رولو کا ہنس کر بولا۔ ”ارے حکیم صاحب یہ دنیا ہے
یہاں پر آپ کی شہرت اور نیک نامی کے دشمن بھی ہیں ان
میں ہی سے کوئی ہوگا۔“

”یہ دونوں نام نئے سامنے آئے ہیں۔“ حکیم وقار
نے کہا۔

”سو گندی کے بارے میں مجھے پتہ ہے یہ ایک بڑا
خطرناک پیر ہے اس کے پاس اور بھی پیر ہیں۔ یہ سب
گندے پیر ہیں گندے کام کرتے ہیں بیماریاں اور جراثیم
پھیلانے کے یہ ماہر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کچھ
نہیں ہے بڑی جلدی بھاگ جاتے ہیں مگر ان کی تباہ
کاریاں بہت ہیں، اچھے بھلے شہر کو بیماریوں سے بھر دیتے
ہیں۔ دوسرا نام موبن مہاراج کا ہے یہ نام میرے لئے بھی
نیا ہے کڑن چھوت نے بتایا ہے کہ کسی گاؤں میں اس نے
پیر منڈل بنایا ہوا ہے مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس نے
کڑن چھوت کو تباہ کر دیا ہے۔ اس کا اور
آپ کا تعلق کیا ہے، اس میں ضرور کوئی درمیانی کڑی ہے
کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہے جس کے کہنے پر یہ آپ کی
طرف آیا ہے۔ بلاوجہ تو وہ آنے سے رہا اب مجھے مطب کی
حفاظت کا بندوبست کرنا ہے اس درمیانی کڑی کو تلاش کرنا
ہے ہماری دشمنی موبن سے تو ہے ہی نہیں۔“ رولو کا بولا۔

”تم نے درست اندازے لگائے ہیں۔“ حکیم وقار
بولے۔

”یہ موبن مہاراج کون ہے؟“ رولو کا نے پوچھا۔
”میں کا جانو، میں تو حکم کا غلام ہوں جو کہا وہ کر رہا
ہوں۔“

”آگے کیا کرتا یہ بتا۔۔۔۔۔۔“ رولو کا نے پوچھا۔
”یہ آدمی مر جاتا اس دوا خانے میں اور یہ دوا خانہ
بدنام ہوتا پھر حکیم کو یہ بیماری ہوتی اس کی اولاد کو ہوتی اور
سب مر جاتے موبن مہاراج کا کام ہو جاتا۔“
”اور اب تو باہر آ جا تیرا کام ختم ہوا، تو ایک کو بھی
نہیں مار سکا۔“ رولو کا بولا۔

”باہر تو میں ہرگز نہیں آؤں موبن مہاراج کا حکم
ہے۔“ وہ بولا۔

”تو چلیا تو سو گندی کا ہے اور حکم موبن کا بانتا ہے۔“
رولو کا نے پوچھا۔

”سو گندی بیماری دکھ پریشانی کرنے کا ماہر ہے۔ پر
موبن مہاراج اس سے بھی آگے ہے اس کے پاس گاؤں
گوپی چند میں بڑے پیر ہیں میں تو خالی بیماری کرتا ہوں۔“
وہ بولا۔

”تیرا نام کیا ہے میرا نام کڑن چھوت، بڑی سے
بڑی بیماری میرے پاس ہے۔“ کڑن چھوت بولا۔

”تو باہر نہیں آئے گا تو اس آدمی کے شریر میں اس
کی چتا کے ساتھ ہی جل جائے گا کیونکہ یہ تو مرنے ہی والا
ہے باہر آئے گا تو تیرے ساتھ یہ بھی فٹ جائے گا۔“ رولو کا
نے کہا۔

”سو گندی اور موبن مجھے نہیں چھوڑیں گے۔“ وہ
بولا۔

”تو میرے شرن میں آئے گا تو بچ جائے گا۔“
رولو کا بولا۔

”تو کون ہے یہ تو بتا۔“ کڑن چھوت بولا۔
”تجھے بتانے کا میں پابند نہیں ہوں ایک منٹ میں
باہر نہیں آیا تو تیری خیر نہیں ہوگی۔“ رولو کا بولا۔

رولو کا نے ایک چھوٹا سا دیا اس مریض کے سامنے
جلا کر رکھ دیا۔

”بات وزن دار ہے وکیل، کچھ ہوا تو نہیں، میں جاتا ہوں مہاراج کے پاس کل سویرے۔“ گنگا دھر نے کہا۔

مگر اس کو جانے کی ضرورت نہ پڑی مہاراج موہن سویرے ہی اس کے پاس آ گئے۔

رولوکا کا کارندہ رات کو بھی پوری رپورٹ رولوکا کو دے چکا تھا اور واپس آ گیا تھا۔

”پتھارو مہاراج۔“ گنگا دھر موہن کو دیکھ کر بولا۔

”میں آج آپ کے پاس آنے والا تھا۔“

”اسی کارن تو آ گئے ہیں۔ پر تو لگتا ایسا ہے کہ تیرا گھر گھیراؤ میں ہے بھاری بھاری ہے۔“

موہن کمار نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر کہا۔

”نہیں مہاراج ایسا مجھے تو کچھ نہیں لگتا۔“ گنگا دھر بولا۔

”تیری آنکھ اور میری آنکھ میں بڑا فاصلہ ہے تیری ناک اور میری ناک میں بھی فاصلہ ہے میں سو گھر رہا ہوں پر کیا ہے اس کا پتہ ابھی چل جائے گا۔“ یہ سنتے ہی رولوکا کا کارندہ ہوا ہو گیا اور اس نے رپورٹ رولوکا کو دے دی۔

چند منٹ کی خاموشی کے بعد موہن بولا۔ ”بھاگ گیا۔“

کارندہ پھر اپنی جگہ آ گیا۔ موہن کی آنکھیں پھیل گئیں غصے میں بولا۔

”ارے کا ہے آنکھ مجھ کو کیل رہا ہے تو کون ہے سامنے تو آ پھر دیکھیں تیری ہیکڑی۔“ مگر کارندے کو لڑنے کی اجازت نہ تھی موہن نے پھر کچھ پڑھا مگر کارندہ اس سے پہلے ہی چپکا تھا۔

مہاراج پھر گڑبڑا کر رہ گیا اس کا چہرہ غصے سے اور بگڑ گیا تھا۔ اس نے کچھ پڑھا اور ہاڑ کر بولا۔

”اب کے آئے تو کر لے قابو جانے نہ پائے۔“

گنگا دھر بولا۔ ”مہاراج آتے ہی کس چکر میں پڑ گئے جل پانی تو کرلو۔“

”کرئیں گے کیوں نہیں کریں گے پہلے بندوبست تو

”آپ اپنا کام کریں میں اپنا کام کرتا ہوں“ رولوکا بولا۔

رولوکا نے دلی میں حکیم وقار کے دشمنوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔

دلی میں حکیم وقار کا سب سے بڑا دشمن وید گنگا دھر ہی نظر آیا اور رولوکا نے اس پر اپنا ایک کارندہ مقرر کر دیا وہ کارندہ اس کے ساتھ اس کے سامنے کی طرح رہتا تھا۔

ایک دن رام مورتی گنگا دھر سے ملنے آ گیا۔ بولا۔

”وید جی تم نہ آتے تو چلا آیا ہوں۔“

”بڑی کرپا کر دی آپ نے۔“ گنگا دھر بولا۔

”سناؤ کیا تیرا تجربہ اس حکیم کا کیا ہوا؟“

”ارے ابھی تو کچھ نہیں ہوا۔ میں مہاراج سے ملا تھا وہ بتا رہے تھے کہ ایک خطرناک پیر چھوڑ دیا ہے۔ وہی پورے دوا خانے کا کلیان کر دے گا، حکیم سسر اعلان کرنا ہی رہے گا اور مریض مرتے جائیں گے کچھ دن میں حکیم کا بھٹہ بیٹھ جائے گا۔“ گنگا دھر بولا۔

”کتنے دن ہو گئے اس بات کو۔“ رات مورتی نے پوچھا۔

”دس گیارہ دن ہو گئے ہیں۔“ گنگا دھر نے جواب دیا۔

”تو کچھ ہوا، کچھ سن گن مطب کی تم نے لی۔“ رام مورتی نے پوچھا۔

”روز میرا آدمی جاوے ہے پر کچھ ہوا نہیں ہے دوا خانہ اسی طرح چل رہا ہے۔“

”تو پھر سمجھ لو کچھ ہونے کا بھی نہیں ہے موہن مہاراج کا پیر بے کار گیا۔“ رام مورتی نے کہا۔

”ارے کا کہو ہو، بڑے زبردست شکلی والے ہیں مہاراج۔“ گنگا دھر بولا۔

”پر ہر دار کارگر نہیں ہوتا وید جی تمہارے آگے بھی موتی چور کا لٹو نہیں رکھا ہے کہ اٹھا کے کھا لو گے

ارے پرانے تجربے سے تم نے کچھ نہیں سیکھا۔“ رام مورتی نے کہا۔

پھر ایک بہت بڑے چگاڈو نے زمین کی طرف عین حویلی کی چھت پر اترنے کی کوشش کی اور وہ منڈیر پر آ کر بیٹھ گیا اور پھر اندر کی طرف پرواز کرنا چاہا مگر منڈیر نے اس کے پیروں کو پکڑ لیا اور وہ پھر پھڑا کر رہ گیا اس کے منہ سے ایک کریناک چیخ برآمد ہوئی جو کہ موہن مہاراج نے سنی لی اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”پھنس گیا لگتا ہے۔“

اس نے بڑھنا شروع کر دیا حملہ تیز کرنے کو اس کے پیر اترنے لگے مگر چھت پر آ کر بے بس ہو گئے۔ مگر ان کی تعداد کم نہ ہوئی اور پھر رات کے اندھیرے میں آسمان پر اڑنا بادل ان چگاڈوں کے اوپر آ گیا اور ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ یہ بادل بہت معمولی شہد کی مکھیاں کا تھا۔

مگر ان کی تعداد اور نظم و ضبط اور حملہ کرنے کا انداز ماہرانہ تھا۔ چگاڈوں کے پاس راہ فرار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ زمین پر گر رہے تھے مگر زمین پر گر کر کے بعد نظر نہیں آتے تھے یہ آسمانی لڑائی تھی۔ موہن مہاراج کی فوج کمزور پڑ رہی تھی اس نے پینتیرا بدلا اور آسمان سے سارے چگاڈو غائب ہو گئے۔ آسمان پر کالا بادل اب بھی موجود تھا۔

مہاراج کی آواز رولوکا کے کان میں آئی۔ ”تو کون ہے؟“

”میں انسان ہوں۔“ رولوکا بولا۔

”لگتا تو نہیں۔“ مہاراج بولا۔

”مجھے تو انسان نہیں لگتا۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”میں تیری موت ہوں۔ تو نے میدان مار لیا ہے پر

ایسا ہمیشہ نہیں ہوگا۔“ مہاراج بولا۔

”زیادہ اپنی تعریف نہ کر تیری طاقت میں نے دیکھ لی ہے اور سن تیرا مانگے کا بیر میرے پاس قید ہے اور دوسروں سے مانگ کر وار کرتا ہے انسانوں کو مصیبت میں ڈالتا ہے اور پھر اڑتا بھی ہے۔“ رولوکا بولا۔

”اونچا نہ بول تیری حالت ایسی کروں گا کہ کسی نے نہیں کی ہوگی۔“ موہن مہاراج کی آواز آئی۔

کر دیں۔“ اور وہ وہیں پر کنڈل بنا کر بیٹھ گیا اور کچھ دیر میں اس نے ہاتھ کے اشارے کرنا شروع کر دیے اور کنڈل سے باہر آ گیا اور بولا۔ ”اب ہوا اس کا کام چڑیا بھی اڑ کر تیرے گھر نہیں آ سکتی جو آوے گا بھسم ہو جائے گا۔“

کارندے نے سارا چکر رولوکا کو بتا دیا تھا۔ رولوکا بولا۔ ”تم اس کے گھر کے اندر ہرگز نہیں جاؤ گے دور دور سے اس پر نظر رکھو گے۔ اب بات کچھ اور بڑی نظر آ رہی ہے۔ اس نے ضرور راستے بند کئے ہوں گے۔“

موہن مہاراج نے نگاہ دھر سے پوچھا۔ ”حکیم کی کیا خبر ہے؟“

”ٹھیک ہے، کوئی خاص بات اب تک نہیں ہوئی۔“

نگاہ دھر بولا۔

”ارے تو وہ سوگندی کا چیلہ لیا ہوا، کا پھنس گیا جان

میں۔“ سوہن بولا۔

”میں کیا جانوں گرو.....“ نگاہ دھر ڈر کر بولا۔

”ٹھہر جا بلاتا ہوں اس کو۔“ اور زمین پر بیٹھ کر اس نے کچھ بدبانا شروع کر دیا۔ مگر کچھ نہ ہوا ہر طرح اس نے کوشش کر لی مگر کڑن چھوٹ نہ آیا نہ جواب آیا مہاراج

غصے سے سرخ ہو گیا اور زور سے بولا۔ ”تیرا سہ پورا ہور ہا ہے حکیم تو نے میرا بیر پکڑا ہے میں دیکھ کیا کرتا ہوں۔“

رات کے بارہ کے بعد کا وقت تھا مطب کے سب دروازے بند تھے اور پورا علاقہ اور مطب کی حویلی

اندھیرے کی چادر اوڑھے تھی۔ مگر رولوکا اس حویلی کے اندر تھا اور اس کے سارے کارندے حویلی کے اطراف

میں پھیلے ہوئے تھے۔ آسمان پر کچھ پرندے نظر آ رہے تھے یہ رات کے راہی پرندے تھے۔ چگاڈو تھے اور آہستہ آہستہ ان کی تعداد بڑھ رہی تھی تعداد کے ساتھ ان کے حجم بھی بڑے ہو رہے تھے رولوکا کو سب نظر آ رہا تھا اس کو وہ بھی نظر آ رہا تھا جو کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا ان چگاڈوں کے عین اوپر ایک کالا بادل صبح ہو رہا تھا اور بادل چگاڈوں کی

طرف بڑھ رہا۔

”فکر مت کر، میں تیرے قریب ہوں پھر آؤں گا۔“ اور آواز بند ہوگئی۔

روزی کی طرح مطب صبح کھلا اور مریض آتے گئے۔ رولوکا کا کام بڑھ گیا اس کے کارندے مصروف ہو گئے۔ پھر رات ہو گئی اور جاسوس کارندے گنگا دھر کے گھر کے اطراف میں مصروف عمل ہو گئے۔ مکان کے چاروں طرف نہ نظر آنے والی ایک دیوار کھڑی تھی اور اس کی بلندی آسمان تک تھی اس دیوار سے رولوکا کا ایک کارندہ نکلا گیا۔ ایک زوردار زخاں ہوا اور وہ ہواؤں میں پرواز کرتا دور جانے لگا شاید اس کا کسی پہاڑ سے ٹکرانے کا ارادہ تھا مگر دوسرے کارندے درمیان میں آ گئے اور اس کو روک لیا وہ بری طرح زخمی تھا۔ رولوکا نے اس کو دیکھا اور ایک طرف دیکھ کر کہا۔ ”اس کو کالا باری میں جو لا پہاڑی پر لے جا۔“ اور وہ کارندہ چلا گیا۔ آج ہندوستان کی سر زمین پر پہلی دفعہ یہ ہوا کہ اس کا افریقی کارندہ زخمی ہوا۔ کالا باری میں رولوکا کے ساتھی اور دوست موجود تھے مگر اس نے سبھی ان سے مدد نہیں لی تھی حالانکہ وہ سب اس کے لئے ہر وقت تیار تھے۔

رولوکا کو سنجیدہ ہونا پڑا۔ یہ دشمن کچھ جان دار ہے اس پر علم کے ساتھ عقل کا بھی استعمال ضروری تھا۔ گوپی چند گاؤں ابھنیرے کے قریب ہے اور یہ اسی گاؤں سے آیا ہے۔ وہاں پر شاید اس کا بیر کنڈل ہو اور یہ وہیں سے طاقت حاصل کرتا ہو رولوکا نے اندازہ لگایا اور مطب پر پہرہ سخت کر کے گاؤں کو گئی چند چلا گیا۔ مندر ویران پڑا تھا ہر طرف ہوکا عالم تھا۔ وہ دیوی کے بت کے سامنے چلا گیا اور دیوی کے بت سے بولا۔

”کب تک تو انسانوں پر ظلم کرے گی اور ہاتھ بڑھا کر بت اٹھاتا چاہا کہ بہت اچھل کر اوپر ہو گیا۔“

مگر اچھل کر زیادہ اوپر نہ ہو سکا اور زمین پر گر کر ریزہ ریزہ ہو گیا اس کے ٹکڑے ہوتے ہی ویرانے میں کراہیں اُڑنے لگیں اور پھر جھاڑیوں میں اچانک بڑی خوفناک آگ جل اُٹھی اور چیخ و پکار زیادہ

ہونے لگی۔ آگ آسمان سے باتیں کر رہی تھی رولوکا اس آگ کے درمیان اطمینان سے کھڑا تھا۔ درخت اور جھاڑیاں جل گئیں تو وہ گھپا نظر آنے لگی جو کہ موہن مہاراج کا ٹھکانہ تھی۔ اب آگ کے جلانے کو کوئی چیز نہیں بچی تھی رولوکا نے گھپا کی طرف اشارہ کر دیا اور آگ کے شعلے گھپا کے اندر چلے گئے اور اندر سے بڑی بھانک کر ہٹا کر آوازیں آنے لگیں اور پھر ایک دھماکہ ہوا گھپا اڑ گئی۔ ٹیلے کی ساری مٹی ہوا میں اڑ گئی چاروں طرف دور دور تک دھول پھیل گئی اور گھپا کا نام و نشان نہیں رہا۔

درخت اور جھاڑیاں جل گئیں اور صاف میدان نظر آنے لگا۔ رولوکا نے ایک ٹکڑی اٹھائی وہ ٹکڑی آدھی جلی تھی اس کو مٹی میں سیدھا کھڑا کر دیا اور زور سے کہا۔ ”خیال رکھنا، اب یہاں کوئی نہیں آئے گا، تیرے ساتھ میرے سب دوست ہیں۔“

اور واپس دلی آ گیا یہ ساری کارروائی اس نے دن میں کی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کالے اور گندے پیر رات میں طاقتور ہوتے ہیں دن میں وہ سورج کی روشنی میں اندھے ہو جاتے ہیں مگر رولوکا کے کارندے دن اور رات دونوں میں پوری طرح کام کرتے ہیں۔ رات کو ایک دو دفعہ موہن مہاراج کی آواز آئی مگر اس نے جواب نہیں دیا۔

آخر میں وہ بولا۔ ”ارے گاڈ ریگیا بڑا بلوان بنا پھر بتا تھا اب بولتی بند ہے۔“

اب رولوکا کا بولنا ضروری ہو گیا ہے۔ وہ بولا۔ ”میں بولتا کم ہوں کام زیادہ کرتا ہوں۔ تو سچی خورہ ہے بکواس زیادہ کرتا ہے ذرا اپنے بیر منڈل کی تو خبر لے یہاں کیا بکواس کر رہا ہے۔“

”بیر منڈل میں دیوی موجود ہے وہ رکھشا کرتی ہے۔“ وہ ٹپ کر بولا۔

”مگر وہ بھاگ گئی ذرا دیدار تو کر کے آ۔“ رولوکا بولا۔

”ارے جا، تو کیا کرے گا بڑی شکتی ہے وہاں پر

پندہ پر نہیں مار سکتا۔“ وہ غرور سے بولا۔

اور میں ہمیشہ بدلے کی آگ میں جلتا رہا۔ مجھے کچھ نہیں ملا کچھ نہیں ملا، مگر میں کیا کروں اب میں خود بھنس گیا ہوں، یہ گیانی سے بھی زیادہ خطرناک ہے، میرا پیچھا کب چھوڑے گا، میرے گھر میں منڈلی لگائے گا، میں وعدہ کرتا ہوں حکیم سے دشمنی ختم کر دوں گا کبھی اس کا برا نہیں چاہوں گا پر میرا پیچھا اس مہاراج سے کیسے چھوٹے گا۔“ گنگا دھر بولا۔

”بڑا آسان کام ہے، تم ایسا کرو فوراً یا تار کو چل پڑو، یہ تمہارا پیچھا نہیں کرے گا اس کا تو کوئی دھرم ہے ہی نہیں یہ گند ہے اور گندگی میں ہی رہے گا۔“ رولوکا بولا۔

انسان کی سوچ کے رخ کو بدلنا مشکل بھی ہے اور آسان بھی، بعض دفعہ پوری زندگی جو بات سمجھ نہیں آتی وہی بات ایک اشارے میں سمجھ آ جاتی ہے۔ گنگا دھر زندگی بھر حکیم وقار سے بدلہ لینے کی کوشش کرتا رہا ہر طرح ہر مقام پر اپنی سی کی، اتنا آگے بڑھ گیا کہ ہندو مسلم فساد تک ہونے کے اندیشے پیدا ہو گئے مگر شاید رولوکا کی چوٹ بڑے وقت پر پڑی گنگا دھر کے دل کے اندر رولوکا کی بات اثر کر گئی رولوکا میں یہ خوبی بھی تھی کہ اس کی بات بگڑے سے بگڑے آدمی پر اثر کرتی تھی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ کسی کو بھی مشورہ دیتا تھا اس میں خلوص ہوتا تھا سچائی ہوتی تھی اپنے مطلب کی خاطر وہ کسی کو مشورہ نہیں دیتا تھا وہ سانسے والے کے فائدے کی خاطر مشورہ دیتا تھا اور اکثر اس کی بات مان لی جاتی تھی۔ یہی سچائی کی طاقت تھی یہی اس کا انعام تھا وہ اس کو پا کر خوش ہوتا تھا حکیم وقار اور اس کے خیالات کا میل تھا اور ان کی محبت کی بنیاد ہی تھی کہ دونوں ایک طرح سوچتے تھے اور عمل کرتے تھے۔

مہاراج ابھمیرہ ہی گیا تھا اور پھر گاؤں گوہنی چند سے آگے بڑھا مگر یہ کیا میدان، ہموار تھا ایک بھی جھاڑی اور درخت نہیں تھا ٹیکری اور گھپا کا نام نہیں تھا میدان میں گائے اور بکریاں پھرتی تھیں اور آسان پر کالے بادل بارش کی تیاری کر رہے تھے اور کچھ ہی دیر میں تیز بارش ہونے لگی وہ کھڑا رہا۔ اور منہ ہی منہ میں پڑھتا رہا شاید وہ

”تو باتیں ہی کرتا رہے گا اور تیرا یہ گنگا دھر اور اس کے ساتھی تو بھی وہیں پہنچ جائیں گے جہاں پر تیرا میر کنڈل چلا گیا ہے اور ہاں وہاں ذرا دیکھ بھال کر جانا ہاں پر بڑا خطرہ ہے تیرے لئے میں چھپ کر تیری طرح دائر نہیں کرتا سوچ لے۔“

مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ رولوکا سمجھ گیا کہ وہ دوڑ گیا ہے۔ کارندے نے بتایا کہ اب نظر نہ آنے والی دیوار نہیں ہے پندے گنگا دھر کے مکان پر پرواز کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہوا مہاراج ابھمیرہ روانہ ہو گیا۔

اور سویرے سویرے گنگا دھر کے پاس حکیم کامل کے روپ میں صبح ہی پہنچ گیا۔

”آؤ حکیم صاحب کیسے کشت اٹھایا بڑے بھاگ ہیں میرے کہ آپ آئے۔“ گنگا دھر بولا۔

رولوکا نے کہا۔ ”وید جی آدمی ہمیشہ تو دنیا میں رہتا نہیں کچھ ایسا ضرور کرتا ہے اور اس پر کچھ نرمی ہو جائے کچھ نیک کام کرتا ہے دان پن کرتا ہے انسانوں کے کام آتا ہے کچھ نہ کچھ اور پر جواب دینے کی گنجائش پیدا کرتا ہے۔“

”بات تو تمہاری سولہ آنا درست ہے۔“ گنگا دھر بولا۔

”برے کام کرنے والے زیادہ دن برے کام نہیں کر پاتے ان کی رسی تنگ تو ہوتی ہے۔ گیانی تہواڑی کی کہانی تو آپ کو پتہ ہے دو بندروں نے اس کو مار ڈالا بہت بڑا ہشتی والا تھا تم کو پتہ نہیں کہ وہ بندر اس کے اپنے بھرتے اگر بندر ہوتے تو سرکار پکڑ نہ لیتی۔ تم اب پھر اسی پھیر میں پڑ گئے ہمارے رام رام کرو بڑھے آدمی کا کیا بھروسہ کب ہتا زمین پر گر پڑے۔ اس دنیا میں ہزاروں آئے اور چلے گئے زندہ رہی تو نیکی، بدی کو تو مرنا ہی ہوتا ہے اور آگے کیا کہوں۔“ رولوکا کھڑا ہو گیا تو گنگا دھر بولا۔

”تیری بات اندر جاتی ہے میں نے حکیم سے دشمنی کی اس کے خلاف بہت کچھ کیا پر کچھ نہ ہوا۔ وہ اپنی جگہ رہا

کاندھے پر بیٹھ گیا اور اس کی چونچ رولوکا کے کان کے پاس آ گئی۔ رولوکا نے گردن ہلائی جیسے کہہ رہا ہو ٹھیک ہے اور پرندہ آسمان کی طرف پرواز کر گیا۔

اور رولوکا دلی آ گیا۔ حکیم وقار نے پوچھا۔ ”کیا خبر ہے؟“

”بھاگ گیا اس کی آدمی طاقت جو زمین پر تھی ختم ہو گئی اور آدمی کے ذریعے وہ لڑائی نہیں کر سکتا۔ اس لئے فرار ہو گیا ہے مگر اس کھیل میں مجھے بھی حرا آ رہا ہے اس کی فحقی جو بھی ہے اس کا خوب دفاع کر رہی ہے مگر تک ، آنا تو اس کو دلی ہے کیونکہ یہاں پر میں ہوں تم ہو، اس کو تمہارے پیچھے گنگا دھرنے لگایا تھا مگر گنگا دھرا اس کو چھوڑ کر یاترا پر چلا گیا۔ مگر مہاراج کے لئے اب اس کی اتنا کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے گنگا دھر تو الگ ہو گیا، ہو سکتا ہے میرے اور تمہارے بعد وہ اس کی بھی خبر لے۔“ رولوکا بولا۔

☆.....☆.....☆

ایک سال گزر گیا۔ مہاراج موہن کا قصہ یاد پارینہ بن گیا تھا مگر رولوکا کو اس کا انتظار تھا۔ دلی کی گرمیاں شباب پر تھیں بارشوں کی دعائیں ہو رہی تھیں۔ آخر دعائیں رنگ لائیں اور تیز بارش ہونے لگی۔ مطب اپنے وقت پر کھلا ضرور مگر اتنی بارش میں کون آتا۔ کوئی حکیم بھی نہیں آیا یا مگر رولوکا اکیلا اور مطب میں رہائش پذیر ایشاف ہی تھا۔ آسمان پر کالے بادل تھے بجلی بار بار کڑا کر رہی تھی روڈ پر پانی کا ریلہا چل رہا تھا۔ رولوکا مین دروازے کے پاس کھڑا باہر کا نظارہ کر رہا تھا کہ اچانک ایک تانگہ دروازے پر رکا اور اس میں سے ایک بوڑھا اور ایک عورت اترے ان کے اترتے ہی تانگہ ہوا ہو گیا۔ گھوڑے زور سے نہنٹائے اور رولوکا کے کان کھڑے ہو گئے اس نے آسمان کو دیکھا اور آکھ کے کچھ اشارے کئے اور بوڑھے کی طرف بڑھا۔ عورت نے کہا۔ ”میرے پتا کی حالت خراب ہے جلدی سے چیک کر لیں۔“ رولوکا نے بوڑھے کو دیکھا اس کا پورا بدن نیلا ہو رہا تھا نہ ہری لکیں چیز کے استعمال یا بوڑھے خطرناک سانپ کے کاٹنے کے آثار

اپنے پچھڑے لڑاکاؤں کو طلب کر رہا تھا۔ اپنی محنت سے کمائی آتماؤں کو بلارہا تھا اپنی دیوی کالی کی مدد مانگ رہا تھا۔ بارش ہوتی رہی وہ جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا اس کے چاروں طرف پانی جمع ہو رہا تھا۔ پانی بڑھتا گیا وہ سینے تک ڈوب گیا اس کی پرانتھ کالی نے نہیں سنی اس کا کوئی پیر اس کے پاس نہیں آیا پھر وہ مایوسی کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے کھڑے ہونے کے بعد اس کے دماغ میں ایک آواز گونجی۔

”دیکھ لیا تو نے اپنے پیر کنڈل کو اب یہاں سبزہ ہوگا۔ کھتی ہوگی اناج پیدا ہوگا انسان اور جانور اپنی غذا پائیں گے تیرے دماغ میں اب بھی کچھ آیا کہ نہیں۔“

”تو کون ہے؟ جو میرے اندر بول رہا ہے۔“

مہاراج موہن نے سوال کیا۔

”یہی سوال کچھ پہلے بھی تیرے بہت بھولے نے کیا ہے مگر ان کو جواب نہیں ملا۔“

”مگر میں اس سوال کا جواب چاہتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”آواز آئی۔“ تیری ودیا اور تیرے منتر اس کا جواب نہیں دیتے، تیرا کیسا علم ہے کہ تو اندھا ہے، آدمی آدمی جب لکڑی گھماتا ہے تو وہ نہیں دیکھتا کہ کس کا سر پھوٹا تو بھی یہی کر رہا ہے تیرے علم کی جہاں پر انتہا ہوتی ہے، وہیں سے میری ابتدا ہے، میں تیرے سر پر ہوں ہر وقت، تو دنیا کے کسی سرے پر چلا جا میری گرفت میں رہے گا۔“

”زیادہ لمبی مت ہانک تو جس علم سے میرے اندر بول رہا ہے وہ میں بھی جانتا ہوں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، میں جا رہا ہوں پھر آؤں گا روک سکتا ہے تو روک لینا۔“

مہاراج غائب ہو گیا۔ زمین پر جہاں وہ کھڑا تھا وہاں پر صرف ایک نشان رہ گیا۔ اس کے جاتے ہی رولوکا نمودار ہو گیا۔ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”کہاں جائے گا۔“ کچھ دیر وہیں پر کھڑا رہا پھر ایک طرف سے ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا اور اس کے

تھے رولو کا نے بوڑھے کو بستر پر لٹا دیا۔ اور ایک نہایت مجرب دوا بوڑھے کے حلق میں ڈال دی۔ اس کے بعد اس نے پوچھا۔

”کسی سانپ نے کاٹا ہے۔“

”ہاں حکیم صاحب ہمارا مکان محلہ چنٹی قبر کے پاس ہے، ہم لوگ لکڑی اور ایلے جلاتے ہیں۔ بارش کے آثار دیکھ کر میں اور پتاجی ایندھن کو اٹھا رہے تھے کہ ایلو کے اندر سانپ تھا اس نے پتاجی کو ڈس لیا۔“

”کوئی بات نہیں میں نے دوا دی ہے ابھی قے ہوگی اور آدھا زہر باہر آ جائے گا اس کے بعد دوسری دوا دوں گا۔“ رولو کا کی دو گھنٹی کی محنت کے بعد بوڑھے نے آنکھیں کھول دیں۔ بارش کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ بوڑھا اور عورت اندر تھے بارش بند ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

اچانک روڈ پر لگا ہوا بہت پرانا نیم کا درخت جڑ سے اکھڑ گیا اور زمین پر گرا بھی نہیں اور تیزی سے مطب کے دروازے کی طرف آیا بظاہر ایسا لگتا تھا جیسے ہوا اس کو لارہی تھی مگر ایسا نہیں تھا وہ اتنا بھاری درخت تھا کہ اس کو زمین پر گر جانا چاہئے تھا۔ وہ دروازے پر گرنا ہی چاہتا تھا کہ ایک ہوا کا زور دار ریل دروازے کی طرف سے اٹھا اور درخت دور سڑک پر ایک زور دار آواز کے ساتھ گر گیا۔

درخت کے گرنے ہی کچھ غیر مانوس سی آوازیں اس کے نیچے سے ابھریں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ بارش اپنے شباب پر تھی اور بجلی بڑے زور کی چمک رہی تھی۔ لوگ کہتے ہیں اتنی تیز اور خوفناک بارش دلی میں کبھی نہیں ہوتی تھی۔

درخت زمین پر اتنی زور سے گرا تھا کہ اس کی آواز دور دور تک گئی تھی۔ درخت گرنے کے بعد آسمان پر زور کی بجلی کڑکی ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے کئی توپ ایک ساتھ چلا دی گئی ہوں زمین سے آسمان تک ایک روشن تار نظر آنے لگا اور مطب کی حویلی کے اوپر گردش کرنے لگا کڑک اور دھماکے برابر ہو رہے تھے لوگ گھروں میں چھپ گئے تھے اور بارش کا زور اور بڑھ گیا تھا۔ چند منٹ یہ کیفیت رہی اس کے بعد بجلی کی کڑک بند ہو گئی اور گھپ اندھیرا چھا

گیا دن میں رات کا سماں نظر آنے لگا تھا۔

رولو کا دروازے سے باہر آ گیا اور اس نے انگلی سے دائیں طرف اشارہ کیا آسمان پر پھر ایک دفعہ بجلی چمکی اور لمحہ کے بعد ایک کڑک کے ساتھ بند ہو گئی پھر بائیں طرف اشارہ کیا اور اس طرف بھی ایسا ہی ہوا اور بارش کا زور ٹوٹ گیا۔ کالے بادل مغرب کی طرف تیزی سے جانے لگے اور ہوائیں تیز ہو گئیں دس پندرہ منٹ میں آسمان پر کوئی بادل نہیں تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی اور ہوائیں بھی تیز نہیں تھیں زمین پر پانی بڑی تیزی سے ایک طرف جازا تھا۔ ٹوٹا ہوا درخت سڑک پر پڑا تھا اور لوگ حیرت سے اس تناور درخت کو دیکھ رہے تھے۔

لوگوں کی حیرت اس لئے اور زیادہ تھی کہ یہ بارش پوری دلی میں نہیں ہوئی تھی۔ دلی شہر کے لوگوں نے بجلی اور بادل کے گرجنے کی آوازیں ضرور سنیں تھیں لوگ دور دور سے چل کر آ رہے تھے۔ اتنی تیز بارش اور صرف ایک محدود علاقے میں، اتنا تناور درخت بعد جڑ کے اکھڑ کر اتنی دور چلا گیا یہ بھی تعجب کی بات تھی کچھ دیر کے بعد حکیم وقار بھی آ گئے۔ رولو کا اندر ہی تھا بولے۔

”اماں کیا کھیل تماشا شروع ہو گیا ہے۔“

رولو کا نے ہنس کر جواب دیا۔ ”میں تو اسی کے انتظار میں تھا۔“

”تو ہوا کیا، پھر بھاگ گیا۔“ حکیم وقار بولے۔

”بڑی تیزی سے آیا تھا اور بڑا وقف دے کر آیا تھا تاکہ میں دھوکا کھا جاؤں، اس کو اتنی کامیابی ضرور ملی کہ وہ حملہ کرتا رہا اور میں دفاع میں آ گیا میں نے اس پر حملہ نہیں کیا یہ لڑائیاں بھی اسی قسم کی ہوتی ہیں کہ حملہ آور اگر ایک دفعہ زور پکڑ جائے تو صرف اپنا دفاع کرنا پڑتا ہے اور حملہ کرنے کا نہیں سوچا جاتا۔ مگر میں اس صورت میں بھی کچھ کر لیتا مگر میں نے صرف اپنا اور مطب کا دفاع کیا اس طرح حملہ ہیڈ کوارٹر کو برباد کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہیڈ کوارٹر ختم ہونے کے بعد دشمن کی طاقت آدمی رہ جاتی ہے اور دشمن

”یہ میں نے آپ کو سمجھانے کو کہہ دیا ہے ورنہ افریقی زبان میں روتوک کہا جاتا ہے اس کا مطلب ہوتا ہے سوتوں کو اٹھانے کی جگہ۔“ رولوکا بولا۔
 ”یہ تو تم نے اور چکر میں ڈال دیا۔“ حکیم وقار بولے۔

رولوکا ہنس کر بولا۔ ”وہ سوئے لوگ جو سینکڑوں سال پہلے سوئے تھے مگر انہوں نے جو کچھ افریقہ میں حاصل کیا وہ ان کے پاس اب تک موجود ہے اس ہنر اور علم کو وہی حاصل کر سکتا ہے یا ان سے لے سکتا ہے جو ان کی نسل سے ہو اور ان سے کم بھی نہ ہو۔ ان کے پاس بڑے عجیب کرب اور حیرت انگیز چیزیں ہیں جانوروں کی زبان سمجھنے کا ہنر میں نے ان سے ہی لیا تھا۔ میرا دشمن تیری پر ہے تو میں بھی کچھ کروں۔“ رولوکا بولا۔

”اب تم کیا کرنے جا رہے ہو؟“ حکیم وقار نے پوچھا۔

”جہاں پر سال کے بارہ مہینے برف پڑتی ہے درجہ حرارت اتنا کم ہوتا ہے کہ انسان زندہ نہیں رہ سکتا وہاں پر بھی انسان زندہ رہتا اور مصروف عمل رہتا ہے سردی اور برف اس پر اثر نہیں کرتی میرے پاس ایسی دوائیں ہیں جو کہ بچی کا کم کرتی ہیں۔ مگر وہ ایک محدود مدت اور سب کے لئے نہیں ہے بہت کچھ برف میں جم جاتا ہے۔

میرا دشمن جہاں پر ہے وہ علاقہ سخت سرد ہے وہاں پر زندگی کے آثار نہیں ہیں۔ مگر وہ ہے میں بھی وہاں رہتا چاہتا ہوں اسی طرح جس طرح وہ رہتا ہے اس کی تیاری ضروری ہے مجھے نہیں پتہ کہ اس کا علم کیا ہے مگر میں جانتا ہوں کہ کالا ہاری کے روتوک میں مجھے یہ علم مل جائے گا اور اس میں اس کی گھپا کے دروازہ پر بیٹھ سکوں گا۔“

اور رولوکا کالا ہاری روانہ ہو گیا۔

دماغی طور پر اس کا رابطہ حکیم وقار سے ہوتا رہا اور تین مہینے گزر گئے۔

اور پھر اچانک ایک دن رولوکا واپس آ گیا۔ حکیم وقار نے پوچھا۔ ”بہت دن لگا لئے۔“

غلطیاں کرتا جاتا ہے وہ یہی چاہتا تھا مگر وہ کامیاب نہیں ہوا اور پھر ناگنا پر بت کی ایک گھپا میں بند باندھ کر بیٹھ گیا ہے مجھے کچھ اندازہ اس کی طاقت کا ہو رہا ہے اب تک میرا سابقہ جن لوگوں سے پڑا ہے یہ ان سب سے زیادہ چالاک ہے اور اس کے پاس کئی قسم کی ہتھی بھی ہے۔ یہ کسی ایک پر بھروسہ نہیں کر رہا۔ مگر زیادہ چالاک دشمن بھی بڑی بڑی غلطیاں کرتا ہے اس نے بادل جمع کر لئے، بارش کرا دی، ہوا چلا دی، بجلی کڑکا دی، دھماکے کرا دیئے، درخت گرا دیئے، یہ معمولی ہتھی نہیں ہے اس کے لئے اس نے محنت کی ہوگی مگر پھر بھی ایک بھول کر گیا۔“ رولوکا بولا۔

”کیا بھول کر گیا؟“ حکیم وقار نے پوچھا۔
 فوج کو ترتیب سے لڑایا جاتا ہے اگر کسی کے پاس فوج زیادہ ہے اور بے ترتیب ہے تو کم تعداد کی فوج بھی ان پر بھاری ہو جائے گی۔ وہ اس غلطی میں ترتیب قائم نہ کر سکا میں قلعہ بند تھا وہ کھلے میدان میں تھا اس لئے میرا کم نقصان ہوا اور اس کو بھگانا پڑا اب پھر دوبارہ تیاری کے لئے وہ وقت لے گا۔ مگر اب کے میں حملہ آور ہوں گا اور وہ دفاع کرے گا۔ اس کھیل میں ذرا مزہ آنے لگا ہے۔“

”تم بھی حکیم صاحب کھیل تماشے کرنے لگے ہو۔“ حکیم وقار نے مسکرا کر کہا۔

”دشمن نگر کا ہو تو مزا آتا ہے اس نے میرے خلاف اچھی جنگ کی ہے میری امید کے خلاف کئی کارندے زخمی ہوئے ہیں۔ مجھے بھی تیاری کی ضرورت ہے میں سخت حفاظت مطب کی کر دیتا ہوں اور اس کے ٹھکانے پر بھی پہرہ لگا دیتا ہوں اس کے باہر آتے ہی مجھے خبر ہو جائے گی اور میں کچھ دن کے لئے کالا ہاری جا رہا ہوں وہاں پر میرا پاور ہاؤس ہے اور میرا فوجی ہیڈ کوارٹر ہے۔“ رولوکا بولا۔

”فوجی ہیڈ کوارٹر کی تم نے خوب کہی وہ بھی اتنی دور۔“ حکیم وقار بولے۔

”ان بزرگوں کو جگانا آسان نہیں ہے وقت تو لگتا ہے۔“ رولوکا بولا۔

”ہوا کیا یہ تو بتاؤ؟“ حکیم وقار بولے۔

”برف پر رہنا اس پر آگ روشن کرنا اور گھر بنا کر رہنا ممکن ہے لوگ گھپاؤں کے اندر رہتے ہیں مگر میں برف پوش پہاڑ کی چوٹی پر اب زندہ رہ سکتا ہوں اور اسی طرح جس طرح زمین پر ہوں میں نے کہا تھا نا کہ کالا ہاری میرا پاور ہاؤس ہے۔“ رولوکا بولا۔

”موہن کے آنے کے آثار نظر آتے ہیں۔“ حکیم نے پوچھا۔

”اب میں اس کا انتظار یہاں پر نہیں کروں گا اس نے میرے ہیڈ کوارٹر پر حملہ کیا تھا میں اس کے پاس خود جاؤں گا، اب برف اور سردی میرا کچھ نہ کر سکے گی میں اس کو قلعہ بند کروں گا۔“ رولوکا بولا۔

”تم اس سے پہلے خود سے کبھی حملہ آور نہیں ہوئے یہ نئی بات تم میں نظر آرہی ہے۔“ حکیم وقار نے کہا۔

مہاراج موہن جس طاقت کو حاصل کر رہا ہے وہ شیطان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ وہ اس شہر کو چند گھنٹوں میں ختم کرنا چاہتا ہے اب مہاراج کا تعلق براہ راست شیطان سے ہوا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ انسانوں کو جتنی جلدی وہ ختم کر سکے کر دے جو نقصان پہنچا سکتا ہے پہنچا دے اور اپنے گرو شیطان کو خوش کرے۔“

رات کا پتہ نہیں کون سا پھر تھا کہ رولوکا اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا اس کے دماغ میں آواز آرہی تھی۔ ”کیا گھبرا گیا ہم ہیں مہاراج موہن حیرت مت کر، تیاری پکڑ ہم آنے والے ہیں پھر نہ کہنا دھوکے سے حملہ کر دیا۔“

رولوکا ہنس پڑا پھر بولا۔ ”پہلے تو نے دھوکا نہیں کیا ہے؟“

”ارے وہ حملہ کہاں تھا ذرا سا جلوہ دکھایا تھا۔“ مہاراج بولا۔

”تیری کتاب میں تو یہ دھوکا نہیں ہے جھوٹ فریب سب جائز ہے تو کس منہ سے ایسی بات کرتا ہے تیرے گرو

نے تجھے صرف جھوٹ کے اور کیا دیا ہے۔“ رولوکا بولا۔

”بہت بول رہا ہے، سن تیرا بڑے بڑے سوراؤں

سے پالا پڑا ہوگا۔ مگر تو اب بھی کم جانتا ہے پر اسرار دنیا

بہت بڑی ہے آج بھی دنیا میں ایسی جگہیں ہیں جہاں ہر

انسان کی رسائی نہیں ہے وہاں پر کون ہے زمین سے

آسمان تک ان کی عملداری ہے کوئی نہیں جانتا۔ تجھے پتہ

ہے اس مقام پر کیا ہے۔“ مہاراج نے کہا۔

”واہ تیری معلومات، ارے یہ تو ہر آدمی جانتا ہے تو

یہ بتا دے کہ میں کون ہوں۔“ رولوکا بولا۔

”بتا دیں گے ایک دفعہ تجھے اصلی روپ میں دیکھ

پاویں پھر بتائیں گے۔“ وہ بولا۔

”اور تیری یہ حسرت کبھی پوری نہیں ہوگی۔ تجھے پتہ

ہے دنیا میں ایک ایسی طاقت بھی ہے جس کی طاقت کے

آگے ساری قوتیں بیچ ہیں ساری دھرتی کی مہمان خلیاتیں

مل کر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں اس کا ایک اشارہ پوری

کائنات کو روکی کے گالوں کی طرح فضا میں اڑا سکتا ہے تو

کتنا بے وقوف ہے کتنا نادان ہے کہ اس مہمان خلیاتی کو چھوڑ

کر شیطان کا آلہ کار بن گیا ہے تو کیا اور تیرا گرو کیا یہ دنیا

لاکھوں سال سے ہے اور رہے گی تیرے جیسے نہ جانے

کتنے آئے اور دنیا کو ختم کرنے کی حسرت لے کر چلے گئے

انسان پہلے بھی تھا اور آگے بھی رہے گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”بہت بول رہا ہے پہلے تیری کھوج کرنا ہوں تو

کون ہے؟“ مہاراج بولا۔

”ضرور کھوج کر تجھ سے پہلے بھی کئی کر چکے ہیں تو

بھی کر.....“ رولوکا بولا۔

اور رابطہ ختم ہو گیا۔ رولوکا کو اس کی قوت کا کچھ

اندازہ ہوا۔ ٹیلی پیٹھی کا بھی وہ ماہر ہے ایک ایک کر کے

اس کے ہنر اور خفگی سامنے آ رہی تھی۔ رولوکا کے کارندے

دور در کر اس کی پہرہ داری کر رہے تھے اس کے بیروں پر

نظر لگائے تھے درگا اور کالی کے پیر اس کے چاروں طرف

پھرتے تھے۔ ارواح خبیثہ اور پیر بھیرو گویا کالے جادو کے

سازے تھیار اس کے پاس تھے اور وہ اپنے گرو کی دی

کمانڈر کے پکڑے جاتے ہی فوج میں لڑنے کی قوت کم ہوتے ہوئے ختم ہو جاتی ہے رولو کا کے سپاہی آگے آرہے تھے ان کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ کالے جادو کے حیر حکم کے غلام ہوتے ہیں مگر ان کو حکم دینے والا خاموش تھا۔ وہ کم ہو رہے تھے آزاد ہو رہے تھے ان کے پیروں کی بیڑیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ آزادی پاتے ہی وہ بھاگ رہے تھے اور مہاراج بے بسی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا دماغ صاف ہو گیا تھا اس پر لکھے منتر اور اس کے اشلوک مٹ رہے تھے زبان پر تالا پڑا تھا اور آنکھیں کھلی تھیں صرف ایک پہر میں اس کے سارے پیر اور ارواح خبیثہ بھوت پریت بھاگ گئے وہ اکیلا رہ گیا مقابلے کی حسرت لئے خالی ڈھول اور اس کا جسم سردی سے کانپنے لگا۔ سردی روکنے والی ہشتی بھی گلی گئی پھر ایک گونج دار آواز گھما میں گونجی۔

”مہاراج تو نے دیکھ لی اپنی طاقت، تیری مدد کو کون آیا، میں نے کہا تھا نا کہ کائنات بنانے والے کی طاقت کے سامنے کسی کی نہیں چلتی مگر تو آگیا شیطان کے پکر میں اب وہ کہاں ہے، آتا کیوں نہیں تیری مدد کو، وہ نہیں آئے گا تو اسی غار میں برف کی قبر میں دفن ہو جائے گا۔ دیکھ لے میں نے تجھے نہیں مارا تیرے کسی پیر کو نہیں مارا وہ تجھے چھوڑ کر بھاگ گئے میں جا رہا ہوں مگر تو یہیں پر رہے گا۔ تیرے ہاتھ پیر کھلے ہیں مگر دماغ تیری ودیا سے پاک ہو چکا ہے تجھے نئے سرے سے زندہ رہنا ہوگا اور اگر اس برف کے پہاڑ سے اتر کر میدان میں آیا یا تو میں تجھے اتنی رعایت دیتا ہوں تیری موت اور زندگی کی جدوجہد میں رکاوٹ نہیں ڈالوں گا۔“ آواز بند ہوگی مہاراج کے ہاتھ پیر کھل گئے اور وہ دوڑ کر غار کے دروازے پر آ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

☆.....☆.....☆

دنیا کے کاروبار کبھی کسی کے نہ ہونے سے نہیں رکتے قدرت کا نظام ہے قدرت کے نظام میں کبھی رکاوٹ نہیں آتی ایک کے بعد دوسرا آتا ہے، اپنا کام کرتا ہے اور چلا

طاقت کے نشے میں مست ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ حملہ کرنے سے ڈر رہا تھا۔ اس کو اپنے دشمن کی طاقت کا ذرا اندازہ نہیں تھا وہ دشمن کے بارے میں ذرا نہیں جانتا تھا جبکہ دشمن اس کے بارے میں ذرا ذرا رپورٹ رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اتنی طاقت کے ہوتے ہوئے بھی حملہ نہیں کر رہا تھا پہلے حملے کا حشر اس کے سامنے تھا، دھوکے سے اچانک کیا گیا حملہ بھی ناکام ہوا تھا، وہ بہت دور کی سوچ رہا تھا مگر رولو کا اس کے بہت قریب تھا اس کے پہرے داروں کے سامنے تھا۔ اندر باہر کا معائنہ کر رہا تھا اس نے قلعے میں کیا ساز و سامان جنگ رکھا تھا اس کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے پہرے داروں کے مورچوں پر جا رہا تھا مگر اس کو یا اس کے پیر کو ذرا اندازہ نہیں تھا کہ دشمن ان کے پاس موجود ہے۔

ہر جنگ سے پہلے جاسوس دشمن کی طاقت کا اندازہ کرتے ہیں اگر دشمن بھاری ہے تو اس کے مطابق تیاری کرتے ہیں کمزور ہے تو اس کے کمزور پہلوؤں کو پکڑتے ہیں اور پھر جنگ ہوتی ہے رولو کا وہی کر رہا تھا۔ اور پھر ایک دن رولو کا اس گچھا میں داخل ہو گیا جس میں مہاراج موجود تھا۔ اندر مہاراج ایک تخت پر بیٹھا تھا۔ ایک نیم برہنہ ناری اپنے جسم کے کرب دکھا رہی تھی۔ رولو کا جاتے ہی اس نگلی عورت کو زور کا دھکا دیا وہ لڑھک کر دور جا گری۔

مہاراج کڑک کر بولا۔ ”کون ہے تو.....؟“

مہاراج نے منہ میں کچھ پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ اس کا منہ بند ہو گیا۔ اس کے پیر اس کے قریب تھے مگر مہاراج ان کو بلا نہیں سکتا تھا آواز نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے سامنے کوئی نہیں تھا وہ جانتا تھا کہ کوئی ہے مگر وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس کی فوج غار کے باہر کھڑی تھی اور اس فوج کا کمانڈر قیدی ہو گیا تھا۔ بھیرو اس کا غلام کالی اس کی رکھوالی دور کھڑی تھی مہاراج کے قریب کوئی نہیں آ رہا تھا مہاراج کے غرور کا شیشہ ٹوٹ رہا تھا۔ اس کی یہ ترنا کہ وہ اپنے دشمن کو دیکھ لے یہ پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

جاتا ہے۔ انسان سوچتا ہے، ہائے اب کیا ہوگا؟ مگر کچھ دن کے بعد پہلے کو بھول جاتا ہے، حکیم وقار کے مطب کے ملازمین کو کچھ پتہ نہیں کیا ہوا تھا اور کیا ہونے والا تھا؟ حکیم وقار اور رولو کا ہی جانتے تھے اور رولو کا کسی انسان کو مار ڈالنے کا قائل نہیں تھا وہ کہتا تھا۔ ”یہ تو بہت آسان کام ہے مشکل کام یہ ہے کہ راہ سے بھٹکے ہوئے کو راہ راست پر لایا جائے اس کو موقع دیا جائے مگر اس طرح کہ اس کو سزا کا احساس بھی نہ رہے۔“

نئے دواخانے کو قائم ہوئے پانچ سال گزر گئے۔ یہ مطب اتنا مشہور تھا کہ انگریز سرکار کے انگریز بھی علاج کرانے آنے لگے تھے پہلے پہلے وہ سمجھتے تھے کہ یہ کوئی ایسے ہی عطائی سے حکیم ہیں مگر وہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہاں پر نہایت روائی سے انگریزی بولنے والے حکیم موجود ہیں اور وہ حیرت کرتے تھے کہ اتنی جلدی وہ مرض کی جڑ تک پہنچ جاتے تھے اور بڑی آسانی سے علاج کر دیا کرتے تھے۔ اس دواخانے کا پورا عملہ مسلمان تھا یہ لوگ ذات پات اور مذہب کی بنیاد پر علاج نہیں کیا کرتے تھے بلکہ سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک روا رکھتے تھے یہاں تک کہ جو لوگ پوری ادائیگی کرتے وہ اور جو ادائیگی نہیں کرتے تھے سب کو اہمیت برابر دی جاتی تھی اور باہر کے فرد کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون مفت علاج کر رہا ہے۔

حکیم وقار اور حکیم کامل کے بڑے سخت آڈر تھے کہ ہر ایک پر پوری توجہ دی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کے کونے کونے سے مریض آتے تھے اور صحت یاب ہو کر جایا کرتے تھے۔ حکیم وقار اور حکیم کامل کے کمرے برابر تھے مگر صبح کے وقت اکثر ایک ہی کمرے میں دونوں ہوتے تھے۔

ایک صبح حکیم عشرت کے ساتھ ایک بوڑھا مریض کمرے میں داخل ہوا۔ حکیم کامل نے آگے بڑھ کر اس کو سنبھالا اور ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ حکیم عشرت نے کہا۔ ”بڑے صاحب کا میں نے معائنہ کرنا چاہا تھا مگر انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں بڑے حکیم سے معائنہ کراؤں گا تو

میں آپ کے پاس لے آیا ہوں۔“ یہ سن کر حکیم وقار بولے۔ ”آپ نے اچھا کیا؟ آپ جا میں دیکھتا ہوں۔“ حکیم عشرت چلے گئے۔ حکیم وقار نے کرسی مریض کی طرف کی اور کہا۔ ”ہاں بزرگ آپ کو کیا تکلیف ہے؟“ بہت کمزور نظر آنے والا بوڑھا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”تم دونوں میں حکیم وقار کون ہے؟“ حکیم وقار نے کہا۔ ”آپ کے سامنے موجود ہوں میرا نام وقار ہے۔“

”مجھے تم سے اکیلے میں بات کرنی ہے دوسرے صاحب کو باہر بھیج دو۔“ وہ بولا۔ حکیم کامل نے خاموشی سے دروازہ کھولا اور باہر آ گیا مگر باہر آتے ہی روپوشی کی حالت میں دوسرے راستے سے اندر چلا گیا اور پھر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔

بوڑھے نے حکیم وقار سے کہا۔ ”اب تو کوئی اور ٹھکانہ تلاش کر لے، یہ حویلی تجھے چھوڑنا ہوگی، میں بے وجہ جھگڑا نہیں کرتا، جو میری بات مان لیتا ہے اس کو انعام بھی دیتا ہوں۔“

”تمہاری بات میرے سر پر سے گزر گئی ہے۔ صاف صاف بات کرو بڑے میاں۔“ حکیم وقار بولے۔

”میرا نام گوگی ہے میں دس سال سے سندربن کے جنگل میں قپیا کر رہا تھا، میرا شریر ایسا ہو گیا ہے کہ اس پر کوئی بیماری اثر نہیں کرتی، میرے ساتھ میرے ساتھی ہیں وہ اتنے خطرناک ہیں کہ میرے اشارے پر دی شہر کو تباہ کر ڈالیں۔ مگر میں بے وجہ جھگڑا نہیں کرتا۔“ وہ بولا۔

”گوگی جی اب بھی میں کچھ نہیں سمجھا؟“ حکیم وقار بولے۔

”تیرا استھان ہمارا ہے ہم نے سینکڑوں آتماؤں کو یہاں قید کر دیا تھا اس لیے کہ جب ضرورت ہوگی آجائیں گے اور ہم لگ گئے اپنے کام میں اور تو نے نہ معلوم کس طرح ان کو آزاد کر دیا اور مالک بن کر بیٹھ گیا یہ حویلی اور

زمین ہمارے پرکھوں کی یادگار ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں میرے بزرگ وزیر تھے انہوں نے اس کو بڑے پیار سے بنوایا تھا، تو نہیں جانتا اس حویلی میں کیا کیا خوبی ہے؟“ گوگی بولا۔

”آپ بتائیں کیا خوبی ہے؟“ حکیم وقار نے پوچھا۔

طور پر خریداہے۔“ حکیم صاحب بولے۔

”میں کسی قانون کا پابند نہیں ہوں تجھ کو بتانے آیا ہوں میرا ٹھکانہ دلی میں کہیں نہیں ہے۔ تجھ کو یہ حویلی خالی کرنی ہے مجھے اس کی ضرورت ہے میرا کام سندربن میں ختم ہو چکا ہے۔“ وہ بولا۔

”گوگی جی کیا آپ مجھ سے زبردستی کر کے یہ حویلی حاصل کرو گے۔“ حکیم صاحب بولے۔

”میری چیز ہے تو لوں گا۔“ وہ بولا۔

”مگر میں نے تو خریدی ہے ایک بھاری رقم گوہر دھن کو ادا کر کے میری رقم کا کیا ہوگا؟“ حکیم صاحب بولے۔

”تم جانو اور گوہر دھن جانے، میرا اس سے کیا واسطہ تم نے بتاؤ کہ میں اب کب آؤں؟“ وہ بولا۔

”ابھی میں آپ کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ حکیم صاحب بولے۔

”میری بات غور سے سن لے! تیری یہ حکیم کی دکان ایک دن میں بند کر دوں گا۔ کسی دھوکے میں مت رہنا، تو نے میرے پرکھوں کی آتماؤں کو اگر بھگا دیا تو یہ مت سمجھنا کہ تو نے بڑا کام کر دیا ہے، چلا ہے دوسروں کے مال پر اترنے، میں کوئی آتما نہیں ہوں مگر سن لے یہ شریر جو تو دیکھ رہا ہے یہ بھی میرا نہیں ہے میں کسی شریر کا محتاج نہیں ہوں ضرورت کے مطابق شریر کا لباس پہن لیتا ہوں۔ چند روز دیتا ہوں، زیادہ وقت میرے پاس نہیں ہے۔“

اور گوگی دروازے سے برق رفتاری سے چلا گیا تو رولو کا نمودار ہو گیا۔

حکیم وقار بولے۔ ”سن لی پوری کہانی.....“

”اس حویلی کی نہ جانے کتنی کہانیاں سامنے آنے والی ہیں۔“ رولو کا بولا۔

”اب اس نئی مصیبت کا کیا کریں؟ آدی تو خطرناک نظر آتا ہے۔“ حکیم وقار بولے۔

”ہمارا کام ہی خطرناک لوگوں کے ساتھ ہے یہی کرتے آئے ہیں آپ فکر نہ کریں“ رولو کا بولا۔

اس حویلی کے کئی دروازے ہیں ایک دروازہ لال قلعہ میں کھلتا ہے، ایک دروازہ آگرہ کے قلعے میں کھلتا ہے، وہ راستے استے بڑے اور صاف ہیں کہ گھوڑے پرسفر ہو سکتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے خود حکم دے کر ایسا بنوایا تھا مگر حالات کچھ ایسے بگڑے کہ بہادر شاہ ان راستوں کو استعمال ہی نہ کر سکا اور گرفتار ہو گیا۔ اس کے ساتھ میرے بڑے بھی مارے گئے حویلی کے سارے لوگ مارے گئے مگر ان کی آتماؤں کو میرے ایک گرو نے حویلی سے جانے نہیں دیا۔ میں جب بڑا ہوا تو وہ میرے پاس آ گئے اور میری سکھشا کی۔ غم سن کر حیران ہو گئے کہ میرے گرو سوسال پہلے قتل ہوئے تھے اور انہوں نے میری سکھشا کی اور اپنا سب کچھ سونپ کر چلے گئے۔ ان کے ذریعہ اس حویلی میں قید آتماں میرے حصے میں آئیں۔“ گوگی

ذرا کا تو حکیم وقار بولے۔

”ان صاحب کو ان آتماؤں کو قید کرنے کی ضرورت کیا تھی؟“

”ضرورت تھی، پہلی ضرورت تو یہ تھی کہ اس حویلی کو قابو کرنا تھا، دوسری بات یہ تھی کہ ان آتماؤں سے کچھ معلومات لینی تھیں اس زمانے کے حالات اور اپنے دشمنوں کے بارے میں پتہ کرنا تھا۔“ گوگی بولا۔

”جو دشمن تھا وہ تو انگریز تھا اور وہ تو ہر روز بدلتا رہتا تھا اس کا پتہ کر کے کیا ملتا؟“ حکیم صاحب بولے۔

”بات تیری درست ہے مگر ان آتماؤں کو رکھنا تو تھا یادگاری کے طور پر ہی سہی.....“ وہ بولا۔

”اب تو یہ حویلی میری ہے میں نے اس کو قانونی

”مجھے تم پر بھروسہ ہے میں ذرا بھی فکر مند نہیں ہوں۔“ حکیم وقار بولے۔

”وہ کہتا ہے میرا ٹھکانہ دلی میں نہیں ہے مگر مجھے اس کی یہ بات درست نہیں لگتی۔“ رولو کا بولا۔

”کیوں اس کی وجہ تمہارے نزدیک کیا ہے؟“

”اگر وہ دلی میں نہیں رہتا تو پھر دلی کے حالات خاص طور پر آپ کے حالات کے لیے اس نے اپنا کوئی جاسوس ضرور چھوڑا ہوگا۔ سندربن میں دس سال گزارنے والا اور تپیا کرنے والا اچانک دلی کیوں آ رہا ہے؟ اس کے آنے کی وجہ صرف حویلی کی آتما نئیں نہیں ہیں اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہے۔“ رولو کا بولا۔

”تم نے جو اندازے لگائے ہیں تمہارے پاس اس کی ضرورت کوئی ٹھوس وجوہات بھی ہوں گی۔ تم یہ بتاؤ وقت کم ہے تم کیا کرنے والے ہو؟“

”میں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے، میرا جاسوس اس کے ساتھ لگا ہوا ہے شام تک پتہ چل جائے گا کہ وہ کہاں سے آیا تھا؟“ رولو کا بولا۔

”واہ! حکیم کامل تمہارا ہر کام مکمل ہوتا ہے۔“ حکیم وقار بولے۔

”حکیم صاحب پر اسرار دنیا کے قاعدے قانون آپ کے قاعدے قانون سے الگ ہوتے ہیں۔ ہر بیماری کے لیے ایک ہی دوا دی نہیں جاتی۔ بیماری کی نوعیت دیکھی جاتی ہے اسی طرح سحر کا علاج بھی سحر ہی ہے جو وقت پر ٹھیک فیصلہ کرتا ہے وہی کامیاب ہوتا ہے، یہاں پر ذرا سی مہلت بھی نہیں دی جاتی اس لیے کہ ذرا سی مہلت بھی موت بن جاتی ہے۔ یہ ایسا علم ہے کہ اس کے اندر جانے والا چلتا جائے سفر ختم نہیں ہوتا، ہر علاقے کا الگ الگ سحر ہے اس کی طاقت بھی نرمالی اور الگ ہے اس کو سمجھنا، وہاں کے حالات کے مطابق اپنا دفاع کرنا پہلے ضروری ہے، جو لوگ اپنا دفاع مضبوط کرنے کے بجائے حملہ کرنے کی سوچتے ہیں اکثر مار کھا جاتے ہیں، پہلے خود اپنا گھر مضبوط کرنا چاہئے اور پھر

آگے قدم رکھنا چاہئے یہ لڑائی کا بڑا بنیادی اصول ہے، اب کے ہمارے سامنے جو ہے وہ جنگل سے آیا ہے۔

ظاہر ہے اس کی طاقت میں بنیادی عنصر جنگل کا ہوگا اس کے موکل پائیہ جو ہوں گے وہ بھی جنگلی مزاج کے ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس نے اس سے آگے جانوروں پر بھی کچھ اثرات ڈالے ہوں، جنگل کے اندر اکیلے رہنا جہاں پر طاقت کا قانون چلتا ہے اتنا آسان نہیں ہوتا کیونکہ مداخلت ہونے پر ساری محنت رائیگاں چلی جاتی ہے۔“

”تم درست خطوط پر سوچ رہے ہو۔“ حکیم وقار بولے۔

شام کو رولو کا نے بتایا۔ ”گوگی نے درست بتایا تھا وہ سیدھا بنگال گیا تھا اور وہاں سے سندربن کے اندر چلا گیا تھا۔“

”اتنا لمبا سفر کر کے وہ آیا تھا۔“ حکیم وقار بولے۔

”میں نے آپ کو بتایا تاکہ پر اسرار دنیا کے سفر کرنے کے ذرائع الگ ہوتے ہیں۔ ان کے فاصلے اہمیت نہیں رکھتے گوگی روز آ سکتا ہے۔“ رولو کا بولا۔

ایک ماہ کے بعد گوگی پھر موجود تھا۔ آتے ہی بولا۔

”تو نے کیا سونچا حکیم، کب خالی کر رہا ہے؟“

”ابھی تو میرا ارادہ نہیں ہے۔“ حکیم وقار نے اعتماد سے کہا۔

”اپنی بنیائی عزت کا خیال کر حکیم، ایک دن میں ملیا میٹ کر دوں گا، غور سے سن لے۔“ وہ بولا۔

”گوگی تو نے میرے متعلق غلط اندازے لگائے ہیں میں جانتا ہوں تو بنگال سے آتا ہے مگر سن لے میں جو نظر آتا ہوں وہ نہیں، تیری آنکھیں اور تیری وڈیا تجھے دھوکا دے رہی ہے، پھر سے غور کر اور دیکھ تو نے مجھے لڈو سمجھ لیا ہے جو اٹھا کر منہ میں رکھ لے گا۔ سن لے یہ حویلی میری ہے تو لے سکتا ہے تو لے لینا۔“ حکیم وقار بولے۔

”اوہو! بڑی تیزی آ گئی ہے، کس نے جانی بھری ہے ذرا یہ تو بتا۔“ گوگی بولا۔

”میں خدا پر بھروسہ کرتا ہوں۔“ حکیم وقار بولے۔
 ”دین دھرم کی باتیں تو کرنا نہیں میں کسی دھرم کو
 نہیں مانتا یہ سب ڈھکوسلے ہوتے ہیں۔ میرا وچن ہے کہ
 یہ حوبلی کیا ہے، اس سے دونی حوبلی میں تجھے دوں گا، اس
 کے ساتھ جو کہے گا وہ بھی دوں گا۔ یہ حوبلی میری آن
 کا مسئلہ ہے اس کے بدلے جو جو مانگے گا میں دوں گا، میں
 کرو کی قسم کھا کر کہتا ہوں اور وچن دیتا ہوں کہ جو طلب
 کرے گا، میں دوں گا یہ حوبلی مجھے چاہئے ہر طرح چاہئے
 ۔ تجھے نہیں پتہ کہ میرے لیے یہ کیوں ضروری ہے؟“
 ”چل یہ بھی بتادے کہ کیوں ضروری ہے؟“

”میں ہرگز نہ بتاتا مگر تجھے بتانے میں کوئی حرج
 نہیں ہے۔ کیونکہ میری ودیا بتاتی ہے کہ تیرے پاس صرف
 حکمت ہے اور کچھ نہیں۔ حکمت سے مجھے کوئی ڈر نہیں ہے تو
 اگر کچھ کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔ تجھے نہیں پتہ کہ
 کہاں سے آتا ہے اور کہاں چلا جاتا ہے؟ آنے والے کو
 ہندو کہہ، سکھ کہہ، مسلمان کہہ یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں
 اصل تو کم لوگ جانتے ہیں۔ جو جانتے ہیں وہ کسی کو بتاتے
 نہیں، تو سن! اس سرنگ کے راستے میں ایک مہاراش کی
 لاش پڑی ہے اور وہ میرا انتظار کر رہی ہے اس نے کہہ دیا
 ہے کہ اس نسل میں مجھے پیدا ہونا ہے اور مجھے اس کی لاش
 حاصل کرنی ہے وہ مہاراش پھر سے اس دنیا میں آئے گا
 اور اس کے واپس لانے کا کارن میں ہوں گا۔ وہ آنے
 کے بعد دوبارہ راج کرے گا اور اپنے دشمنوں سے بدلہ لے
 گا۔ اب تو سمجھ گیا ہوگا میرا اس حوبلی کو حاصل کرنا کیوں
 ضروری ہے؟ اس مہاراش کی لاش کے قریب جانا اور
 حاصل کرنا آسان نہیں ہے، مجھے تیاری کرنی ہے اور وہ
 تیاری یہاں کرنی ہے۔ سندر بن کی تیاری میں کر کے آیا
 ہوں، میرے پاس جو کچھ ہے اس کے بارے میں تو نے
 کبھی نہیں سنا ہوگا اور نہ دیکھا ہوگا، میری ایک آواز پر
 درندے اس شہر پر ٹوٹ پڑیں گے اور اس کے علاوہ بھی نہ
 جانے کیسی کیسی آفتیں تیرے اوپر آ سکتی ہیں مگر تیرا میرا
 جھگڑا نہیں ہے۔ میں تجھے اس سے اچھی حوبلی دے سکتا

ہوں، میری آن اور میری شان بننے والی ہے۔ یہ حوبلی
 میں کسی بھی حالت میں ہوا اس کو حاصل تو کروں گا۔“ اور یہ
 کہنے کے بعد وہ چلا گیا۔

رولوکا نمودار ہوا۔ ”واہ حکیم صاحب آپ نے اس
 کی ہند گھڑی کو خوب کھولا۔ ہندوستان میں شاید یہ اکیلا ہے
 جو جانوروں پر قابو کر سکا ہے اور جس لاش کا ذکر کر رہا ہے
 وہ ضرور ہوگی کیونکہ پراسرار دنیا میں ایسا ہوتا ہے۔“

”یاریہ گورکھ دھندہ میرے توپلے پڑنا نہیں۔“ حکیم
 وقار بولے۔

”مگر آپ نے اچھا کام کیا ہے اگر آپ کی جگہ میں
 ہوتا تو وہ ہرگز نہیں کھلتا اس نے آپ کا ناپ تول کیا اور
 جب دیکھا کہ آپ کے اندر کچھ نہیں ہے، تو وہ بے فکر ہو کر
 کھل گیا۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ ناپ تول کا کتنا پکا ہے
 اس کی ودیا نے اس کو ٹھیک بتایا تھا۔ آدمی تیز لگتا ہے اور
 بے وجہ جھگڑا کرنے کا بھی شوقین نہیں ہے مگر غرضی بھی ہے
 ۔ ایسا آدمی خطرناک ہوتا ہے اس نے کہا تھا کہ لاش زندہ
 ہوگی اور دوبارہ راج کرے گی اور دشمنوں سے انتقام لے گی
 مگر دشمنوں میں کون لوگ ہوں گے یہ نہیں بتایا۔ اس بے
 وقوف کو پتا نہیں کہ سو ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے بعد اس
 کا کون سا دشمن زندہ ہوگا اگر اس کا اشارہ ان کی نسل کی
 طرف ہے تو زیادہ خطرناک بات ہے۔“ رولوکا بولا۔

”تم نے بہت دور تک کی سوچ لی ہے۔“ حکیم وقار
 بولے۔

”حکیم صاحب اس کیس میں آپ پیش منظر
 میں اور میں پس منظر میں رہوں گا۔“ رولوکا بولا۔
 ”تم جہاں رکھو گے رہیں گے، ہم تو تمہارے ساتھ
 ہیں۔“ حکیم وقار بولے۔

”اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی توجہ آپ پر
 ہوگی آپ کو دیکھنے کا پرکھے گا آپ کا ڈیفنس اس کو اس چکر
 میں ڈالے گا اور وہ اس کی طاقت کو تلاش کرے گا جو آپ کا
 ڈیفنس کرتی ہے مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوگا کیونکہ
 میں نے سمجھ لیا ہے اس کی نظریں انسان کے اندر تو دیکھ لیتی

ہیں مگر جو سامنے نظر نہ آئے اس کو وہ نہیں دیکھ پاتیں۔ لیکن اس نے ہشتی کچھ زیادہ حاصل کر لی ہے میرے اندازے سے زیادہ مگر پھر بھی بہت کچھ حاصل نہیں کیا شاید اس کے پاس وقت نہ ہو، لاش کے زندہ کرنے کا وقت قریب ہو اور وہ کچھ کام ادھورے چھوڑ کر وقت سے پہلے انسانوں میں آ گیا ہو مگر پھر بھی میں کہوں گا کہ بہت کچھ لے کر آیا ہے۔ جانوروں پر حکومت کرنے کا علم بہت بڑا علم ہے۔“ رولو کا بولا۔

”اب وہ پھر آئے گا۔“ حکیم وقار بولے۔

”میں نے نئے طرز کے چہرے رکھے ہیں جن کو اس کی ویدیا تلاش کرنا چاہے تو بھی تلاش نہیں کر سکتی۔“ رولو کا بولا۔

”مثلاً ذرا بتاؤ تو.....“ حکیم صاحب بولے۔

”آپ نے چھت کی کڑی میں یہ پیلی برکا چھتا کبھی دیکھا تھا۔“ رولو کا نے چھتا دیکھ کر کہا۔

”نہیں نیی چیز ہے“ حکیم صاحب بولے۔

”اس چھتے میں کئی سو برہیں۔ ہر ایک طاقت ہے

اس کا زہر اتنا خطرناک ہے کہ بڑے سے بڑا جانور ہلاک ہو سکتا ہے اور کسی طرح دیکھا جائے تو یہ برہی نظر آئے گی کوئی خصوصی چیز نظر نہیں آئے گی، مگر یہ خصوصی چیزوں یعنی بیر وغیرہ کو بھی کاٹ لے تو اس کو بھی بے کار کر دے گی یہ ہے اس کی خصوصی بات مگر بڑے سے بڑے جادو کا ماہر، اس کو معمولی برہی کہے گا۔“ رولو کا نے تفصیل بتائی۔

”واہ بہت خوب.....“ حکیم وقار نے کہا۔

”اسی طرح کے اور بھی انتظامات کئے ہیں ہیڈ

کوآرڈر مضبوط ہو تو لڑنے میں مزا آتا ہے۔ میں نے جس کو کبھی نہیں بلایا تھا وہ بھی کالا ہاری چھوڑ کر میرے پاس آنے کو تیار ہیں کیوں کہ یہ حویلی اگر گوگی کی آن کا مسئلہ ہے تو ہمارے لیے بھی اب آن کا مسئلہ بن گئی ہے“ رولو کا بولا۔

”تمہارے خیال میں معاملہ سنگین ہے۔“ حکیم

صاحب بولے۔

”اگر لاش کا معاملہ نہ ہوتا تو شاید میں سنگین خیال نہ کرتا مگر جادو کی دنیا بڑی پر اسرار ہے کیونکہ اس کا سربراہ شیطان خود ہے وہ انسان کو ایسے چکر دے کر اور طاقت دے کر قابو کر کے رکھتا ہے کہ آدمی خود کو زمین کا مالک خیال کرنے لگتا ہے وہ لاش ضرور ہوگی اور اس کے بارے میں شیطان نے گوگی کے کان میں یہ بات ڈالی ہوگی۔ وہ لاش تیرے کسی بزرگ کی ہے وہ لاش زندہ ضرور ہوگی تجھے اس کو حاصل کرنا ہے اور پھر تیرا راج ہوگا۔ گوگی پوری طرح اس کی گرفت میں ہے وہ ایڑی چوٹی کا زور اس حویلی کو حاصل کرنے میں لگائے گا اور پھر اپنی منڈی بنا کر ایک نئی طاقت لے کر سرنگ میں اترے گا۔ یہ حویلی اس کا پہلا قدم ہے اور میں اس کے پہلے قدم کو اٹھنے نہیں دوں گا۔“ رولو کا نے بتایا۔

حویلی کے ہر کمرے میں کچھ نہ کچھ نیا ضرور تھا مگر حکیم صاحب نے سب کو کھد دیا تھا وہ اپنا کام کریں کسی نئی چیز پر غور نہ کریں حویلی کی دیوار پر کبوتر بھی زیادہ آنے لگے تھے مریض روزانہ آ رہے تھے کام حسب معمول ہو رہا تھا۔ ایک دن ایک مریض کو ایک برہنے ڈنک مار دیا اس کی حالت خراب ہو گئی۔ رولو کا اس کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ مریض سخت تکلیف میں تھا، رولو کا نے کچھ نہیں کیا اور پوچھا۔

”تو کون ہے!“ وہ کچھ نہ بولا تو رولو کا پھر بولا۔ ”تو

ابھی پانی بن کر گندے نالے میں بہہ جائے گا پھر کبھی اپنی اصلی حالت میں نہیں آئے گا بتا کون ہے؟“

”میں گوپی پور نیا کا داس ہوں اس کے کہنے پر سن گن لینے آیا تھا مریض بن کر۔“ وہ بولا۔

”اب تو ٹھیک تو نہیں سکتا میرے پاس تیرا علاج نہیں ہے جا بھاگ جا پور نیا سے کہہ دینا حکیم وقار کے پاس علاج نہیں ہے۔“ رولو کا بولا۔ وہ مطب سے نکل کر غائب ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد رولو کا بولا۔ ”آپ کا نام اس لئے آگے رکھا کہ میں تو ہوں ہی نہیں، میں گوگی سے

بھی دور رہوں گا اگر اس کے پاس گیا تو روپوشی میں ہی جاؤں گا۔“

”اس دفعہ تمہاری چالیں نئی اور زراعی نہیں ہیں؟“

حکیم وقار بولے۔
”اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دفعہ براہ راست آپ کو نشانہ بنایا گیا ہے مطب کو نشانہ بنایا گیا ہے مجھے۔ مطب عزیز ہے اور اس سے زیادہ آپ عزیز ہیں، میں ذرا سا سوراخ بھی کھلا چھوڑ نہیں سکتا، آپ نے دیکھا کہ ایک کالی بھیڑ روپ بدل کر آئی تھی اس کو نہیں چھوڑا گیا۔“ رولوکا بولا۔

”ہاں یہ تعجب کی بات ہے کہ کسی کو کسی برنے کبھی ڈنک نہیں مارا اور مارا تو دشمن کو مارا، میرے لیے تو یہ بڑی حیرت کی بات ہے۔“

”افریقہ اور یہاں کہ کارندوں میں یہی فرق ہے..... افریقہ والے خود فیصلہ کرتے ہیں اور عمل کرتے ہیں اور یہاں کے حکم کا انتظار کرتے ہیں۔“ رولوکا بولا۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہاری مثال کے خلاف کچھ کر گزریں۔“ حکیم وقار بولے۔

”ایسا ہو سکتا ہے مگر وہ بھی میرے مفاد میں ہوگا میرا اور میرے کارندوں کا ایک ذہنی رابطہ ہوتا ہے، میں ہزاروں میل دور ہوں جب بھی یہ میرے رابطے میں رہتے ہیں۔“ حکیم صاحب یہ بڑی پیچیدہ اور پراسرار دنیا ہے اس دنیا میں رہنے والے اس کی پابندی کرتے ہیں۔ افریقہ میں اور امیزون کا لاہاری کے جنگلات کے حامل میں اور یہاں کے کالے جادو کرنے والوں میں بڑا فرق ہے۔ کوئی نیا افریقی حامل شاید انڈیا میں اپنے علم کے پورے پورے نتائج حاصل نہ کر سکے کیونکہ اس کے لیے ماحول بدل جائے گا، لوگ بدل جائیں گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے یہاں کے ماحول کو سمجھے یہاں کے لوگوں کے دماغوں کو پڑھے ایکدم وہ کچھ نہیں کر سکتا اسی طرح انڈیا کا کالا جادو اور اس کے نہایت طاقتور بیر افریقہ کے ماحول میں پورا کام نہیں کر سکیں۔ آپ نے دیکھا کہ میں

نے شروع شروع میں خود کو بچا کر کام کیا اور پوری طرح اپنی طاقت کو بروئے کار نہیں لایا صرف اپنا کام چلایا مگر اب میں یہاں کے جادو اور جادو گروں کے داؤ پیچ اور ان کے بارے میں جانتا ہوں، کون سا بیر کیا کر سکتا ہے؟ اور کیا نہیں کر سکتا؟ کہاں پر اس کی حد ختم ہوتی ہے؟ اور اس کا کمزور پہلو کیا ہے؟ اس طرح کے جادو گروں کی طاقت کا ذریعہ کیا ہے؟ وہ کہاں کہاں جاسکتا ہے؟ اور کس کس سے طاقت حاصل کر سکتا ہے؟ مگر ہر مقام پر اس کے نام بدل جاتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں یہ طاقت فلاں کی ہے، یہ فلاں کی ہے۔ ناکام ہونے کی صورت میں یہ اس سے خفا ہوتے ہیں۔ باقی سب کو کچھ نہیں کہتے۔ یہ گورکھ دھندہ شیطان نے ہزاروں سال سے پھیلایا ہوا ہے۔“ رولوکا بولا۔

”حویلی کی تو تم نے حفاظت کر لی اب کیا ارادہ ہے؟“ حکیم صاحب بولے۔

”میں اس لاش کا پتہ چلاؤں گا جو یکڑوں سال سے پڑی ہے اور جس کے حصول کی خاطر گوگی اس حویلی کو حاصل کرنا چاہتا ہے، رولوکا بولا۔

”تم اس کا کیا کر گے؟“ حکیم صاحب بولے۔

”میں اس کو کالاہاری لے جاؤں گا شاید اس میں کچھ ایسا ہو جو میرے کام آ سکے۔“ رولوکا بولا۔

”کیا یہ کام خطرناک نہ ہوگا؟“ حکیم وقار بولے۔

”ہو سکتا ہے مگر ضروری اس لیے ہے کہ گوگی نے اس کو حاصل کرنے کے لیے یکڑوں سال انتظار کیا ہے، ضرور اس میں کوئی خاص بات تو ہے۔“ رولوکا بولا۔

”تو یہ کام کب شروع کرو گے۔“ حکیم وقار بولے۔

”آج رات کو میں اس سرنگ کا دروازہ تلاش کروں گا۔“ رولوکا نے کہا۔

رات کو رولوکا اپنے کام پر نکل پڑا اور میدان کے کنوئیں کی منڈیر پر آ گیا۔ کنواں بالکل خشک تھا اور پھر کنوئیں کے اندر داخل ہو گیا۔ کنواں بہت گہرا تھا مگر رولوکا

پورا جسم ایک سرخ چادر میں ڈھکا ہوا تھا اور یہ چادر ہلکی ہوتی محسوس ہوتی تھی۔

لاش کی آنکھیں کھلی تھیں اور ان میں زندگی کے آثار نظر آتے تھے۔ رولوکانے چادر ہٹانے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ چادر میں اور زیادہ ہلچل پیدا ہو گئی، اب رولوکانے غور سے اس چادر کو دیکھا تو اسے یقین نہیں آیا، یہ چادر نہیں تھی بلکہ سرخ رنگ کے چوہنیوں جیسے کپڑے تھے جن کے رنگ لال تھے سوائے آنکھوں کے پورے بدن پر وہ گردش کر رہے تھے۔

رولوکانے ہاتھ اوپر کر لیا اور تابوت کے چاروں طرف چکر لگایا۔ تابوت میں پینڈے کی طرف دو سوراخ تھے ایک سوراخ سے یہ چیونٹی نکلیں گے باہر آ رہے تھے اور ایک لائن میں کہیں چارہ تھے جبکہ دوسری طرف سے دوسری لائن اندر جا رہی تھی۔ ان کیڑوں کی رفتار ایک جیسی تھی جتنے باہر آتے تھے اتنے ہی اندر جاتے تھے، ان کا نظم و ضبط میکا کی تھا، اور حیرت انگیز بھی تھا۔

کیڑوں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ پورے ہال میں خاموشی تھی، وہ پھر تابوت میں جھانکنے لگا، لاش کی پر اسرار آنکھیں اپنے اندر ہزار دستانیں چھپائے رولوکا کو دیکھ رہی تھیں ان آنکھوں میں زندگی تھی مگر جسم پر ہزاروں چیونٹیاں حرکت کر رہی تھیں، ان چیونٹیوں کے پردے میں اس کا جسم کیا تھا؟ آنکھیں اس کو مرد کہتی تھیں مگر آنکھوں سے کسی کو مرد یا عورت ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ پھر رولوکانے تابوت کا ڈھکن آہستہ سے گرا دیا اور تابوت سے جانی چیونٹیوں کی لائن کی طرف چلا۔ یہ چیونٹیاں ایک قطار میں دائیں طرف کے راستے پر جا رہی تھیں، وہ سرنگ بھی اندھیری تھی، چند قدم کے بعد اندھیرا چھا گیا مگر یہ کیا اندھیرا ہوتے ہی چیونٹیاں روشنی دینے لگیں اور کم از کم اتنی روشنی تو ہو گئی کہ ان کی قطار صاف نظر آنے لگی۔

رولوکا اس قطار کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا، نہ معلوم کتنا وقت گزر گیا۔ قطار اتنی ہی رہی اور ان کی رفتار بھی واپس آنے والی چیونٹیوں کے برابر تھی شاید پورا دن گزر

اس طرح اتر رہا تھا جیسے بیڑیوں سے کوئی اترتا ہے۔ کتواں ختم ہوا اور اس کے جسم سے ہوا کا جھونکا نکل گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کتواں دراصل سرنگ کا راستہ ہے، ایک طرف دروازہ لگا ہوا تھا۔

رولوکانے اس پر زور ڈالا اور دروازہ چرچاتا ہوا کھل گیا وہ اس دروازے میں داخل ہو گیا اندر گھپ اندھیرا تھا رولوکا آگے چلنے لگا، یہ اندازہ کرنا کہ وہ حویلی کی کس طرف سفر کر رہا ہے مشکل تھا مگر وہ چٹا گیا شاید پورا دن گزر گیا اندرون اور رات کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

اب سرنگ میں کہیں کہیں ڈراسی روشنی ہو جاتی تھی وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ روشنی کسی چراغ کی یا سورج کی نہیں تھی بلکہ سرنگ کی دیوار میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پتھر لگے ہوئے تھے اور وہ اندھیرے میں روشنی دے رہے تھے ایک دوزمین پر بھی بڑے چمک رہے تھے۔ وہ اور آگے چلا اب سرنگ اور کشادہ ہو گئی تھی اور

پھر وہ ایک بڑے ہال نما کمرے میں پہنچا۔ اس کمرے کی چھت بہت اونچی تھی اور گول تھی اس میں بڑے بڑے سوراخ تھے اور ان میں سے روشنی آ رہی تھی۔ ہال میں خوب روشنی تھی، اس گول کمرے کے ٹین اور راستے تھے ایک وہ تھا جس کے ذریعے وہ آیا تھا تین راستوں پر اندھیرا تھا اور درمیان میں ایک اونچا چوڑا بنا ہوا تھا اس پر ایک بڑا سا لکڑی کا تابوت رکھا تھا۔ یہ ہال نہایت ہی بھیاںک نظر آ رہا تھا۔ ایسی ویرانی اور محسوس برس رہی تھی کہ عام آدمی کا اس میں زندہ رہنا مشکل تھا۔ رولوکا تنہا تھا مگر وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ تنہا نہیں ہے اس کے سامنے ہی تابوت رکھا تھا اور وہ سمجھ گیا تھا کہ اس میں ہی وہ لاش ہوگی۔ سرسراہٹوں کی ایک معمولی سی آواز آ رہی تھی مگر وہ اب تک ان سرسراہٹوں کی وجہ نہیں سمجھ سکا تھا، وہ آہستہ آہستہ اس تابوت کے قریب پہنچ گیا اور اس نے تابوت کے کٹڑے کو پکڑ کر ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا دیا۔ ڈھکن بہت بھاری تھا۔ تابوت کے کنارے بہت اونچے تھے، تابوت میں ایک لاش نظر آ رہی تھی یہ انسانی لاش تھی مگر یہ کیا اس کا

پھول کھلے ہوئے تھے۔ وہ پانی سے باہر آ گیا تب اس کی نظر اپنے جسم پر پڑی تو وہ حیران رہ گیا اس کا پورا جسم سنہرا ہو گیا تھا۔ سونے کے باریک باریک ذرات اس کے جسم پر چپکے ہوئے تھے کنارے کی جھاڑی کے قریب گیا اور ہاتھ بڑھا کر ایک پھول توڑ لیا مگر یہ کیا اس جھاڑی پر بے شمار وہی چھوئیاں ان پھولوں کا رس چوس رہی تھیں۔

ہر جھاڑی پر اس نے یہی دیکھا۔ ایک قطار ان جھاڑیوں کی دور تک چلی گئی تھی۔ آخری سرے پر چھوئیاں اسی رفتار اور اسی نظم و ضبط کے ساتھ سفر کرتی نظر آئیں اب وہ ان کے ساتھ چلا اور چلتا ہی رہا ان کا سفر آسان اور کم وقت کا تھا اور سرنگ بھی چھوٹی تھی۔ وہ تابوت میں جاری تھیں اور جو چھوئیاں تابوت سے واپس جاتی تھیں گویا ان کا کام ختم اور زندگی بھی ختم۔ نئی اور تازہ دم ان کی جگہ پر آ جاتی تھیں، وہ پھول جو اس نے توڑا تھا اس کی جیب میں تھا۔

لاش کو قائم رکھنے یا زندہ رکھنے میں اس پھول کے رس کا دخل تھا جو کہ چھوئیاں اس تک پہنچا رہی تھیں، کتنی حیرت کی بات تھی یہ ایک یا دو سال کی بات نہیں تھی یہ سینکڑوں سال کے ہو رہا ہے اب یہ لاش بڑی اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ رولوکا کے لیے اس لاش کا راز جاننا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ وہ کنوئیں کی طرف چلا اور وہیں آ گیا جہاں سے سرنگ شروع ہوئی تھی، کنوئیں کے اوپر آیا۔ حوٹلی میں سناٹا تھا اس کو اندازہ نہیں تھا وہ کتنے دن اندر رہا ہے کنوئیں سے باہر آتے ہی اس نے کنوئیں کے راستے کو بند کر دیا اب کنوئیں کے اندر صرف وہی جاسکتا تھا اندر سے کوئی بھی باہر نہیں آ سکتا۔

لاش کا راز بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا گوگی اس کے بارے میں ضرور جانتا تھا اس لیے گوگی بھی اہم تھا۔ رولوکا کو پتہ نہیں تھا کہ ابھی لاش کے زندہ ہونے میں کتنا عرصہ باقی ہے یہ کون ہے؟ اور دنیا میں دوبارہ آ کر کیا کرنا چاہتا ہے؟ بہت کچھ جاننا ضروری ہے اور بہت کچھ کرنا باقی تھا۔ اس کا راز خدہ قدرت میں کیا کیا ہے؟ کسی کو کچھ پتہ

گیا اس نے قطار کو چھیڑنے یا ان کے قریب جانے کی کوشش نہیں کی، یہ رولوکا کی زندگی کا انوکھا اور نیا تجربہ تھا۔ اس نے نضی مخلوق سے رابطہ کرنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی۔ پہلے وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ چھوئیاں کہاں جارہی ہیں۔ سرنگ بہت لمبی تھی اور چھوئیاں کی قطار کہیں پر بھی نہیں ٹوٹی تھی ان کے فاصلوں میں فرق نہیں پڑا تھا۔ دن رات اور وقت ان پر کچھ اثر انداز نہیں ہوا تھا۔ ان پر تھکن بھوک کچھ اثر نہیں کرتی تھی۔ پھر دور کہیں سے پانی گرنے کی آواز آنے لگی تو وہ چھوئیاں سے تیز چلتا ہوا ان سے آگے جانے لگا۔ اب سرنگ میں روشنی آرہی تھی، کچھ دیر کے بعد وہ ایک گہری کھائی میں کھڑا تھا۔ کھائی کی چوڑائی دس فٹ سے زیادہ نہیں تھی اور پانی بھرنے کی شکل میں اس کھائی میں گر رہا تھا۔ پانی وہیں پر تھا کی طرف بہہ نہیں رہا تھا بلکہ زمین کے اندر جا رہا تھا۔ چھوئیاں کی قطار اس پانی میں اتر رہی تھی اور پانی کے ساتھ زمین میں جارہی تھی۔ تابوت سے نکلنے والی چھوئیاں کا تو پتہ چل گیا کہ وہ اتنا سفر کر کے اس پانی میں چلی گئیں۔

اور جو قطار پانی کے اندر جارہی ہے وہ کہاں سے آرہی ہے؟ یہ پتہ کرنا بھی ضروری ہے۔ مگر ابھی یہ بات ادھوری ہے کہ چھوئیاں پانی میں جارہی ہیں آخر کیوں جارہی ہیں؟ رولوکا نے سوچا اور اپنا ہاتھ پانی میں ڈال دیا۔ پانی میں ہاتھ ڈالتے ہی اس کو اندازہ ہو گیا کہ یہ پانی نہیں ہے، پانی میں گاڑھا پین تھا، بھینسی بھینسی خوشبو آرہی تھی۔ رولوکا نے فوراً پہچان لیا کہ یہ خوشبو گندھک اور نیم کی تھی۔ وہ پانی میں اتر گیا جہاں پر پانی زمین کے اندر جا رہا تھا وہ اس کے اندر اتر گیا اور پھر اس کے اندر ہی اندر جانے لگا۔ اس کے پیر زمین پر نہیں تھے وہ پانی میں تیر رہا تھا۔ کافی دیر تیرنے کے بعد اس کے پیروں تلے زمین آگئی تو اس نے کھڑے ہو کر آنکھیں کھول دیں اور اطراف کی طرف نظریں دوڑائیں۔ یہ ایک چھوٹا سا تالاب تھا اس کے چاروں طرف کھنی جھاڑیاں تھیں اور کنارے کی جھاڑیاں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں ان جھاڑیوں پر پہلے رنگ کے

میرے ایک اشارے کا محتاج ہے مگر میں یہ نہیں کر ہا اس لیے کہ مجھے کچھ بڑا کام کرنا ہے میں کسی جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا تو اپنی ذرا سی چھو چھک کے بھروسے پر میرا راستہ کاٹ رہا ہے۔“ گوگی بولا۔

”مجھے پتہ ہے تو نے کنوئیں کے اندر جانے کی کوشش کی ہے مگر جانیں سکا اور تھک کر میرے پاس آیا ہے کنوئیں کے اندر کیا ہے؟ تجھے پتہ ہے تو نے اندر جا کر دیکھا ہے۔“ رولوکا بولا۔

”تو نہیں جانتا یہ ایک بہت بڑا راز ہے انسان کی ہمیشہ زندگی کا راز ہے وہاں کون جاسکتا ہے؟ میں نے کئی سال محنت کی ہے اور وہاں جانے کا طریقہ دریافت کر لیا ہے میں جاسکتا ہوں۔“

”تیری بھول ہے، وہاں پر جانا اتنا مشکل نہیں کہ پوری زندگی اس کے لیے وقف کر دی جائے۔ صرف ایک پھول کی خاطر.....“ رولوکا نے جیب سے پھول نکالا پھول اب بھی تازہ تھا۔ ”تو جانتا ہے یہ کیا ہے؟“ گوگی نے حیرت سے اس پھول کو دیکھا اور چاہا کہ رولوکا سے چھین لے۔ رولوکا جانتا تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گا، پھول پھر رولوکا کی جیب میں چلا گیا۔

”گوگی بے چینی سے بولا۔“ تجھے یہ پھول کہاں سے ملا؟“

”میں نے اس جھاڑی سے توڑا ہے جس پر یہ کھلا تھا اس جھاڑی پر لاکھوں چوئیاں اس کا رس چوس رہی تھیں اور پھر وہ ایک سرنگ کے راستے سے ایک بڑے گول ہال میں آ رہی تھیں اور ایک سوراخ کے ذریعہ ایک تابوت میں جا رہی تھیں پھر دوسرے راستے سے یہ باہر آ رہی تھیں اور پانی میں گر کر جان دے رہی تھیں میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ پھول انسانی زندگی کو طوالت دیتا ہے زندہ رکھتا ہے۔“ رولوکا بولا۔

”تجھے یہ سب کچھ کس نے بتایا ہے؟“ گوگی بولا۔
 ”تو اس چکر میں مت پڑ یہ بتا کہ میں نے جو کہا سچ کہا کہ نہیں.....“ رولوکا بولا۔

نہیں ہے، زمین کی کون سی تہہ میں کیا ہے؟ کس کو پتہ ہے؟ دنیا میں ان چمکتے پتھروں کی کیا اہمیت ہے؟ جو سرنگ کو روشنی دے رہے ہیں؟

جھاڑیاں ہری تھیں اور سونے کے کلر کے پھول ان پر کھل رہے تھے۔ ان پھولوں کا رس یہ خاصیت رکھتا تھا کہ سیکڑوں سال پرانی لاش برقرار تھی اس کی آنکھیں زندہ تھیں۔ زمین کے اندر کے اسرار رولوکا کے سامنے آ رہے تھے۔ رولوکا کی زندگی کے نئے تجربات اس کی معلومات کو بڑھا رہے تھے اور اس کو مزہ آ رہا تھا۔

رولوکا جانتا تھا کہ گوگی ضرور آئے گا پہلے تو اس نے سرنگ تک جانے کی دو تین کوششیں کی مگر ناکام ہوا کیونکہ رولوکا کے کارندے موجود تھے ان پر گوگی کی ایک نہ رہی وہاں سے ناکام ہونے کے بعد وہ خود مطب میں آ گیا اس کا روپ ایک مریض کا تھا۔ پہلے وہ حکیم وقار سے ملا مگر انہوں نے رولوکا کے پاس اس کو بھیج دیا وہ اطمینان سے بیٹھ گیا اور بولا۔ ”تم وہ نہیں جو نظر آتے ہو۔“ اور تم بھی وہ نہیں ہو جو نظر آ رہے ہو۔“ رولوکا بولا۔

”ہاں تم نے درست کہا تو پھر یہ بھی سمجھ لو کہ تم جو کچھ کر رہے ہو ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔“ وہ بولا۔
 ”میں اپنے گھر کی حفاظت کر رہا ہوں جو کہ ہر شخص کرتا ہے۔“ رولوکا بولا۔

”یہ حویلی تیری نہیں ہے یہ میری ہے آج سے نہیں سیکڑوں سال سے، تو مالک کیسے بن گیا؟“ گوگی بولا۔
 ”زمین اسی کی ہوتی ہے جو اس کو سکھ رائج الوقت ادا کر کے خریدتا ہے تیرے پرکھوں نے اس کو ضرور بخویا ہوگا مگر وہ زمانہ ختم ہو گیا۔ نئے زمانے میں یہ ہماری ہے۔“ رولوکا بولا۔

”مگر یہ میری ضرورت ہے میں نے اس کو خالی رکھا تھا آتماؤں کو قید اسی لیے کیا تھا کہ کوئی آنہ سکے تو نے ان آتماؤں کو بھگا دیا اور یہ مطب کھول کر بیٹھ گیا یہ صرف

”میں دھرتی کو چیر کر چلا جاؤں گا۔“ وہ غصے سے بولا۔

”مجھے اناڑی سمجھتا ہے میں تیرے راستے میں انگارے ڈال دوں گا تو اس سرنگ میں نہیں جاسکتا۔“ رولو کا بولا۔

”میں جاؤں گا تو مجھے نہیں روک سکتا میری زندگی بھر کی محنت اور بھگتی، دیوی دیوتا میری مدد کریں گے۔ میں سرنگ تک پہنچ جاؤں گا۔“ اور اچانک وہ کرسی سے غائب ہو گیا۔

رولو کا جانتا تھا اس کا اس طرح غائب ہونا صرف ایک مخصوص وقت کے لیے ہے۔ بہت کچھ گوگی نے بتایا تھا مگر لاش کی حقیقت کو راز میں رکھا تھا۔ وہ لاش کس کی تھی اس کو کیوں رکھا گیا تھا اس سے کیا کام لیا جاتا تھا؟

☆.....☆.....☆

گوگی سرنگ تک جانے کی بار بار کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہیں ہوا۔ اس کے بڑے بڑے بیرپلٹ گئے اس کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ رولو کا کی کی نظر اس پر مچی پھر اس نے ایک سرنگ دلی کے باہر سے کنوئیں تک بنانے کا پروگرام بنایا اور بہت گہرائی میں اس کے بیروں نے وہ سرنگ بنائی۔ رولو کا دیکھ رہا تھا رولو کا کے کارندوں نے اس کا رخ بدل دیا اور گوگی کے بیرسنگ بناتے چلے گئے اور وہ سرنگ حویلی کے کنوئیں سے بہت دور سے گزرتی دلی کے باہر چلی گئی اور اس میں دیا کا پانی بھرنے لگا تو سارے بیر بھاگ کھڑے ہوئے گوگی کا پلان پھر ناکام ہو گیا اور اب اس کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ اس نے ہر طرف مدد کو نظریں دوڑائیں مگر کوئی کارگر مدد اس کو نہ ملی اس کو اپنے خواب بکھرتے نظر آنے لگے وہ لاش اس کے لیے بڑی اہم تھی۔ دنیا بھر کی شمشتی حاصل کرنے کے لیے اور دنیا پر راج کرنے کے لیے وہ ضروری تھی مگر اس کا حصول گوگی نے جس قدر آسان سمجھ لیا تھا اور اس کے خیال میں جو رکاوٹیں آنے والی تھیں ان کا توڑ اس نے پوری زندگی تپسیا کرنے کے بعد پیدا کر لیا تھا مگر جو رکاوٹ اس کے سامنے آئی تو اس

”میں نے جوسنا ہے اس کے حساب سے تو نے درست کہا ہے مگر میں سمجھتا تھا کہ صرف میں جانتا ہوں تجھے یہ سب کیسے پتا چلا اور یہ پھول تو نے کہاں پایا؟“ گوگی کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

”تیرے خیال میں تو ہی اس خیال کو اکیلا جانتا ہے۔“ رولو کا بولا۔

”ہاں مجھے تو یہی اندازہ تھا۔“ وہ بولا۔

”تیرا اندازہ درست تھا میں اگر وہاں نہ جاتا تو مجھے بھی پتا نہیں چلتا۔“ رولو کا بولا۔

”کیا کہا تو نے پھر سے بول.....“ وہ بیتاب ہو گیا۔

”میں نے جو کہا وہ تو نے سن لیا ہے مرا کیوں جا رہا ہے؟ میں نے ان چیونٹوں کے ساتھ سفر کیا ہے اس سونے کے تالاب کو دیکھا ہے میرے جسم پر اب بھی سونے کے ذرات موجود ہیں۔“ رولو کا بولا۔

”میں تیری بات کا یقین نہیں کرتا تو نے ضرور کسی ذریعہ سے پتا چلایا ہے۔“ وہ بولا۔

”اس کنوئیں کے راز کو پوری دنیا میں صرف تو جانتا ہے یہی تو بھی کہتا ہے اور میں تیرے پاس راز جاننے نہیں گیا تو سنی ہوئی کہتا ہے، میں آنکھ سے دیکھی بیان کر رہا ہوں تو یہاں پر اس لیے موجود ہے کہ مجھے تیری ضرورت ہے تجھے اپنی شمشتی پر بڑا ناز ہے تو پھر تو اس کنوئیں پر جا کر دیکھ لے۔“ رولو کا نے بڑے سکون سے کہا۔

”تو کون ہے؟ تو نے میرا پورا راز پایا، زندگی کی ساری محنت میں نے اس لاش کو پانے کے لیے صرف کی ہے وہ لاش اتنی بڑی شمشتی ہے کہ اس کا کوئی کنارہ نہیں ہے تجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے اس کے جگانے کا راز میں جانتا ہوں صرف میں۔“ گوگی بولا۔

”تو پھر تو اس راز کو اپنے پاس رہنے دے میں سرنگ سے لاش تک جانے کا راستہ ہی بند کر دوں گا۔“ رولو کا نے کہا۔

معاملہ بہت خطرناک ہے، آپ نے وہ کنواں تو دیکھا ہوگا جو میدان کے درمیان بنا ہوا ہے وہ دراصل ایک سرنگ کا راستہ ہے، زمین کے اندر بہت لمبی سرنگ ہے، اندر روشنی نہیں ہے کہیں کہیں پر روشنی نظر آتی ہے مگر وہ روشنی کسی سورج یا کسی چراغ کی نہیں ہے وہ روشنی اس کی دیوار پر لگے پتھروں کی ہے۔ یہ بہت لمبی کہانی ہے حکیم صاحب آپ صرف یہ سمجھ لیں اس سرنگ کے آخر میں ایک لاش ہے مگر وہ زندہ لگتی ہے، عورت ہے کہ مرد کچھ پتہ نہیں چلتا، صرف آنکھیں نظر آتی ہیں۔ اس لاش کو ایک جادوگر حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ ابدی زندگی حاصل کر سکے۔“

”رولو کا بولا۔“
”مگر یہ کیسے طرح ممکن ہے۔“ حکیم صاحب نے پوچھا۔

”یہ دنیا ایک عجوبہ ہے اس کی جتنی کھوج کرو گے اتنی ہی نئی باتیں، انوکھی چیزیں نکلتی ہیں۔ آپ کو پتا ہے شیطان کیا کچھ کر سکتا ہے مگر جو اس کا ناکام کر سکتا ہے وہ شیطان نہیں کر سکتا۔“ رولو کا بولا
”یہاں پر کونئیں پر تمہارا پورا انتظام ہے۔“ حکیم صاحب نے کہا۔

”آپ اس کی فکر نہ کریں وہ آئے گا ضرور مگر کونئیں کے اندر نہیں جاسکتا اور حویلی پر حملہ نہیں کر سکتا میں کچھ دن یہاں رہوں اس کے بعد شاید امیزون کے جنگلات میں سفر کرنا پڑے اور باتیں میں بعد میں بتاؤں گا اب چلتا ہوں۔“ اور پھر رولو کا کارابلٹ ٹوٹ گیا۔

رولو کا کالا ہاری کے جنگلات میں مارا مارا پھر رہا تھا اس کے ساتھ اس کے کئی دوست تھے وہ اس کی ہر طرح سے مدد کر رہے تھے وہ اس پھول کے پودے کو تلاش کر رہے تھے جو وہ زمین کے اندر سے لایا تھا۔ خولی اس پھول کی یہ تھی کہ یہ آج بھی تر تازہ تھا۔ اس کی بیلے بیلے پنکھڑیاں چمک رہی تھیں اس پھول کو جنگل کی گہرائی میں رہنے والوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ ایک انوکھی چیز تھی آخر اس پھول کی تلاش میں رولو کا کو، اور آگے امیزون کی

کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی اور اس کا کوئی موثر توڑ اس کے پاس نہیں تھا گھبراہٹ اور غصہ تو اس کو آتا تھا پوری زندگی کی محنت بے کار جا رہی تھی۔

یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کنواں ہے مگر اس پر پہرہ نظر نہیں آتا میں قریب جاتا ہوں تو کنواں نظر نہیں آتا؟ زمین ہموار نظر آتی ہے دور جاتا ہوں تو پھر نظر آتا ہے۔

یہ کیسی نظر بندی ہے کہ میں اندھا ہوا جاتا ہوں۔ نظر بندی تو معمولی چیز ہے مگر میری نظر بندی، گوگی کی نظر بندی، حیرت کی بات ہے ایسا لگتا ہے اس نظر بندی کا کوئی اور ہی چکر ہے، میری دو یا اس کا جواب نہیں دے پاتی کوئی دیوی دیوتا اس کا جواب نہیں دیتا۔ اور سرنگ بھی نہ بنی سارے کام ادھورے پڑے ہیں اور سے گزرتا جا رہا ہے۔

مطب کا کاروبار حسب معمول چل رہا ہے۔ اب کسی کو اندازہ نہیں کہ مطب کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ حکیم وقار سے رولو کا کی ملاقات نہیں ہو رہی ہے آخر کار حکیم وقار نے رولو کا کو یاد کر لیا۔

ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ ان کے یاد کرنے پر کچھ دیر میں رولو کا ان کے سامنے آ جاتا تھا مگر اس دفعہ ایسا نہ ہوا مگر اس کی آواز حکیم وقار کے کان میں سنائی دی۔ ”کیسے یاد کیا حکیم صاحب؟“

حکیم وقار نے دماغ میں پوچھا۔ ”تم کہاں ہو رولو کا؟“

”میں آپ سے کئی ہزار میل دور کالا ہاری کے جنگل کے درمیان اپنے ایک دوست کے پاس ہوں۔“ وہ بولا۔
”ارے اتنی دور ایسی کیا ضرورت پیش آگئی۔“ حکیم صاحب بولے۔

”میں آپ کو بتانا سکا حالات اتنی تیزی سے بدل رہے ہیں کہ ہر پل کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے۔“ رولو کا بولا۔

”کیا یہ سب کچھ حویلی کی وجہ سے ہو رہا ہے؟“ حکیم صاحب نے پوچھا۔

”بنیادی طور پر تو حویلی ہی ہے مگر اس کی آڑ میں

حالانکہ میں نے اس کو زندگی میں پہلی دفعہ دیکھا ہے اگر اس میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے کی خصوصیت ہے تو کیوں نہ کسی مرتے آدمی کو کھلا کر دیکھیں پتہ چل جائے گا.....“

رولوکا اس کی بات سن کر حیران ہوا اور بولا۔ ”واقعی۔“

اور پھر ان کا سفر تیزی سے ہوا اور وہ پھر کالا ہاری میں آ گئے وہاں پر ایک نیم وحشی قبیلے کے مہمان ہوئے رولوکا کو یہ لوگ جانتے تھے اور ڈرتے تھے ایک جوان کو کسی زہریلے سانپ نے کاٹ لیا وہ بری طرح تڑپ رہا تھا اس کی زندگی کے آخر ختم ہو رہے تھے اس کی سانس رک رک کر آ رہی تھی پورا بدن نیلا ہو گیا تھا چند لمحوں کا مہمان تھا، رولوکا اس کے سر کے پاس گیا اور پھول کی ایک پتی اس کے منہ کے اندر ڈال دی، اور باقی پھول اس کے جسم پر پھیرنے لگا۔ پتی اس کے منہ میں گئی اور اس کا سانس بحال ہو گیا باقی پھول کی رنگت بدل گئی اور پھر وہ نیلا ہو گیا اور پھر وہ پورا نیلا ہو گیا۔ رولوکا نے مسلمانہ بند کر دیا۔

نوجوان کا نیلا جسم اپنی رنگت پر آ گیا اور پھول میں سے زہر نکلنے لگا اور صرف چندرہ منٹ میں یہ نوجوان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رولوکا اپنے دوست سے بولا۔

”میں نے جو دیکھا تھا وہ بھی درست تھا۔ یہ پھول زندگی دیتا ہے مگر میں نے اس کو زمین کے اندر نہ جانے کتنی گہرائی میں ایک تالاب کے کنارے سے توڑا ہے اس تالاب کا پانی سنہرا تھا اور اس میں سونا ملا ہوا تھا۔“

”تم اور پھول حاصل کر سکو تو مجھے ایک دوسرے دیتا۔“ اس کا دوست بولا۔

”اگر حاصل کر سکا تو کیونکہ وہ زمین اتنی گہرائی میں ہے مجھے خود پتہ نہیں ہے دوستوں تم نے میرا بہت ساتھ دیا اپنی دوستی کا حق ادا کر دیا اب مجھے اجازت دو۔“ اور رولوکا واپس روانہ ہوا۔

☆.....☆.....☆

رولوکا نے حکیم وقار کو کالا ہاری اور امیزون کے حالات اور اس پر کیا گزری اس کے تجربے کے خزانے میں کیا کچھ نیا مل آیا یہ سب بتا دیا۔

طرف سفر کرنا پڑا یہاں پر دریا کے کنارے کنارے ان کا سفر جاری رہا، ہزار ہا قسم کے نئے درخت، پودے اس کی نظروں میں آئے ان پودوں اور درختوں کی افادیت اور خصوصیت اس کے ساتھیوں نے اس کو بتائیں۔ رولوکا کے معلومات کے خزانے میں کچھ اور مال جمع ہوا اب وہ اس مقام پر تھے جہاں دریا زمین کے اندر غائب ہوتا ہے۔ یہ جگہ گھنے جنگل اور ایک بہت اونچے پہاڑ کے دامن میں تھی یہاں پر پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا اور پہاڑ کے دامن میں بہت زور دار آواز پیدا ہو رہی تھی..... جیسے آسمان اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ ہوتی ہے مگر یہ گڑگڑاہٹ مستقل تھی اور کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ رولوکا چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا ہر طرف ہرے ہرے درخت تھے دریا کا پانی سنہری ہو رہا تھا اس میں سونے کے ذرات کی آمیزش صاف نظر آتی تھی مگر یہاں پر دور دور تک کوئی آبادی نہیں تھی اس کی وجہ پانی کا شور تھا اور جو قریب قبائل تھے وہ بھی بہت دور تھے ان کو سونے کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا وہ اس قدر وحشی تھے کسی بھی انسان اور جانور میں تمیز نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک جانا پنی موت کو دعوت دینا تھا۔ کئی دن رولوکا اس پھول کی تلاش میں پھرتا رہا مگر کامیاب نہ ہوا اس کے ایک دوست نے پوچھا۔

”تم اس کو کیوں تلاش کرتے ہو؟ تمہارے پاس تو یہ ہے۔“

رولوکا نے کہا۔ ”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے اگر یہ یہاں پر کالا ہاری میں ہوتا تو تم اس کی خاصیت سے ضرور واقف ہوتے میں اس پھول کی خاصیت دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہوں اس کے بارے میں مجھے صرف یہ پتہ ہے کہ یہ زندگی دیتا ہے جسم کو مرے نہیں دیتا۔“

رولوکا کا دوست ہنس پڑا۔ ”رولوکا تم بہت بڑے ذہین ہو بہت کچھ ہے تمہارے پاس، تمہارے باپ اور عظیم دادا نے تم کو بہت کچھ دیا، میں ہی کیا سب تم کو مانتے ہیں۔“

”اس پھول کی اصلیت پتا کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے

”حکیم وقار بولے اب کیا ارادہ ہے؟“

”میں ایک بار پھر سرنگ میں جاؤں گا۔“ رولو کا بولا۔
”اس دفعہ تم کو بہت محنت کرنا پڑی ہے۔“ حکیم

صاحب بولے۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ معاملہ اتنی سنگین صورتحال پیدا کر سکے گا۔ گوگی خطرناک تو ہے مگر اس کی کمزوریاں بھی بہت ہیں وہ ٹیلی پیٹھی جانتا ہے وہ جانوروں سے رابطہ کر سکتا ہے مگر صرف مخصوص قسم کے چوپاؤں سے، ہر قسم کے جانوروں سے نہیں کر سکتا، غائب ہو سکتا ہے مگر چند منٹوں کے لیے وہ صرف برف پوش چوٹی پر رہ سکتا ہے مگر اس کے لیے اس کو ایک بوٹی استعمال کرنا ضروری ہے اس کے پیچھے وہی ہیں جو کالے جادو کرنے والوں کے ہوتے ہیں عام آدمی کے لیے وہ بہت خطرناک ہے وہ کسی کو بھی چکر میں ڈال سکتا ہے مگر میں نے اس کو پورا پڑھا ہے میں اس کے ساتھ لگا ہوا ہوں اس کا علم، میری اطلاع اس کو نہیں دے سکا۔ میں اس کی کمزوریاں اور اس کی طاقت دونوں سے واقف ہوں وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتا اس کو صرف اتنا پتہ ہے حکیم کامل ہی سب کچھ کرتا ہے مگر اس کا بھی اس کو پورا یقین نہیں ہے وہ لاکھ جتن کرے مگر پھر بھی کنوئیں کے قریب نہیں آ سکتا میں ایک بار پھر اندر جاؤں گا۔“ رولو کانے کہا۔

حکیم صاحب بولے۔ ”جاؤ مگر اپنا خیال رکھنا۔“

رولو کا صبح ہی صبح کنوئیں پر چلا گیا اور اب کے اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا..... اور چند منٹ میں وہ سرنگ کے دروازے پر کھڑا تھا سرنگ پہلے کی طرح اندھیری تھی اس کی طوالت کا رولو کا اندازہ تھا کہ جگہ روشن پتھر نظر آئے اس نے ایک پتھر پر ہاتھ رکھا تو پتہ چلا کہ روشنی دینے والا پتھر بہت چھوٹا سا تھا جیسے انگلی میں نگ، اس نے وہ پتھر دیوار سے نکال کر جیب میں ڈال لیا اور آگے بڑھ گیا۔ سرنگ ختم ہو گئی اور وہ اس گول کمرے میں پہنچ گیا جس کے چاروں طرف راستے تھے اور درمیان میں ایک تابوت رکھا تھا تابوت اسی طرح اسی مقام پر رکھا تھا۔ رولو کانے

اس کے چاروں طرف چکر لگایا پہلے کی طرح چوئیاں ایک سو راخ سے باہر آ رہی تھیں اور دوسرے سے اندر جا رہی تھیں ان کی رفتار اور نظم و ضبط میں ذرا سا بھی فرق نہیں تھا۔

وہ جانتا تھا کہ واپس جانے والی چوئیں کا سفر لمبا ہے مگر وہ اسی تالاب پر جائیں گی کہ وہ آنے والی چوئیں کی سرنگ میں چلا گیا اور چلتا گیا جہرنا اسی مقام پر گر رہا تھا اور پانی اسی مقام پر جہاں جہرنا گر رہا تھا گھوم رہا تھا وہ اطمینان سے اس بھنور میں اتر گیا اور پانی کے ساتھ سفر کرتا ہوا وہ اسی تالاب کے کنارے کھڑا تھا وہی موسم تھا نہ سردی نہ گرمی دن رات کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ تالاب کے کنارے پر گھنی ہری جھاڑیاں خاموش کھڑی تھیں اور ان میں ہزاروں پیلے پھول کھل رہے تھے۔ رولو کا اس پیلے پھول کی اہمیت کا اب اندازہ تھا وہ پھول اس کی ضرورت تھا۔ وہ کنارے کنارے چلتا ہوا ایک جھاڑی کے قریب چلا گیا اور کئی پھول اس نے توڑ کر اپنی جیب میں ڈال لیے کئی جیبیں اس کی تھیں وہ تیاری کر کے آیا تھا جھاڑیوں پر لاکھوں چوئیاں پھولوں کا رس پی رہی تھیں اس نے ان کو نہیں چھوڑا وہ حیران تھا کہ چوئیاں یہاں پر یہ رس حاصل کرتی ہیں اور لاش تک لے جاتی ہیں جبکہ درمیان میں تیز پانی کا بھنور ہے وہ کس طرح جاتی ہیں وہ اس کی کھوج میں ہر طرف جانے لگا۔ جھاڑیوں میں ایک طرف سرخ پتھر کی دیوار کھڑی تھی۔ یہ دیوار ایک پہاڑ تھا پہاڑ سرخ تھا اور چوئیاں بھی اسی رنگ کی تھیں بڑی مشکل سے رولو کا دیکھ پایا کہ چوئیں کی رفتار پر جا رہی ہے وہ حیران رہ گیا..... اتنی بلندی کا سفر یہ چھوٹی سی مخلوق طے کرتی ہے اور پھر نہ معلوم کتنا سفر کر کے سرنگ تک جاتی ہیں اپنا خزانہ اس لاش پر لٹا کر اپنی جان دے دیتی ہیں کتنی حیرت کی بات ہے کس نے ان کو اس کام پر لگایا ہے اس چھوٹی سی مخلوق کا کام صرف یہ ہے کہ جھاڑی پر پیدا ہوئی اور اس کے پھولوں کا رس اپنے پیٹ میں اتار، لاش پر آئی اور مر گئی۔ وہ واپس آنے کو مڑا اور پھر واپس ایک جھاڑی کے

کر سکتا ہوں، تمہاری زندگی کی ضمانت یہ جیو نیٹیاں ہیں
جواب دو.....“

اس کے دماغ کی لکیروں میں ایک باریک مگر بہت
کمزور آواز پڑی۔ ”ایسا نہ کرنا۔ میں ایک ہزار سال سے
زندگی کی آس میں پڑی ہوں اب میرا چہرہ زندہ ہوا ہے مگر
باقی جسم زیادہ سے زیادہ سو سال میں زندہ ہو جائے گا۔ مگر
تم نے جیو نیٹوں کا راستہ روک لیا تو میں پوری زندہ نہیں
ہو سکتی، مجھ پر رحم کرو، یہ کام جس طرح ہو رہا ہے ہونے دو
اگر دولت کی ضرورت ہے تو سرنگوں میں دولت بھری ہے
جتنا چاہے لے جاؤ۔“ آواز بند ہو گئی۔

”مجھے دولت کی ضرورت نہیں..... تم کون ہو بتاؤ
؟“

”میری کہانی بہت طویل ہے تم سن کر کیا کرو
گے؟“ آواز آئی۔

”میں نے اس کہانی کو ہی سننے کے لیے یہاں
آنے کا ارادہ کیا تھا۔“ وہ بولا۔

”تو سنو! میرا تعلق مصر سے ہے، مصر نے دنیا
کو بہادر انسان دیا اس کا نام ویمس تھا اس نے مشرق وسطیٰ
پر بیس حملے کئے اور مصر کو ایک نیا ملک بنایا۔ اس کی ساتویں
نسل میں میری پیدائش ہوئی اس وقت مصر میں فرعونوں کی
حکومت تھی۔ فرعون موت سے بہت ڈرتے تھے، وہ کہتے
تھے کہ انسان کبھی مرتا نہیں اگر اس کا جسم باقی رہے تو کسی نہ
کسی دن اس کی روح جسم میں واپس آ جاتی ہے اگر جسم
باقی نہ رہے تو روح بھی فنا ہو جاتی ہے اس لیے وہ اہرام
بناتے تھے اور ان میں انسانی ضرورت کی تمام اشیاء رکھ دیا
کرتے تھے اور اپنے جسموں کی حفاظت کے طریقے

نکالے، وہ کسی حد تک اس میں کامیاب ہوئے مگر اس سے
آگے کی سوچ رکھنے والے فرعون اس سے اول کے زمانے
میں تھے ان کا کہنا تھا کہ جب جسم محفوظ رکھا جا سکتا ہے تو
روح کو بھی محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ روح جسم کے اندر سے
جانے نہ پائے جب روح اندر رہے گی تو موت کبھی؟ انسا
ن ہی زندہ رہے گا اور اگر کسی طرح جسم چھوڑ دے تو دور نہ

پاس گیا اس نے اپنا دماغ اس جھاڑی پر لگا دیا اور اس نے
رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔

وہ جانتا تھا کہ یہ بہت مشکل کام ہے یہاں کی
دنیا اور اس کا ماحول الگ ہے۔

شاید جیو نیٹوں کے کسی بڑے سے رابطہ ہو جائے
اب کے اس نے دوسری طرح کوشش کی۔

مگر اس کے دماغ میں کچھ آوازیں بھن بھناتی
ابھریں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا وہ سمجھ گیا کہ یہ بہت مشکل
کام ہے اس نے کچھ اور پھول توڑ کر جیب بھر لی اور سرنگ
پار کر کے اسی ہال میں آ گیا جہاں پر لاش رکھی تھی وہ
تابوت کے قریب گیا اور اس کا ڈھکن اٹھا دیا۔

وہ حیران رہ گیا لاش کا پورا چہرہ نظر آ رہا تھا پہلے اس
کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔

یہ چہرہ ایک عورت کا چہرہ تھا، سرخ سفید ہونٹ اور
ناک نہایت خوبصورت سر پر بال سنہری رنگ کے اور
آنکھیں ایسی کہ آدمی دیکھ کر دیوانہ ہو جائے وہ ایک حسین
چہرہ تھا چہرے کے ہونٹوں پر بڑی دلچسپ مسکراہٹ تھی
ایسا لگتا تھا کہ وہ رولو کا کو دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔

رولو کا اس کے پاس کھڑا رہا اس کی سحر بھری نگاہیں
رولو کا چہرے پر جمی ہوئی تھیں مگر رولو کا نے اس پر

صرف ایک نظر ڈالی تھی وہ اس کی آنکھوں کے سحر سے بچتا
چاہتا تھا وہ سمجھ گیا کہ یہ بہت بڑا چکر ہے اس نے ایک

آزمودہ طریقہ اختیار کیا اور اس کے دماغ کی طرف رجوع
کیا۔ دماغ میں حرارت کا احساس رولو کا کو ہوا اور بڑی نرمی

اور متوازن آواز میں وہ بولا۔ ”تم میری آواز سن رہی
ہو؟“ مگر جواب نہ آیا۔

وہ پھر بولا۔ ”تم میری آواز سن رہی ہو، اگر سن
رہی ہو تو جواب دو، مجھے ہر حال میں تمہارا جواب درکار

ہے۔“
جواب پھر بھی نہیں آیا تو رولو کا بولا۔ ”میں آخری

دفعہ تم سے کہہ رہا ہوں اگر اب بھی جواب نہیں آیا تو
میں ان جیو نیٹوں کی قطار توڑ دوں گا، تم جانتی ہو میں یہ

کمزور ہو رہا ہے، اس کا ثبوت تمہاری یہاں پر موجودگی ہے۔“ آواز بند ہو گئی۔

رولوکا بولا۔ ”اے مصر کی ہونے والی ملکہ تیرا راز اب افشا ہو گیا ہے تو شاید اپنی منزل پر نہ پہنچ سکے مگر میں تیری آس نہیں توڑوں گا۔ میں ہر آنے والے کو روکوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تجھے کئی ہزار سال پورا جسم حاصل کرنے میں لگ جائیں گے۔ وہ بوڑھا کاہن آئے گا مگر اس کا سحر کچھ نہیں کر سکے گا۔ دیکھ لے میں تیرے دربار میں موجود ہوں اور اس کاہن کو پتہ نہیں ہے وہ کاہن بھول کر رہا ہے وہ نہیں جانتا کہ روح اور جسم پیدا کرنے والا کون ہے؟ وہ پیڑ کے پتوں اور ٹہنیوں پر دماغ لڑا رہا ہے جڑ نہیں جاتا، موجد کو نہیں دیکھتا ایجاد پر غور کرتا ہے، یہ اس کی بنیادی خرابی ہے اس لیے اس کو کامیابی نہیں ہوگی۔“ رولوکا نے کہا۔

”اے آج کے عقل مند انسان تیرے پاس اس کا حل ہے۔“ آواز آئی۔

”ہے مگر نہیں بتاؤں گا، نہ خود اس پر کبھی عمل کروں گا کیونکہ ابھی اس کا وقت نہیں ہے، جب وقت آنے لگا تو قدرت خود وہ کام کرے گی۔ میں صرف یہ کروں گا کہ تمہاری طرف کے تمام دروازے بند کر دوں اور تم کو اسی حالت میں رہنے دوں گا۔“ رولوکا بولا۔

”یہ تو تم مجھ پر ظلم کرو گے۔“ آواز آئی۔
 ”تم نہیں جانتی کہ یہاں کی کسی چیز کو چھیننے کا مطلب کیا ہے؟“ رولوکا بولا۔

”یہ کمرہ جس عظیم پہاڑ کی چوٹی کے نیچے ہے وہ پھٹ پڑے گا یہ زمین اندر کوٹھس جائے گی ہزاروں انسانوں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ میرے جیسے ہزاروں لوگ زمین پر رہتے ہیں، زمین ان کو نگل جائے گی پہاڑ لاوا خارج کریں گے، شہر کنڈر بن جائیں گے، وہ مصری بوڑھا ایسا انتظام کر کے گیا ہے کہ صرف ایک ستون پر یہ سب قائم ہے اور وہ ستون تم ہو، تم پر یہ سب رکھا ہے تم کو چھینا گیا تو تمہارے ساتھ ہزاروں انسان زندگی ہار

جانے پائے اور واپس آئے۔ اس کے لیے تجربات ہونے لگے اور فرعون بدلتے رہے۔

مجھے بھی تجربات کی بھٹی سے گزرنا پڑا پھر ایک بوڑھا کاہن میری لاش لے کر راہ فرار اختیار کر گیا۔ اس نے میری لاش کو کچھ اس طرح کر دیا تھا کہ میں اپنی لاش کو تروتازہ دیکھتی تھی مگر اندر کے دروازے بند تھے مگر وہ بوڑھا کاہن ناامید نہیں تھا۔ بوڑھا ایک بہت بڑا ساحر بھی تھا وہ ان حدود کو پار کر چکا تھا جس کے بعد روح اور مادہ میں فرق نہیں رہتا اس نے فانی اور غیر فانی کا فرق مٹانے کی کوشش شروع کر دی تھی، اس کے ذرائع لامحدود تھے، اس کے طریقے حیرت انگیز تھے۔ وہ مصر سے چلا اور یہاں آ گیا یہ جگہ اور مقام اس کی دریافت تھی اس نے اس تالاب کے کنارے ان بھاڑیوں کی فصل لگائی اور ان چیونٹیوں کو کام پر لگادیا، میرا جسم جو گھل رہا تھا ختم ہو رہا تھا، کچھ دنوں کے بعد اس کو ختم ہو جانا تھا اور روح فنا ہونے والی تھی کہ اس کی ترکیب سے میرے جسم کی بربادی رک گئی اور روح پھر سے جسم کے آنے کا انتظار کرنے لگی مگر یہ کام کتنے سال میں ہوگا اس کا وہ ٹھیک اندازہ نہ کر سکا اس نے ایک عظیم پہاڑ کے عین نیچے یہ کمرہ بنایا۔ اس کے چار راستے رکھے ایک پر چیونٹیاں آتی تھیں دوسرے پر جانے والی تھیں، ایک دنیا میں جانے کے لیے تھا مگر چوتھا راستہ اس کی واپسی کا راستہ تھا جو اس کو مصر یا پتہ نہیں کہاں لے جاتا تھا۔

وہ ہر سو سال کے بعد اس راستے سے واپس آتا تھا اور تابوت کو دیکھ کر اور اپنے انتظام کو دیکھ کر واپس چلا جاتا تھا اس کا انتظام مکمل تھا اس کا خیال تھا کہ ایک ہزار سال کے بعد میرا جسم مکمل ہو جائے گا اور میں مکمل ہو جاؤں گی اور جسم اور روح کا ملاپ ہو جائے گا اور مصر پھر سے اپنے عروج پر آ جائے گا، وہ اس کا فرعون ہوگا اور میں اس کی ملکہ ہو جاؤں گی، اور ہم دونوں لامحدود مدت تک اس دنیا پر راج کریں گے مگر اس کا خیال پورا نہ ہوا۔ ہزار سال گزرنے کے باوجود بھی میں نامکمل ہوں، اس کا سحر بھی

اس کا ہن کو میں ماننا ہوں حیرت تو یہ ہے کہ اس علم کی بنیاد بھی نہیں ملتی۔“

”تم نے کس طرح جانا کہ یہ ایک طلسمی کارخانہ ہے؟“ حکیم صاحب نے پوچھا۔

”ہاں یہ اہم سوال ہے کسی طرف بھی کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ اس نظام کا نقلی پن ظاہر ہو۔ زمین بھی پہاڑ تھا پانی تھا اور وہ شخصی مخلوق تھی اس کے علاوہ کوئی جاندار نہ تھا جھاڑیوں پر کوئی چڑیا پرندہ تک کچھ بھی نہ تھا ہر طرف گہری خاموشی تھی۔“

کنوئیں کے راستے سرگ کے اندر جانے کے راستے پر ایسا نہ تھا کوئی رکاوٹ نہ تھی میں جب پہلی بار گیا تھا اس وقت میں نے محسوس کر لیا تھا لیکن میں نے اس رکاوٹ کو ختم کیا تھا اس لیے میں نے واپس آ کر کنوئیں پر پہرہ سخت کر دیا تھا کیونکہ جو رکاوٹ تھی وہ میں ختم کر چکا تھا۔“

ایک ہزار سال بعد وہ کاہن آئے گا، میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ میری آمد کی اطلاع پائے گا کہ نہیں۔ اس کا ہن کی عمر کیا ہے؟ کہ ہزاروں سال سے زندہ یا صرف روحانی طور پر آتا ہے اگر جسمانی طور پر آتا ہے تو اس نے جسم کو برقرار رکھنے کا کوئی فارمولہ ایجاد کر لیا ہے؟“

رولوکا نے اپنی بات مکمل کی تو حکیم صاحب بولے۔
”ہر شخص کی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے اور جب یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو زندگی تھک جاتی ہے اور تھک کر سونے کی خواہش کرتی ہے اور سو جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں فلاں شخص مر گیا مگر یہ بوڑھا کاہن ہزاروں سالوں سے چلا آ رہا ہے اور تھکا نہیں۔“

”ہاں ایسا ہو سکتا ہے اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس کا مقصد پورا نہیں ہوا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ جسمانی طور پر موجود ہو بھی سکتا ہے۔ اس نے اپنا جسم حفاظت سے رکھ دیا ہو اور روحانی طور پر دنیا میں گردش کر رہا ہو، اس کے سحر کی موجودگی ظاہر کرتی ہے مگر وہ کہیں پر ہے ضرور۔“ رولوکا بولا۔

جانیں گے۔ میں نہ تم کو چھیڑ سکتا ہوں اور نہ تمہاری مدد کر سکتا ہوں نہ مصری کاہن کے نظام میں تبدیلی لاسکتا ہوں، میری بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی اور تم کو مجھ سے شکایت نہیں ہوگی۔“ رولوکا نے کہا۔

”کسی مری ہوئی عورت کے لیے زندہ انسانوں کو داؤ پر نہیں لگایا جاسکتا۔ تمہارا نظریہ درست ہے، میں نے آج تک صرف اپنے بارے میں سوچا ہے۔“ آواز آئی۔

”آج کا انسان بھی ہزاروں سال پرانے انسانوں کی طرح سوچتا ہے مگر اس دور میں اور اس پرانے دور میں یہ فرق ضرور ہے کہ انسان کو اچھے راہ برل گئے ہیں ان کے طریقے اور اصول انسان کو کائنات کے بنانے والے کی طرف لے جاتے ہیں۔“ رولوکا بولا

”اے اس زمانے کے انسان تم چلے جاؤ اسی طرح سے جس طرح تم آئے، تین راستے تم نے دیکھ لیے ہیں مگر تم اس طرف نہیں جانا جس پر بوڑھا کاہن جاتا ہے وہاں پر تمہیں دکھائیں گے۔“

رولوکا نے اس اندھیری سرنگ کی طرف دیکھا تاہم کا ڈھکن بند کر دیا اور واپسی کی سرنگ میں داخل ہو گیا اور روشنی کرنے والے بیشار پتھر اس کی جبب میں آنے لگے اور وہ کنوئیں پر آ گیا وہاں سے باہر آنا اس کے لیے مشکل نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

”رولوکا! تم نے حیرت انگیز حقیقت بتائی ہے اگر تمہارے علاوہ کوئی یہ کہانی سناتا تو میں ہرگز ہرگز اس کو تسلیم نہ کرتا۔“ حکیم وقار نے کہا۔

”اور حکیم صاحب مجھے پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ میں کچھ نہیں ہوں، مجھے یہ تسلیم کرنے میں بھی شرم نہیں کہ مصری کاہن کے علم کو سمجھ سکوں اس کا علم مکمل اور پائے دار ہے، وقتی طور پر جادوگر نظروں کے سامنے بہت سے مناظر دیکھ سکتا ہے مگر ایک پورا نظام قائم کرنا اور ہزاروں سال اس کو قائم رکھنا جبکہ اس کو قائم رکھنے والا وہاں ہے بھی نہیں

کنوئیں کی منڈیر پر موجود تھا۔ اس کے سامنے گوگی موجود تھا مگر گوگی نہیں جانتا تھا کہ رولوکا اس کے کتنے قریب ہے۔ گوگی ابھی کنوئیں کے قریب بڑھا ہی تھا کہ جاگتے آلو کا پر اس کے چہرے پر لگا اور وہ دور جا کر اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنی مدد کو کچھ کرنا چاہا تھا کہ رولوکا کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

”بس اس سے آگے کچھ نہ کرنا ورنہ بے موت مارا جائے گا۔“ مگر گوگی طاقت کے نشے میں چور تھا وہ آسمان کی طرف پرواز کر گیا رولوکا زمین پر رہا اور جاگتا آلو گوگی کے سر پر بی رہا۔

جاگتے آلو کی گرفت میں اس کی گردن آگئی۔ گردن گرفت میں آتے ہی اس کے اوسان خطا ہو گئے، آلو نے چند لمحے میں اس کو رولوکا کے سامنے ڈال دیا گوگی کچھ دیر خاموشی سے بڑا ہوا اور پھر کھڑا ہو گیا تو رولوکا نے کہا۔

”میرے کارندے کو پکڑ کر صرف لانے کا حکم تھا، اس لیے تو زندہ ہے، تو بڑا نادان ہے اور بے صبر ہے، تیس چالیس سال کی محنت اور علم اس کے مقابلے پر کتنا ہوگا تو خود اندازہ کر لے گا، تو نے کسی سے اس لاش کے بارے میں سن لیا اور دوڑ پڑا اس طرف، ارے نادان تو نہیں جانتا وہ کون سا علم ہے؟ اور وہ کون سی دنیا ہے؟ تو زمین کے اندر جانے کو بے چین ہے، تجھے زمین کے اوپر کے علم کا پتہ نہیں ہے، تو نہیں جانتا کہ میں کون ہوں کیا کر سکتا ہوں؟ اور چلا ہے زمین کے اندر۔ تو نے ابھی کچھ نہیں دیکھا کچھ نہیں سیکھا صرف کالے پیلے جادو اور سفلی اور گندے علوم سے تو بڑے کام کرنے چلا ہے۔“

رولوکا نے جیب سے ایک پتھر نکالا اور سامنے ڈال دیا ”دیکھ یہ کیا ہے؟ یہ پتھر اس زمین کا ہے جہاں پروہ لاش رکھی ہے، پھر ایک پھول اس کے سامنے ڈال دیا اور کہا۔ ”یہ وہ پھول ہے جس کا رس اس لاش کو زندہ کر رہا ہے تجھے پتہ نہیں کہ اس پھول کی کیا خوبی ہے اور اس پتھر کی کیا ہے؟ یہ دونوں میں تجھ کو دیتا ہوں مگر ان کو برباد نہ کرنا اور پھول کو استعمال نہ کرنا اس کی جس قدر خوبیاں ہیں اس سے

”یہ تو درست ہے کہ مصریوں کے پاس ایسے نادر کیمیائی نسخے تھے جس نے طبی نادر طریقے تخلیق کئے۔ آج کی طب اور سائنس مصریوں کے مقابلے میں صفر ہے۔ آج تک طب کے متعلق جو کتابیں لکھی گئیں وہ بیکار ہیں وہ تمام تجربات جو حیات انسانی پر آج تک ہوئے یہ تجربا ت ہر دور کے حکمانے کئے ہیں وہ سب بیکار تھے۔ وہ بوڑھا کا بن جس نے دوشیزہ کا جسم اور روح دونوں کو آج تک باقی رکھا ہے اس کے اصول اور قاعدے درست ہیں۔“ حکیم وقار نے جواب دیا۔

”آپ کی بات کا جواب میرے پاس نہیں کیونکہ میں نے مصریوں کا زمانہ نہیں دیکھا ان کا علم نہیں پڑھا ان کے کیمیکل اور دواؤں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، میں تو ابھی تک اس جھاڑی اور پھول کے بارے میں بھی نہیں جانتا، میں نے اس کے راز سمجھنے کو ہزاروں میل کا سفر کر لیا ان مقامات پر گیا جہاں پر وہ درخت اور بوٹیاں پیدا ہوئی ہیں جو دنیا کے کسی خطے پر پیدا نہیں ہوتیں مگر زمین کے اوپر میں نے اسے نہیں پایا تو آپ بتائیے کہ میں بوڑھے کا بن اور اس کے سحر کے بارے میں کیا جان پاؤں گا۔“

حکیم صاحب یہ دنیا کے عجائبات ہیں یہ ہماری سمجھ سے باہر ہیں، یہ کائنات بہت بڑی ہے اس کے بارے میں صرف اس کا خالق جانتا ہے یا وہ لوگ جانتے ہیں جن کو خود اس کا علم رہتا ہے۔ از خود خالق کے رازوں کو کوئی حل نہیں کر سکتا۔ رولوکا نے جواب دیا۔

”تمہاری بات بہت وزن رکھتی ہے۔“ حکیم صاحب نے جواب دیا۔

☆.....☆.....☆

گوگی کی پوری کوشش تھی کہ کنوئیں کے اندر کسی طرح چلا جائے۔ رولوکا جانتا تھا کہ وہ اندر جا کر کیا کرے گا اس کو پتہ نہیں کہ اندر کتنی خطرناک چیز دنیا کے لیے ہے وہ علم کی کمی کی وجہ سے بے صبری کرے گا اور پھر دنیا تباہی کے دہانے پر پہنچ جائے گی۔

رات کا آخری پہر تھا رولوکا روپوشی کی حالت میں

زیادہ تباہ کاریاں بھی ہیں۔ میں نے تجھے اس لیے دیا کہ تو ان کے بارے میں پتہ کر لے۔ یہ دنیا کے اوپر کی چیز نہیں ہے یہ دنیا میں تجھے نہیں ملے گی جب غور کر لے تو میری چیز مجھے واپس کر دینا اب تو جا اور اس کنوئیں میں جانے کا خیال ہرگز ہرگز اپنے دل میں مت لا ورنہ جو تیرے پاس ہے سب لٹ جائے گا۔“

گوگی نے پھول اور پتھر اٹھایا اور غائب ہو گیا۔

رولوکا جانتا تھا کہ گوگی کی سمجھ میں اتنی جلدی اس کی بات نہیں آئی ہوگی۔ اس لیے اس نے پہرہ مزید سخت کر دیا پورے میدان میں اس کی ہوائی فوج اتر گئی اور کنوئیں کی طرف جانے پر پابندی لگا دی گئی۔ دن اور رات میں کوئی ادھر نہیں جاتا تھا مریضوں کے لیے دوسری جگہ باندوبست کر دیا گیا تھا۔

حکیم وقار رولوکا کے انتظامات دیکھ رہے مگر جانتے تھے کہ رولوکا جو کرے گا ٹھیک ہوگا۔

گوگی اس پتھر کو لے کر پتھروں کے ماہرین کے پاس پھر تاربا۔ پورے ہندوستان میں اس نے دور دور کا سفر کیا مگر کوئی نہ بتا سکا کہ یہ کون سا پتھر ہے؟ پتھر نہ گول تھا نہ چوکور اس کی بناوٹ عجیب تھی ایک طرف سے یہ چوکور تھا اور دوسری طرف سے یہ تین کونے کا لگتا تھا، اس کے اوپر کی سطح سفید تھی مگر اندر لائن دودھیا نظر آتی تھی۔ وہی سفید لائن روشنی میں صرف لائن تھی مگر اندھیرے میں روشن ہو جاتی تھی اور اس میں سے دودھیا روشنی نکلنے لگتی تھی۔ اس کو توڑنے یا اس پر کسی قسم کی زور آزمائی اس نے نہیں کی تھی کہ رولوکا نے اس کی تباہ کاریوں کا ذکر کر دیا تھا۔ پہلے تو گوگی کو رولوکا کی باتوں کا یقین نہیں تھا مگر پھر آہستہ آہستہ اس کو یقین ہو رہا تھا جس نے اس پتھر کو دیکھا وہ حیران ہوا، ایسا نایاب پتھر کسی نے نہیں دیکھا تھا ابھی تک، اس کی صرف ایک خوبی ان سب کو نظر آتی اور وہ تھی اس کے اندر کی روشنی۔

گوگی کے پاس پھول بھی تھا اور حیرت انگیز طور پر وہ تروتازہ تھا، اس میں مرجھاہٹ کے آثار دور دور تک نہیں

تھے۔ اس کے بارے میں بھی گوگی کچھ پتہ نہ کر سکا اس کا علم خاموش تھا اس کی عقل جواب نہیں دے رہی تھی اور اس کے دوست احباب جنگل اور پہاڑوں کے ساتھی کسی نے زندگی میں ایسا انوکھا پھول نہیں دیکھا تھا، جو ہمیشہ تازہ رہتا ہو اور زندگی اور توانائی سے بھرپور مگر اس کی تباہ کاریاں بھی ساتھ تھیں۔ گوگی نے چاہتے ہوئے بھی اس کو نہیں چھیڑا اب اس کی سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ میں کیا ہوں؟ میری حقیقت اس دنیا کے کارخانے میں کتنی ہے مگر شیطان اس کے ساتھ تھا وہ کب اس کے دماغ میں مثبت خیال آنے دیتا۔ گوگی شیطان کا بڑا ہتھیار تھا وہ اس ہتھیار کو کند ہونے نہیں دے سکتا تھا۔ وہ گوگی کو پھر پہاڑ پر لے گیا اور گوگی کو نئے ساز و سامان سے لیس کرنے لگا اور یقین دلانے لگا کہ تو ہی اس زمین کا سب سے بڑا شکتی مان ہے، تیرے سامنے سب ہونے ہیں، تیرے اشارے پر طوفان آ سکتا ہے، تیرے اشارے پر آسمان آگ برسا سکتا ہے، گوگی پورے سال پہاڑ پر رہا مگر اس کی ودیا اور شیطان نے بھی اس کو پتھر کے بارے میں نہیں بتایا۔ پتھر کے بارے میں وہ صرف یہ پتہ کر سکا کہ یہ زمین کی گہرائی کا ہے اور پھول کے بارے میں کچھ پتہ نہ چلا، پھول آج بھی تروتازہ تھا۔

رولوکا جانتا تھا کہ گوگی، اتنی آسانی سے سیدھے راستے پر نہیں آئے گا، اس نے اپنی چھاؤنی وہیں رکھی تھی، مطب کا کاروبار حسب معمول چل رہا تھا۔ اس نایاب پھول کی کرامات وہ دیکھ چکا تھا اس نے حکیم وقار کو اس کے بارے میں بتا دیا تھا حکیم صاحب نے بڑی حفاظت سے ان پھولوں کو رکھا ہوا تھا اور پتھر بھی حکیم وقار کے پاس تھے۔

ایک مرتبہ گوگی پھر آ گیا۔ وہ کنوئیں کی منڈیر پر کھڑا تھا اور گوگی اس کے سامنے کھڑا تھا گوگی کے بدن پر صرف ایک لنگوٹی اور صدری تھی اس کے دونوں طرف نئے پہرے دار تھے اس کی چوٹی سیدھی کھڑی تھی اور اس کے بالوں کا رنگ سفید تھا گوگی کے چہرے پر عمر کی لکیریں اور کھنٹی ہوئی تھیں مگر آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہو گیا تھا

”مگر اب تو وہ میرے قبضے میں ہے، میں سودے بازی کی پوزیشن میں ہوں۔“ گوگی بولا۔

”تو پوری زبان اپنے گرد کی استعمال کر رہا ہے، تجھے یہی کہنا چاہئے تھا۔“ رولوکا بولا۔

”یہ تو اپنا داؤ ہے کبھی چھکا کبھی پو.....“ گوگی بولا۔

”مگر تیرے نصیب میں چھکا نہیں ہے تیری نیت شیطانی ہے، شیطان عمر بھر یہ کھیل کھیل رہا ہے مگر چھکا کبھی نہیں آئے گا۔“ رولوکا بولا۔

”یہ تیرا خیال ہے میرے پاس دیوی دیوتاؤں کی شکتی ہے، میں بھی کسی بھروسہ پر یہاں آیا ہوں۔ کھنڈالہ کی شکتی کے بارے میں تو نہیں جانتا، میں زمین پر پیر ماروں تو زمین اندر کو دھسنے جائے گی، آسمان پر اشارہ کر دوں تو اڑتے ہوئے سارے نیچھی زمین پر گر پڑیں۔“ گوگی بولا۔

”تیرے گرد نے پوری ہوا بھر کر تجھے یہاں بھیجا ہے۔“ رولوکا بولا۔

”تجھے ابھی میں بتاؤں گا کہ ہوا بھری ہے کہ شکتی بھری ہے۔“ گوگی بولا۔

”ذرا اپنی حالت پر رحم کر لے، تجھے تو یہ نیک نہیں پتہ کہ تیری جیب کٹ گئی ہے۔“ رولوکا بولا۔

”کیا اول فول بکے جا رہا ہے۔“ وہ غصے سے بولا۔

”اپنی جیب میں ہاتھ ڈال پھر پتہ چلے گا۔“ رولوکا نے مسکرا کر کہا۔

گوگی نے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر پتھر اور پھول دونوں اس میں نہیں تھے وہ چونک کر اچھل پڑا۔ رولوکا ہنس کر بولا۔

”زیادہ ہندر کی طرح مت اچھل، میری چیز تھی میرے پاس آگئی۔“

”تو نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے؟“ وہ بولا۔

”تیری نیت خراب تھی امانت واپس نہیں کرنا چاہتا تھا تو اندھا دھوا بہرا ہے تجھے خود اپنے بارے میں پتہ نہیں ہے ارے تیری لنگوٹی بھی کوئی لے جائے گا اور تو بھرے بازار میں نگاہو جائے گا تجھے پتہ نہیں چلے گا، پہلے اپنے تن

اس کے کھڑے ہونے کا انداز جارحانہ لگتا تھا مگر کوئے کی طرح جو ہر وقت چونکنا رہتا ہے اور بھاگنے کے لیے ہر وقت تیار ہوتا ہے۔

گوگی نے کنوئیں کی طرف بڑے غیر محسوس انداز میں قدم بڑھایا۔ رولوکا کی گونجتی آواز اس کے کان میں آئی۔ ”بس آگے تیرا قدم ہے۔ تو پھر آگیا، تیری سمجھ میں میری بات نہیں آئی شاید۔ تو بڑا نادان ہے، تو اس چیز کی ضد کر رہا ہے جس کا وزن تو نہیں اٹھا سکتا۔“

”میں کنوئیں میں ضرور جاؤں گا یہ میری آن کا سوال ہے۔“ گوگی بولا۔

”تیری آن یا تیرے گرد کی آن تجھے آگے رکھ کر مروا دے گی اور پھر کسی اور نادان کو تیری جگہ لے آئے گی برے وقت میں وہ تیرے قریب نہیں آئے گا تو کس کے بھروسے پر یہ سب کر رہا ہے تیری آن کیا ہے؟ تو ایک بے وزن پتھر ہے۔“ رولوکا بولا۔

”میرے پاس میری شکتی ہے میں نے اپنی تمپیا کا پھل پالیا ہے۔“ گوگی بولا۔

”تو پھر بتا پھول کہاں ہے اور پتھر کہاں ہے بتا اس کی حقیقت کیا ہے۔“ رولوکا بولا۔

گوگی چالاکی سے بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تجھے خود پتہ نہیں کہ وہ کیا ہے؟ تو نے مجھے صرف اسی کارن ان کو دیا تھا کہ میں اپنی ودیا سے پتہ کروں تجھے بتاؤں، تو سن رکھ میں تجھے کچھ نہیں بتاؤں گا کہ وہ کیا ہے؟“

”تجھ میں اور مجھ میں یہی فرق ہے، میں نے تجھ کو ایک قیمتی چیز دی بھروسہ کیا، مگر بے وقوف، جب دینے والا اس طرح کسی پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ لینے کی قوت بھی رکھتا ہے، تجھے کچھ پتہ نہیں چلا تو تو نے نئی کہانی بنائی۔ میری چیز واپس کر دے۔“ رولوکا بولا۔

”واپس تو کر دوں گا مگر تجھے بتانا ہوگا کہ آخر یہ کیا ہے؟“ گوگی بولا۔

”سودے بازی کرے گا، میں نے سودے بازے کی تھی۔“ رولوکا بولا۔

کی فکر کرو، ورنہ تیری حالت بندروں جیسی ہوگی، رولوکا نے جواب دیا۔

”میں پھر آؤں گا۔“ اور وہ ایک دم پیچھے ہٹا تو رولوکا نے آواز دی۔ ”رک جا تیرے جانے کے دروازے بند ہیں اور پر بھی دیکھ لے اور چاروں طرف بھی دیکھ.....“ گھوگی رک گیا اور بولا۔ ”میں نے آنے کا کہا ہے، میں کسی بھی کام سے تیرے پاس آ سکتا ہوں۔ اور اب بھی میں کسی لڑائی کے لیے نہیں آیا تھا تیری امانت لوٹانے ہی آیا تھا مگر تو نے غلط سمجھ لیا۔“ گھوگی نے پلٹا کھایا۔

رولوکا ہنس پڑا اور بولا۔ ”تو یہ نہ سمجھ میں نے تیری بات تسلیم کر لی ہے مگر میں موقع ضرور دیتا ہوں تجھے بھی دوں گا تو جاسکتا ہے مگر یہ خیال رکھنا کہ آئندہ اگر بری نیت سے آیا تو تیرا نقصان ہوگا جا چلا جا اور کوئی نئی چال سوچ.....“ گھوگی غائب ہو گیا اور رولوکا مطب میں آ گیا۔

☆.....☆.....☆

مطب میں مریضوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ اسی حساب سے طبیب اور عملہ بھی بڑھا دیا تھا۔ پورے یوپی سے مریض آتے تھے اتنا اچھا علاج ہونے پر بھی اخراجات مناسب لیے جاتے تھے۔ یوپی کا ایک بڑا ضلع ہے یہاں کے زمین دار راجہ بھگت ناتھ ہیں۔ پچاس سے اوپر ان کی عمر ہے مگر بڑے صحت مند۔ ان کی دولڑکیاں، بڑی شادی شدہ اور دولڑکے ہیں ایک ان کی بیوی سے اور ایک لڑکا ان کی باندی سے ہے مگر انہوں نے اعلان کر دیا ہے کہ شکر اور ایرج دونوں ان کے لڑکے ہیں دونوں کو برابر چاہتے ہیں شکر اور ایرج دونوں کی عمروں میں صرف ایک سال کا فرق ہے شکر بڑا ہے اور وہی ان کی بیوی سے ہے اور یہی ان کا وارث ہے مگر ایرج کے لیے انہوں نے زندگی میں اتنا کر دیا ہے کہ ان کے مرنے کے بعد اس کو کسی قسم کی پریشانی نہ ہو مگر ان کی بیوی ایرج اور اس کی ماں کے سخت خلاف ہے۔

اس کی روز روز کی جھک جھک سے تنگ آ کر بھگت

ناتھ نے کان پور میں ایرج اور اس کی ماں کے لیے ایک حویلی خرید لی اور اس کو ایرج کے نام کر دیا اور ان کی پرورش کو زمین بھی حاصل کر لی اور وہ خود بھی کان پور میں کئی کئی روز بیٹے کے پاس رہنے لگے۔ کان پور میں ایرج پڑھنے لگا شکر اپنی ماں کے ساتھ بخجور میں رہا مگر جاکیر دارانہ ماحول میں اس کی توجہ تعلیم کی طرف کم رہی۔ دوسرے وہ ماں کا لاڈلہ بھی تھا دن بھر تفریح کرتا اور پھرتا رہتا۔ حویلی کی لونڈی باندیاں اس کی دوست تھیں اماں خوش تھیں کہ ایرج اور اس کی ماں حویلی سے چلی گئی۔

پتا جی بھی دو کلڑوں میں بٹ گئے۔ کان پور میں ہوتے تو جاکیر کا انتظام بیوی کے ہاتھ میں ہوتا اور وہ بیٹے کو کھلی چھوٹ دے دیتے۔ اس طرح شکر ہر طرح کی برائیوں میں گرفتار ہوتے گیا۔ جہاں دولت ہو اور اقتدار بھی ساتھ ہو شراب و شباب بھی ضرور آتا ہے۔

اور پھر آدمی پھسلن پر آ جاتا ہے، وہ رکنا بھی چاہے تو رک نہیں پاتا۔ اس کے دوست احباب اس کو روکنے کا موقع نہیں دے پاتے کیوں کہ اس ہے ان کو بھی عیش کا موقع ملتا ہے۔

شکر جوان تھا اور پوری جاکیر اس کے کنزروں میں تھی، وہ بہت تیز دوڑ رہا تھا۔ شکر کے لکھن راجہ بھگت ناتھ کے سامنے تھے مگر وہ خاموش تھے ان کا زیادہ وقت کان پور میں ایرج اور اس کی ماں کے ساتھ گزرتا تھا، یہاں کی زمین اور حویلی ایرج کے نام تھی ایرج نے وکالت بھی کر لی تھی اور اس پیشے سے وہ وابستہ ہو گیا، زمینوں کی دیکھ بھال تو پتا جی کرتے تھے۔ وہ ایک اچھا وکیل تھا بہت ٹھنڈے مزاج کا اور محنت کرنے والا اس کے پاس جو کس آ یا اس نے جیت لیا اس کی شہرت بڑھ رہی تھی اور اس کی دولت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا جو باپ نے اس کو دیا اس نے خوشی سے لے لیا تھا۔ جاکیر میں کسی حصے کا ذکر بھی اپنی زبان پر وہ نہیں لاتا تھا یہی حالت اس کی ماں کی تھی۔

قدرت کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں جاکیر ختم ہو رہی

تھی شکر کے دوست اس کو دیک کی طرح چاٹ رہے تھے اور شکر شراب و شباب میں مدھوش تھا۔

باپ سے اس نے تعلق ختم کر لیا تھا مگر باپ نے پھر بھی اس کو جاگیر کا مختار بنا دیا تھا۔

زمین بیوں کی تجوری میں جاری تھی، باغ اجڑ کر ختم ہو رہے تھے اور آمدنی کے ذرائع ختم ہو رہے تھے اور شکر کے دوست دور ہوتے جا رہے تھے۔ یہی دنیا کی ریت ہے جہاں گزرنہ ہو وہاں کھیاں بھی نہیں آتیں۔ شکر اکیلا ہوتا جا رہا تھا اور اب اس کے پاس جاگیر کے نام پر صرف حویلی بھی اور وہ ایک بننے کے پاس رہن بھی اور اس پر اتنا روپیہ لیا جا چکا تھا کہ شکر اس کو ادا نہیں کر سکتا تھا۔

اس وقت شکر کی ماں کو اور شکر کو باپ کی یاد آئی اور دونوں کان پور راجہ صاحب کے پاس آ گئے ایرج نے دونوں کا سواگت کیا اور کہا ”بھیا کیسے آنا ہوا؟“

”پتا جی کی یاد آئی تو چلے آئے“ شکر بولا۔

راجہ بھگت ناتھ نے غصے سے کہا ”یاد آئی ہے یا ضرورت لائی ہے، تیرے سب کا نام مجھے پتہ ہیں، تو نے پوری جاگیر شراب میں بہادری، تمام زمینیں بیوں کی تجوری میں چلی گئیں، سب باغات جل گئے تیرے پاس کیا ہے؟ میں نے پوری جاگیر تجھے سوپ دی کچھ نہیں لیا تو نے آج تک پلٹ کر خبر نہ لی اور یہ تیری ماں اس کو بھی پتی کی کچھ خبر نہیں۔ یہ بھی سب پا کر مست ہو گئی اور تو تو راجہ تھا اب میرے پاس آیا کیوں ہے؟“ وہ بولے۔

ایرج نے باپ کو کہا ”پتا جی ایسا نہ کہیں گھر آئے کسی کو ایسا نہیں کہا جاتا اور برے وقت میں اپنے ہی یاد آتے ہیں بھیا تم پتا جی کی بات کا برا نہیں مانا یہ ذرا جذباتی ہو گئے تھے۔“

”میں نے برا نہیں مانا یہ بڑے ہیں۔ پانچ جوتے بھی مار دیں تو بھی میرا کیا جائے گا۔“ شکر بولا۔

”ہاں ایرج بیٹا اب آپ ہیں، برا بھلا کہہ دیں تو بھی سننا پڑے گا۔“ شکر کی ماں نے کہا۔

شکر بولا۔ ”تمہاری والدہ نظر نہیں آ رہیں.....“

”اندر ہیں..... آپ لوگوں کے سامنے نہیں آ رہیں کر شاید آپ لوگ پسند نہ کرو کیونکہ وہ تو پہلے بھی آپ کے نشانے پر رہی ہیں..... معاف کرنا بھی بات سچی زبان پر آ جاتی ہے کبھی کبھی.....“ ایرج نے جواب دیا۔

دونوں خاموش رہے تو راجہ بھگت ناتھ بولے۔ ”اب یہ بھی بتلائے دو کہ آئے کیوں ہو؟ بے مطلب تو تم آنے سے رہے، یہ تو میں جانتا ہوں۔“

”مصیبت کی گھڑی میں کہاں جائیں یہ بتاؤ۔“ بیوی بولی۔

”یہ مصیبت کون لایا ہے؟ ایرج وہاں ہوتا تو تم اس کے سر پر ڈال کر الگ ہو جاتیں۔ ارے تم نے اور تمہارے لاڈلے نے جو بویا ہے وہ تو کاٹنا ہوگا۔“

”حویلی گرن، بن پڑی ہے اور بنیا کہتا ہے کہ پوری رقم ادا کرو یا خالی کرو۔ سات پشتوں کی عزت داؤ پر لگی ہے میں کیا کروں؟“ شکر بولا۔

”تو نے سات پشتوں کی عزت کی رکھوالی کی ہے ارے تو اسی جاگیر میں کمی بن کر رہے گا تیرا راج پاٹ اور تیری ماں کی اکڑی گردن نرم جب ہی ہوگی اب ذرا کمی بن کر تو وہ اب تجھے پتہ چلے گا کہ زندگی کیا ہے۔ تو نے میرا نام ڈبو دیا، خاندان کی سات پشتوں کی بنائی عزت کو ملیا میٹ کر دیا اب میرے پاس کیا رکھا ہے؟ کان پور میں سب ایرج کی محنت اور تعلیم کی بدولت ہے۔ تو نے عزت برباد کی ہے مگر ایرج نے عزت بڑھائی ہے، یہ اس شہر کا بڑا وکیل ہے تو راجہ تھا مگر دھوبی کا کتا بن گیا ہے۔ میں تیرے اور تیری ماں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“ راجہ بھگت ناتھ غصے سے بولے اور ان کا چہرہ مارے غصے اور غم سے سرخ ہو گیا۔ ان کے منہ سے سفید سفید کف بہنے لگا اور چار پائی پر گر پڑے ایرج نے دوڑ کر ان کو پکڑا، ان کے پورے بدن میں لرز اٹھا، ہاتھ پیرا کڑ رہے تھے اور چہرہ ایک طرف جھٹکا جا رہا تھا۔

ایرج کی سمجھ میں آ گیا کہ ان پر فاج کا ایک ہوا ہے، اس نے فوراً ان کو گاڑی میں ڈالا اور ایک بڑے

دوا خانے لے گیا۔ شکر بھی ان کے ساتھ تھا۔ ڈاکٹروں نے فوری طور پر علاج شروع کیا اور کہا کہ ایک بڑا خطرناک تھا آپ فوراً لے آئے تو کچھ امید ہے ہم کچھ کر سکیں۔ مگر سات روز بھی مسلسل علاج کے بعد صرف اتنا ہوا کہ راجہ صاحب کی سانس چل رہی تھی ان کو تالی کے ذریعہ غذائی جاری تھی۔

پھر ایریج نے ان کو دلی لے جانے کا فیصلہ کیا اور ایک گاڑی کا بندوبست کر لیا۔ ایک ڈاکٹر بھی ان کے ساتھ رکھا گیا اور وہ بہت جیزی سے دلی کی طرف روانہ ہوئے۔ چوبیس گھنٹے سفر کر کے وہ حکیم وقار کے مطب میں آ گئے یہاں پر فوری طور پر ان کا علاج شروع ہوا۔ حکیم وقار اور رولوکا نے ان کا معائنہ اچھی طرح کیا اور پھر دونوں نے ان کی حالت کے پیش نظر ایک تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا اور ایریج سے کہا۔

”آپ کے مریض کی حالت تسلی بخش نہیں ہے آپ نے آنے میں دیر کر دی اور پھر سفر نے اور زیادہ ان پر اثر کیا ہے مگر جب تک سانس تب تک آس، ہم ان پر ایک نئی دوا کا تجربہ کرتے ہیں آپ کا مریض تو آخری منزل پر ہے اگر وہ دوا کام کر گئی تو ان کو زندگی اور صحت مل جائے گی ورنہ موت کا علاج تو کسی کے پاس بھی نہیں ہے، اب آپ بتائیں کہ ہم علاج کریں کہ نہیں.....“

ایریج نے ایک منٹ سوچا اور پھر جلدی سے بولا۔
”آپ علاج کریں۔“

حکیم وقار نے کہا۔ ”ٹھیک ہے..... آپ باہر انتظار کریں۔“ ایریج باہر چلا گیا۔

اور حکیم وقار نے جیب سے وہ پھول نکالا اس کی ایک پتی تو ڈکر مریض کے منہ میں ڈال دی۔ باقی پھول رولوکا نے مریض کے بدن پر مسلنا شروع کر دیا، مریض نے چند منٹ بعد ایک جھر جھری لی۔ رولوکا کی مالت جاری رہی اور دس منٹ کی مالت کے بعد مریض کے اکڑے ہاتھ پیر نرم ہو گئے اور ان میں زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ رولوکا نے مالت کا عمل

جاری رکھا اور مریض نے آنکھیں کھول دیں اور ہاتھ پیر ہلانے لگا۔ رولوکا نے مریض سے پوچھا۔

”اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟“

مریض بولا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔“

”آپ اپنے ہاتھ پیر اور گردن کو حرکت دیں۔“ مریض نے گردن اور ہاتھ پیروں کو حرکت دی اور بولا۔

”میرا جسم کام کرتا ہے میں اٹھ کر بیٹھ سکتا ہوں۔“ رولوکا بولا۔ ”تو پھر بیٹھ جائیں۔“ مریض اٹھ کر بیٹھ گیا پھول کی جادوئی کرامات نے ایک گھنٹے میں مرتے ہوئے آدمی کو تندرست کر دیا..... مریض نے پانی پیا اور بھوک کی شکایت کی۔

حکیم وقار نے دروازہ کھول کر ایریج کو اندر بلا لیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا باپ بستر پر سکون سے بیٹھا ہوا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حقیقت کتنی یا خواب، وہ حیرت سے بولا۔ ”باپو آپ ٹھیک ہیں۔“

”ہاں ایریج میں ٹھیک ہوں یہ لوگ انسان نہیں دیوتا ہیں۔“ راجہ بھگت ناتھ بولے۔

حکیم وقار نے مسکرا کر کہا۔ ”شری مان ہمیں دیوتانہ بتائیں انسان ہی رہنے دیں۔ دنیا میں دیوتاؤں کی ضرورت نہیں ہے ضرورت انسانوں کی ہے۔“

بھگت ناتھ بولے۔ ”حکیم صاحب آپ نے ٹھیک کہا۔ آج کی دنیا کو انسانوں کی ضرورت ہے۔“

رولوکا کے اشارے پر ایک شخص دودھ لے آیا تو رولوکا نے کہا۔ ”آپ کو بھوک لگ رہی تھی آپ یہ دودھ پئیں اس کے بعد دو تین گھنٹے آرام کریں، آپ کا مرض تو ختم ہوا، اب کمزوری دور کرنا باقی ہے۔“

بھگت ناتھ نے پورا گلاس پی لیا اور بولے۔ ”آج دودھ میں جو ملا ہے اس سے پہلے بھی نہیں ملا تھا۔“

حکیم وقار ہنس کر بولے۔ ”آپ کئی دن کے بھوکے تھے اس وقت تو آپ کو ہر چیز اچھی لگتی.....“

”میں کھڑا ہو کر دیکھنا چاہتا ہوں۔“ بھگت ناتھ نے کہا۔

رولوکا نے ان کو پکڑ کر کھڑا کر دیا اور بولا۔ ”دو چار قدم چلیں، گریں گے نہیں۔“

بھگت ناتھ دروازے تک گئے اور پلٹ کر آئے اور بولے۔ ”مجھے پتہ ہی نہیں چل رہا کہ میں بیمار بھی تھا۔“
”آپ پر اللہ کی مہربانی ہوئی ہے۔“ حکیم وقار بولے۔

”مجھے ایسا لگتا ہے جیسے مجھے کسی جادوگر نے طوطا بنا کر پنجرے میں بند کر دیا تھا اور آپ نے اس پنجرے کو توڑ کر دوبارہ مجھے انسان بنا دیا ہے، عجیب خواب کی سی کیفیت ہے۔“

”اس بھیانک خواب کو بھول جائیں، میری بات کو یاد رکھیں، انسانی اعضاء ایک حد تک دباؤ برداشت کرتے ہیں اس کے بعد ٹوٹ پھوٹ کا عمل ہونے لگتا ہے، آپ پر ضرور کوئی ایسا دباؤ آیا تھا جس نے آپ کے خون کی گردش کو متاثر کیا تھا اور آپ کے اعضاء کو بے کار کر دیا تھا، اب آپ کو یہ احتیاط کرنا ہوگی کہ آپ کے دماغ پر غیر ضروری بوجھ نہ آئے، گردش خون نہ بڑھے۔“ رولوکا نے مشورہ دیا۔

پھر حکیم وقار نے ایرج کو مخاطب کیا۔ ”اپنے والد کا خیال رکھنا، جو لوگ اپنے بزرگوں کو خوش رکھتے ہیں اللہ ان کو بھی کبھی ناخوش نہیں ہونے دیتا.....“

”شکریہ حکیم صاحب آپ کے علاج کا بھی اور آپ کے مشورے کا بھی یہ کب تک یہاں رہیں گے۔“ ایرج نے پوچھا۔ ”آپ آج ہی لے جاسکتے ہیں مگر آپ کا سفر لمبا ہے اس لیے ان کو ایک دو دن آرام کرنے دیں تو اچھا ہے۔“

حکیم وقار نے جواب دیا۔ دو دن بعد بھگت ناتھ کان پور چلے گئے گاڑی سے گھر پر وہ خود اتارے تو ان کو دیکھ کر شکر اور ان کی ماں دوڑ کر ان کے پاس پہنچے۔ شکر بولا۔ ”پتا ہی آپ کیسے ہیں؟“

”دیکھ رہا ہے ٹھیک ہوں، تو نے میرے جانے کا پورا انتظام کر ہی دیا تھا۔“

ایرج نے شکر کو جواب دینے سے منع کیا اور کہا۔ ”آئیے پتا جی آپ اندر آئیے.....“ بھگت ناتھ کو بستر پر پہنچا کر وہ واپس آیا اور بولا۔ ”بھیا باپو کی حالت ایسی نہیں کہ کوئی ذرا سی بھی بات ان کے مزاج کے خلاف کی جائے جو بات کرنی ہے آپ مجھ سے کریں۔“

”بات یہ ہے ایرج کہ اب میرے پاس بھی وقت کم ہے، بنیا کوٹ میں جانے کو تیار بیٹھا ہے۔ اس کی رقم میرے اوپر چالیس ہزار ہے اس نے حویلی پر دی ہے اور تھوڑی تھوڑی کر کے دی اور مجھے بھی اندازہ نہیں تھا اور رقم بڑھتی گئی اگر اس کو رقم ادا کر دی جائے تو حویلی بچ جائے گی اور اگر نہ دیں تو خاندانی عزت تو جائے گی، میں بھی کسی جھوپڑی میں پڑا ہوں گا۔“ شکر بولا۔

”بھیا آپ نے پوری زمینداری لے لی تھی میں نے اعتراض نہیں کیا تھا اور ساری زمینیں برباد کر دیں میں نہیں بولا، باپو کی ہر چیز پر آپ نے قبضہ کر لیا تھا اور پھر برباد بھی کر دیا اب حویلی اور خاندان کی آن کی بات آپ کرتے ہیں جس وقت برباد کر رہے تھے اس وقت آپ کو اس کا خیال نہیں آیا جب آگ نے سب کچھ جلا دیا اور آپ کا تن جلنے لگا تو اس وقت خاندانی آن بان آپ کو یاد آگئی میں ایک دیل ہوں دیل ہر کام قانونی طریقہ پر کرتا ہے۔ میں بیٹے کا حساب بیباک کر دوں گا مگر حویلی آپ کی نہیں رہے گی وہ میرے نام ہوگی اس کا مالک میں رہوں گا مگر آپ میرے بڑے بھائی ہیں اور رہیں گے آپ ہی اس میں رہیں، میں کبھی نہیں آؤں گا اور یہ بات صرف ہم دونوں کو ہی پتہ ہوگی اور ہاں یہ بھی بتا دوں کہ میں یہ کام آپ کو نچا دکھانے یا حویلی حاصل کرنے کے لیے نہیں کر رہا بلکہ آپ کی آنکھیں کھولنے کے لیے کر رہا ہوں ابھی بہت وقت ہے خود کو اور نہ گرائیں۔ جاگیر داری کا چولا اتار کر انسان کا چولا اختیار کریں میں آپ کی مدد کروں گا اگر آپ کے قدم پھر سے ڈنگائے تو یاد رکھیں اب کے گرے تو میں پھر اٹھانے بھی نہیں آؤں گا آپ بے فکر ہو جائیں میں بنیا سے بات کر لوں گا اس کا پتہ مجھے

دے جائیں۔“ اریح نے اپنی بات مکمل کی۔
اور شکر کرواپس آ گیا اور حوبلی کا سلسلہ ختم ہوا۔

☆.....☆.....☆

گوگی بہت بڑا شیطان کا چپلا تھا اس کے دماغ میں شیطان نے بہت کچھ بھر دیا تھا۔ اس کے داکیں بائیں بڑے بڑے طاقت ور پیر کھڑے کر دیئے تھے وہ بے چین تھا زمین کے اندر جانے کو مگر کنوئیں کے راستے پر کچھ اس طرح کا پہرہ تھا کہ اس کے نزدیک کوئی نہیں جاتا تھا۔ بڑے سے بڑا پیر دور بھاگتا تھا، گوگی بڑی تیاری سے آتا تھا اور ہر بار اندر جانے کی حسرت لیے واپس چلا جاتا تھا۔ یہ روز روز کی آنکھ پھولی اور پہرہ داری سے رولوکا کے بہت سے کام رک گئے تھے آخر رولوکا نے اس دروازے کو بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

کئی ٹرک پتھروں کے میدان میں آ گئے اور رات کو سب کنوئیں کے اندر چلے گئے۔ اس کے بعد کئی ٹرک کوئلے کے آگئے وہ بھی اندر چلے گئے پھر چونا آیا اور وہ بھی اندر چلا گیا۔ کنواں بہت گہرا تھا مسلسل مٹی اور چونا آتا رہا اور رات کو کنوئیں کے اندر جاتا رہا کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ آخر حوبلی میں یہ سب کچھ کہاں جا رہا ہے کنواں بھرتا گیا پانی چھوڑا گیا اور پھر مٹی بھری جانے لگی۔

اور پھر کنواں پورا ہو گیا۔ اس دوران گوگی نہیں آیا کنوئیں کی منڈیر ایسی ہی تھی اور وہ دور سے کنواں ہی نظر آتا تھا گوگی کچھ دنوں کے بعد آ گیا پہرہ سخت نہ تھا مگر رولوکا اس کے قریب ہی موجود تھا۔

اس کے سارے کارندے میدان کو گھیرے ہوئے تھے۔ گوگی نے دیکھا منڈیر پر کوئی نہیں ہے اور پہرہ بھی نظر نہیں آتا وہ تیز رفتاری سے کنوئیں کی طرف گیا اور جھانک کر دیکھنے لگا وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پانی منڈیر کے اوپر تک موجود تھا اس نے ہاتھ ڈال کر پانی کی موجودگی کا یقین کرنا چاہا اور ہاتھ پانی میں ڈال دیا۔ پانی موجود تھا اور اس میں آسمان پر چمکتا چاند بھی نظر آ رہا تھا وہ غصے سے بولا۔ ”پھر دھوکا.....“

رولوکا کی آواز آئی۔ ”تو بڑا بیوقوف ہے، اتنی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی کہ تو کسی پرفوج لے کر حملہ کرنے آتا ہے تو کیا اس کو یہ حق نہیں کہ اپنی حفاظت کرے، تو کنوئیں کے اندر جانا چاہتا تھا تو جا، آج میں تجھے نہیں روکوں گا، آخر تو نے بھی بڑی محنت کی ہے۔ تیرے گرو نے بھی تجھے خوب نوازا ہے۔“ رولوکا بولا۔

”آخر تو تھک گیا نہ.....“ وہ غرور سے بولا۔

”میں تھکا نہیں تجھ پر رحم آ گیا ہے۔“ رولوکا بولا۔

”رحم ارے تو کیا رحم کرے گا، جو رحم کرتے ہیں وہ خود قابل رحم ہوتے ہیں، میں شکتی رکھتا ہوں، میرے ساتھ میری شکتی ہے، میں آج ضرور زمین کے راز کو پاؤں گا اور اس لاش کو پا کر زمین کا رعبہ بنوں گا میرا یہی سپنا ہے، یہی گرد کی تمنا ہے۔“ گوگی منڈیر پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا اور ہر طرف اشارے کرنے لگا وہ اپنے پیروں کو ہوشیار کر رہا تھا ان کو بیدار کر رہا تھا، رولوکا اس کا تماشا دیکھ رہا تھا، کچھ دیر گوگی یہ تماشا کرتا رہا اور پھر منڈیر سے کنوئیں کے اندر کود گیا۔ گوگی کے پانی میں کودنے کے بعد ایک سانس تک نہ آئی اور اس کا جسم موم کی طرح پگھل کر پانی کو گدلا کر گیا اس کے سارے پیر منتظر رہے مگر کھیل ختم ہو چکا تھا۔

پوری دنیا پر راج کرنے والا گوگی مہاراج کنوئیں کے پانی میں تحلیل ہو گیا۔ یہی قانون قدرت ہے ایک حد تک انسان کو چھوٹ لپٹی ہے اس کے بعد اس کی گرفت ہو جاتی ہے، اس کے سارے پیر اور شیطانی قوت اس کے کسی کام نہ آتی۔

وہ طاقت کے نشے میں بھول گیا تھا کہ آخر اس کائنات کا بنانے والا بھی کوئی ہے جو اتنی بڑی کائنات کو بنا سکتا ہے اور اس کو چلا رہا ہے وہ آخر اپنے نظام میں مداخلت کب تک برداشت کرے گا۔

پھر اس کی رسی تنگ ہوگی اور گوگی جیسے ایک معمولی اشارے سے صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے یہی ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا، نام صرف ایک ہی رہے گا، اور وہ رب کائنات کا ہوگا.....

☆.....☆.....☆

مطب کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ باہر کے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ رولو کا اور میں ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ میرے ایک سوال پر رولو کا بولا۔

”حکیم صاحب انسان پھر انسان ہے وہ خود سے کتنا ہی بے نیاز ہو اپنے بارے میں کچھ بھی سوچتا ہو مگر انسان ہونے کے ناطے زندگی کی ضروریات سے غافل نہیں ہو سکتا۔ اس کے اندر کی دلکشی بھی باقی رہتی ہے اور فطری طلب بھی رہتی ہے۔ میں نے جو زندگی گزاری ہے اس کے باوجود میرے اندر وہ صفات موجود ہیں اور ان ہی میں حسن و دلکشی سے پسندیدگی کا احساس بھی زندہ ہے اور کسی حسین شخصیت کی قربت کا احساس بھی مگر یہ دوسری بات یہ ہے کہ میرے نزدیک حسن کا معیار کیا ہے۔ میں افریقن ہوں اور وہ بھی گھنے جنگلات اور دشوار گزار علاقے کا باشندہ، میرا معیار حسن کیا ہوگا جو حسین چہرے یہاں پر نظر آتے ہیں ان کی حیثیت میرے نزدیک کیا ہے۔“

”تو پھر آج بتاؤ تمہارا معیار کیا ہے تم حسن کو کس انداز میں پرکھتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت نازک سوال آپ نے کر دیا۔ میں اس سوال کا کیا جواب دوں میں زبان سے کچھ بھی کہہ دوں گا مگر وہ بے اثر ہوگا یہاں پر کچھ کرنا پڑتا ہے خود کو منوانا پڑتا ہے تو حقیقتوں کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

یہ میرے اور آپ کی ملاقات سے پہلے کی بات ہے۔ میں افریقہ سے باہر آ گیا تھا اور خود دوسری دنیا میں سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میرے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود میں کسی ہتھیار کو استعمال نہیں کر رہا تھا میں خود اپنی ذاتی شخصیت کو آزما رہا تھا۔ میں ایک ایسی سرزمین پر تھا جس پر ہزاروں سال کی تاریخ رقم تھی اس سرزمین نے ہزاروں سال پہلے بڑی ترقی کی تھی اس کے نشانات ریگستانوں میں بکھرے پڑے تھے آج کا انسان ہزاروں سال پہلے کے انسان کی ترقی کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ میں زندگی میں پہلی بار اس سرزمین پر آیا تھا۔ مصر کی ہزاروں سال پرانی تاریخ کی ان گنت پر

اسرار اور حیرت ناک کہانیوں کا مدفن یہ مقام ہے۔ اسی جگہ پائے جانے والے آثار فرامین مصر کے زمانے تہذیب اور معاشرتی و سماجی زندگی کی پوری طرح نشاندہی کرتے ہیں دور تک پھیلے ہوئے کھنڈرات، صاحب نظر کے لئے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ میں نے تصور میں ہزاروں سال پہلے کے زمانے کو دیکھا یہ جگہ کتنی باروق اور اہمیت کی ہوگی..... شام ہوتے ہی لوگ اس جگہ سے دو رہو جاتے ہیں کیونکہ دور دور تک یہاں پر پانی نہیں ہے سواری صرف اونٹ کی ہے کوئی سیاح رات کو یہاں نہیں رکتا پتھروں کو دیکھ کر کہانیاں سنانے والے بھی چلے جاتے ہیں۔ ان کی روزی بھی خوب ہے ہر روز ایک نئی کہانی ہر پتھر کی ہر اہرام کی بنا لیتے ہیں۔

میں رات کو وہیں رک گیا ہر پتھر اور اہرام زبان حال سے آدمی کی بے ثباتی اور عبرت کی داستان بیان کر رہا تھا میں حیرت محویت اور تجسس کے ساتھ کھنڈرات پر لکھی ان کہانیوں کو پڑھتا رہا۔

اور رات کب گزر گئی مجھے اندازہ نہ ہوا۔ اس رات کے بعد بھی نہ معلوم کتنی راتیں میں ان کھنڈرات میں پھرتا رہا میری سمجھ میں خود نہیں آ رہا تھا کہ میں کس کی تلاش میں ہوں میں کیوں اپنا وقت یہاں پر بادر کر رہا ہوں۔ میں اپنی اس وقت کی کیفیت بیان کرنا چاہوں تو بھی شاید نہ کر سکوں۔

ان ہی کھنڈرات میں مجھے ایک راستہ نظر آیا اور میں اس پر چل پڑا ساری رات چلتا گیا کھنڈرات دور ہو گئے دن نکل آیا سورج کی پہلی کرنیں ریگستان پر پھیل رہی تھیں دور دور کوئی انسان نہیں تھا۔

یہ کوئی راستہ بھی نہیں تھا مگر مجھے یہ راستہ ہی نظر آ رہا تھا لیکن اس کے دونوں طرف اونٹ کے گھانوں کی طرح کی چٹانیں تھیں ان پر کچھ سوکھی جھاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ آسمان پر دو چار چیلیں عین میرے سر کے اوپر منڈلا رہی تھیں جیسے ان کو یقین ہو کہ میں ان کی غذا بننے والا ہوں۔

بنائی ہوگی؟ زمین کی اتنی گہرائی میں یہ سرگ ان کے کس کام آتی ہوگی؟ مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا، میں سوچتا رہا اور آگے بڑھتا رہا۔ نہ معلوم میں کتنا چلا ہوں گا کہ سرگ ختم ہوگئی جہاں سرگ ختم ہوئی وہاں پر روشنی تھی مگر اتنی کہ غور سے دیکھنے پر کچھ نظر آجائے جہاں پردن رات کی تیز کرنا دشوار تھا۔

میں نے سامنے کی طرف غور سے دیکھا ایک دروازہ نظر آیا میں اس دروازے کی طرف چلا دروازہ بند تھا اس کے کیواڑ پتھر کے تھے یہ ایک چوکور عمارت نظر آتی تھی کیواڑوں پر مصریوں کے نقش نگار کھودے گئے تھے اور رنگ بھی کیا گیا تھا ہزاروں سال گزر جانے پر بھی یہ نقش نگار صاف نظر آتے تھے دروازے پر ایک پتھر کی تختی بھی لگی تھی اس پر قدیم زبان میں کچھ لکھا تھا میں دروازے کے بالکل سامنے کھڑا تھا اور میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں اس کی تلاش میں آیا ہوں۔ میں نے دروازے پر ہاتھ رکھا، میرا خیال تھا اس پتھر کے دروازے کو کھولنا آسان نہیں ہوگا۔ صدیوں سے بند پتھر کا یہ دروازہ اتنی آسانی سے کھل جائے گا اس کا میں گمان نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ہاتھ پر ذرا زور ڈالا اور گزر گڑا ہٹ کی معمولی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اندر اندھیرا نہیں تھا دو دھیا روشنی پھیل ہوئی تھی۔ میں نے افریقہ میں بڑے بڑے کتبے کئے تھے اور دوسروں کے بھی دیکھے تھے ایک سے ایک بڑا سحر وہاں پر موجود ہے وہ جادوئی سرزمین کہلاتی ہے مگر میں تسلیم کرتا ہوں کہ مصریوں کا علم ہزاروں سال پہلے بھی ہم سے زیادہ تھا۔

میں نے دروازے کے اندر قدم رکھا۔ چوکور کمرہ تھا زیادہ بڑا نہیں زیادہ سے 10X10 کا ہوگا اس کے درمیان میں ایک چبوترہ تھا اندازاً ایک فٹ اونچا۔ اس پر ایک تابوت رکھا تھا اس تابوت کے دائیں طرف ایک چبوترے پر ایک ڈھانچہ پڑا تھا۔ میں نے اس کو ہاتھ نہیں لگایا کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ ہزاروں سال کا یہ ڈھانچہ ہاتھ لگا تو ہی مٹی ہو جائے گا۔ ایسا ہی ایک ڈھانچہ بائیں

میں اپنے اس سفر کو کیا نام دوں بس اس کو اقدام جنون ہی کہہ سکتا ہوں میں جنون اور مصلحت کوئی اور پس و پیش میں یقین نہیں رکھتا جنون تو ایک ادائے رندانہ ہے۔ قدم بڑھایا تو بڑھ گیا جنون میں جب قدم اٹھایا جاتا ہے تو پیچھے پلٹ کر کون دیکھتا ہے میں نے بتایا نا کہ میری جو کیفیت اس وقت تھی اس کا بیان آسان نہیں۔

میرا ہر احساس مجھ سا گیا تھا صرف اتنا یہ تھا کہ میں آگے جا رہا ہوں۔ دور دور آبادی نظر نہیں آتی تھی ریت کے اونچے اونچے ٹیلے اور ان پر دوڑتی ریگ ماہی، ہوا میں باریک سی سرسراہٹ اور دھوپ کی تمازت، کبھی کبھی تیز ہوا کے ساتھ ریت میرے چہرے پر لگتی تھی۔ سارے دن گزر گیا میرا سفر تمام نہ ہوا۔ رات آگئی اور میں ایک نالے نما راہ پر آ گیا آسمان پر تارے نظر آ رہے تھے میری دونوں طرف پتھر کی دیوار تھی یہ نالہ گہرا ہوتا جا رہا تھا میں زمین کے اندر کی طرف چل رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ڈھلان بڑھتی جا رہی تھی اور میری رفتار خود بخود تیز ہو رہی تھی۔ اچانک یہ نالہ ایک سرگ میں تبدیل ہو گیا اور میں ایک اندھیری سرگ میں چلنے لگا اندھیرے کے باوجود میں کسی دیوار سے نہیں ٹکرایا۔ کوئی پتھر میرے قدموں سے نہیں ٹکرایا۔ میں حیرت انگیز طور پر ان ہی مقامات سے گزرا جہاں پر راستہ صاف تھا۔ میری کوئی پر اسرار طاقت میری مدد نہیں کر رہی تھی اور میں کوئی مدد لینا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے خود کو آزاد مانا تھا۔ نئی دنیا میں آیا تھا مجھے اپنا وزن کرنا تھا اپنی قوت برداشت کو آزمانا تھا۔

سرگ کا سفر کتنا لمبا تھا اس کا اندازہ نہیں۔ اندھیرے نے دن رات کی تیز ختم کر دی تھی سرگ میں ہوا کا گزر تھا کبھی کبھی ٹھنڈی ہوا چہرے پر لگتی تھی تو اچھا لگتا تھا۔ میں اپنے پورے افریقی قد کے ساتھ سفر کر رہا تھا سرگ میرے قد سے بھی اوپر تھی میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کی چھت کا اندازہ کرنا چاہا مگر میرا ہاتھ چھت سے نہیں ٹکرایا۔

میں نے سوچا مصریوں نے اتنی لمبی سرگ کیوں

انکشافات کی ہرگز توقع نہیں تھی۔

اچانک اس کے جسم کو حرکت ہوئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے جسم پر ہزاروں سال پرانا لبادہ تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے گہری فکر اور تجسس کا اظہار ہوتا تھا۔ اس نے میری طرف اپنی بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر دیکھا مجھے ایسا لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو تمہارا شکر ہے۔ اس کے حسن میں جو پرشکوہ عظمت تھی دل اور دماغ کو تسخیر کرنے والی جو صلاحیت تھی اور آنکھوں میں طلسماتی چمک تھی ایسا لگتا تھا کہ کسی مصور نے اسے کیونٹس پر سے اتار کر تابوت میں رکھ دیا ہے۔

وہ تابوت سے نکل کر زمین پر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر انوکھی سی مسکراہٹ آ گئی جیسے اس نے زمین کو فتح کر لیا ہے۔ وہ میرے سامنے کھڑی ہو گئی اس کا قدمیرے افریقی قد سے ذرا کم تھا مگر عام زنانے قد سے کہیں زیادہ تھا۔ اس کا جسم نہ فربہ تھا نہ دبلا جہاں جس قدر گوشت کی ضرورت تھی موجود تھا ہر چیز موزوں اور خوبصورت تھی میں اس کے حسن کے حیرت میں مبتلا تھا میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں اس سے متاثر ہو گیا تھا۔ زمین کی گہرائیوں میں، ہزاروں سال پرانا حسن کا پیکر، وہ دوشیزہ میرے سامنے زندہ کھڑی تھی میں اس کو اور مجھے دیکھ رہی تھی۔

مجھے اپنی کسی ضرورت کا احساس نہیں تھا میں نے کب سے کچھ نہیں کھایا تھا میں نے کتنا لمبا سفر کیا تھا۔ شاید اس کو بھی یہ احساس تھا کہ میں نے دور کا ایک انسان ہوں میری بھی کچھ ضرورت ہو سکتی ہے۔ بھوک، پیاس مردوں کو نہیں لگتی زندوں کے لئے تو یہ سب ضروری ہے۔

اس کے ہونٹوں کی نگھڑیوں میں جنبش پیدا ہوئی پھر اور بڑھی اور موتیوں کی طرح دانت نظر آنے لگے اور اس کے منہ سے نہایت باریک سریلی آواز برآمد ہوئی۔

”تم نے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔“ یہ الفاظ کس زبان میں بولے گئے پتہ نہیں مگر میری سمجھ میں آ گئے۔ میں اس کی طرف بڑھا کہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لوں وہ فوراً مجھ سے دور ہو گئی۔

طرف پڑا تھا ان دونوں کے درمیان میں ایک لکڑی کا صندوق تھا اس پر سونے کی پتیاں چڑھی ہوئی تھیں نہ معلوم کس لکڑی کا یہ صندوق تھا کہ اس کا رنگ کالا ہو چکا تھا میں نے اس کا ڈھکن اٹھایا تو حیران رہ گیا اس میں ایسے نایاب ہیرے جواہرات بھرے تھے کہ ان کی روشنی کمرے میں پھیل گئی پھر میں نے اس دودھیاروشنی پر غور کیا روشنی دیواروں سے پھوٹ رہی تھی اور ہوا بھی دیواروں سے آرہی تھی کچھ برتن تھیں اور کچھ کھانے کا سامان بھی رکھا تھا۔ میں پھر تابوت کے سرہانے کی طرف آ گیا اور میں نے تابوت کے ڈھکن کو ایک طرف سرکا دیا۔ اندر سے ایک عجیب سی خوشبو باہر آئی ایسی خوشبو میں نے کبھی نہیں سونگی تھی کبھی لوہان کا شہہ ہوتا تھا کبھی کانور کا شمع ہوتا تھا۔ میں نے ڈھکن کو پورا اٹھا کر زمین پر رکھ دیا۔

اف میرے خدا! میں حیران رہ گیا کیونکہ خوشبو کا چہرہ پوری طرح روشن تھا اس کی لمبی پلکیں، ستواں ناک اور سنہری بال تھے رخسار دیکھتے ہوئے چودھویں رات کی طرح نمایاں تھے ہزاروں سال سے اس بند تابوت میں ایسی زندہ حقیقت میرے سامنے آئے گی میں اس کا گمان نہیں کر سکتا تھا۔ مصر کی سرزمین نے مجھے نئے نئے عجوبات سے روشناس کر دیا تھا۔ میں حیرت سے اس حسین چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا میں اس کی تلاش میں آیا ہوں اسی نے مجھے اپنے پاس بلایا ہے میں زمین کے کتنے اندر ہوں مجھے اندازہ نہیں تھا یہ کوئی بڑا اہرام نہیں تھا یہ کسی شاہ کا مدفن نہیں تھا نہ یہ کوئی ملکہ ہے پھر یہ کون ہے اور میں خود بخود کیوں اس کے پاس آ گیا ہوں؟ اس کے بالوں کی ایک لٹ ہوا سے اڑ کر اس کے حسین ماتھے پر آ گئی۔ میں نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر اس کو ہٹانا چاہا ابھی میرا ہاتھ اس کے چہرے سے ایک انچ دور تھا کہ اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کے حسین ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ آ گئی ایسی مسکراہٹ جس پر آدمی اپنا تین من دھن سب چھوڑ سکتا ہے میں حیران رہ گیا میرا ہاتھ جہاں تھا وہیں پر رک گیا۔ مجھے اتنے غیر فطری غیر عقل اور ناممکن العمل

میں کیا تھا مگر جس طرح میں اس کی بات سمجھ رہا تھا اسی طرح اس نے بھی میرا سوال سمجھ لیا۔

”میں شہزادی ریتھما کی کنیز خاص ہوں۔ شہزادی ریتھما سیٹی فرعون نمبر ایک کی لڑکی تھی سیٹی اول خود کو خدا کہتا تھا اور خود کو اپس دیتا مشہور کر دیا تھا اس کے جنون کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی کو معاف نہیں کرتا تھا شہزادی اس کے کارنامے جانتی تھی۔ فرعون سیٹی نے ہزاروں زندہ آدمیوں کی میاں بٹوائی تھیں اور ان پر نہ جانے کیسے کیسے تجربات کئے تھے جو اس کو ذرا اپنا مخالف نظر آتا وہ اس کوئی کے لئے پیش کر دیتا تھا کہ ان میں بے چاری شہزادی بھی پھنس گئی۔

میں اس کی کنیز خاص تھی میری زندہ می بھی بنائی جانی تھی۔ اس میں شہزادی کی کوئی خطا نہیں تھی اس نے میرے لئے یہ کیا کہ وقت مانگ لیا اور خود کو پہلے پیش کر دیا۔ زمین کے اندر اس نے یہ دفن بنایا تھا اور مجھے بتا دیا تھا کہ میری می بننے کے بعد تم اس مقام پر اس علم کے ذریعہ آ جانا اور وقت مقرر کر کے تابوت میں لیٹ جانا یہ بند ہو جائے گا تم جو وقت مقرر کرو گی اس وقت اس تابوت کو کھولنے کوئی آئے گا تم اس کو خود بلاؤ گی وہ ایک نڈر اور جفاکش بہادر ہوگا تیری ہر طرح مدد کرے گا اور تجھے دنیا میں لے جاتے ہیں۔ تجھے تیرا گوہر مقصود تلاش کرنے کو صرف بائیس سال ملیں گے اگر تو اپنا گوہر مقصود حاصل کر سکی تو پھر اپنی طبیعت میں گمراہی کر سکتی ہے اور اگر تیرا منظور نظر نہیں ملا تو تجھے واپس آنا ہوگا۔“ وہ خاموش ہوئی تو میں نے پھر پوچھا۔

”نام تم نے اب بھی نہیں بتایا۔“

وہ ایک دلچسپ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”تم مجھے انتہائی کہہ سکتے ہو یہ نام میری ماں کا بھی تھا اور میری نانی کا بھی تھا، فرعون کی کنیزوں کے نام نسل در نسل چلتے تھے۔“

”بات اب بھی ادھوری ہے میں اور سوال کروں۔“

میں نے کہا۔

”ابھی یہ وقت نہیں آیا تم صرف مجھے دکھ لو۔ آج صرف یہی آرزو رکھو اور پوری کرو کل کی حسرت کا کیا پتہ پوری ہوگی کہ نہیں۔ جو میرے وہ حاصل کر لو آج میں نے ہزاروں سال کے بعد زمین پر قدم رکھا ہے آج تم ہزاروں سال کے بعد میرے گھر آئے ہو تم میرے محترم مہمان ہو تمہارے لئے میرا سب کچھ حاضر ہے مگر میرا جسم ابھی اس قابل نہیں کہ تمہاری زندگی کی گرمی برداشت کر سکے، مجھے اس زمین کی آب و ہوا میں سانس لینے دو، میں نے اپنے مہمان کے لئے جو رکھا ہے وہ حاضر ہے۔“ وہ سر ہانے کی طرف گئی اور مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور بولی

”یہ سب تمہارا ہے مگر میں ابھی تمہاری نہیں ہوں۔ تم میری امید رکھنا بھی نہیں اس لئے کہ میں جس کے لئے دوبارہ آئی ہوں مجھے اس کو تلاش کرنا ہے اگر وہ مجھے نہ ملا تو میں پھر اسی جگہ آ جاؤں گی میرا یہ مقبرہ اسی طرح رہے گا یہ زمین کی اتنی گہرائی میں ہے کہ اس کو تلاش کرنا اس تک آنا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ تم کو میں نے بلایا تو تم آئے ہو جن راستوں پر چل کر آئے ہو اب وہ نہیں رہے تم اور میں زمین کے بہت نیچے کھڑے ہیں یہاں پر انسانی قوم کبھی نہیں آئے گی۔“

میں نے پوچھا۔ ”اور میں یہاں سے واپسی کس طرح جاؤں گا۔“ تو وہ بولی۔

”میں جانتی ہوں تم معمولی نہیں ہو اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ رہوں گی اور ساتھ دنیا میں لے جاؤں گی۔ تمہاری ضروریات زندگی انسانی ضروریات ہیں دنیا میں آنے کے بعد میں بھی اس سے مبرا نہیں ہوں۔ اب آؤ میرے ساتھ تم میرے بال پکڑ سکتے ہو اور میرے ساتھ چل سکتے ہو۔ تم عام آدمی نہیں ہو میری رفتار کا مقابلہ کر سکتے ہو اور اگر کہیں نہ کر سکو تو کہہ سکتے ہو۔“

میں نے سفرد بارہ شروع کرنے سے پہلے کہا۔

”تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا تم کون ہو؟ تم کو کس

نام سے پکاروں گا؟“ میں نے یہ سوال اپنی مادری زبان

وہ بولی۔ ”شہزادی نے ٹھیک کہا تھا تم عام آدمی نہیں ہو، پوچھو کیا پوچھتے ہو؟“

”فرعونوں کے ذہن میں اہرام بنانے اور اس میں خود کو محفوظ کرنے کا خیال کیونکر آیا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”فرعونوں کو موت کا بہت ڈر تھا وہ مرنا نہیں چاہتے تھے وہ فنا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انسان

مرنے کے بعد بھی اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک اس کا جسم باقی رہتا ہے اور انسانی جسم کے فنا ہوتے ہیں

روح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ فرعون ہمیشہ رہنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے مرنے کے بعد بھی اپنے جسم کی

حفاظت کی اور پتہ نہیں وہ کہاں تک اس میں کامیاب ہوئے۔ مگر شہزادی ریتلھا کا تجربہ کامیاب ہوا کیونکہ میں

تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔ اس نے مجھے وعدے پر ماریا تھا اور وعدے پر زندہ کر دیا شاید ریتلھا کی ہڈیاں بھی

مٹی ہو چکی ہوں مگر اس کا علم لافانی ہے میں جس وقت اس تابوت میں لیٹی تھی اس وقت میری عمر اٹھارہ سال تھی اور

میں اٹھارہ کی زندہ ہوئی ہوں میری طبیعت عمر اگر ساٹھ سال ہے تو میری موت پچاس سال بعد ہوگی میں اپنی طبیعت عمر

میں انصاف نہیں کر سکتی مجھ پر اس طرح وقت اثر انداز ہوگا جس طرح عام زندوں پر ہوتا ہے جوانی بڑھاپا اور پھر

موت..... مصریوں نے جسم پر مٹی بنا کر محفوظ کرنے کا طریقہ اپنایا۔“

”روح کو کیوں نام محفوظ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک دو فرعونوں نے اس قسم کے تجربات کئے تھے انہوں نے روح کو جسم کا غلام بنانے کے طریقے بنائے

تھے روح انتہائی طاقتور چیز ہے اس کو وقت مقررہ سے زیادہ جسم میں قید نہیں کیا جاسکتا وہ ہر حالت میں جسم چھوڑ

یتی ہے پھر انہوں نے اسی روح کو دوبارہ جسم میں بلائے پر تجربات کئے تجربہ کامیاب نہیں ہوا اس طرح انہوں نے

صرف امراء اور شاہوں کے لئے ایسے انتظامات کئے کہ ان کی روہیں اہراہوں میں قید ہیں اور کسی بھی وقت می شدہ جسم میں دوبارہ آجائیں۔“ وہ بولی۔

”یہ تو ٹھیک ہے کہ ہر فنا میں بقاء ہے ہر موت میں زندگی ہے مگر اس طرح نہیں جس طرح مصریوں نے اس کو

کیا ہے یہ درست ہے کہ کوئی صورت معدوم ہوتی ہے تو کچھ زمانے کے بعد ارتقائی منزلیں طے کرنے کے بعد

ایک نئی صورت بلکہ میں تو کہوں گا اس سے بہتر صورت پیدا ہو جاتی ہے انسان آگے کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ نئی نئی

ایجادات کرتا ہے پہلے جو تصور تھا آج حقیقت ہو رہا ہے۔ مصریوں کا علم بے شک ایک عظیم علم تھا مگر وقت کی

ضرورت میرا مطلب ہے ہر زمانے کی ضرورت کے مطابق نہیں تھا۔ انہوں نے نہ معلوم کتنے انسانوں کو اپنے

تجربے کی نظر کر دیا ہوگا مگر اس کا فائدہ نہ ان کو ملتا نہ آنے والے زمانے کو اس کی بجائے اگر وہ کوئی ایسی ایجاد

کر جاتے جو آنے والے زمانے کے لئے کارآمد ہوتی اور ہر زمانے کے لوگ اس ایجاد کو اور ترقی دیتے رہتے تو ان کی وہ ایجاد انسان کے لئے ان کی یادگار ہوتی۔ وہ صرف

خدا اپنے کے چکر میں خود اپنی حفاظت کرتے رہے جسم اور روح کو بندش کرنے میں اپنا سارا وقت برباد کر دیا ان کے پاس کیمیاوی اصول تھے وہ کسی معجزے کی تخلیق کر رہے

تھے۔ مگر سیٹی اول کا شہر اور بیکل راکا کا ابن اعظم جو صرف فرعون کی روح اور جسم کو باقی رکھنے میں لگے رہے مگر ہوا کیا

وقت کی دھول نے سب کو اپنے نیچے دبا لیا۔“ میں نے کہا۔

”تمہاری بات میں وزن ہے میرے دوست تم نے اپنا تعارف نہیں کیا۔“ وہ بولی۔

”میں خطہ افریقہ کا ایک نہایت پسماندہ آدمی ہوں میری تعریف صرف اتنی ہی ہے۔“

”تم اپنے بارے میں کچھ کہو مگر میرے سینے میں شہزادی ریتلھا کا علم ہے وہ کہتا ہے تم اس سے بہت آگے

کی چیز ہو مگر تمہارا دل ایک چڑیا کی موت پر بھی روتا ہے میں شہزادی کے علم کی بدولت تمہارے سامنے ہوں تم

مصریوں کے علم کو مانو نہ مانو میرے لئے اس سے فرق نہیں پڑتا فرعون نے میرے ساتھ بھی کچھ اچھا نہیں تھا کہ میں

ان کی تعریف کروں۔ مگر شہزادی نے خود کو مٹا کر مجھے زندہ

رکھنا کسی کو شک نہ ہو کہ تم کوئی مافوق الفطرت چیز ہو خود کو چھپائے رکھنا جب بہت ضرورت پڑے تو بے شک استعمال کرنا۔“

”کیا یہ لوگ بہت بڑے ساحر ہیں.....؟“ انتونی نے پوچھا۔

”ان کا سحر وہ نہیں ہے جو کہ مصریوں کا تھا۔ ان کا سحر تم دیکھنا مگر زیادہ سوال ان سے نہ کرنا اگر سوال کرو گی یہ جواب نہیں دیں گے..... آؤ میں تم کو ہندوستان کی سرزمین پر لے چلتا ہوں یہ سرزمین بھی کم پر اسرار نہیں ہے آؤ میرا ہاتھ پکڑو۔“ میں نے کہا۔

”تم بھول رہے ہو کہ ابھی میں تمہارا ہاتھ پکڑنے کی حالت میں نہیں ہوں تم یہ سمجھ لو کہ مٹی کا جو برتن بنایا جاتا ہے وہ کتنا نازک ہوتا ہے میں ابھی اسی منزل پر ہوں ذرا سی ٹھٹھیں مجھے ریزہ ریزہ کر سکتی ہے۔“ انتونی بولی۔ ”تو پھر تم کو کسی گھٹی آبادی والی جگہ لے کر جانا بھی خطرناک ہو سکتا ہے تمہاری یہ کیفیت کتنے عرصہ رہے گی۔“ میں نے پوچھا۔

”گرم علاقے میں صرف سات دن اور ٹھنڈے علاقے میں چالیس دن کے بعد میرا جسم تم جیسا ہو جائے گا خون کی روانی بھی مکمل ہو جائے گی..... یہ بات شہزادی نے مجھے بتائی تھی۔ تو پھر کسی ایسے مقام پر چلتے ہیں۔ جہاں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہ ہو تمہارے لباس کا بھی مسئلہ طے کرنا ہے اور تمہاری غذا کا بھی تم یہ بتاؤ تمہاری غذا کیا ہے؟“

”یہاں کی آب ہوا مجھے گرم ملے گی تو ہر قسم کی غذا استعمال کر سکتی ہوں۔“ انتونی نے کہا۔

”تم کسی گاؤں کا تصور کرو میں تمہارے بال پکڑتا ہوں۔“

ایک منٹ کے بعد رولو کا کو ایسا لگا جیسے وہ ہوا میں پرواز کر رہا ہے اور پھر اس کے پیر زمین پر لگ گئے۔ وہ ایک بہت چوڑی سڑک کے کنارے کھڑے تھے سڑک پر لاریاں اور کاریں تیزی سے دوڑ رہی تھیں۔

”یہ کیا ہے میرے دوست۔“ انتونی نے پوچھا۔

کر دیا۔ میں اس دور میں ہوں اس زمانے میں بغیر گھوڑے کے گاڑیاں چلیں گی، آگ ہر وقت ہر جگہ میسر ہوگی لوگ زمین پر پیر ہلائے بغیر دوڑیں گے کیا تم شہزادی کے علم کو نہیں مانتے۔“ وہ بولی۔

”شہزادی کا علم یکا تھا میں اس کو مانتا ہوں مگر میرے ذہن میں یہ سوال ضرور ہے کہ شہزادی نے تم کو اس علم کا اشارہ تو ضرور دیا ہو گا کسی بھی عظیم علم کو خود تک رکھنا اور سینے میں رکھ کر چلے جانا تو بہت بڑی حماقت ہے اس سے کسی کا کیا بھلا ہوا علم تو یہ ہے کہ دوسروں کو اس کا فائدہ ہو ہو کوئی اس سے مستفید ہو اور اس علم کو عام کیا جائے تاکہ وہ ختم نہ ہو۔“ میں نے کہا۔

”میں تمہارا مطلب سمجھ رہی ہوں مگر میں جھوٹ نہیں کہتی جو کچھ میرے اندر رہے وہ ہے میں سوچتی ہوں وہ ہوتا ہے کیوں اور کیسے اس کا مجھے خود پتہ نہیں ہوتا۔ میں نے تمہارے بارے میں غور کیا مجھے پتہ چل گیا میں باہر دنیا میں جانے کی سوچ رہی ہوں جواب آ رہا ہے کہ جاؤ۔ بس یہ ہے میرا علم میں نے اس کو باقاعدہ سمجھ کر حاصل نہیں کیا ہے یہ شہزادی ریلے تھا کی دین ہے اس کے پاس جو تھا اس نے میرے سینے میں اتار دیا اور خود تجربے کی نظر ہو گئی۔“

”میری سمجھ میں تمہاری بات آ رہی ہے تمہاری سچائی کی گواہی کی ضرورت مجھے نہیں ہے۔ میں رولو کا ہوں افریقہ کا مشہور آدمی مگر میں وہ نہیں کرتا جو مصری کا بن اور فرعونوں کے مشیر کرتے تھے۔ بہر حال تم اب بتاؤ کہاں جاؤ گی۔“ میں نے کہا۔

”اس سوال سے کیا مطلب ہے تمہارا کیا مصر کے علاوہ بھی اور دنیا ہے؟“ وہ بولی۔

”ہاں! دنیا انسانوں کا جنگل ہے ہر طرف شہر میں آبادیاں ہیں سیکڑوں مصر سے بڑے اور جدید ملک اس زمین پر آباد ہیں تم ایسی حیرت ناک چیزیں دیکھو گی جن کو دیکھ کر تم خود یقین نہیں کرو گی۔ مگر میری بات یاد رکھنا آج کے انسان میں جس بہت زیادہ ہے کیوں اور کیسے کے چکر میں یہ لوگ زیادہ ہیں تم اپنی پراسرار طاقت اور سوچ پر قابو

ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میری بیوی کبھی آ جاتی ہے۔“ وہ بڑا محم شیم آدمی تھا اگر میں اس کو پہلوان کہوں تو بھی غلط نہیں ہوگا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے قابو کرے گا اور پھر انتونی کے حسن کے مزے لوٹے گا۔

شام ہو رہی تھی اس نے ایک کٹھری میں لائین جلا دی اور چلا گیا۔ میں نے انتونی سے کہا۔ آدمی نیت کا خراب لگتا ہے تم سو جاؤ میں جاگتا ہوں۔“ وہ بولی۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے وہ تمہارے اور میرے قریب نہیں آسکے گا کیوں کہ وہ خود ایسا سوئے گا کہ سورج نکلنے کے بعد اٹھ سکے۔“ انتونی نے جواب دیا۔

انتونی زمین پر لیٹ گئی میں دروازے کے پاس گیا ہم دونوں سوئے اور رات گزرتی میں پہلے اٹھا اور کٹھری کے باہر آ گیا وہ شخص اب تک بے خبر سو رہا تھا میں ڈانگور اور سیب توڑے اور لانڈرا گیا۔

انتونی نے مسکرا کر کہا۔ ”کھانے کو لائے ہولاؤ۔“ اور ہم دونوں کے پیٹ بھر کر سیب اور انگوٹھ کھائے۔

میں پھر باہر نکلا تو مجھے ایک بکری چتی نظر آ گئی اس کے تھن پھولے ہوئے تھے اور دودھ بھرا تھا۔

میں نے اس کا کان پکڑا اور کٹھری میں لے آیا۔ ایک تھن کا دودھ اس نے پی لیا اور ایک تھن کا میں نے بکری چتی گئی ہم دونوں باہر آ گئے اور باغ کی سیر کرنے لگے گیارہ بجے کے قریب وہ بے خبر مالی اٹھ گیا اور دوڑ کر ہماری طرف آیا اور ہاتھ ہلا بلا کہ نہ معلوم کیا کیا کہتا رہا۔

میری کھ میں صرف اتنا آیا کہ تم نے سارا دودھ پی لیا۔ وہ کام میں لگ گیا اور ہم کٹھری میں آ گئے۔ کوئی چار بجے ایک ٹرک باغ میں آ گیا۔

اس میں چار مزدور اور ڈرائیور تھا وہ درختوں سے پھل اتارنے لگے اور ٹرک بھرنے لگے۔ ایک گھنٹہ وہ لوگ یہ کام کرتے رہے اس کے بعد ایک پیڑ کے نیچے کھڑے ہو گئے اور باتیں کرتے رہے اس کے بعد ٹرک چلا گیا اور مزدور بھی چلے گئے۔

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

”یہ آج کے دور کا جادو ہے یہ لوگ اونٹوں پر اور گھوڑوں پر سواری نہیں کرتے یہ لوہے کے گھوڑے بناتے ہیں اور ان کو دوڑاتے ہیں ان سے سوال نہ کرنا میں سوال کروں گا تم خاموش رہنا۔“

دونوں سڑک کے کنارے کھڑے تھے ایک سواریوں سے بھری لاری ان کے قریب آ کر کٹھری ہو گئی ایک آدمی نے کٹھری سے گردن نکال کر پوچھا۔ ”کہاں جاتا ہے۔“ سوال فاری میں کیا گیا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا مگر میں نے اشارے سے اس کو منع کر دیا کہ کہیں نہیں جاتا ہے۔

اس نے انتونی پر ایک نظر ڈالا اور سینے پر ہاتھ مار کر ہوائی بوسہ لیا اور گاڑی چلی گئی۔

سڑک کے دائیں طرف درختوں کے جھنڈے میں نے سوچا سڑک کے کنارے تو ایسا ہی ہوگا کہ کٹھری انتونی کا بلاخبر حسن اور انوکھا لبادہ ہر کسی کو اس کی طرف لے آئے گا۔

میں درختوں کے جھنڈ کی طرف میں پڑا انتونی میں میرے ساتھ روانہ ہوئی۔ یہ ایک باغ تھا اس میں کئی قسم کے پھل لگے تھے دور سے چھوٹا نظر آئے والا یہ باغ بہت بڑا تھا ایک آدمی کھری ہاتھ میں لے کر کام کر رہا تھا مجھے دیکھ کر دوڑ کر میرے پاس آیا پھر اس کی نظر انتونی پر پڑی تو اس کے چہرے کی ناگواہی میں بڑی ہوا گئی وہ جھک کر بولا۔ ”میں کیا خدمت کروں آپ دونوں کی۔“ اس نے

بھی زبان فاری استعمال کی میں نے اشارے سے بتایا کہ تیری بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے ہم لوگ سافر ہیں دو چار دن تیرے باغ میں رہنا چاہتے ہیں وہ خوش ہو گیا اشارے سے اس نے اپنی رضا کا اظہار کر دیا اور دوڑ کر گیا اور کچھ فروٹ درختوں سے توڑ کر لے آیا اور اشارے سے کہا کھاؤ اس کی نگاہیں انتونی پر جمی ہوئی تھیں۔

میں اس کی نظروں کے ساتھ تھا اس کے اندر کیا پروگرام بن رہے تھے سمجھ رہا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہاں پر کوئی عورت نہیں

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

میں نے اشاروں سے کہا۔

”تو ہماری خدمت کر، تیرا باغ بہت پھل دے گا۔“

میں نے کہا۔

”میں کیا کروں.....؟“ وہ بولا۔

”ایک زنانہ جوڑا کپڑا لے آ میری عورت کو

ضرورت ہے اور ہمارے کھانے کا بندوبست پورا کر ہم

صرف سات دن کے تیرے مہمان ہیں اگر ذرا بھی تیری

نیت میں خرابی ہوئی تو یاد رکھنا سوجائے گا۔“ اس نے

اشارے سے توبہ کی اور چلا گیا شام کو ٹرک آیا تو اس میں

کپڑے تھے۔ اتنونی نے وہ ڈھیلا ڈھالا مقامی لباس پہن

لیا۔ سات دن تک وہ خطرناک آدمی ہماری خاطر کرتا رہا۔

سات دن کے بعد ہم اسی ٹرک میں ایک گاؤں کی طرف

روانہ ہوئے۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ یہ لوگ بلوچی زبان

بولتے تھے۔ اتنونی کے تو نقش نگاری ایسے تھے کہ مرد تو مرد

عورتیں بھی اس کے قریب آتی تھیں۔ اب اتنونی بہتر

ہو گئی تھی گاؤں کے لوگ میرا احوال پوچھتے تھے یہ لوگ

بڑے مہمان نواز تھے ہم ایک رات کے قیام کے بعد آگے

بڑھ گئے۔ اس طرح گاؤں گاؤں پھرتے ہوئے کوئٹہ

آگئے کوئٹہ شہر تھا۔ اتنونی نے حیرت سے اس کی ہر چیز

دیکھی اور ہم آگے چلے ہستی میں پورے ایک ہفتہ قیام کیا

یہاں کی گرمی نے اتنونی کو پختہ کر دیا۔

میری جیب میں سونے کے سکے تھے میں ان سے

اخراجات پورے کر رہا تھا۔

اتنونی کو پتہ نہیں تھا کہ ہم گاڑیوں میں سفر کرتے

ہیں کوئی اتنا تاریک نہیں۔

میں پہلے ہی ادرا کر دیتا تھا۔ بلوچستان کے بعد

ہم سندھ میں داخل ہوئے اور حیدر آباد میں ایک مکان

لے کر رہنے لگے۔ میں نے اتنونی کے لئے اور کپڑے

مقامی طرز کے خریدے اپنا حلیہ بھی درست کیا اور ایک

برقعہ بھی خرید لیا۔ کیونکہ اتنونی کو دیکھ کر ہر کوئی اس کا دیوانہ

ہو جاتا تھا۔ حیدر آباد، سندھ زیادہ بڑا شہر نہ تھا قریب

قریب بہت سے گاؤں تھے اور شام کو زمیندار اور وڈیرے

رات کو اس نے بھجور اور دودھ ہم کو دیا کئی کی موٹی
موٹی روٹیاں بھی تھیں جو کہ شاید مزدور لائے تھے ہم دونوں
نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور کوٹھری میں لیٹ گئے۔ کچھ ہی دیر
میں ٹرک واپس آ گیا اور اس میں چاروں مزدور موجود تھے
۔ اب میرے ایکشن میں آنے کا وقت تھا۔ مگر اتنونی بے
فکر تھی بولی۔ ”تم فکر نہ کرو آرام سے سو جاؤ ان سب کے
سر پر نیند سوار ہے۔“

میں لیٹ گیا مزدور ایک درخت کے نیچے گھاس
کے بستروں پر بیٹھ گئے مالی بھی بیٹھ گیا۔ وہ شاید ہمارے
سونے کا انتظار کر رہے تھے مگر وہ خود سو گئے ان کی نیند اتنی
گہری تھی کہ میں ان کے گرد چکر لگا کر آ گیا ان کی ٹوپیاں
اور جوتے زمین پر پڑے تھے۔ میں نے ٹرک میں ڈال
دیا۔ ٹرک کے پٹرول کے ٹینک کا ڈھکن کھول دیا اور سارا
پٹرول زمین پر گر گیا اور میں آ کر سو گیا اور حسب معمولی
سویرے اٹھ گیا اور بکری کا دودھ اور مزدوروں کی روٹیاں
جو کہ ٹرک میں رکھی تھیں پیٹ بھر کر ہم دونوں نے کھالیں
باقی روٹیاں میں نے کوٹھری میں چھپا دیں۔ مجھے کسی بھی
حالت میں ایک ہفتہ یہاں پر گزارنا تھا گیارہ بجے جب
اٹھ گئے ان کو تعجب ہوا کہ وہ سو کس طرح گئے ان کی جوتیاں
اور ٹوپیاں بھی نہیں تھیں اور پٹرول کی بو بھی آ رہی تھی وہ
دوڑے ٹرک کی طرف مگر پٹرول کا ایک قطرہ ٹینک میں
نہیں تھا وہ آپس میں لڑنے لگے مالی کو برا بھلا کہنے لگے
اب ان کے لئے ایک کام اور بڑھ گیا تھا۔ پٹرول لے کر
آنا تھا یا ٹرک کو دھکا دیکر مین روڈ تک لے جانا تھا۔ کسی کی
کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جب کچھ سمجھ نہیں آیا تو مالی میرے
پاس آ گیا۔ اس نے اشاروں میں پوچھا۔ ”تو کون
ہے؟“ میں نے کہا۔ ”انسان ہوں۔“

اس نے پھر کہا۔ ”میں نہیں مانتا۔“
میں نے کہا۔ ”نہیں مانتا تو نہ مان مگر اپنی نیت
صاف ضرور کر لے تو میری عورت پر بری نظر رکھتا ہے یاد
رکھ تو ایسا سونے گا کہ کبھی نہیں اٹھے گا۔“ وہ پہلوان نما مالی
ڈر گیا کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔ ”مجھے معاف کر دے۔“

وڈیرہ مجھ سے بولا۔ ”تم اس کو پہلے چھپا کے ادھر آیا ہے بول کدھر ہے۔ وہ؟“
میں نے کہا۔ ”میں تیرے پاس آیا تھا اس وقت وہ وہیں پر تھی۔“
”تو ایسے نہیں بتائے گا لا تو ذرا گامی کو، دیکھ ابھی بتاتا ہے۔“ وڈیرہ بولا۔

ایک آدمی ایک بہت بڑے شکاری کتے کو لے آیا۔ وہ شیر کی مانند کتا تھلانے والے نے اس کو میرے سامنے کھڑا کر دیا کتے نے میری طرف دیکھا میں نے ڈنٹی رابطہ اس سے کیا اور کہا کتے کے کان کھڑے تھے منہ کھلا ہوا تھا۔ وحشت اور خونخواری صاف ظاہر تھی مگر اس نے مجھ پر حملہ نہیں کیا میری بات سننے لگا۔

”تو ان خالوں کی غلامی کب تک کرے گا یہ تیرے دوست نہیں تجھے ذرا کمزور پائیں گے تو تجھے مار کر تیری جگہ دوسرے آدمی لے آئیں گے یہ سب تیرے دشمن ہیں۔“
کتا پلٹ گیا اور جو آدمی اس کو لایا تھا اس پر حملہ کر دیا اور ایک منٹ میں اس کا کام تمام کر کے وڈیرے پر چھلانگ لگائی مگر درمیان میں دو تین آدمی آگئے کتے نے ان کو بری طرح ڈنسی کیا اور باہر نکل کر بھاگ گیا یہ سب صرف چند منٹ میں ہوا۔

وڈیرے کے سامنے کئی زخمی پڑے تھے ایک لاش پڑی تھی اور وڈیرے کی آواز بند تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بچپن سے پالتو کتا اچانک باغی کس طرح ہو گیا وہ کچھ دیر کو مجھے بھول گیا تھا ایک آدمی نے اس کے ہاتھ میں شربت کا گلاس پکڑا دیا۔ وڈیرے نے ایک ہی سانس میں وہ ختم کر لیا ذرا اس کے ہوش و حواس درست ہوئے تو وہ دہڑاڑ۔

”ارے ان لوگ کو میرے سامنے سے ہٹاؤ جلدی کرو اور اس حرام زادے کتے کو ڈھونڈو اور فوراً گولی مار دو وہ شاید پاگل ہو گیا ہے۔“
میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”پاگل نہیں ہوا عقل مند ہو گیا ہے تم لوگ کو عقل سکھا رہا ہے۔“

سیر کو حیدر آباد آیا کرتے تھے ان میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے یہ لوگ نہایت عیش بے فکر ہے اور بے حس تھے انہوں نے غریب ہاریوں کسانوں کو اپنا غلام بنایا ہوا تھا۔ ان کے خلاف آواز اٹھانے والا سندھ میں رہ نہیں سکتا تھا یہ لوگ انسان کو انسان نہیں سمجھتے تھے ان کے بارے میں لوگوں نے مجھے بتایا تھا لوگ ان کے سامنے بھی نہیں آتے تھے اپنی لڑکیوں اور بیویوں کو چھپاتے تھے ان کے کارندے کسی اچھی شکل اور جوان عورت کی تلاش میں پھرتے رہتے تھے اور ان عورتوں اور لڑکیوں کو ہر حالت میں ان تک پہنچا دیا کرتے تھے اور انعام پاتے تھے۔ میرا مکان پرانے قلعہ کے پاس تھا اتنی کبھی گھر سے باہر نہیں جاتی تھی۔ مگر یہ نہیں کس طرح اس کے بارے میں وڈیرہ اللہ وسایا کو پتہ چل گیا۔ اس کے کارندے میرے پاس آگئے اور مجھے پکڑ کر وڈیرہ اللہ وسایا کے پاس لے گئے۔
وہ بڑا موٹا تازہ آدمی تھا اس کی بڑی خوفناک قسم کی مونچھیں تھیں۔ شکل سے ہی بد معاش لگتا تھا میں نے اندازہ کر لیا کہ یہاں پر کچھ ہاتھ پیر نکالنا ہوں گے۔
”ارے تم تو بڑا چھپا رستم ہے اتنا بڑھیا مال گھر میں ڈال رکھا ہے کدھر سے اٹھا کر لایا ہے۔“

میں نے جواب دیا۔ ”مصر سے لایا ہوں وہ ہزاروں سال پہلے مرگئی تھی دوبارہ زندہ ہوئی ہے۔“
”ارے تم سالہا ہم کو چریا بناتا ہے سچ بتاؤ۔“ وہ بولا۔

”سچ بات تم کو بتادی تم مانو نہ مانو مگر یہ بات ضرور مان لو کہ اس کے قریب ہرگز نہ جانا ورنہ نقصان ہوگا۔“
میں نے نہایت ملال لہجے میں کہا۔
”تو چریا بناتا ہے دیکھ تو ادھر رہ میں اس کو ادھر بلاتا ہوں۔“ اس نے ایک آدمی کو آواز دی۔

”ارے اوچھوٹو ذرا اس کو لے کر تو آ.....“
میں وہیں کھڑا رہا۔ چھوٹو دوڑ گیا۔ مگر دس منٹ کے بعد اکیلا آ گیا۔ بولا۔
”گھر تو خالی پڑا ہے ادھر کوئی نہیں ہے۔“

”سائیں ہم تمہارا غلام ہے تم جو بولے گا کرے گا۔“ وڈیرہ بولا۔۔۔۔۔

”سارے کتے اور آدمی عورتیں آزاد کر دے، ہاریوں اور کسانوں کو ان کا پورا پورا حق دے میں ادھر حیدر آباد میں ہوں آج اور ابھی سے یہ کام کر جوتو کرے گا میرے سامنے ہوگا۔ نہیں کرے گا تو پاگل پن کی بیماری تیرے گوتھ میں تیرے خاندان میں آ جائے گی تیرے خاندان کا ایک عورت مرد بچہ اس بیماری سے نہیں بچے گا غریبوں کے پاس یہ بیماری نہیں جائے گی تیرا اور تیرے خاندان کا نام نشان ختم ہونے والا ہے تو نے بہت برا کیا ہے۔“

میں نے اس کو بری طرح ڈرا دیا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا رہا اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ میں دروازے سے باہر آ گیا اور گھر آیا تو اتونی نے مسکرا کر میرا استقبال کیا اور بولی۔

”تم نے تو اس کی حالت خراب کر دی اور نام میرا رکھ دیا۔ مجھے پتہ ہے تم معمولی آدمی نہیں ہو کتے سے تم نے بات کر لی یہ کوئی معمولی ظلم نہیں ہے۔“

”میں تمہاری عزت بڑھا رہا ہوں اس لئے کہ تم اس دنیا کے لئے ایک نایاب چیز ہو مگر تمہاری ناپابی تمہارے لئے مسائل کھڑی کر سکتی ہے میں تمہاری حفاظت کر سکتا ہوں اگر نہ کر سکتا تو ہرگز تم کو ساتھ نہ لاتا۔ ہر جگہ کے مسائل الگ الگ ہیں تم کو جو دیکھے گا اس کے دل میں تمہاری طلب پیدا ہوگی کیونکہ تمہارے مصری نقش و نگار یہاں کی عورتوں سے الگ ہیں تم ہزاروں میں اپنی الگ شناخت رکھتی ہو۔ مگر تم کو خود بھی اپنا خیال رکھنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”تم میرے بارے میں فکر نہ کرو میں صرف تم کو جانتی ہوں، تم کہیں پر ہو میں تمہارے پاس آ جاؤں گی، دنیا کا کوئی ساحر مجھے تمہارے پاس آنے سے روک نہیں سکتا۔ تم ہی ہو جو میرے مطلوب کو حاصل کرنے میں میری مدد کر سکتے ہو۔“ اتونی نے کہا۔

”تم اپنا کیواس بند کرو میں تیرے کو بھی دیکھتا ہوں۔“ وڈیرہ بولا۔

”اور کتنے کتے تیرے پاس ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اب کے کتے نہیں کچھ اور چھوڑوں گا۔“ وڈیرہ جل کر بولا۔۔۔۔۔

”اور وہ سب تیرے خلاف جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ عورت ہزاروں سال پرانی ہے مصر سے میرے ساتھ آئی ہے تو اس پر نیت خراب کر رہا ہے وہ تجھے نہیں چھوڑے گی تو اور تیرے سارے لوگ پاگل ہونے والے ہیں۔“

میرا یہ کہنا تھا کہ شربت لانے والا آدمی اس کے ہاتھ میں خالی گلاس اب تک تھا اس نے پلٹ کر وہ گلاس وڈیرے کے منہ پر مار دیا اور ایک طرف دوڑ گیا وڈیرہ دھاڑا۔ ”ارے پکڑو حرامی کو۔“ میں نے کہا۔ ”یہ سب پاگل ہو رہے ہیں سب کے بعد تو بھی پاگل ہو جائے گا تو نے ہزار سال کی مری ہوئی عورت پر نیت خراب کی ہے وہ تم کو نہیں چھوڑے گی۔“

”ارے بابا اس کو روکو ہم سے بھول ہو گیا ہے ہم کو معاف کر دو ہم تمہارا ہاتھ جوڑتا ہے۔ رحم کرو، ہم کو برباد مت کرو۔“ وہ گڑگڑا کر بولا۔

میں نے کہا۔ ”تو نے زندگی میں کسی پر رحم کیا ہے، تو نے انسانوں کو انسان سمجھا ہے تو انسانوں پر کتے چھوڑتا رہا ہے تیرے کتے بکری اور مرغی کا گوشت کھاتے ہیں اور تیرے ہاریوں کو دو وقت کی روٹی نہیں ملتی تو رحم کی بات کس منہ سے کر رہا ہے۔“

وہ میرے قدموں میں گر گیا اور بولا۔ ”ابھی ایسا نہیں ہوگا مجھے معاف کرو۔“

”معاف میں نہیں کر سکتا تیری بات اس ہزاروں سال پہلے مری ہوئی عورت تک پہنچا دوں گا اس کی مرضی ہے۔ تجھے معاف کرے نہ کرے۔ میں صرف اتنا کر سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تم نے اب تک اپنے مطلوب کے بارے میں بتایا نہیں ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”میرا مطلوب میرا محبوب فرعون سیٹی اول کا ایک خاص مشیر تھا اس نے سیٹی اول کے لئے بہت کام کیا روح اور جسم کے بارے میں اس کا علم بہت وسیع تھا مگر سیٹی اول اس سے ناراض صرف اس بات پر ہو گیا کہ وہ روح کو قید کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ سیٹی اول نے اس کو بھی تجربے میں جھونک دیا اس کا جسم فنا ہو گیا اور روح کا پتہ نہیں کیا ہوا؟

میں نے اس کے جسم کو تو دیکھا تھا وہ ختم ہو گیا تھا مگر روح کی میں منتظر ہوں شاید وہ کبھی مجھ سے رابطہ کرے۔“ انتونی نے کہا۔

”میں ایک بات کروں برا تو نہیں مانو گی۔“ میں نے پوچھا۔

”میں تمہارے آسرے پر ہوں برا نہیں مانوں گی۔“ وہ بولی۔

”روح کے بارے میں جو نظریات مصریوں کے تھے وہ سارے کے سارے درست نہیں تھے اگر ان کے نظریات روح کے بارے میں درست ہوتے تو پھر سارے فرعون زندہ ہو جاتے مگر ایک بھی واقعہ ہزاروں سال گزرنے پر ایسا نہیں ہوا۔“

”میرے نظریات اتنے کچے نہیں کہ تم ان کو تبدیل کر سکو۔ ہمارے گمشدہ ماضی اور اپنے دامن میں ہزاروں الجھنیں لئے حال کی تفصیل ضرور میرے ساتھ ہے مگر میں اس مذہب ماضی کی وارث ہوں جس کی تحقیق میں مصر کا بہت بڑا حصہ ہے ہزاروں سال سے ہماری تہذیب پر تحقیقات ہو رہی ہیں اور ابھی اور ہزاروں سال اس کے لئے درکار ہوں گے۔“ انتونی نے کہا۔

”میں نے آپ کی تہذیبی اقدار کی بات نہیں کی ہے میں صرف یکساں بات کرتا ہوں۔ بے شک اس میں مصریوں نے بہت ترقی کی تھی مگر روح کے معاملے پر آکر وہ بھٹک گئے۔ ان کو پتہ نہیں تھا کہ آدی مر کرتا نہیں زندہ

ہوتا ہے۔ محدود سے لامحدود کی منزل کی طرف جاتا ہے ہماری موجودہ زندگی اصل زندگی نہیں ہے ہمارا اصل ہماری روح ہے موت سے مصری ڈرتے تھے اس پر قابو پانے کو انہوں نے بڑے پاؤں پیلے وہ اگر جان لیتے کہ موت تو بڑی خوبصورت چیز ہے عارضی زندگی سے دائمی زندگی کی طرف موت لے جاتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو کیا میری تلاش لا حاصل ہے میں اپنے مطلوب کو حاصل نہیں کر سکتی۔“ انتونی ادا سی سے بولی۔

”میں تمہارے یقین اور عقائد کو چیلنج نہیں کرتا۔ اس لئے کہ کوئی تو چیز تھی جس نے تم کو ہزاروں سال ہزاروں فٹ زمین کے اندر محفوظ رکھا ہوا تھا۔ یہاں پر آ کر میری عقل کی سوئی انک جاتی ہے۔“

”تم نے مجھے فکر میں ڈال دیا ہے تمہاری باتیں جھٹلانے کو میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“

”مجھے افسوس ہے انتونی تم کو میری باتوں سے دکھ ہوا مجھے معاف کر دو۔“ میں نے کہا۔

انتونی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

وڈیرہ حیدر آباد سے چلا گیا اس نے جاتے ہی وہی کیا جو میں نے کہا تھا اس کی کاپی لٹ ہو گئی تھی۔ اطراف کے دوسرے وڈیرے اس کو حیرت سے دیکھ رہے تھے مگر اس نے اپنی جیل کے دروازے کھول دیئے سارے خونخوار کتے مار دیئے اور ہار یوں کو آزاد کر دیا تھا۔ ہاری اور کسان خوش ہو گئے۔ میں اس کے پاس چلا گیا وہ مجھے دیکھ کر میرے سامنے جھک گیا۔ میں نے کہا۔

”میرے سامنے مت جھک اس کے سامنے جھک جس نے تجھے وڈیرہ بنایا ہے جس نے تجھے طاقت دی ہے جو تجھے کھانے کو دیتا ہے اب بتا تیرے اندر خوشی کی روشنی پیدا ہو رہی ہے۔ غریبوں کی دعائیں تیرا بیڑہ پار کر دیں گی انسان کو انسان سمجھنا تیرے پاس جو کچھ ہے وہ امانت ہے اس امانت کو دیانت داری سے لوگوں تک پہنچانا۔ میں تجھے اب نہیں ملوں گا۔ مگر میری بات یاد رکھنا میں کسی وقت بھی آ سکتا ہوں۔“

”تم اس کو اٹھاؤ مجھے یہ سخت ناگوار لگ رہا ہے۔“
انتونی نے کہا۔

میں نے پولیس والے کی طرف دیکھا وہ کیلے کھارہا تھا۔ ایک کھانچا تھا دوسرا اس کے ہاتھ میں تھا اس نے کیلے کا چھلکا اتارنے کی کوشش کی مگر کیلا تو ٹکڑی ہو گیا۔ اس نے حیرت سے کیلے کو دیکھا مگر کیلا بظاہر کیلا ہی تھا اس نے پھر اس کو چھیلنے کی کوشش مگر کامیاب نہیں ہوا اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے اس نے قریب بیٹھے آدمی کے ہاتھ میں وہ کیلا پکڑا دیا اور بولا۔

”اس کو چھیلو یہ کیسا کیلا ہے؟“ اس آدمی نے بڑی آسانی سے اس کو چھیل کر پولیس والے کے ہاتھ میں دے دیا۔ ”واہ سائیں واہ یہ کیسا کیلا ہے۔“ اس نے اس پر زور سے دانت مارا مگر یہ کیسا کیلا تو پتھر تھا دانتوں کی کڑکڑاتی آواز آئی اور اس نے وہ کیلا کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

مگر بات یہاں پر ختم نہیں ہوئی اس کے پیٹ میں سخت گڑبڑ ہو گئی اور وہ تیزی سے لیٹرین کی طرف دوڑا اس کی سیٹ خالی ہو گئی میں نے کھڑے آدمی کو کہا بیٹھ جاؤ وہ بولا نہیں سائیں وہ فرعون آئے گا تو غصہ کرے گا میں نے کہا۔ ”اب وہ نہیں آئے گا تین، چار گھنٹے کا سفر ہے بیٹھ جاؤ۔“

وہ بیٹھ گیا پولیس والا فارغ ہو کر واپس آیا اس نے اس آدمی کو بیٹھا دیکھا تو ذرا اس کے چہرے پر ناگواری آئی مگر پھر فوراً ہی دوبارہ لیٹرین کی طرف دوڑا۔ وہ شخص اپنی سیٹ پر کراچی سٹی اسٹیشن تک بیٹھا دیا اور پولیس والا پریٹ کرتا رہا۔ گاڑی کھڑی ہو گئی سب لوگ اتر اتر کر چلے گئے میں اور انتونی بھی اسٹیشن سے باہر آ گئے۔ انتونی نے کبھی دیکھی تو بولی۔ ”اس میں گھوڑا ہے یہ سواری اچھی ہے میں اس میں ہی بیٹھوں گی۔“

میں نے ایک گھوڑا گاڑی کو اشارہ کیا وہ قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے کہا۔ ”کسی ہوٹل میں لے چل۔“ کوچوان بولا۔ ”آؤ سیٹھ۔“

گھوڑا گاڑی بندر روڈ پر آئی تو ایک بلڈنگ کو دیکھ کر

میں حیدر آباد آ گیا اور کراچی کی طرف انتونی کے ساتھ روانہ ہوا۔ ریل کو دیکھ کر انتونی نے کہا یہ کیا ہے؟ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”یہ آگ اور پانی کا جادو ہے آج کے آدمی نے اس جادو سے یہ گاڑی بنائی ہے۔“ میں اور انتونی مردانے ڈبے میں ہی بیٹھ گئے۔ سواریاں پوری تھیں کھڑکی کی طرف میں نے انتونی کو بیٹھا تھا اس نے سفید رنگ کا برقعہ اوڑھ رکھا تھا آنکھوں کے سامنے جالی تھی ایک پولیس والا ڈبے میں آ گیا اس نے خاکی نیکر اور خاکی شرٹ پہن رکھی تھی سر پر صاف تھا اور اس میں ایک لال پٹی بڑی تھی۔ وہ بڑے رعب سے اندر آیا تھا ساری سیٹ بھری تھیں۔

اس نے ایک نظر بیٹھے ہوئے لوگوں پر ڈالی اور کنارے پر بیٹھے ایک شخص کو کہا۔ ”کھڑا ہو جا۔“ وہ پولیس کے ڈر سے کھڑا ہو گیا اور پولیس والا اس کی جگہ پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

وہ آدمی غریب سا تھا خاموش کھڑا رہا۔ انتونی نے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟ جو دوسروں کا حق مار رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ پولیس ہے اس کا یہی کام ہے۔ یہ پولیس والا سرکاری ملازم ہے اس کے کہنے پر یہ گاڑی رک بھی سکتی ہے تم اس طرح سمجھ لو کہ فرعونوں نے اہرام بنائے اس کے بنانے کو جومر دور آئے وہ کون تھے میری معلومات کے مطابق وہ قیدی تھے ان کی موت زندگی سے فرعونوں کو دلچسپی نہیں تھی۔“

”مگر اس کمزور کے ساتھ تو اس پگڑی والے نے سراسر ظلم کیا ہے۔“ انتونی بولی۔

”یہ بہت معمولی پولیس والا ہے اس کا ہاتھ جہاں تک جاتا ہے یہ کرتا ہے اس سے بڑے بڑے پڑے ہیں وہ اپنی وردی اور عہدے کے اعتبار سے ظلم کرتے ہیں یہ غلام ملک ہے اس کے باشندوں کو ظلم سننے کی عادت پڑ گئی ہے ان کی ذہنیت بدل گئی ہے تم دیکھ لو اس ایک پولیس والے سے سب خوف زدہ ہیں وہ کس طرح اکڑ کر بیٹھا ہے۔“ میں نے کہا۔

انتونی بولی۔ ”یہ بھی اہرام ہیں کیا؟“
میں نے ہنس کر کہا۔ ”یہ گھر ہیں یہاں پر اہرام نہیں
ایسے گھر ہوتے ہیں۔“
اونٹ گاڑی کو دیکھ کر اس نے کہا۔ ”یہ کیا ہے اونٹ
کے پیچھے یہ کیا لگا ہوا ہے؟“
میں نے بتایا۔ ”گاڑی لگی ہے اس پر یہ لوگ سامان
لا دتے ہیں۔“

سب سے زیادہ حیرت اس کو گدھا گاڑی دیکھ کر
ہوئی بولی۔ ”کتنا معصوم جانور ہے اس پر بھی بوجھ لا دیا
ہے۔“
میں کیا جواب دیتا مسکرا کر رہ گیا۔
گاڑی ایک عمارت کے سامنے رک گئی۔ کو جوان
بولاً ”ہوٹل آگیا سیٹھ۔“

میں اتر گیا انتونی بھی اتر گئی۔ میں نے کرایہ ادا
کر دیا اور اندر چلا۔ اندر ایک کاؤنٹر بنا ہوا تھا اور اس کے
پیچھے ایک بڑی موٹی کرسیں عورت بیٹھی تھیں۔
مجھے دیکھ کر بولی۔ ”کیا مانگتا ہے میں؟“
مجھے اس کا انداز سخت ناگوار گزرا میں نے کہا۔ ”میں
بھکاری نہیں ہوں رہنے کو کمرہ چاہئے۔“

اس نے میری طرف غصہ سے دیکھا اور بولی۔ ”
خالی نہیں ہے سرکاری لوگ کے واسطے ہے۔ ادھر سولین
لوگ کو کمرہ نہیں ملتا تم جاؤ تم کو پتہ نہیں یہ سو لجر بازار ہے
ادھر سو لجر لوگ کو کمرہ ملتا ہے۔“
میں نے کہا۔ ”سو لجر لوگ ادھر کیا کرتا ہے۔ کمرہ
لے کر۔“

”موج کرتا ہے ڈرنک کرتا ہے گرل فرینڈ کو لے کر
آتا ہے اور کیا کرتا ہے۔“ وہ بولی۔
”اچھا تم نمبر سات دے دو وہ خالی ہے۔“ میں نے
کہا۔

”تم کیسا آدمی ہے سات نمبر خالی کدھر ہے اس کا
بلنگ ہو گیا ہے۔“ وہ بولی۔
اب میری برداشت سے باہر کی بات تھی میں نے

اس کی طرف دیکھا تو وہ ایک منٹ کے بعد بولی۔
”دیتا ہے تم غصہ نہیں کرو۔“ اس نے ایک آدمی کو
آواز دی۔ ”ڈی سوزا ادھر آؤ ان لوگ کو سات نمبر میں
پہنچاؤ۔“
یہ ہوٹل کیا تھا عیاشی کا گڑھ تھا۔ انتونی نے کہا۔ ”یہ تو
بڑی گندی جگہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہو جائے
گی۔“

رات کو یہاں پر رونق ہوتی تھی مگر رات کو پورے
ہوٹل میں اندھیرا تھا۔
موٹی مالکن بھاگی بھاگی پھر رہی تھی مگر کوئی بتی نہیں
جل رہی تھی موم بتی بھی نہیں جلتی تھی ہر طرف عورتیں اور
سو لجر دوڑ رہے تھے ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔
لڑ رہے تھے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا سارے بلب کیسے
ٹوٹ گئے۔

آدھی رات تک یہ ہوتا رہا اور پھر سب تھک کر چلے
گئے۔ صبح پتہ چلا کہ شراب کی ساری بوتلیں خالی تھیں اور
نالیوں میں شراب بہہ رہی تھی۔

دوسرے دن جو آیا وہ ایک منٹ کے بعد ہی بھاگ
کھڑا ہوا۔ موٹی عورت خود حیران تھی کہ گاہک بھاگ کیوں
رہے ہیں۔ ایک بوند شراب ہوٹل میں نہیں رہ گئی۔ تیسرے
دن ایک عورت بھی نہیں آئی سارا ہوٹل ویران ہو گیا۔
پورے ہوٹل میں اندھیرا کئی بار بلب لگائے گئے مگر لگتے ہی
ٹوٹ گئے۔ کاؤنٹر پر اندھیرا دروازے پر اندھیرا صرف
سات نمبر میں روشنی تھی اب ذرا موٹی کو عقل آئی اور وہ
میرے پاس آ گئی اس نے انتونی کو دیکھا تو حیران رہ گئی۔
بولی۔ ”یہ کون ہے؟ ایسا ونڈ رفل پیس میں نے پہلی بار
دیکھا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”اب دیکھ لو پھر شاید زندگی بھر دیکھنے کو
نہ ملے۔“
”یہ کون ہے کدھر سے آیا ہے یہ پری لگتا ہے۔“
بتاؤ۔“ وہ بولی۔

”یہ پری نہیں ہے ایک عورت ہے، مری ہوئی

چیزیں بنا رہا ہے جو آگے چل کر اور ترقی کریں گی اور انسانی زندگی میں انقلاب آجائے گا۔“ میں نے کہا۔

”تم نے درست کہا فرعونوں نے صرف اپنی بقا کی جنگ لڑی ہے۔ انسانوں کے لئے کچھ نہیں کہا۔“ انتونی نے کہا۔

”اس کائنات کو بنانے والا کوئی فرعون نہیں ہے اس کو بنانے والا رب کائنات ہے۔ اس نے انسانوں کے لئے کوئی راز نہیں رکھا ہے۔ مگر انسان اس سے فائدہ اس وقت ہی لے سکتا ہے جب وہ قدرت کے اصولوں کو صدق دل سے اپنا لے اس کائنات کے کچھ اصول ہیں ان پر چلنا ضروری ہوتا ہے فرعون خود کو خدا کہتے تھے مگر موت سے ڈرتے تھے۔ اب تم خود فیصلہ کرو وہ خدا کس طرح ہوئے اس طرح ان کے بنائے اصول اور قاعدے بھی بیکار تھے ان کو فنا ہونا تھا اور ہوئے۔“ میں نے کہا۔

”تم نے درست کہا خدا کو موت کا ڈر نہیں ہوتا۔ فرعونوں نے اپنی طاقت کو خدا کی بنا ڈالنا تھا مگر وہ طاقت ان کے کسی کام نہ آئی ان کے نظریات میں مجھے اب جھول نظر آ رہا ہے۔“ انتونی بولی۔

”ان کے پاس علم تھا کیسا گری میں ان کو مہارت تھی مگر فرعون طاقت کے نشے میں مست بھی تھے ان کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ انسانی جسم کی ایک طبیعت ہوتی ہے اس کے اس جسم کو فنا ہونا ہوتا ہے آدمی مر جاتا ہے اس کے لئے دنیا کی ہر شے مرجاتی ہے انہوں نے تاریخ سے سبق نہیں لیا ان سے پہلے بھی آخر انسان تھے وہ کیوں نہ رہے ان گنت تہذیبیں بنیں اور مٹ گئیں اس لئے کہ جو پیدا ہوا ہے اس کو مرنا ہے مرنے کے بعد انسان کی اصل یعنی روح کو پھر خالق کائنات کے پاس جانا ہوتا ہے اس کو

دنیا میں روکنا میرے خیال میں بہت بڑا گناہ ہے۔ اپنے عقل سے یا کسی علم سے اس پر کنٹرول حاصل کرنا قدرت کے قانون میں مداخلت کرنے کے برابر ہے فرعونوں نے یہی کیا ہے مگر وہ کیا ان کے اہرام کا توڑے گئے ان میں رکھا سونا، چاندی اور دولت جو انہوں نے اپنی دوسری زندگی

عورت جو ہزاروں سال پہلے مر گئی تھی اب دوبارہ دنیا میں آئی ہے۔“ میں نے کہا۔

موٹی کو ایسا لگا جیسے اس کے نیچے اسپرنگ رکھ دیا ہو وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے سینے پر، صلیب کا نشان بنایا اور ڈرتے ڈرتے بولی۔ ”ادھر کیوں آیا ہے؟“

”اس لئے کہ تم نے حرام کام شروع کر دیا ہے تم خود گناہ کرتا ہے اور دوسروں کو بھی گناہ کرنے کا موقعہ دیتا ہے تم ان کاموں کو چھوڑ دو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ہم کو معاف کر دو ادھر کوئی سولجر نہیں آئے گا کوئی چھو کر نہیں آئے گا ادھر شراب نہیں لے گا اور بولو ہم کیا کرے۔“ موٹی بولی۔

”تم عیسائی ہو حضرت عیسیٰ کو مانتی ہو۔“ میں نے پوچھا۔

”حضرت عیسیٰ کو مانتی ہوں اس لئے تو عیسائی ہوں۔“ وہ بولی۔

”تم جھوٹ کہتی ہو حضرت عیسیٰ نے شراب پینے کی کب اجازت دی ہے۔ عیاشی کرنے کا حکم انہوں نے کب دیا ہے تم نام حضرت عیسیٰ کا لیتے ہو مگر ان کی تعلیم پر نہیں چلتے۔ تم لوگ عیسائی ہرگز نہیں ہو اگر عیسائی ہو تو وہ کرو جس کا حکم حضرت عیسیٰ نے تم کو دیا ہے۔ میں تم کو عیسائی نہیں مانتا۔“ میں نے کہا۔

موٹی نے گردن جھکا کر میری بات سنی اور زمین پر بیٹھ گئی۔ ”تم بربر بولا۔“ اتنا صاف بات ہم کو چہرچ میں بھی کوئی نہیں بتایا ہم اب تک بہت گناہ کیا ہے۔“

”ساری بتیاں جل گئیں۔“ انتونی نے پوچھا۔

”یہ کون سا جادو ہے کہ ایک گول لٹو روشنی دیتا ہے۔“

”یہ پانی کا جادو ہے اس کو بجلی کہتے ہیں ہزاروں میل پر پانی میں یہ روشنی پیدا ہوتی ہے اور گھروں تک آتی ہے یہ جادو بہت کام کا ہے اس سے آنے والی سلیس بہت فائدہ اٹھائیں گی فرعونوں نے اگر اس قسم کی کوئی چیز بنائی ہوتی تو انسانیت کو بہت فائدہ ہوتا آج کا انسان ایسی

کے لئے رکھا تھا لوگ لوٹ کر لے گئے اور ان کی لاشوں کو نشان عبرت بنا کر رکھ لیا گیا۔ کسی فرعون کی روح اس کے جسم میں واپس نہ آئی اس سے ثابت ہوا کہ ان کے عقیدے غلط تھے۔ وہ غلط سمت میں سفر کرتے رہے آج اگر ان کو یاد کیا جاتا ہے تو صرف اس لئے کہ انہوں نے کیمیاوی چیزیں ضرور ایجاد کیں تھیں۔ مگر وہ بھی صرف اپنی بقا کی خاطر اس میں عوامی فائدے کی کوئی بات نہ تھی۔ میں نے کہا۔

”تمہاری ساری باتیں اپنی جگہ پر درست ہیں میں اس سے انکار نہیں کرتی۔ کیا تم میرے وجود سے انکار کرتے ہو۔ میں کیا ہوں میری روح نے میرا جسم کیوں نہیں چھوڑا؟“

”تمہارا سوال بڑا اہم ہے۔ میں اس کا جواب یہ دے سکتا ہوں کہ دنیا میں ہزاروں قسم کے علم موجود ہیں شہزادی کے پاس بھی کوئی ایسا علم ہو جس نے تم کو ایک مقررہ مدت کے لئے نیند میں پہنچا دیا ہو۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ تمہارے تابوت میں کچھ کیمیاوی طریقہ استعمال کیا گیا ہو اور اس تابوت کو زمین کے اندر ایسے مقام پر دفن کیا گیا ہو جہاں پر جسم کے خراب ہونے کا ڈر نہ ہو۔ میں نے جب تمہارا تابوت کھولا تھا اس وقت اس میں سے ایک خاص قسم کی بو باہر آئی تھی۔ تمہارا مقبرہ ہر طرف سے بند تھا اس میں صرف ایک پتھر کا دروازہ تھا اور اندر ہوا آنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور مقبرہ نہایت ٹھنڈا تھا اس میں ضرور کوئی ایسی ٹینک استعمال کی گئی تھی کہ تمہارے جسم کو گرمی نہ ملے اور ہوا بھی نہ لگے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کیونکہ میں کیمیا دان نہیں ہوں۔ مگر جس نے بھی تم کو محفوظ کیا وہ بہت بڑا سائنس دان تھا اس کا فارمولا مکمل تھا اس نے ذرا سی غلطی نہیں کی۔“ میں نے جواب دیا۔

”اچھا بتاؤ کدھر چلتا ہے۔“ انتونی نے پوچھا۔ ”کراچی کی سیر تو کرو۔ پھر آگے چلیں گے آؤ آج تم کو سمندر کی سیر کراتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مگر تم کو برقعہ میں چلنا ہوگا کیونکہ تمہارا کھلے منہ

جاننا لوگوں کو پاگل کر دے گا۔“

وہ مسکرائی اور بولی۔ ”میں ایسی عجیب چیز ہوں۔“

”ہاں تم ایسی ہی چیز ہو۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

اس نے برقعہ پہن لیا اور میں نے ایک ہلکی کرائے پر کی اور کلفٹن کی طرف روانہ ہوئے۔

کلفٹن پردن کے وقت زیادہ بیٹھ نہ تھی ہم بارہ درمی میں بیٹھ کر سمندر کا نظارہ کرنے لگے۔ انتونی نے برقعہ کا نقاب چہرے سے اوپر کر دیا۔ بارہ درمی کے نیچے پکڑے چھوٹے والے ٹھیلے کھڑے تھے پوری بارہ درمی میں ہم دو ہی تھے ایک آدمی اوپر آ گیا اور بولا۔ ”بولو بیٹھ کیا کھائے گا؟“ وہ بات مجھ سے کر رہا تھا مگر نظریں انتونی پر تھیں میں نے کہا۔ ”کیا ہے تیرے پاس۔۔۔۔۔“

”بھیل پوری ہے آلو کی چاٹ ہے دسی بڑا ہے اور چھوٹا ہے ایک دم تازہ بولو کیا مانگتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آلو کی چاٹ لے آکر لال مرچ نہیں ڈالنا۔“ وہ چلا گیا۔

انتونی نے پوچھا۔ ”کون تھا؟“ میں نے جواب دیا۔ ”دکاندار تھا کھانے کو پوچھ رہا تھا۔“ ”یہاں کے لوگ مہمان نواز ہیں۔“ وہ بولی۔ ”وہ اپنا سوداچ رہا ہے مہمان نوازی نہیں کر رہا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

کچھ دیر میں وہ ایک ٹرے لے آیا اس میں دو پلیٹ چاٹ اور پانی کا جگ رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا اس نے آدمی نے انتونی کا جائزہ اچھی طرح لیا اور چلا گیا۔

میں نے ایک پلیٹ انتونی کے ہاتھ میں دے دی اور کہا۔ ”کھاؤ شاید تم کو کبھی چیز اچھی لگے۔“

ایک پلیٹ میں نے خود کھانی شروع کر دی مگر مجھے مزہ نہیں آیا دو تین چمچے کھا کر میں نے رکھ دی۔ انتونی نے اس پلیٹ کو سونگھا اور رکھ بولی۔ ”یہ ٹھیک نہیں ہے تم نے کھائی ہے تو فوراً نکال دو۔“

میں بارہ درمی کے کنارے گیا اور حلق میں انگلی ڈال

کر جو کھایا تھا نکال دیا اور کلی کر لی۔ ٹھیلے والے کے اندازے کے مطابق ہم کو دس پندرہ منٹ میں بے ہوش ہو جانا تھا۔ وہ اسی حساب سے اوپر آیا مگر ہم دونوں بیٹھے تھے۔ وہ پلٹ لے کر جانے لگا تو میں نے آواز دی۔

وہ میرے سامنے آ گیا میں نے کہا۔ ”تو نے کیا دیا تھا اس پلیٹ میں یہ پلیٹ تجھے اندر کر سکتی ہے اور سن تیرے جو ساتھی ادھر ادھر پھر رہے ہیں سب مارے جائیں گے۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور منہ میں انگلی ڈال کر سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز کے ساتھ ہی تین، چار لٹکے گکڑے جوان بارہ دری میں ہمارے سامنے آ گئے۔ میں نے کہا۔ ”تم لوگ کیوں آئے ہو؟“

ایک گکڑا جوان جو اوپری جسم سے ننگا تھا اور اس کا جسم طاقت ور نظر آتا تھا۔ وہ بولا۔ ”ارے ہم لوگ کو اس عورت کا ضرورت ہے مال قسم بہت خوبصورت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تجھے پسند ہے تو لے جا میں منع نہیں کرتا۔“

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور انتونی کی طرف بڑھا۔ انتونی نے اس کی طرف دیکھا تو وہ فوراً رک گیا اور ایک بھیا نک چیخ مار کر سمندر کی طرف دوڑ گیا۔ میں نے دوکاندار کو کہا۔ ”تو لے جا اس عورت کو تجھے بھی پسند ہے نا.....“

دوکاندار چند منٹ خاموش کھڑا رہا پھر آگے بڑھا۔ قریب پہنچا ہی تھا کہ اس نے بھی ایک بھیا نک چیخ ماری اور سمندر کی طرف بھاگ گیا۔ اس کے بعد جو دو تین آدمی تھے وہ بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ سمندر کا پانی آگے آنے لگا اور چاروں طرف پانی ہو گیا اس کے نیچے کھڑے سارے ٹھیلے پانی میں ڈوب گئے اور ٹھیلوں کو سمندر لے گیا اور جو لوگ انتونی کے امیدوار بن کر آئے تھے سب کو سمندر نے نگل لیا۔ دور کھڑے لوگوں نے سمندر کا چند منٹ کا جلال دیکھا اور پھر بہہ کر ڈوبنے والوں کی لاشیں کنارے پر آنے لگیں۔

میں اور انتونی سکون سے اٹھے کبھی کھڑی تھی آ کر بیٹھ گئے تو کوچوان بولا۔ ”ادھر کیا ہوا صاحب کوئی ڈوب گیا ہے کیا؟“

میں نے جواب دیا۔ ”ہاں بے ایمان دوکاندار ڈوب گئے۔ ان کے بے ایمان ساتھی بھی ڈوب گئے۔“ ہوٹل آ کر انتونی نے کہا۔ ”ادھر کا لوگ اچھا نہیں ہے۔ ادھر سے چلو۔“

دوسرے دن میں نے موٹی عورت کا حساب کیا اس نے بھی نہایت ایمان داری سے حساب بنایا۔ میں نے کہا۔ ”اب تم پوری عیسائی بن رہی ہو۔ یہ بتاؤ بمبئی کے کلٹ کہاں ملے گا۔“

”شپ کا کلٹ مانگتا ہے۔“ وہ بولی۔

”ظاہر ہے بمبئی تو شپ سے ہی جانا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔

”ہم منگواتا ہے تم کدھر جائے گا شام کو کلٹ آ جائے گا ابھی تم نے حساب کر دیا ہے اب تم ہمارا مہمان ہے شپ روٹ نہیں جاتا جس دن جائے گا تم کو ہم خود کیاڑی شپ پر چڑھائے گا تم نے ہم پر بہت احسان کیا ہے ہم تمہارے واسطے جو کرے گا تم کو ہم تم کو کبھی نہیں بھولے گا۔“

تین دن تک ہم اس کے مہمان رہے ان دنوں میں اس نے ہماری بہت خدمت کی اور تین دن کے بعد ہم شپ پر بمبئی کے لئے روانہ ہوئے۔

کسی پر نکال مالک کا شپ تھا۔ ہر قسم کے عیاشی کے سامان اس میں موجود تھے یہاں پر بھی انگریز سولجروں کے لئے شراب، شاب سب کچھ موجود تھا۔ ہمارا کمرہ دوسری منزل پر تھا یہ کمرہ درجے کے حساب سے مڈل کلاس کا تھا۔ پہلی منزل پر بہت بڑا ہال تھا اس ہال میں ہر وقت ہڑبونگ ریتی تھی شراب میں مدہوش سولجروں اور دوسرے ہر وقت شور کرتے رہتے تھے ہر ایک کی بغل میں کرچین لڑکیاں ہوتی تھیں اور ہال کے اندر ہی بوس کنار کرتی رہتی تھیں میں ایک دفعہ اس ہال میں گیا تھا مگر وہاں کا ماحول

مجھے اچھا نہیں لگا اور میں نے انتونی کو بتادیا کہ ہم لوگ یہاں پر ہی رہیں گے پورے جہاز پر پیشہ ور عورتیں موجود ہیں۔ جہاز کا عملہ ان کے ذریعہ کمائی کر رہا ہے ہم نے رات کا کھانا کمرے میں منگوا لیا جو بیہوش کھانا لایا اس نے حیرت سے انتونی کو دیکھا میں سمجھ گیا کہ خطرے کی گھنٹی بج گئی ہے یہ ضرور باہر جا کر سب کو بتائے گا اور اس خورگدھ کمرے کے باہر منڈلائیں گے۔ ہم کھانے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا تو جہاز کے عملے کی وردی میں ایک شخص اندر آ گیا اور رُبے مہذبانہ انداز میں بولا۔ ”سر آج بڑے ہال میں بہت جشن ہے آپ تشریف لائیں۔ انجوائے کریں گے۔“

میں نے پوچھا۔ ”یہ جشن کیوں ہے؟“ تو وہ بولا۔ ”اس قسم کے جشن ہم لوگ کرتے رہتے ہیں۔ مسافروں کو خوش کرنے کو.....“ میں نے پھر پوچھا۔ ”وہاں پر ہوتا کیا ہے؟“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”سرموج کریں ہر ملک کی ڈرنک آپ کو ملے گا ہر قسم کی عورت ملے گی آدی کو اور کیا چاہئے زندگی انجوائے کرنے کا نام ہے۔“

”تمہارے لئے ایسا ہوگا مگر میرے لئے ایسا نہیں ہے دعوت دینے کا شکریہ مگر تم دعوت گناہ دے کر گناہ گار ہو گئے ہو اب اور نہ بولنا ورنہ اور گناہ کرو گے۔“ اس نے کہا۔

اس نے کچھ بولنا چاہا مگر میں نے اس کو کمرے کے باہر پہنچا دیا۔

انتونی بستر پر منہ دوسری طرف کر کے لیٹی تھی اس نے پوری بات سنی تھی اٹھ کر بیٹھ گئی بولی۔ ”اس شپ کو عیاشی کا اڈا بنایا ہوا ہے ان لوگوں نے لیا لگتا ہے۔“

”تین، چار روز کا سفر ہے یہ تو گزارنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”اس شپ کو بھی ہوٹل والا سبق پڑھا دو ان کو اچھے اور برے میں تمیز کرا دو۔“ انتونی نے کہا۔

”یہ کرنا مشکل نہیں ہے مگر دنیا کے رنگ ڈھنگ بہت بگڑتے جا رہے ہیں اچھائیاں دیتی جاری ہیں اور برائیاں بڑھتی جا رہی ہیں اس کام میں بہت وقت لگے۔“ میں نے کہا۔

”تم اپنا کام کرتے رہو اچھائی کو پھیلاتا تو اچھی بات ہے میں نے تم سے یہی سیکھا ہے تم نے فرعوں کے اصولوں اور عقیدوں کو میرے دماغ سے نکال دیا ہے میں بھی تمہارے انداز میں سوچتی ہوں انسانیت کے فائدے کی بات میری سمجھ میں آ رہی ہے ہزاروں برے لوگ مر جاتے ہیں کون یاد رکھتا ہے اور اگر یاد کرتا ہے تو اچھے الفاظ استعمال نہیں کرتا اچھے انسانوں کو یاد رکھا جاتا ہے اور عزت سے یاد کیا جاتا ہے فرعوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو بہت سمجھایا تھا مگر پھر بھی وہ نہ سمجھے اور ہمیشہ کے لئے نشان عبرت بن گئے۔ ان کا نام بدی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔“ انتونی نے کہا۔

”اچھا اس دفعہ تم کچھ کر دو میں دیکھتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے میں کرتی ہوں۔“ رات کو جشن پورے شباب پر تھا ہال میں میوزک کا شور تھا۔

عورتوں کے شراب میں ڈوبے قہقہے تھے اور مردوں کی مستی بھری چیخ و پکار تھی۔ دروازے پر بڑی زور کی دستک ہوئی میں نے دروازے کی کھڑکی کھول کر پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“

دروازے پر دو تین عملے کی وردی والے آ دی کھڑے تھے ایک بولا۔ ”تم کو کیپٹن نے بلایا ہے۔“

میں نے جواب دیا۔ ”میں کیپٹن کا ملازم نہیں ہوں مسافر ہوں اور ٹکٹ خرید کر سفر کر رہا ہوں۔ اس کو بولو صبح خود آ کر بات کرے تم نہ آنا۔“ میں نے کھڑکی بند کر دی۔ اس نے پھر غصے سے دروازہ بجایا مگر اندر سے کچھ جواب نہ دار.....

ساری رات وہ بار بار دروازے پر آتے رہے اور

کتنی دور آگئے ہیں۔ سارے دن سمندر میں بھاگ دوڑ ہوتی رہی مگر یہ مقام سب کے لئے نیا تھا۔

آخر یہ فیصلہ ہوا کہ واپس چلا جائے اور جہاز کو موڑ کر واپس چلایا گیا۔ پوری رات چلنے کے بعد جہاز ایک جزیرے کے قریب آ گیا تھا۔ یہ چٹانی جزیرہ تھا اس لئے جہاز دور کھڑا رہا اور کشتی میں لوگ اس ایک جزیرے پر گئے۔ انہوں نے بتایا کہ جزیرہ غیر آباد ہے اس پر صرف پتھر اور ریت ہے۔

اب فیصلہ ہوا کہ اور آگے چلتے ہیں مگر اب جہاز کا چلنا دشوار تھا کیونکہ سمندر کے اندر چٹانیں تھیں اور رات میں پتہ نہیں یہ یہاں تک کس طرح آ گیا تھا۔ یہ جزیرہ کسی نقشے پر نہیں تھا۔

اب جہاز کو ٹرن کرنا بھی دشوار تھا۔ سمندر کے اندر چٹانیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ کیپٹن کے چہرے پر بارہنج رہے تھے اور سارے عیاش مرد اور عورتیں اپنی جانوں کی فکر میں مبتلا ہو گئے تھے۔ تین دن تک انجینئر کو کوشش کرتے رہے کہ جہاز کو کسی طرح ان چٹانوں کے جال سے باہر لے جائیں مگر کچھ نہ ہوا۔ آخر کیپٹن نے حکم دیا کہ جہاز کو خالی کر دیا جائے اور سب لوگ جزیرے پر آ جائیں اور وزن بھی کم کر دیا جائے پھر کوشش کرتے ہیں۔

کشتیوں میں عورتیں اور مرد بھر بھر کر جزیرے پر آنے لگے اور پورا جہاز خالی ہو گیا۔ کیپٹن میرے پاس آیا بولا۔ ”سر آپ بھی جزیرے پر چلے جائیں۔ جہاز چھنسا گیا ہے اس کو نکالنے کی کوشش کرتا ہے اس کوشش میں اگر جہاز کو نقصان ہوا تو آپ کی جان بھی خطرے میں ہوگی۔“

”جو گناہ تم اس جہاز پر کرتے رہے ہو اور تمہارا عملہ کرتا رہا ہے اس کی سزا تو ملنا تھی اور وہ سزا یہ ہے کہ تم اس جزیرے پر رہو گے یہ جزیرہ جہازوں کی گزرگاہ سے اتنی دور ہے کہ تم ان کو نہیں دیکھ سکتے واریس کے ذریعہ اطلاع کرو شاید کوئی مدد آ جائے مگر کوئی جہاز اس طرف نہیں آئے گا اور سنو اس جزیرے پر سرخ رنگ کی چوٹی ہے اس کے کانٹے کا علائقہ نہیں ہے۔ میں جہاز پر ہی رہوں گا

میری نیند خراب کرتے رہے۔ اتنی تو بے خبر سو رہی تھی سویرے پھر دروازہ بجایا گیا میں نے پوچھا کون ہے جواب ملا۔ ”ناشتہ لایا ہوں۔“

میں نے دروازہ کھول دیا ناشتہ لے کر آنے والا بیرہ اندر آ گیا ناشتہ میز پر رکھ کر بولا۔ ”آپ ان لوگ کا بات نہیں مانا کیپٹن بھی ناراض ہے آپ کو بجائی تک جانا بہت مشکل ہو جائے گا۔“

اتنی اس کے سامنے آ گئی اور بولی۔ ”تم لوگ گدھے ہو یہ شپ بمبئی کب جا رہا ہے یہ تو کسی نامعلوم سفر پر ہے تم سب بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے والے ہو کیپٹن کو بتادو اگر جہاز کو روک سکتا ہے تو روک لے۔“ بیرہ نے یہ سنا تو حیران رہ گیا اور بھاگ کر کیپٹن کے کمرے میں چلا گیا۔

کیپٹن بولا۔ ”وہ بری زاد اٹھ گئی تھی دیکھ آیا تو.....“ بیرہ بولا۔ ”سر پہلے جہاز کی فکر کریں یہ کدھر جا رہا ہے۔“ ”جہاز ٹھیک جا رہا ہے ایسی کوئی اطلاع نہیں ہے۔“ کیپٹن بولا۔ پھر ایک جھٹکے سے کیپٹن اٹھا اور کٹرول ٹاور کی طرف تیزی سے دوڑا اور زور سے دھاڑا۔ ”تو کدھر جا رہا ہے۔“ کٹرول ٹاور آپریٹر نے جواب دیا۔ ”میں روٹ پر ہوں میرے آلات یہی بتا رہے ہیں۔“

”مگر روٹ کے آثار بتا رہے ہیں کہ ہم غلط سمت میں چل رہے ہیں۔“ ”اسی سمت ہم نے رات بھر سفر کیا ہے سر، میں تو آلات کو دیکھتا ہوں دوسری طرف رات میں کیا نظر آتا ہے۔“

”سارے آلات چیک کرو برابر کام کر رہے ہیں۔ اور اسپنڈ کم کرو اور زیادہ آگے جانا خطرناک ہو سکتا ہے میرے لئے تو یہ مقام نیا ہے۔“

اچانک بیچ سمندر میں بے وجہ جہاز کھڑا ہو گیا۔ لنگر گرا دیئے گئے اور سارا عملہ مصروف ہو گیا۔ کشتیاں اتاری گئیں کہ پتہ کریں یہ کون سا مقام ہے اور ہم روٹ سے

میں نے کہا۔ ”ہوٹل تو ہوٹل ہے اس میں بھید بھاؤ کیوں ہے۔“

وہ بولا۔ ”تم نوا ماڑوں ہے ہم بولتا ہے ادھر دو ٹائپ ہوٹل ہے۔ بولو کدھر جانا ہے۔“

”کوئی درمیانی ہوٹل بھی ہوگا۔ وہاں پہنچا دے۔“

ٹیکسی والا دروازہ کھول کر نیچے آ گیا اور بولا۔ ”تم

ہم کو مسلمان لگتا ہے تمہاری بیوی برقعہ میں ہے ہم بھی

مسلمان ہے درمیانہ ہوٹل خراب جگہ ہے ادھر سب برا کام

ہوتا ہے شراب اور عیاشی یہ سمجھی ہے ادھر انڈیا کا بد معاش

آتا ہے اپنا اپنا کرتب لاتا ہے ہم کو اتنا بات نہیں کرنا تھا پین

برقعہ دیکھ کر اتنا بات کیا ہے ادھر اپنا خیال رکھنے کا ضرورت

ہے تم نیا آدمی ہے آؤ بیٹھو گاڑی میں آپ کو فنی والی جگہ

پہنچا دیتا ہوں۔“ میں نے جواب نہیں دیا اور گاڑی میں

بیٹھ گیا اتنوی بھی بیٹھ گئی ٹیکسی چل پڑی۔ آدھے گھنٹے کے

بعد اس نے ایک پرانی بلڈنگ کے سامنے گاڑی روک لی

اور اتر پڑا۔ بولا۔

”آؤ بہن جی اتر آؤ۔“ میں اور اتنوی گاڑی سے

باہر آ گئے۔

”یہ علاقہ ماہم کہلاتا ہے اور یہ گھر ہے ہوٹل نہیں

ہے۔ اس گھر میں ایک بوڑھی عورت اور ایک مرد ہے۔

بہت بڑا گھر ہے ان کا گزارہ مسافروں پر ہی ہے آپ

یہاں پر گھر کی طرح رہیں گے کسی قسم کی فکر نہیں کرنا پڑے

گی صرف یہ بوڑھے لوگ آپ کو کھانا نہیں دیں گے یہ

مسلمانوں کا علاقہ ہے میں بھی ادھر ہی ذرا فاصلے پر

رہتا ہوں آئیے اندر آ جائیے۔“ دروازے کے اندر آتے

ہی اس نے آواز دی ”ماموں میں آیا ہوں۔ گھر صاف

ستھرا تھا ایک کمرے سے ایک بوڑھا سفید کرتے اور نیند

میں باہر آ گیا بولا.....

”کیا بات ہے۔ اکبر علی خیریت تو ہے کیسے آنا

ہوا۔“

”ماموں آپ کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ دو مہمان ہیں

بیمبی میں نئے ہیں اس غلام شہر میں کم ہو جاتے اس لئے

میں نے تیرے گناہ میں حصہ نہیں لیا ہے مجھے کچھ نہیں ہوگا

اور میری عورت جس کو تم نے لوٹ کا مال سمجھ لیا تھا وہ بھی

میں پر ہے گی تم جزیہ پر جاؤ اور اس جہاز کو چھوڑ دو

اور اس پر سے گناہوں کا بوجھ کم کر دو۔“ میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ”میں کیپٹن ہوں آخری وقت تک جہاز پر

میرا ہر اندر ضروری ہے یہی قانون ہے۔“

”تیرا قانون کیا ہے میں نہیں جانتا میرا قانون یہ

ہے کہ تو جزیہ پر پر جائے گا تو جائے گا تو اس جہاز کی

مصیبت کم ہوگی کیونکہ تیری وجہ سے اس جہاز پر عیاشی کا اڈا

قائم ہوا ہے تیری سزا وہی ہے جو اور عیاشی کرنے والوں کی

ہے سرخ چیونٹیاں تیرا انتظار کر رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔

وہ جھج کر بولا۔ ”میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔“ اس کی

آواز اتنوی نے سنی اور انگلی اس کی طرف کردی اور پھر انگلی

کو اوپر کیا۔ کیپٹن کے پیر زمین سے اٹھ گئے اور وہ سمندر

کے اوپر تیزی سے جزیہ کی طرف جانے لگا جہاز خالی

ہو گیا سارے مرد اور عورتیں پورا عملہ جزیہ پر قید ہو گیا

جہاز اشارت ہوا وصل دی اور سکون سے ٹرن ہوا اور روانہ

ہو گیا۔ کیپٹن اور تمام عملے نے یہ تماشا دیکھا اور حیران

کھڑے رہے اور صرف آٹھ دن میں سب کا کام تمام

ہو گیا۔ سرخ چیونٹیاں ان پر حملہ آور ہو گئیں اور ہڈیاں تک

صاف کر گئیں۔ چار روز کے بعد جہاز کھڑا ہو گیا میں نے

ایک کشتی سمندر میں اتاری اور اتنوی کو لیکر آبادی کی طرف

چلا کشتی چلانے میں بھی مجھے محنت نہیں کرنا پڑی اور میں

بیمبی کے ساحل پر اتر گیا۔ وہ ساحل ایسا تھا۔ جہاں پر

سینکڑوں کشتیاں کھڑی تھیں اتنوی برقعہ میں تھی ہماری کشتی

ساحل سے دور تھی مگر درمیان میں کشتیاں موجود تھیں اور

وہی پل کا کام کر رہی تھیں ہم سے کسی نے کوئی سوال نہ کیا

ورہم گودی سے باہر آ گئے۔

میں نے ایک ٹیکسی روکی اور کسی ہوٹل میں چلنے کا

کہا۔

ٹیکسی والا بولا۔ ”ہندو ہوٹل میں چلنا ہے کہ مسلمان

ہوٹل میں۔“

چوپائی سمندر کا کنارہ ہے کراچی کے کلکشن پر دیوار لگادی جائے تو وہ بھی ایسا ہی بن جائے گا وہاں کے دوکانداروں کا رویہ بھی کراچی والوں کی طرح ہے۔

ہم چوپائی اترے ہی تھے گاڑی کے پاس دو عورتیں آگئیں اور انہوں نے اکبر علی سے کہیں چلنے کو کہا۔ اکبر علی نے مجھ سے کہا صاحب آپ کتنی دیر یہاں رکیں گے۔ میں نے کہا یہی گھنٹہ دو گھنٹہ اکبر علی بولا۔ اگر آپ اجازت دیں تو یہ بھاڑا اٹھالوں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں آجاؤں گا میں نے کہا لے جاؤ میرا کیا نقصان ہے اکبر علی چلا گیا۔

انتونی نے برقعہ اتار اہوا تھا مگر چہرے پر پھر بھی کپڑا تھا مگر آدھا چہرہ تو نظر آ رہا تھا جو قریب سے گزرتا دیکھتا سی رہتا۔ سمندر کے کنارے میزیں بڑی تھیں اور نہایت بوسیدہ کرسیاں پڑی تھیں ان پر بہت لوگ بیٹھ کر سمندر کا نظارہ کر رہے تھے اور ہنسی پوری کھا رہے تھے۔ ہم دونوں بھی بیٹھ گئے اور دو پلیٹ کا آرڈر دے دیا۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک لمبا آدمی اس کی قلمیں لمبی اور بال بڑے بڑے تھے جسم پر شرٹ اور پینٹ اور ہاتھ میں سگریٹ کا ڈبہ اور ماچس اس نے اطمینان سے سگریٹ کا ڈبہ اور ماچس میز پر رکھ دی اور کرسی ہمارے قریب کر کے بیٹھ گیا اور بولا.....

”میرا نام نانو بھائی ہے میں فلم بناتا بھی ہوں اور ہیرو کا کام بھی کرتا ہوں۔ میری کامیابی کا راز یہ ہے کہ میں ہر وقت نئے چہروں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ آپ دونوں ٹیکسی سے اترے تھے میں اس وقت سے آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ برا مت ماننا میں صاف بات کرتا ہوں اور جو کچھ ٹھان لیتا ہوں وہ ضرور کرتا ہوں۔ یہ لڑکی جو تمہارے ساتھ ہے ایک بہترین ہیروئن بن سکتی ہے۔ اس کا قد چال ڈھال حیرت انگیز ہے چہرہ آدھا دیکھا ہے مگر لا جواب ہے یہ میرے ساتھ ہیروئن کے پارٹ میں خوب سجے گی اور فلم سپر ہٹ ہو جائے گی۔ بولو کیا کہتے ہو۔“

”ہوسکتا ہے تم ایسے فلم میکر ہو ایسے ہیرو بھی ہو مگر

آپ کے پاس لے آیا۔“

”بہت اچھا کیا، آؤ میاں میرے کمرے میں بیٹھو اور بیٹھی تم دوسرے کمرے میں ممانی کے پاس بیٹھ جاؤ، بریلی سے آئے ہیں جگت ماموں ہو گئے ہیں۔“

”آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔“ ماموں نے مجھ سے پوچھا۔ اصل بات میں کیا بتاتا۔ میں نے کہا۔

”میرے پیر میں ماموں چکر ہے ایک جگہ سے آیا ہوں تو بتاؤں آپ یہ سمجھ لو کہ میں دلی سے آیا ہوں۔“

میرے ذہن میں اس وقت دلی کا نام ہی آیا تھا۔

”ارے واہ میاں شہروں کا شہر دلی۔“ پھر رنجیدہ آواز میں بولے۔

”میں بوڑھا آدمی ہوں۔ بیوی بھی ایسی ہی ہے صفائی کو ایک ملازم ہے مگر کھانا ایک ہوٹل سے منگواتا ہوں ہمارا کھانا ہی کیا ہے بوڑھاپے نے ہوک اڑادی ہے بس یہ پریشانی آپ کو ہوگی۔ کرائے وغیرہ کا مسئلہ نہیں ہے جو دل کرے دے دیا کرنا جب تک دل کرے رہو تمہارا ہی گھر ہے۔“ بڑے میاں کی باتوں میں مجھے سچائی نظر آئی انہوں نے ایک صاف ستھرا کمرہ مجھے دے دیا۔ اکبر علی ڈرائیور کو میں نے کرایہ ادا کر دیا اور کہا۔ ”سویرے روز وہ آجایا کرے اور شام تک میرے ساتھ رہے روزانہ کے حساب سے اس کی ادائیگی کر دی جائے گی۔“ اکبر علی نے میری پیشکش قبول کر لی اور چلا گیا۔

گھر بہت بڑا تھا اور صاف ستھرا بھی تھا ہوٹلوں والا ماحول نہیں تھا میں اور انتونی کے علاوہ صرف ماموں اور ممانی تھے ماموں صبح بہت سویرے اٹھ جاتے تھے اور اذان کی آواز آتے ہی چلے جاتے تھے ممانی اپنے کمرے میں جاگ کر نماز پڑھتی تھیں۔ نہایت شریف اور سیدھے لوگ تھے۔

جب بھی شہر کے لوگوں کے لئے میرے دل میں جو پہلا تاثر پیدا ہوا وہ بہت اچھا تھا۔

اکبر علی اور ماموں دونوں پر غلوم آدمی تھے۔

اکبر علی روزانہ انتونی اور مجھے سیر کرانے لے جا

تا تھا۔

انتونی بولی۔ ”تماشہ دیکھو گے۔“

میں نے کہا۔ ”تماشہ تو کرنا ہی پڑے گا وہ آئے گا ضرور کیونکہ وہ ہیرو ہے۔“

پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ آ گیا۔ میں نے کہا۔ ”اتنی فوج کی ضرورت کیا تھی ہیرو صاحب.....“

اس نے جواب نہیں دیا۔ انتونی کڑاٹھانے کا اشارہ آدمیوں کو کیا۔ مگر جس کرسی پر انتونی بیٹھی تھی وہاں وہ نہیں تھی اس کی جگہ پر ایک بلی کان کھجاری تھی۔ اچانک یہ نئی صورت حال دیکھ کر نانو بھائی کی حالت خراب ہو گئی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اس کے ساتھ آئے آدمی اس کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے وہ کرسی پر بیٹھ کر ہانپنے لگا میں نے اس کی حالت دیکھ کر کہا۔ ”کیا ہوا ہیرو کیوں پریشان ہو؟“ اس نے ماتھے سے پسینہ پوچھا اور انتونی کی کرسی پر نظر ڈالی انتونی اپنی جگہ موجود تھی اور ایک کالی بلی کرسی کے پاس بیٹھی تھی۔ نانو بھائی کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ”ایسا کیسے ہوا؟ یہ کیمرہ ٹرک ہے۔“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”حقیقی دنیا میں کیمرہ ٹرک نہیں چلتی تیری کھوپڑی میں طاقت کا نشہ بھرا ہے اس کو نکال اور پھر عقل کے کھوڑے پر سوار ہو کر دیکھ، یہ کون ہے تیری طرف اگر دیکھ لیا تو تیری ساری طاقت ہوا ہو جائے گی فلم بنانا تو دور کی بات دیکھنا بھی بھول جائے گا۔“ میں نے کہا۔ مگر آدمی ڈھٹ تھا بیٹھا رہا بولا۔ ”میں جانتا ہوں یہ کوئی ٹرک کیا ہے ہم ہیروؤں کو چڑھانا کراڑا دیتے ہیں پھر عورت بنا لیتے ہیں تم نے بھی کوئی ایسا کام دکھایا ہے میں سمجھ گیا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”ٹرک دکھانا ہی پڑے گی۔“ اچانک اس کو ایسا لگا جیسے اس کے بدن پر ہزاروں کیڑے چڑھ گئے ہیں وہ پورے بدن کو ملنے لگا مگر جین نہ آیا کوٹ اتار کر پھینک دیا میٹھی بھی اتر گئی پھر پتلون کا نمبر آ گیا اور وہ پتلون اتار کر خالی انڈرویئر میں ایک طرف اپنے بدن کو کھجانا ہوا دوڑ گیا۔

اچھے انسان شناس نہیں ہو راہ چلتے کسی لڑکی کو آپ اس طرح کی پیشکش نہ کیا کرو یہ طریقہ غلط ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں یہاں کے ہر طریقہ کو جانتا ہوں تم اپنی مرضی بتاؤ اور دام بتاؤ۔“ وہ بولا۔

”دیکھو میرے دوست ہر کسی کو ایک لکڑی سے نہیں ہانکا جاتا تم اس لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تم کو اگر پتہ چل جائے کہ یہ لڑکی کون ہے تو تمہاری پتلون گیلی ہو جائے گی۔ اس لئے آپ تشریف لے جائیں۔“ میں نے کہا۔

نانو بھائی کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا وہ بولا۔ ”میں ادھر سے اٹھا کر اس کو لے جا سکتا ہوں دیکھتا ہوں کون روکتا ہے۔ تجھے میرے بارے میں پتہ نہیں ہے میں پورا ہیرو ہوں۔“

”مگر تم ادھر سے انسان ہو۔“ میں نے کہا۔ ”میرے ساتھ پوری فوج ہے بول تو اٹھالوں اس کو اب بھی وقت ہے سوچ لے۔“ وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ”میں نہیں روکوں گا اٹھا لے اور لے جا.....“

اس نے ایک مخصوص قسم کی آواز منہ سے نکالی نیز کے چاروں طرف چھ، سات آدمی کھڑے ہو گئے ایک انتونی کی طرف بڑھا اور رک گیا دوسرا بڑھا وہ بھی پیچھے آ گیا۔

انتونی اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھی تھی اس کے قریب کوئی نہیں جا رہا تھا۔ نانو بھائی دہاڑا۔ ”ابے کیا تماشہ دیکھنے کو آئے ہوا اٹھاؤ اس کو اور ڈالو گاڑی میں۔“

مگر کسی نے اس کی بات نہیں سنی اور ایک طرف چل دیے۔

میں نے کہا۔ ”ہیرو صاحب اپنی عزت بچاؤ اور چلے جاؤ تو اچھا ہے ورنہ یہ پتلون کوٹ چھوڑنا پڑے گا۔ ننگے بھاگتے ہوئے تم اچھے نہیں لگو گے۔“

”میں ابھی آتا ہوں وہ اٹھ کر ایک طرف چل دیا۔“

نہیں پڑا ہوا۔ ”روکڑا کدھر سے آئے گا۔“
میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک پتھر اس کے
ہاتھ پر رکھ دیا اور کہا۔ ”اس کو کوچ دو اور گاڑی خرید لو۔“
وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”نہیں سیٹھ میں صرفاً
بازار بیچنے کو جاؤں گا تو بولیں گا چرا کر لایا ہوں اور اندر
کر دیا جاؤں گا۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا ایسا کرو مجھے صرفاً بازار لے کر
چلو۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ وہ بولا۔۔۔۔۔ اور ہم دونوں صرفاً
بازار کی طرف روانہ ہوئے۔ میں ٹیکسی سے اتر کر ایک
بہت بڑی دوکان پر پہنچ گیا۔ سبز مین نے پوچھا۔ ”کیا مانگتا
ہے سر؟“

اگر وہ سر نہ کہتا تو شاید مجھے غصہ آ جاتا میں نے کہا۔
”دوکان کے مالک سے ملو اور۔“ وہ اندر چلا گیا۔ اس کے
ساتھ ایک جوان آدمی سفید کپڑوں میں آ کھڑا ہوا
بولا۔ ”حکم کرو مہربان۔۔۔۔۔“

”میرے پاس کچھ ہیرے ہیں وہ دکھانا
چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”آئیے اندر آ جائیے۔“ وہ بولا اور اپنے کمرے
میں لے گیا۔ میں نے جیب سے ایک ہیرا نکال کر اس
کے سامنے ڈال دیا اور کہا۔ ”یہ ہیرا اندازاً پانچ ہزار سال
پرانا ہے اور کسی فرعون کی مٹی کے ساتھ نکلا تھا اس کو پرکھ لیں
کسوٹی لگالیں اور پھر دام بتائیں۔“

اس نے اتنا بڑا ہیرا شاید پہلی بار دیکھا تھا بولا۔ ”یہ
کام اتنی جلدی نہیں ہو سکتا۔“

میں نے کہا۔ ”میں اس کو چھوڑ دیتا ہوں آپ رکھ
لیں میں کل آ جاؤں گا پھر بتا دیں۔ آپ کو اجازت ہے کہ
آپ ہر طرح اس کو چیک کر لیں مگر توڑنے کو شش نہ کریں
یہ کسی بہت بڑے شہنشاہ کا ہیرا ہے اگر پسند نہ ہو تو واپس
کر دیں اور پسند ہو تو مناسب قیمت لگا دیں۔“ میں اٹھ
کھڑا ہوا۔

”مگر کسی قسم کی چھڑے بازی نہ کریں۔ میں آپ

اس کے پیچھے کچھ نیچے دوڑے۔“ پاگل ہے پاگل
ہے۔۔۔۔۔ اور نانو بھائی ہیرو پاگل ترار دے دیئے گئے میں
اٹھ گیا تو انتونی بھی اٹھ گئی اور ہم روڈ پر آ گئے اکبر علی آ چکا
تھا بولا۔ ”ادھر کون پاگل آ گیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”نانو
بھائی فلم میکر اور ہیرو جو کہ پاگل ہو گیا ہے۔“
اکبر علی حیرت سے بولا۔ ”نانو بھائی پاگل ہو گیا۔

ارے یہ تو بسببی کا بہت بڑا بد معاش ہے اس کے پاس تو
ہر وقت آدمیوں کی پوری فوج رہتی ہے فلمی دنیا میں بھی
اس کی بد معاشی چلتی ہے مگر اس کی فوج اس کا ساتھ چھوڑ گئی
آؤ گھر چلو۔۔۔۔۔“

دوسرے دن اخبارات میں نانو بھائی کے پاگل
ہونے کی خبر چھپی ہوئی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ایک عورت
کا ذکر بھی تھا چشم دید گواہوں کے بیان کے مطابق وہ
عورت اتنی حسین تھی کہ آدمی اس کو دیکھ کر خود کو بھول جاتا ہے
اور اس کے اشارے پر سب کام کرتا ہے اس کی آنکھیں
انسان پر حیرت انگیز اثرات ڈالتی ہے نانو بھائی کے ساتھ
آئے آدمیوں کے بیانات نے سب کو حیرت میں ڈال
دیا۔ اخباری رپورٹر اور پولیس کے لوگ اس عورت کی
تلاش میں لگ گئے۔ اکبر علی نے اخبار پڑھ سنایا اور کہا۔

”سر مجھے لگتا ہے یہ لوگ آپ کی تلاش میں ہیں۔“
میں نے کہا۔ ”ان کو تلاش کرنے دو، وہ زندگی بھر
تلاش کرتے رہیں گے اور کچھ نہیں پائیں گے تم خاموش
رہنا۔ کوئی آ گیا تو بھی فکر نہ کرنا تمہارا کچھ نہیں ہوگا۔“
”مجھے اپنی فکر نہیں ہے فکر ماموں کی ہے پولیس
یہاں تک آ گئی تو ماموں بوڑھے آدمی ہیں کیا کریں
گے۔“

اکبر علی نے کہا تو میں نے جواب دیا۔ ”ایسا نہیں
ہوگا۔“

”تم یہ بتاؤ یہ ٹیکسی تمہاری ہے۔“ میں نے پوچھا۔
”ارے نہیں صاحب ہم غریب آدمی ہے۔ میں
روپیہ روز مالک کو دینا پڑتا ہے۔“ اکبر علی بولا۔۔۔۔۔

”تم اپنی گاڑی خرید لو۔“ میں نے کہا۔ وہ یہ سن کر

پر بھروسہ کر رہا ہوں اس لئے کہ میں سودا کرنے آیا ہوں۔“ اور میں دوکان سے باہر چلا آیا۔
اکبر علی موجود تھا بولا۔ ”سودا ہوا؟“
میں نے کہا۔ ”کل پتہ چلے گا۔“
دوسرے دن میں دوکان پر پہنچا تو دوکان بندھی میں نے اکبر علی سے کہا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ وہ بے ایمان ہو گیا ہے دوکان بند ہے تم گھر چلو۔“ میں نے گھر آ کر انتونی کو بتایا تو وہ بولی۔
”رات کو اس کے گھر چلیں گے۔“
میں نے کہا۔ ”اس کا گھر تو پتہ نہیں ہے۔“
انتونی بولی۔ ”وہ ہیرا مجھے راستہ بتائے گا اکبر علی کو کہو رات کو آ جائے۔“

اکبر علی رات کو نوبے آ گیا اور ہمارا کھانا بھی لے آیا اکثر وہ کھانا لے کر آ جاتا تھا۔ کھانے کے بعد ہم ایک طرف روانہ ہوئے انتونی خاموش تھی۔ وہ صرف انگلی سے راستہ بتا رہی تھی گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی پھر ایک بڑے سے مکان کے سامنے گاڑی کھڑی ہو گئی۔
انتونی نے بتایا۔ ”اسی مکان میں ہیرا ہے۔“ اکبر علی بولا۔ ”یہ گیٹ وے آف انڈیا کا علاقہ ہے یہاں پر بڑے سرمایہ دار رہتے ہیں۔“ میں اور انتونی گاڑی سے اتر گئے دروازے پر کوئی نہیں تھا مگر دروازہ بند تھا اور مکان قلعہ نما بنا ہوا تھا۔ گھنٹی بجانے پر ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ ”میں نے کہا تم کون ہو؟ مالک کو بلاؤ۔“
”مالک تو پونا گئے ہیں۔“ وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ”جھوٹ مت بولو وہ کھڑکی میں کھڑا ہے اور ہماری طرف دیکھ رہا ہے اس کے ساتھ تو بھی مارا جائے گا زیادہ وفا داری مت دکھا۔“
اس نے دروازہ بند کرنا چاہا مگر میں اور انتونی اندر داخل ہو گئے اس دروازے کے بعد ایک کانچ کا دروازہ تھا میں نے اس کو کھولا اور دونوں ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔
میں نے آواز دی۔

”آ جا باہر نہیں آئے گا تو نقصان اٹھائے گا۔“ چند

منٹ کے بعد وہی آدمی میرے سامنے تھا میں نے کہا۔ ”میں نے تجھ پر بھروسہ کیا تھا اس لئے کہ میں اپنی چیز واپس لینے کی طاقت رکھتا تھا میں نے تیرا نام نہیں پوچھا تھا پتہ نہیں پوچھا، تو نے سوچا ایسا بے وقوف آدمی بار بار نہیں ملتا میرے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے لاکھوں روپے کی چیز تیرے حوالے کر دی مگر تو نزاحق آدمی ہے تو نے یہ نہیں سوچا کہ یہ کیوں ایسا کر رہا ہے میں جانتا ہوں کہ وہ ہیرا اسی چادر دیواری میں موجود ہے تو نے اس کی پرکھ بھی کر لی ہے اور اس کا سودا بھی اٹایا سے باہر کی پارٹی سے کر لیا ہے دوکان بند کر کے تو سمجھ رہا تھا کہ مال تیرا ہوا۔ ارے بے وقوف جس کا مال ہے وہ تیرے سامنے بیٹھی ہے اس کو دیکھ.....“

انتونی نے برقہ اتار دیا۔ وہ جوان شخص انتونی کو دیکھ کر حیران رہ گیا اس کے چہرے کے تاثرات عجیب ہو گئے اس کی آواز بند ہو گئی کافی دیر کے بعد وہ بولا۔ ”تم کون ہو؟“

انتونی نے جواب دیا۔ ”میں شہزادی رلیتھا کی کینز خاص ہوں شہزادی فرعون سیٹی اول کی بیٹی تھی میں اپنی قبر میں ہزاروں سال سوتی رہی ہوں یہ ہیرے شہزادی نے میرے سر ہانے رکھے تھے تاکہ میں جب بیدار ہو جاؤں تو میرے کام آئیں تم نے بے ایمانی کر کے اپنی زندگی خراب کر لی ہے۔ تم نے امانت میں خیانت کا جرم کیا ہے تمہارا حشر بہت برا ہو گا۔“

اس کے چہرے کا رنگ نفی ہو گیا اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا وہ انتونی کے پیروں میں گر گیا اور رو کر بولا۔ ”میں تمہاری ہر بات پر اعتبار کرتا ہوں میں نے غلطی کی ہے اگر آپ کو وہ ہیرا فروخت کرنا ہے تو میں وہ ساری رقم آپ کو ادا کروں گا اگر نہ فروخت کریں تو ابھی آپ کے حوالے کر دیتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”تم نے کتنے کا سودا کیا ہے؟“
وہ بولا۔ ”پانچ لاکھ روپے کا سودا ہے پورے آپ کو ملیں گے میں کچھ نہیں لوں گا۔“

جگن ناتھ نے جواب نہیں دیا اور چیخ کر بولا۔ ”یہ تماشا ختم کرو کیا کر رہے ہو۔“ مگر ان میں سے کوئی نہیں بولا تو میں نے کہا۔ ”تو جاکر ان کو دیکھ وہ زندہ بھی ہیں کہ مر گئے۔“

وہ تیزی اٹھا اور اس نے ایک کو ہلایا وہ زمین پر گر گیا۔ مگر آنکھیں کھلی تھیں اور سانس بھی چل رہی تھی پھر اس نے دوسرے کو ہلایا وہ بھی زمین پر گر گیا اس کی حالت خراب ہو گئی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں ڈر کے مارے اس کا چہرہ سیاہ پڑنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”تیرے اندر کا لک بھری ہے تیرا سارا دھندہ کالا ہے تیری سمجھ میں شرافت کی زبان نہیں آتی۔ اس لئے تیرے اندر کی کا لک صاف کرنا پڑے گی۔۔۔۔۔ بول رقم دے رہا ہے کہ ہیرا۔“ وہ بڑی مشکل سے بولا۔ ”تم جو بولو دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”رقم لے آجئے اس کی ضرورت ہے۔“ وہ اندر گیا اور ایک تھیلے میں رقم لے آیا۔

میں نے کہا۔ ”اگر کم ہوئی تو ایک کے دس لوں گا۔“ جگن ناتھ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”نہیں سیٹھ رقم پوری ہے۔“

”ہیرا تیرے پاس تجوری میں ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں جی رکھا ہے۔“ وہ بولا۔۔۔۔۔ میں نے انتونی کو اشارہ کیا اس نے وہی ہیرا میرے ہاتھ پر رکھ دیا میں نے جگن ناتھ کے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہا۔ ”یہ وہی ہیرا ہے دیکھ لے۔“

جگن ناتھ نے غور سے اس کو دیکھا اور حیرت سے بولا۔ ”پر یہ تو تجوری میں بند تھا پھر تمہارے پاس کیسے آ گیا؟“ میں نے کہا۔ ”تیری طرح میں بھی بے ایمان ہوتا تو لے کر چلا جاتا مگر میں تجھے واپس کر رہا ہوں کیونکہ تو نے اس کی قیمت ادا کر دی ہے مگر تیری بے ایمانی کی سزا تجھے ضرور ملے گی۔۔۔۔۔ اور یہ چاروں جو کہ بمبئی شہر کے مشہور بد معاش ہیں رقم لے کر قتل کرنا ان کا پیشہ ہے ان کو بھی سزا ملے گی۔۔۔۔۔“ میں نے ان چاروں کو کہا۔ ”کھڑے

میں نے کہا۔“ مجھے سودا منظور ہے تم یہ بتاؤ یہ سودا تم نے درست کیا ہے۔“

”اس ہیرے کی قیمت ہو سکتا ہے آگے مارکیٹ میں بڑھ جائے مگر اس وقت یہی مارکیٹ ہے۔“

میں نے کہا۔ ”رقم کب ادا ہوگی۔“ وہ بولا۔ ”کل شام رقم آ جائے گی۔“

میں نے کہا۔ ”میں کل شام آ جاؤں گا ایک بات یاد رکھنا تم اس ہزاروں سال پرانی عورت کو دیکھ چکے ہو کسی قسم کی چال بازی کرو گے تو بمبئی میں تو کیا پورے ہندوستان میں تم چھپ نہیں سکو گے۔“

میں اور انتونی باہر آ گئے اور اکبر علی کے ساتھ گھر آ گئے۔ دوسرے دن اکبر علی ہم کو لے کر اس کے گھر پہنچ گیا۔ آج وہ اکیلا نہیں تھا۔ چار آدمی اس کے قریب تھے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ چاروں اچھے لباس میں ضرور ہیں مگر چھٹے ہوئے بمبئی شہر کے بد معاش ہیں اور وہ کسی اچھے ارادے سے نہیں آئے ہیں۔ انتونی نقاب میں تھی میں نے کہا۔ ”ہاں سیٹھ بولو کیا ارادہ ہے۔“ وہ بولا۔ ”میں کیا بولوں آج تو یہ لوگ بولیں گے اگر

تم کو جان بیاری ہے تو شام سے پہلے بمبئی چھوڑ دو اور بھول جاؤ کہ تم نے میرے ساتھ کوئی سودا کیا تھا۔“

میں نے جواب دیا۔ ”آج پھر تیرے اندر شیطان گھس گیا ہے تو نے یہ جو مٹی کی چار مورتیاں یہاں رکھی ہیں وہ تجھے نہیں بچا سکیں گی۔“

میری بات سن کر ایک بولا۔ ”بس جگن ناتھ سیٹھ تم ابھی کچھ نہیں بولے گا ہم جانے اور یہ طرم خان جانے اس کا عورت کو ایسی منڈی میں بیچے گا کہ اس کا باپ بھی نہیں ڈھونڈ سکتا۔“

میرے ساتھ کچھ خاموش تماشا کی تو تھے میں نے آنکھ کا اشارہ کیا اور ان چاروں کو انہوں نے چھاپ لیا۔

میں نے جگن ناتھ کو کہا۔ ”تو بہت بے ایمان آدمی ہے کل تیرا داغ ٹھیک تھا مگر آج پھر الٹ گیا ہے یہ مٹی کی مورتیاں ہیں تو نے ان پر پھر دوسہ کیا ہے۔“

ہو جاؤ، یہاں سے تم سیدھے تھانے جاؤ گے، کپڑے اتار کے اور پولیس کو بتاؤ، تم نے اب تک جو کچھ کیا ہے۔ اگر ذرا بھی چھپایا تو تمہارے جسم پر جو کمپن چپک جائیں گی اور تمہارا سارا خون پنی جائیں گی۔ دیکھو تمہارے انتظار میں ہیں۔“ ان سب کو جو کمپن نظر آنے لگیں میں نے کہا۔ ”اتارو کپڑے.....“ انہوں نے بہت تیزی سے کپڑے اتار دیئے اور میرے اشارے پر باہر سڑک پر دوڑ گئے جگن ناتھ نے یہ حیرت انگیز تماشہ دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ”مجھے معاف کر دو گرو.....“

”تیری سزا یہ ہے کہ تو روزانہ بیس غریبوں کو اپنے دروازے پر خود کھانا پکا کر کھلانے کا اور یہ کام پورے ایک سال کرے گا۔ ایک دن کا نانہ نہیں ہوگا اور صرف ایک لنگوٹی باندھ کر رہے گا۔ پورے سال کسی قسم کا کپڑا تن پر نہیں ڈالے گا، اگر کپڑا پہنا تو اس میں تجھے کیڑے کاٹیں گے ایک سال کے بعد تو آزاد ہوگا مگر ایسا انداری شرط ہوگی۔“

میں نے انتونی کو اشارہ کیا اور دروازے سے باہر آ گئے۔ اکبر علی دروازے پر موجود تھا۔ بولا۔ ”یہ چار ہنگے کون تھے؟“ میں نے کہا۔ ”تم ان چکروں میں مت پڑو اور کسی کارشوروم پر چلو۔“ اکبر علی نے ایک بہت بڑے کارشوروم پر گاڑی کھڑی کر دی۔ میں نے انتونی سے کہا۔ ”تم یہیں پر رہو۔“ اکبر علی کو ساتھ لے کر میں شوروم کے اندر چلا گیا۔ اندر نئی ٹیکسیاں تیار کھڑی تھیں۔ میں نے اکبر علی سے کہا۔ ”تم گاڑی پسند کرو۔“ اکبر علی نے تعجب سے کہا۔ ”ایسا کیوں سیئہ؟“

میں نے کہا۔ ”تم گاڑی خریدو وجود لے کرے۔“ اس نے ایک بہت اچھی گاڑی پسند کر لی زیر میٹرکی۔ میں نے اس کی قیمت ادا کر دی اور اکبر علی کے نام اس کا رجسٹریشن کرا دیا۔ میں نے شوروم کے مالک کو کہا۔

”شام کو گاڑی لینے آ جاؤں گا جیسے دیکھی ہے ویسی ہی لوں گا۔ پھٹے بازی مت کرنا دھرمبہمی میں تم لوگ دکھانا کچھ ہے اور دیتا کچھ ہے۔“

اکبر علی اور میں باہر آئے اور گھر روانہ ہو گئے۔ میں انتونی کو آج کا دور دکھارہا تھا۔ اس زمانے کی ضروریات بتا رہا تھا۔ وہ بھی خوش تھی نئے نئے تجربات نئے نئے لوگ اس کی نظر میں آرہے تھے۔ اس نے نئے نئے لباس خرید لئے تھے چہرے کے نقاب خرید لئے تھے اور زبان کے بھی کچھ لفظ سمجھ گئی تھی۔ شام کو اکبر علی گاڑی لے آیا۔ بہت خوش تھا بولا۔ ”میری زندگی کا ایک خواب پورا ہوا۔“ میں نے کہا۔ ”دوسرا خواب کیا تھا؟“ وہ بولا۔ ”ارے صاحب بہت ہے ابھی کیا بولے۔“

”انسان پر خوش نصیبی کے دروازے بار بار نہیں کھلتے بول دوسرا خواب کیا ہے؟“

”اپنا گھر اور گھروالی.....“ وہ نظریں جھکا کر بولا۔

میں نے کہا۔ ”اس میں شرمانے کی کیا بات ہے ہر انسان کی یہی خواہش ہوتی ہے۔“

”مگر ہر انسان کے بس میں یہ نہیں ہوتا۔“ وہ بولا۔

”ابھی وقت تیرے ساتھ ہے تو گھر تلاش کر خریدتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”گھر تو بہت ہیں سرگر پگڑی بہت زیادہ ہے چالیس، پچاس ہزار مانگتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”تو سودا کر لے۔“ میں نے کہا۔

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”ٹھیک ہے سرکل کر لوں گا۔“

دوسرے دن صبح ہی وہ آ گیا۔ بولا۔ ”میں نے رات کو ہی سودا کر لیا تھا۔“

”تو پھر آؤ چلتے ہیں کتنے کا سودا کیا ہے؟“ وہ بولا۔

”پچاس ہزار کا نقد فوری قبضہ۔“

اکبر علی کو مکان بھی مل گیا میں نے کہا۔ ”تیری وجہ سے میں رکا ہوا ہوں اب لڑکی تلاش کر لے اور شادی کر ڈال۔“

وہ بولا۔ ”لڑکی تو ہے میرے ماموں کی مگر میری حالت کی وجہ سے ماموں تیار نہیں ہوتا تھا۔ اب میں اس کو بتاؤں گا کہ گھر میرا اپنا ہے اور گاڑی بھی ہے تو شاید راضی ہو جائے۔ شام کو ماموں کے پاس جاؤں گا.....“ دوسرے

دن وہ خوش خوش آیا اور اس نے بتایا کہ ”ماموں تیار ہے۔“

انسان کی قسمت ساتھ دے تو سارے خواب کتنی آسانی سے پورے ہوتے ہیں۔ اکبر علی کے نصیب زور پر تھے میرے پاس روپے تھے ان کو خرچ کرنا بھی تھا اور نیک کام میں خرچ کرنا تھا اس سے کم از کم کسی ایک کی زندگی میں تو انقلاب آیا کسی کو تو فائدہ ہوا۔

پتھروں سے انسانوں کو کیا فائدہ ہزاروں سال سے ایک مقبرے میں بند پتھر انسان کے کس کام کے اس زمانے میں کرنی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ ہرے پیلے نیلے نوٹوں کی گڈیاں ہر چیز خرید سکتی ہیں انسان سے لے کر زمین عورت اور عزت سب کچھ اس کے بدلے مل سکتا ہے یوں تو ہر دور کا انسان لالچی رہا ہے یہ لالچ انسان کی کمزوری ہے بہت سی اچھائیوں کے ساتھ یہ ایک خرابی انسان میں ہر دور میں رہی ہے۔

اکبر علی خوش تھا انتونی نے کہا۔ ”تم اکبر علی سے زیادہ خوش ہو۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں میں خوش ہوں کسی کے کام آنا یا کسی حق دار کو اس کا حق دلانے کی کوشش کرنا کیا باعث خوشی نہیں ہے یہ انسانی زندگی کی وہ سچی خوشی ہے جو سب کو حاصل کرنا چاہئے کاغذ کے نوٹ اور کالج کے کلوے انسانی زندگی کے لئے ضروری نہیں انسانی زندگی کے لئے غذا ضروری ہے اور اس کو حاصل کرنے تھے آج کی کرنسی ضروری ہے اس کرنسی کو حاصل کرنے کے وسائل ضروری ہیں اکبر علی کے پاس وسائل ہیں وہ خوش ہے میں بھی خوش ہوں۔“

انتونی نے کہا۔ ”میں تم کو اور تمہاری خوشیوں کو سمجھ گئی ہوں۔ تم بہت دیر سے پیدا ہوئے اگر فرعونوں کے زمانے میں پیدا ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ ہزاروں لاکھوں لوگ صرف اہرام بنانے میں نہ مارے جاتے ہزاروں لوگ فرعونوں کے حجرے کی نظر نہ ہو جاتے تم اس دور میں وہ کام کر رہے ہو جو بہت کم کر رہے ہیں تم انوکھے انسان نظر آتے ہو۔“

”نہیں انتونی ایسا نہیں ہے اس دنیا میں ہزاروں لوگ مجھ سے بہتر کام کر رہے ہیں۔ دنیا نیک لوگوں سے کبھی خالی نہیں ہوتی۔ نیک لوگ مرنے کے بعد بھی دنیا کو فیض پہنچاتے ہیں فرعونوں کے زمانے میں بھی ایسا ہی ہوگا یہ بات دوسری ہے کہ ہم ان کے بارے میں نہیں جانتے ایسے لوگ شہرت سے دور بھاگتے ہیں۔ کچھ خاموش سپاہی کا کردار ادا کرتے ہیں مگر دنیا کا کوئی گوشہ ان کے وجود سے خالی نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا۔

”میری کتنی بڑی خوش نصیبی ہے کہ میرے سامنے اس زمانے کا پہلا آدمی آیا وہ ایک مثالی انسان ہے میں تم کو کیا نام دوں.....“ انتونی بولی۔

”تم کچھ نام نہ دو میرے ساتھ رہو میں تم پر فخر کرتا رہوں یہی بہت ہے۔“ میں نے کہا۔

”اب شاید ایسا بھی نہ ہو سکے۔“ وہ بولی۔

”کیوں تم نے ایسا کیوں سوچا؟“ میں نے پوچھا۔

”دیکھو دوست مجھے مصر جانا ہے میں شاید پہلی

عورت ہوں جو ہزاروں سال کے بعد مقبرے سے زندہ

نکل آئی ہوں مجھے دیکھنا ہے کہ فرعونوں پر کیا گزری ان کی

دولت کہاں گئی۔ میرے علاوہ بھی کوئی دوسری روح واپس

آئی۔ میرا مقصود کہیں مجھے اہراموں میں تلاش تو نہیں

کر رہا۔ مجھے تم سے جدا ہونا ہوگا مگر زیادہ نہیں صرف بیس

سال کے لئے میں چالیس سال کی عمر میں تم سے ملوں گی

پھر ہمارا ملن ہمیشہ کا ہوگا۔“

اور انتونی مصر چلی گئی۔ میں اپنے آپ سے بے گانا

ہو گیا۔ کچھ عرصہ میں خود کو بھول گیا انتونی کو بھولنا آسان نہ

تھا میں جنگلات کے اندر وقت گزارتا رہا، نئے نئے

تجربات کرنے لگا اور پھر میرا آپ کا ساتھ ہوا۔ ایک

اچھا دوست ملا تو بھیلی زندگی کو میں بھولا۔ اور آپ کے

رنگ میں رنگ گیا آپ کے خیالات اور جذبہ خدمت

میرے من کو بھو گیا اور میں آپ کا ساتھی بن گیا۔“

رولو کا خاموش ہوا تو حکیم وقار بولے۔ ”انتونی کے

جانے کے بعد اس نے تم سے رابطہ نہیں کیا۔“

خوشیوں سے دور چلا جاتا رہا ہوں مگر اب میری منزل قریب ہے۔“ رولوکا بولا۔

”میں تم کو روک نہیں رہا اگر مجھے تم روکنے کا اختیار بھی دے دو تو بھی میں اس اختیار کو استعمال نہیں کروں گا اسی کا نام دوستی ہے مجھے تم جتنے عزیز ہو اس سے زیادہ دوستی عزیز ہے مگر تم کو جب جانے کا اشارہ ہوتا ضرور دینا۔ تم میرے پیارے ہی نہیں ہو اس دوا خانے کا ہر فرد تمہارا دیوانہ ہے، ہر فرد تم کو چاہتا ہے، تم اس دوا خانے کے مالک ہو، مجھے تو تم نے دوستی میں مالک بنا رکھا ہے۔“

”نہیں حکیم صاحب۔“ رولوکا جذباتی آواز میں بولا۔ ”آپ ہی اس کے اصل مالک ہیں میں نے جو کیا ہے آپ کے حوالے سے کیا ہے۔“ حکیم وقار اداس ہو گئے رولوکا بھی خوش نہیں تھا۔

آٹھ دن گزر گئے اور انتونی کا بلا وہ آ گیا۔ رولوکا نے پورے دوا خانے کے لوگوں سے ملاقات کی اور آخر میں حکیم وقار سے کہا۔

”میرے دوست میرے ساتھی اب میرا رخصت کا وقت آ رہا ہے میں مصر جا رہا ہوں انتونی میرا انتظار کر رہی ہے اس کے ساتھ کچھ مشکلات ہیں۔ میں آپ سے خود رابطہ کیا کروں گا، آپ سے دور نہیں ہوں، مصر میں رہوں یونکہ میں رہوں یاد دنیا کے کسی بھی خطے میں رہوں۔“

حکیم وقار نے اداس نظروں سے اس کو دیکھا اور سینے سے لگا لیا۔ دونوں کی آواز شدت جذبات سے بندھتی اور رولوکا نے آنکھوں کی نمی کو زد کا نہیں اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

حکیم وقار نے رولوکا کو دور تک جاتے دیکھا اور دل میں کہا۔ ”خوش رہو میرے دوست تم زندگی کی جن خوشیوں کے لئے جا رہے ہو ان میں کامیاب ہو۔“

☆.....☆.....☆

ضروری ہے کہ انسان تمام چیزوں کی طرف دھیان رکھے اور گنجائش رکھے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ حالات آپ کی مرضی و منشاء کے مطابق چلتے ہیں، جو آپ چاہیں وہی

”اس نے کہا تھا میں خود رابطہ کروں گی اور تم کو بلاؤں گی تم کچھ نہ کرنا۔ بیس سال ہونے والے ہیں اب اس کے رابطے کا وقت قریب آ رہا ہے۔“ رولوکا بولا۔

”اگر اس نے تم کو مصر بلایا تو تم کیا کرو گے؟“ حکیم وقار بولے۔

”میں اس کے پاس جاؤں گا، انسان کا کوئی تو مرکز نگاہ ہوتا ہے میں اور کیا کہوں۔“ رولوکا بولا۔

”ہاں مرکز نگاہ ہونا بھی ضروری ہے ورنہ زندگی پھسکی پھسکی ہوتی ہے۔“ حکیم وقار بولے۔

”حکیم صاحب زندگی میں کچھ لوگ ہی ایسے ملتے ہیں جن کو آدمی عمر بھر نہیں بھولتا۔ میری زندگی میں بھی زیادہ ہمتیاں ایسی نہیں آئی ہیں صرف چند ہیں ان میں آپ بھی ہیں۔ میرے دل کے دروازے آپ کے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے میں جہاں رہوں آپ سے قریب ہی رہوں گا، آپ یاد کریں گے، میں آپ کے ذہن کے پردے پر نمودار ہر جاؤں گا، آپ کی مشکلات اور ضروریات کا حل میں ضرور کروں گا۔“ رولوکا بولا۔

”تمہاری دوستی اور محبت کو فراموش کرنا میرے لئے آسان نہیں ہوگا میں تمہارا عادی ہو چکا ہوں تم جن مسئلوں کو آسانی سے حل کر دیا کرتے تھے میں کہاں کر سکوں گا۔ تم جو دوائیں حاصل کر لیا کرتے تھے میں کہاں پاؤں گا..... تمہاری بے لوث محبت بھری خدمت مجھے رلائے گی میں تمہارا بدل یا ذرا سا بھی بدل کبھی نہیں پاؤں گا۔ میری زندگی کا خوشیوں بھرا دور ختم ہو گیا اب تو صرف زندگی کے دن پورے کرنا ہوں گے۔“ حکیم وقار اداسی سے بولے۔

”حکیم صاحب میں آپ کے جذبات کو سمجھتا ہوں مگر جدائی بھی زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ جو ملتے ہیں ان کو جدا ہونا پڑتا ہے، میں آپ سے جدا ہو کر بھی جدا نہیں ہوں۔ میرا وجود جہاں ہو، میں آپ کے قریب ہی رہوں گا۔ انتونی میری زندگی کی ایسی ضرورت ہے جو صرف مجھے بہت کم عرصہ کو ملے گی انسانی زندگی کی خوشیاں میرے حصہ میں کم آئیں ہیں مگر میں دوسروں کو خوش دیکھ کر اپنی

ارے کھیت پر جاتا تو کیا دھوپ میں نہ ہوتا۔“
شکور خان نے جواب نہیں دیا صرف ہنس کر باہر کی
طرف چل دیئے۔

اس کے بعد بھی شکور خان نے کوشش کی مگر عین
کھیت پر نہیں گیا۔

چکرا گاؤں شاہ پور جہاں سے تین کوس پر ہے۔
یہاں پر آبادی صرف کسانوں کی ہے اور نہایت سادہ لوگ
ہیں، شاید ایک آدھ ہی پورے گاؤں میں ایسا ہے کہ وہ
ہندی لکھ پڑھ لے۔ کوئی خط آجائے تو پنڈت رام بھروسہ
ہی کام آتے تھے وہ انک انک کر خط پڑھ دیا کرتے تھے
اور کونا ٹونا پوسٹ کارڈ آجائے تو رونا پینا شروع ہو جاتا تھا
اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ پوسٹ کارڈ کے کونے کو ٹونا گویا
کسی کی موت کی خبر ہوتی تھی۔ جب خوب رو لیتے تو
پنڈت کی تلاش ہوتی کہ پتہ تو چلے کہ کون کہاں پر مر گیا
ہے مگر اکثر ان کا رونا پینا بے کار جاتا اور پوسٹ کارڈ میں
ایسی کوئی بات نہ لکھی ہوتی۔

ایسے سادہ اور سیدھے لوگ تھے جو دنیا کے دھوکے
فریب کو جانتے نہ تھے۔ جھوٹ بولتے نہیں تھے۔ غریب
تھے مگر بھوکے نہیں تھے، کھانے بھر کا زمین سے لے لیتے
تھے۔

عین خاں نے ماں سے کہہ دیا تھا ہم شاہ پور جاویں
گے اور وہیں پر روزگار کریں گے۔

اماں گھبرا کر بولیں۔ ”ارے وہاں کیا کرے گا سنا
ہے شہری لوگ بڑے خطرناک ہوئے ہیں۔“

”ارے ماں فکر نہ کر شاہ جہاں پور کون سا دور ہے
آتے جاتے رہیں گے۔“ عین بولے۔

”اور وہاں کہاں رہے گا۔ امی تو بتا۔“ اماں بولیں۔
”کام دھندہ مل گیا تو رہنے کا ٹھکانا بھی بن جائے
گا۔“ وہ بولے۔

ابا نے بہت زور مارا اماں نے بہت سمجھایا مگر ان
کے دماغ میں کچھ نہ آیا اور عین نے گاؤں چھوڑ دیا۔ ایک
جوڑا کپڑا پولی میں باندھا اور اماں سے کرایہ لے کر پندرہ

کچھ ہوتا رہے۔ آخر اس دنیا میں اور لوگ بھی رہتے ہیں وہ
بھی تقدیر رکھتے ہیں اور عمل بھی کرتے ہیں۔ دوسرے
لوگوں کے عمل اور آپ کے عمل بے شک الگ الگ ہوں
گے مگر دونوں اپنی اپنی جگہوں پر درست ہوں گے، میرا عمل
آپ کو ناپسند ہو میرا ذریعہ معاش آپ کے لئے ناپسندیدہ
ہو مگر مجھے تو پسند ہے، اس طرح آپ کے لئے بھی کوئی
سوچ سکتا ہے مگر آپ اس کی سوچ کے مطابق تو خود کو نہیں
بدل لیتے۔ آپ اپنا کام کرتے رہتے ہیں یہی دنیا کا
دستور ہے جس کو جو کام اچھا لگتا ہے وہ کرتا ہے اور اسی
فارمولے کے تحت سے دنیا کا نظام چلتا ہے۔

عین کے باپ دادا نے زندگی بھر شاہ جہاں پور میں
ہل چلایا تھا۔ دور تک نظر ڈالو تو بھی سب خاندان کسان ہی
نظر آتا ہے۔ مگر عین خاں نے ایک دن ہل نہیں چلایا ذرا
ہوشیار ہوئے تو باپ نے کھیت پر لے جانا چاہا مگر یہ اڑ
گئے، باپ نے سختی کرنا چاہی تو اماں درمیان میں آ گئیں۔
”کا کرے ہو بچہ ہے، سمجھنا ہی ہے ذرا بڑا ہو گا تو
سمجھ جائے گا۔“

”ارے میں اس کی عمر کا تھا تو ابا کے ساتھ ہل چلاتا
تھا۔“ شکور خان بولے۔

”چلاتے تھے، وہ زمانہ اور تھا، عین کے ابا اب زمانہ
کچھ اور ہے دنیا میں صرف یہی تو نہیں رہ گیا۔ ذرا صبر کرو
میں سمجھا دوں گی۔“ گلشن نے جواب دیا۔

”دیکھ گلشن! تیرے لاڈ پیار میں یہ بگڑ جائے گا، دن
بھر باغوں باغوں پھرتا ہے، پیڑوں پر چڑھتا رہتا ہے گر
پڑا تو ہاتھ پیر سے جائے گا۔“ شکور خان بولے۔

گلشن نے شکور کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور
بولی۔ ”اب جانے بھی دو۔“

مرد کے کاندھے پر عورت محبت سے ہاتھ رکھ دے تو
مرد خود بخود ڈھنڈا پڑ جاتا ہے۔

”اچھا ٹھیک ہے تو کہتی ہے تو ٹھیک ہے مگر اس کو کہنا
گھر رہے دھوپ میں نہ پھرتا رہے۔“
گلشن نے مسکرا کر کہا۔ ”اب تم بھی لاڈ میں آ گئے

اپنا اپنا کرتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”ایک روپیہ تو بہت ہے، میں کہاں سے دوں گا۔“

عین بولا۔

”ایک گھنٹہ میں تو نے آٹھ آنے کمائے، کبھی کبھی دو تین روپے بن جاتے ہیں، کام بہت ہے، کمائی خوب ہے، میں مہینہ کے بعد گھر جاتا ہوں گھر والی کو تیس روپیہ دے آتا ہوں اس نے میرا سارا قرض اتار دیا کئی جانور پال لئے اور گھر بھی ٹھیک کرا لیا بھگوان کی سوگند اب میں بڑے آئندہ میں ہوں ارے سب کھاپی کے ایک روپیہ بچا لے گا تو بھی بہت ہے۔“

”تمہارا نام کیا ہے۔“ عین نے پوچھا۔ ”ہمارا نام گو بندو ہے۔“

”اچا تو گو بندو بھیا ہم ہو گئے تمہارے ساتھی ساتھ رہیں گے تمہارے، بات ای ہے کہ ہم نئے نئے شہر ما آئے ہیں اناڑی ہیں چلت پھرت ہم کا جانے بس تم ہکا ذرا ہوشیار کرے رہنا کام کی تم فکر نہ کرنا خوب کریں گے۔“ عین بولا۔

گو بندو بھی گاؤں کا سادا آدمی تھا اب دونوں جوڑی میں کام کرنے لگے۔

کسی دن روپیہ کسی دن ڈیڑھ اور کبھی دو روپے بھی کمالیتے اس زمانے میں یہ رقم بڑی معقول تھی تیس دن کے بعد عین اور گو بندو گاؤں روانہ ہوئے دونوں کا راستہ ایک ہی تھا چکرا گاؤں پہلے آتا تھا اس کے بعد سوہا گاؤں جہاں پر گو بندو کا گھر تھا۔ دونوں نے گھر کے لئے دو تین روپے کی سوگاتیں خریدیں اور پوٹلی باندھ کر لاری میں بیٹھ گئے۔ چکرا تو ایک گھنٹے میں ہی آ گیا اور عین اتر پڑا اور پوٹلی کا ندھے پر ڈال کر گھر کی طرف روانہ ہوا راستے میں سب سے سلام دعا کرتا وہ گھر پہنچ گیا۔ اماں نے دیکھا تو دوڑ کر لپٹ گئی۔ ”تو ٹھیک ہے بیٹا۔“ وہ بولی۔

”ارے اماں ایسا ویسا ٹھیک، بہت ٹھیک ہیں یہ دیکھ کیلائے ہیں۔“ اس نے پوٹلی ماں کے حوالے کر دی اماں

سال کی عمر میں گاؤں چھوڑ دیا۔ گاؤں کے مقابلے میں شاہ جہاں پور بہت بڑا تھا۔ عین کو لاری نے جہاں چھوڑا وہ اناج منڈی تھی۔ بیل گاڑیوں میں بوریاں آ رہی تھیں مزدور اتار رہے تھے اور گرواسوں میں پہنچا رہے تھے اور عین ان کے کام کرنے کے انداز دیکھ رہا تھا۔

”اے لڑکے کام کرے گا۔“ ایک آدمی اس کے قریب آ کر بولا۔

عین بولا۔ ”اے لو کام کرن کو تو آئے ہیں کاہنہ کریں گے۔“

وہ آدمی بولا۔ ”تو آ جا میرے ساتھ۔“ وہ منڈی کی دوسری طرف اس کو لے گیا یہاں پر کئی بیل گاڑیاں کھڑی تھیں اور ان پر بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ بیل دور کھڑے جگالی کر رہے تھے۔ تین چار آدمی پہلے سے موجود تھے۔ عین کی عمر ان سب سے کم تھی مگر قد کاٹھ میں وہ کم نہ تھا۔ وہ آدمی بولا۔ ”چلو کام شروع کر دو اب آدمی پورے ہو گئے۔“

عین گاڑی پر چڑھ گیا اور بوریاں مزدوروں کے اوپر لدوانے لگا۔ ایک گاڑی خالی ہو گئی تو دوسری پر چلا گیا اس طرح ساری گاڑیاں خالی ہو گئیں۔ اس منشی نما آدمی نے سب کے ہاتھ پر آٹھ آٹھ آنے رکھ دیئے اور بولا۔ ”سویرے زیادہ مال آئے گا سب آ جانا اب جاؤ۔“ ایک مزدور عین کے قریب کھڑا تھا بولا۔ ”کون گاؤں کے ہو؟“

عین بولا۔ ”چکرا گاؤں سے مزدوری کرنے آیا ہوں۔“

”چکرا تو بہت دور ہے لاری نہ ہی ملے گی جاوے گا کیسے۔“ وہ بولا۔

”ہاں تمہاری بات تو ٹھیک ہے۔“ عین بولا۔

”میں چکرا سے بھی آگے سوہا گاؤں کا ہوں روز روز تو نہ جاسکوں ہوں اور یہ سب ایسے ہی ہیں، ہم سب نے منڈی میں ایک ٹھکانا بنالیا ہے، ایک روپیہ ایک مہینہ ما دینا پڑتا ہے تو بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جا، روٹی پانی سب

نے جلدی سے کھولا اور چیزیں دیکھ کر بولی۔ ”اتنا کا ہے خرچ کر دیا تو۔“

”ارے اماں دو چار روپے کا ہے سب، اور یہ دیکھو ہم یہ کہا کر لائے ہیں۔“ اس نے جیب سے پورے تیس روپے ماں کے ہاتھ پر رکھ دیئے، ماں نے حیرت سے دیکھے اور بولی۔

”تو نے کمائے ہیں یہ سب۔“

”ہاں اماں ہم نے کمائے ہیں اور بہت کمادیں گے تو فکر نہ کر۔“

شکور اندر آ کر بولے۔ ”اوہو مین آئے ہیں۔“ مین دوڑ کر لپٹ گیا۔

شکور بولے۔ ”دل بے نظر آتے ہو کیا بات ہے۔“ گلشن دوڑ کر شکور کے پاس آ گئی اور بولی۔ ”یہ لو تمہارے بیٹے کی کمائی۔“ اور اس نے پورے روپے شکور کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ شکور نے پہلے دوپوں کو دیکھا پھر بیٹے کی طرف دیکھا اور اس کو گلے سے لگایا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور آواز جذباتی ہو گئی کچھ دیر کے بعد وہ بولے۔

”آج مجھے پتہ چلا کہ بیٹا کیا چیز ہے میں نے جو کہا ہے وہ بھی سب تیرا ہے، میرے کاندھے تو نے ہلکے کر دیئے، خوش رہ اور خوب کما گھر دوار بنا۔“

”ارے خالی گھر دوار بنائے کیا کرے گا اس میں رہنے والی بھی تو ہو۔“ گلشن نے کہا۔

”اچھا تو تم کو بہولانے کا شوق پیدا ہو گیا ابھی سے۔“ شکور نے کہا۔

”بیٹے کے پیر میں باپ کا جوتا آ جائے تو سمجھ لو بیٹا شادی کے قابل ہے۔“ گلشن نے کہا۔

”اچھا تو پھر کرتیاری اور کر تلاش کوئی اچھی بہو۔“ شکور بولے۔

نین دونوں کی باتیں سن کر بولا۔ ”اماں ابھی مجھے کمانے دے ذرا گھربا ٹھیک کر دو چار جانور پال، دودھ کھی گھر کا ہو جائے گھر ٹھکانے کا بن جائے میں پھر شادی

بیاہ کا سوچوں گا جلدی نہ کرنا۔“

”لے سن لیا بیٹے کا فیصلہ اب بول۔“ شکور بولے۔

”یہ جب کہے گا تب کروں گی بات اس کی بھی ٹھیک ہی ہے۔“

نین اپنی ذات پر بہت کم خرچ کرتا تھا کم سے کم پر کام چلا لیتا تھا اور روپے کو سنبھال کر رکھتا تھا۔

ماں کو سب دے دیا کرتا تھا اور کہتا۔

”اماں یہ سب تیرے ہیں مگر میں آگے دیکھ رہا

ہوں سب خرچ نہ کرنا کچھ ضرور بچا کر رکھنا کام آویں گے۔“

ماں اس سے زیادہ ہوشیار اس نے دو کوٹھے بنائے اور دو تین جانور رکھ لئے اور شکور کی کمائی پر گزرا رہ کرتی رہی، بیٹے کی کمائی اس نے زیادہ خرچ نہ کی۔

نین مزدوری کرتا رہا مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اس فکر میں رہا کہ کوئی چھوٹی موٹی جگہ مل جائے تو وہ مزدوری چھوڑ کر اپنا کام کرے اس کو شوق شروع دن سے تھا اسی لئے وہ روپے جمع کر رہا تھا۔

آخر اس کو ایک بہت چھوٹی سی دکان مل گئی اور اس نے کرائے پر اس کو لے لیا مزدوری کے ساتھ ساتھ اس نے پان، سگریٹ، بیڑی، ماچس اور چھوٹی موٹی چیزیں رکھ لیں اور بیٹھ گیا۔

آدی ایماندار تھا زبان اچھی تھی سارے مزدور اور منڈی کے لوگ اس سے سودا خریدنے لگے اور چکر پان

شاپ چلنے لگی۔ پان کے ساتھ ساتھ دوسری چیزیں بھی بکنے لگیں اور ہر روز خرچ نکال کر تین چار روپے آنے لگے

اس نے پان اچھے بنائے مصالے بھی پورے استعمال کئے اس کے باوجود پان میں اس کی آمدنی بڑھتی گئی اور دکان

بھی بڑی ہوتی گئی ایک لڑکے کو ملازم رکھنا پڑا۔ اب اس نے ٹھنڈی بوتلیں بھی رکھ لیں لوجی وہ بھی خون چلنے لگیں

اور اسی منڈی میں جہاں وہ مزدوری کرتا تھا ایک بڑی دکان کا مالک بن گیا۔ دو تین ملازم کام کرتے تھے اور وہ

سیٹ بنام وصول کرتا تھا مگر اس کی مناساری اور زبان میں

ذرا فرق نہ تھا وہ آج بھی خود کو مزدور کہتا تھا۔

”ارے گو بندو بھیا ای نہ کہو ہم تو مزدور ہیں مزدوری کرتے ہیں۔“ وہ کہتا۔

”تم اب مزدور کہاں ہو سیٹھ ہو، ارے مزدور تو ہم ہیں آج تک، تم ہم سے آگے نکل گئے، گو بندو نے کہا۔“

”مقدر کے کھیل ہیں بھیا ہم تو شروع کے دن سے ٹھانے بیٹھے رہے۔ اپنا کام کریں۔“ وہ بولا۔

”تیری بھگوان نے سن لی ہماری نہ سنی۔“ گو بندو بولا۔

”کوئی پریشانی ہے تو ہم کا بتاؤ۔“ عین بولا۔

”بات یہ ہے کہ چھوری کے گلن کے دن قریب ہیں

میرے پاس سب انتظام ہے پر ان نے ایک مانگ کر لی

ہے کہ چھورا کے نئی سائیکل کی ضرورت ہے پھرے بعد

میں سائیکل پہلے، تو بتاؤ اتنے کم سے میں ایسی بھاری مانگ

میں کیسے پوری کروں، سوچ رہا ہوں ایک دو جانور نکال

دوں۔“ گو بندر بولا۔

”ارے ایسا نہ کرنا گو بندر بھیا سائیکل تم کا مل

جاوے گی اور تمہاری بات بھنی نہ ہوگی فکر نہ کرو۔“

”کاج کہت ہو عین تم۔“ گو بندر بولا۔

”ارے تمہاری چھوری ہے میری بھی تو کچھ لاگت

ہے۔“ عین بولا۔

عین کا بھبی دستور تھا وہ اپنی ذات پر خرچ نہیں کرتا

مگر وہ دوسروں کے کام آ جاتا تھا۔ عین نے اپنی شادی

نہایت غربانہ انداز میں کی تھی چاہتا تو بہت کچھ کر سکتا تھا

باپ نے کہا بھی مگر وہ نہ مانا اور غریب کی لڑکی لے آیا۔

آہستہ آہستہ اس کی یہ عادت مشہور ہو گئی اس کے نوکر اس

سے صاف ستھرے نظر آتے مگر وہ اس کی پرواہ نہ کرتا وہ

کاروبار کا کثیر ابن گیا۔

منڈی میں تھا دکان کے علاوہ بھی دوسرے کام کر لیا

کرتا تھا وہ کم سے کم منافع پر بھی مال خرید لیتا اور فروخت

کر لیتا وہ کہتا کچھ تو مل رہا ہے میرا جاتو نہیں رہا۔ بہت

بیوپاری اس کی اس عادت سے تنگ تھے اب اس کے

پاس گودام بھی تھا مال رکھنے کی جگہ تھی منڈی کا رنگ دیکھ کر

مال نکالتا تھا اور خوب کماتا تھا اس کا اصل کام پان اور

کولڈر تک بھی چل رہا تھا آڑھت کا دھندا بھی ہو رہا تھا

گودام میں بھی ہزاروں کا مال بڑا تھا اور شاہ جہاں پور میں

ایک حویلی نما مکان بھی بنالیا تھا گاؤں کے سارے جانور

اور ماں باپ یہاں آگئے تھے اب عین سیٹھ تھا لوگ اس کو

دیکھ کر سلام کرتے تھے۔ وہ گھر سے منڈی تک پیدل سفر

کرتا تھا۔ باپ نے کہا۔ ”بیٹا کوئی سواری رکھ لے اب تو

سیٹھ ہے تیری ایک عزت ہے۔“ بیوی نے بھی سمجھایا۔

”اب تم پیدل نہ جایا کرو ایک ٹم ٹم بنائے لو ہم بھی کبھی کبھار

سواری کر لیں گے۔“ اس نے بیوی کی بات سنی اور بولا۔

”ہم کون ہیں مزدور ہیں منڈی کا مزدوری کرنے

آئے تھے سوا ب بھی کر رہے ہیں جا میں کو نو فرق نا ہی پڑا

لوگ ہم کا سیٹھ کہت ہیں ہم دل میں ہست ہیں پاگل ہیں

سرسے۔“

”میں تو کہتی ہوں تم اور بڑے سیٹھ ہو جاؤ اور ذرا

اپنی حالت بھی بدلو لنگی بہت پرانی ہو گئی ہے سکر بھی گئی ہے

اونچی اونچی لاگت ہے اس کو بدل ڈالو اور فتویٰ کیسی پیکٹ

ہور ہی ہے نئی سلوا تو تمہاری حالت تمہارے نوکروں سے

بدتر ہے ذرا خیال کرو۔“ بیوی کرین بولی۔

”جب بھی کرتا، خرچے والی بات کرنا ارے لنگی کا

ابھی کیا بگڑا ہے پچھنی تک نہیں تیری مرضی ہے تو رات کو دھو

دینا اور یہ فتویٰ ارے بڑے برکت کی فتویٰ ہے جب

سے پہنی ہے اللہ قسم بھری رہتی ہے اب تو بتا ایسی چیز میں

خود سے جدا کیسے کر دوں تو بول تجھے کچھ ضرورت ہے

ارے میں تیرے اور بچوں کی خاطر کماتا ہوں میرا کیا ہے

میں جیسا بھی ہوں عین ہوں نئی لنگی پہن لوں کہ پچھنی پرانی

میں عین ہوں۔“ بیوی زچ ہو کر کہتی۔ ”تم اپنا خیال نہ کرو

میرا خیال کرو تم عین سیٹھ ہو اس سیٹھ کی تو لاج رکھ لو میں

خوش ہو جاؤں گی کیا کی آجائے گی جو تم نئی لنگی پہن لو

گے۔“

”کریم لوگ مجھے سلام کرتے ہیں کون ہوں بڑا نیتا

ہو جاتی۔ سارے دن وہ یہ کرتے ہال کی کھال اتارتے رہتے، ایک ایک آنے پر بحث مکرار ہوتی، ان کی کھوپڑی نفع نقصان کا حساب ایک منٹ میں کر لیتی بے پڑھے تھے مگر حساب خوب کرتے تھے ایک منٹ ہی رکھا تھا وہ سب کھاتے لکھتے تھا ادھار نقد لکھتا تھا مگر عین بغیر لکھے اپنی ادھاری یاد رکھتے اور وقت پر تقاضہ کر دیا کرتے تھے۔ خود دینا ہوتا تو بھی وقت پر دے دیتے نہ دیا تو کہہ دیا دو چار روز کا وقت لے لیا۔

عین کے والد کا انتقال ہو گیا۔ عین نے تین روز کو سارے کاروبار بند کر دیئے، ہزاروں آدمیوں نے جنازے میں شرکت کی، عین سیٹھ کے والد جو تھے۔ واپس آئے تو دروازے پر دیکھیں کھڑک رہی تھیں۔ دریاں اور چاندنی بڑی تھیں اور نور محمد روٹی حاضر تھا سب بھوکے تھے سب نے خوب کھایا۔ سوک کی نیاز بھی بڑے زوردار طریقہ پر ہوئی ہزاروں کے لئے کھانا بنایا گیا اور کھلایا گیا۔ اتنا دل کھول کر خرچ کرنا سب کے لئے حیرت کی بات تھی مگر جاننے والے جانتے تھے کہ عین صرف اپنی ذات تک کے لئے نکسوں ہیں، باپ کی ہر فاتحہ بڑی دھوم سے وہ کرتا تھا اور چالیسواں تو ایسا کیا کہ پورے شہر میں شاید ہی کوئی سلطان گھر انا ایسا ہو جس کو خبر نہ کی گئی ہو عین سیٹھ کی واہ واہ ہو گئی مگر عین سیٹھ کی لنگی اور فتوری تبدیل نہ ہوئی۔ وہ روزانہ اپنے وقت پر پیدل منڈی کی طرف جاتے ہیں۔

باپ کے بعد اماں بھی ساتھ چھوڑ گئیں۔ عین نے ان کی بھی نظر فاتحہ باپ کی طرح کی خوب خرچ کیا۔

اب بچے جوان تھے قدرتی طور پر ایسا ہوا کہ صرف دو بچے ہی ہوئے لڑکی بڑی تھی پندرہ سال کی عمر میں انہوں نے بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی کر دی، لڑکے کو انہوں نے اپنے ساتھ آڑھت میں رکھا۔ وہ کاروبار سمجھتا رہا منڈی کے داؤ بیچ سیکھتا رہا وہ باپ سے ذرا الگ تھا۔ ذرا سالیوں کہ وہ ہر روز کپڑے بدل کر آتا تھا اس کا سفید لٹھے کا پاجامہ اور سفید چکن کا کرتا ہوا تھا۔ ابا پیدل آتے تھے مگر وہ سویرے ہی سائیکل پر آ کر دکان کھول لیا کرتا

ہوں ان کا رشتہ دار ہوں کون ہوں اری نیک بخت وہ میری فتوری کی جیب کو سلام کرتے ہیں جانتے ہیں اس میں رقم رکھی ہے آج کے زمانے میں کون کسی کو پوچھتا ہے سب اپنے اپنے مطلب کے غلام ہیں اور میں بھی ہوں میں سیٹھ روکڑی مل کو سب سے پہلے سلام کرتا ہوں اس لئے کہ اس کا مال مارکیٹ میں ہر روز آتا ہے اس کے پاس پورے ہندوستان سے مال آتا ہے مجھے بھی وہ مال دیتا ہے میں اس کے مال کو مارکیٹ میں ڈالوں نہ ڈالوں میری مرضی میں اس کے ذریعے روپے کماتا ہوں اس کو میں سلام کرتا ہوں مجھے دوسرے کرتے ہیں سب اپنے اپنے مطلب کو سلام کرتے ہیں تو سمجھتی ہے لنگی فتوری کو سلام کرتے ہیں۔ عین بولا۔

”ارے ہم کا جانے تمہاری لمبی چوڑی باتیں بس ہم تو چاہتے ہیں تم بھی بے ٹخنے رہو ہمارا دل بھی ذرا خوش ہوئے۔“ بیوی نے کہا۔

”اچھا تو پھر تو ایسا کر دو چار بڑھیا سے جوڑے بنائے لے اپنے لئے چھوری اور پھورا کے لئے بھی خرید لے ہم منع نہ ہی کریں گے۔“

”اور تم اس فتوری اور لنگی نہ بدلو گے۔“ وہ جل کر بولی۔

”بدلیں گے ضرور بدلیں گے پھٹ جائے تو بدلیں گے نا بھی تو کام دے رہی ہے تو چلنے دو، اور ای فتوری ای تو برکت والی ہے سمجھا کر دو۔“

”سمجھ گئے خوب سمجھ گئے اب نا ہی کبھی بولیں ہم۔“ کریم جل کر کہتی۔

”عین ہنس کر باہر آ جاتے اور پیدل تین میل سفر کر کے منڈی پہنچتے۔ پہلے دکان پر جاتے وہاں کا حساب کتاب کرتے، رقم جیب میں بھرتے مال کے آرڈر دیتے نوکروں پر ڈانٹ پھینکا کرتے اور آڑھت پر آ جاتے۔ بیوپاری ان کے انتظار میں ہوتے حاضر مال کے سودے کرتے رقم وصول کرتے اور گودام سے مال آ جاتا۔ آنے والے مال کے سودے ہوتے بیانہ ہوتا اور بات بکی

چارٹر کے ہو گئے۔

عنین نہال ہو گئے۔ ”اللہ نے میری کسر پوری کر دی۔“ اب وہ دکان کاروبار سب بھول گئے، سارے دن پوتوں کے ساتھ گزار دیتے۔ بیوی کہتی بھی کہ ذرا افضل کی مدد کر دیا کرو اتنا بڑا کام ہے اور اکیلا کرنے والا ہے۔

”اکیلا کہاں ہے بہت آدمی اس کے پاس ہیں اور کچھ دن جاتے ہیں کہ اس کے یہ شیر میدان میں ہوں گے تو فکر نہ کر۔“ بیوی کہتی۔ ”ارے وہ وقت کس نے دیکھا ہے۔“

”ہاں یہ کہنا تو مشکل ہے مگر آدمی اندازے تو لگاتا ہے پروگرام تو بناتا ہے۔“

افضل نے سب بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ شاہ جہاں پور کے بعد اس نے بڑے لڑکے کا دلی میں داخلہ کر دیا۔ بڑے کا نام منیر خان تھا اس کے بعد دوسرے نے میٹرک کر لیا تو اس کو بھی منیر کے پاس بھیج دیا اس کا نام جمال خان تھا۔ افضل باپ سے زیادہ دوراندیش تھا دنیا کے بدلتے حالات پر اس کی گہری نظر تھی وہ تعلیم کی اہمیت کو سمجھ رہا تھا کاروبار حالات میں تبدیلی آ رہی تھی بڑے شہروں کے لوگ نقد روپیہ وصول نہیں کر رہے تھے سب کو بینک کے ذریعے دینا پڑ رہا تھا بینک کے کام کو بھی سمجھنا ضروری تھا سارے کام ملازمین پر تو نہیں چھوڑے جاسکتے نئے زمانے کا ساتھ دینا ہے اس کے لئے تعلیم ضروری ہے۔

عنین بہت بوڑھے ہو گئے اور بیوی تو ایسی بستر پر پڑی کہ اٹھ کر نہ دیا اور سدھا رہ گئی۔ بیوی کے بعد عنین بھی ایک سال زندہ رہے اور عنین سیٹھ انتقال کر گئے۔

افضل کے دونوں لڑکے تعلیم سے فارغ ہو کر آ گئے ایک نے وکالت اور ایک نے کامرس پڑھی مگر کام کہیں نہ کیا باپ کے ساتھ لگ گئے مگر دونوں دلی میں رہ کر آئے تھے اس لئے شاہ جہاں پور کا کاروبار ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا دونوں دلی کو یاد کرتے تھے اور وہیں پر کام کرنا چاہتے تھے۔

☆☆☆

تھا۔ مگر گدی پر نہیں بیٹھا تھا کاروبار کرتا تھا لین دین بھی کرتا مگر باپ کی گدی سے دور رہتا تھا۔

وقت اور آگے چلا۔ عنین سیٹھ کم آنے لگے افضل کے بچوں کے ساتھ گھر میں گن رہتے۔ سارا کاروبار افضل کے پاس تھا مگر عنین بھی باز نہ آتے دو چار روز کے بعد دکان پر آ جاتے، مگر اتنے فرق کے ساتھ کہ پیدل نہ آتے تانگے پر آتے ان کی لنگی اور فتوری بھی نئی ہوتی بیوی کا کہا نہ مانے والا عنین بیٹے کی بات کا قائل ہو گیا تھا۔

بیوی کہتی۔ ”میں نے زندگی بھر کہا پر تم پر اثر نہ ہوا کہتے کہتے میرا منہ سوگ گیا پر تمہاری لنگی اور فتوری نہ بدلی اور بیٹے کی بات فوراً مان لی۔“

”اری نیک بخت تجھ میں اور اس میں فرق بھی تو ہے تو بیوی ہے وہ بیٹا ہے ارے یہ سب کس کا ہے میں نے زندگی بھر کا ہے کو مزدوری کی ہے بس اس کارن کے میری اولاد سکھ اٹھائے اور میں نے کون سی نئی بات کی ہے سب کرتے ہیں ارے میرے لئے تو دوروئی اور ایک لنگی بہت تھی انسان کی ضرورت بس اتنی ہی ہے اس سے زیادہ کا وہ کیا کرے گا سب رہ جائے گا جو رہ جائے والی چیز ہے اس سے پریم کیوں۔“ عنین کہتا۔

”ارے لو خوب کیا تم نے ارے لوگ تو تم کو بڑا کنجوس کہتے ہیں کپڑے بدلنے نہیں سواری کرتے نہیں ہر جگہ پیدل چل پڑتے ہو۔“ بیوی بولی۔

”لوگوں کا کیا ہے ان کو کسی طرح چین نہیں ہوتا میں بابو بن کر رہتا تو لوگ کہتے ارے دیکھو سراسر بھول گیا اپنی اوقات کل تک منڈی میں مزدوری کرتا تھا اور اسی لئے گاڑی نہیں کرتا تھا۔ میری میلی لنگی اور پیکٹ فتوری مجھے میری اوقات جیسی رکھنی تھی اور انچاڑا نے نہیں دیتی تھی لوگ جنس کہتے تھے میں خوش تھا ہاں میں کنجوس تھا اور ہوں میں اپنے وقت کو نہیں بھولتا مجھے وہ بہت عزیز ہے مگر بیٹے کی عزت کی خاطر میں نے اس کی بات مان لی ہے کیا کروں ایک ہی بیٹا ہے مانتی تو پڑے گی۔“

قدرت کے کھیل نیارے ہیں افضل کے تاب توڑ

آزمیر خان نے ہمت پکڑی اور باپ کو کہا۔
 ”ابا ایک بات کرنا تھی۔“ مزیر خان ڈرتے ڈرتے
 بولا۔

”ہاں بول کیا بات ہے میں سن رہا ہوں۔“ افضل
 نے کہا۔

”ابا جو کام ہم یہاں پر کر رہے ہیں وہی کام دلی
 میں کریں تو کیسا زور دار ہو، پورے ہندوستان کو دیکھ سکتے
 ہیں، ہم ایک کونے میں پڑتے ہیں ہمارے گاؤں گاؤں
 کے لوگ ہیں جن کی ضرورتیں محدود ہیں۔ دلی شہر کے
 چاروں طرف شہر ہیں اس کے علاوہ ہزاروں گاؤں ہیں
 لوگ مال خریدنے دلی آتے ہیں، ہمارا کام بہت ہے
 یہاں پر سینکڑوں کام ہے تو دلی میں لاکھوں کام ہے
 میں نے پورے بازار کا جائزہ لیا ہے ہم وہاں پر آڑھت
 کام کر سکتے ہیں کام میں پڑھی ہے۔ جمال ویل ہے مگر یہ
 ضروری تو نہیں کہ وہ وکالت کرے میرے ساتھ کام
 کرے۔“

باپ نے بیٹے کی باتیں اور بولا۔
 ”بیٹا میں نے دنیا کے بدلتے حالات کی وجہ سے
 ہی تم دونوں کو دلی میں پڑھایا تھا میں جانتا تھا کہ تعلیم کے
 بغیر آدمی اٹھو رہتا ہے آج یہ بہت ضروری چیز ہے تم
 دونوں دلی میں کام کرنا چاہتے ہو تو ضرور ضرورت بھری
 دکان بناؤ دفتر بناؤ گودام لاؤ اور کام کرو، میں نے جو کمایا ہے
 وہ سب تمہارا ہے تم اس کام کو آگے بڑھاؤ۔“

مزیر خاں دلی واپس آ گیا یہاں پر اس نے کھاری
 باؤلی کی منڈی میں ایک دکان خرید لی اور اس کے قریب
 ہی ایک گودام کرائے پر لے لیا۔ ایک میز اور کچھ کرسیاں
 ڈال دیں، دکان پر بورڈ لگا دیا ”عین ٹریڈنگ کمپنی“
 جمال خان دکان پر بیٹھ گیا اور مزیر مال کی خریداری کو
 نکلوا اور اس نے چھڑک مال خرید ڈالا۔ یہ مال مختلف شہروں
 کے تھے مال گودام میں رکھ دیا دوسرے دن پھر مزیر نے
 خریداری کی اور دالوں کے ٹرک خریدے مگر مارکیٹ میں
 نہ لایا لال مرچ کے کئی ٹرک رکھ لئے۔ اب اس کے پاس

گاؤں کے آنے لگے اور وہ اپنی خرید و اخراجات نکال کر دام
 بتانے لگا۔ جن چیزوں پر دام چڑھ گئے تھے وہ اچھا منافع
 دے کر نکل گئیں اور جن کے دام گرے تھے ان کے
 سودے اس نے نہیں کئے اور مارکیٹ کے چڑھنے کا انتظار
 کرتا رہا اور ہر روز ٹرک پر ٹریک اس کے گودام میں اترتے
 رہے۔ آدمی نیا تھا اس لئے سب مال اس کو نقد خریدنا پڑا
 تھا۔ مال کے بیوپاری خوش تھے کہ ان کو نقد مل رہا تھا۔

مزیر نے یہی طریقہ اپنے دفتر کا رکھا وہ کہتا میں نقد
 خریدتا ہوں نقد فروخت کرتا ہوں جس کو ضرورت ہے
 خریدے جب مجھے ادھار ملے گا تو میں بھی ادھار دے
 دوں گا۔ دونوں بھائی محنت کر رہے تھے اور صاف ستھرا
 کاروبار کر رہے تھے دونوں پڑھے لکھے تھے اور اخلاق طور
 پر اچھے تھے جو ایک بار ان سے کاروبار کرتا بار آتا تھا۔

باپ نیندا پتا پورا روپیہ ان کے حوالے کر دیا تھا اب
 وہ لاکھوں کا کاروبار کرتے تھے۔ پوری پوری کھڑی فصل
 خرید لیا کرتے تھے ان کے گودام مال سے بھرے رہتے
 تھے۔ اب ان کے کئی گودام تھے دکان ایک بڑی آفس بن
 چکی تھی۔ اس آفس میں بہت لوگ کام کرتے تھے
 گوداموں میں ہر قسم کا سامان ان کے پاس تھا جو چیز
 پورے بازار میں نہ ملتی وہ عین ٹریڈنگ کمپنی میں مل جاتی،
 ضرورت زندگی کی ہر چیز ان کے گودام میں تھی اور ہر آٹم
 کے لئے الگ الگ آدمی مقرر تھے، وہ اپنے اپنے اسٹاک
 کا حساب رکھتے تھے اور ان کو پتہ تھا کہ یہ چیز کس گودام میں
 کہاں پر رکھی ہے۔ اس طرح در کر تو زیادہ ہو گئے تھے مگر
 کام اچھی طرح ہو رہا تھا کوئی اینٹ بھول نہیں پڑا ہوا تھا ہر
 شخص اپنی اپنی جگہ پر ذمہ دار تھا گوداموں میں پلے دار اور
 گاڑیاں موجود تھیں مال کی نقل حمل بہت جلد ہو جاتی تھی۔
 مزیر اور جمال نے اپنی اپنی تعلیم کا فائدہ اٹھایا تھا اور بڑی
 ہنرمندی سے دلی کے سب سے بڑے اسٹاکسٹ میں
 شامل ہو گئے۔ دوسرے ممالک سے بھی وہ مال منگوا لیا
 کرتے تھے۔ یہ مال بمبئی آتا تھا اور پھر دلی آ جاتا تھا اس
 زمانے میں باہر سے مال منگوانے والے چند ہی لوگ تھے

گودام بڑھتے گئے کاروبار بڑھتا گیا۔

دلی میں سیٹھ دمڑی مل بنیا مشہور آدمی تھا، اس کے نام پر دھندا ہوتا تھا کروڑوں کا کام کرتا تھا اور نقد ادھار سب کرتا تھا اور بڑی پارٹیاں اس پر بھروسہ کرتی تھیں۔

مگر اب کئی سودے اس کے پٹ رہے تھے۔ عین ٹریڈنگ کمپنی پر لوگ زیادہ بھروسہ کر رہے تھے۔ عین ٹریڈنگ کمپنی کئی جگہ دمڑی مل سے آگے تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ وعدے پورے کرتی تھی اس کے مالکان کی گرفت کاروبار پر پوری تھی کسی کارندے پر یہ لوگ کم انحصار کرتے تھے چاروں بھائی خود ہر معاملے میں موجود ہوتے تھے۔

دمڑی بے حساب دولت کا مالک ضرور تھا مگر اس کو اپنے کارندوں پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا اور وہ لوگ لاپرواہی کر جاتے تھے۔

دمڑی مل اپنے دفتر میں بیٹھا تھا اس کے چہرے پر غصہ تھا اور وہ اپنے منبر پر برس رہا تھا۔ ”تم دو کوڑی کے آدمی نہیں ہو، میں تم پر بھروسہ کر کے گوالیا کیا چلا گیا اور تم نے بیڑہ غرق کر دیا۔ سارے یوپی کا مال عین ٹریڈنگ لے گیا تم کو مروج تنک نہیں ملی اب سال بھر کیا کرو گے بنگال کے مال پر گزارہ کرو گے ناریل اور پان لے گا جون پر تو دو یا چند کا قبضہ ہے پنجاب کا مال بہت مہنگا پڑ رہا ہے تم نے آخر کیوں ان باتوں پر توجہ نہ کی؟“

منبر ڈرتے ڈرتے بولا۔ ”سیٹھ جی آپ نے جو آفر مجھے بتائی تھی میں نے وہی یوپی والوں کو دی، گندم، چنا، جوار، باجرے کے وہی ریٹ دیئے جو آپ نے کہے تھے آپ نے کہا تھا اس سے اوپر نہ جانا نہیں تو منافع نہیں ہوگا سنا ہے یہ مال سی بی اور بہار سے بھی آنے والا ہے۔ عین نے ہم سے زیادہ پرسودے کر لئے اور پورے سال کو باندھ لیا۔ میں آگے تو نہیں جاسکتا تھا۔ عین والے آزادی سے سودے کرتے ہیں بہت سودوں میں لکھنا بھی کھاتے ہیں پچھلے سیزن میں ہم گرم مصالحے میں بری طرح نا کام ہوئے ہیں۔“

ان میں عین ٹریڈنگ کمپنی سب سے اوپر تھی۔ افضل خان شاہ جہاں پور میں اپنا کرنے کرتے رہے، انہوں نے بیٹوں کی صلاحیتوں پر پورا اتھار کیا ان کے کام کرنے کے انداز کو نہیں دیکھا اور پوری پوچی ان پر لگادی باپ کے بھروسے کو دونوں بھائی جانتے تھے انہوں نے دلی کی مارکیٹ میں مثالی کامیابی حاصل کی۔ افضل خان ان کے بارے میں سنتے تھے مگر خود سے انہوں نے بیٹوں کے کام میں مداخلت نہیں کی اپنی مرضی نہیں چلائی۔

وقت اور آگے چلا افضل خان کے دولہے کے رستم خان اور کریم خان الہ آباد میں بڑھتے تھے دونوں ایک سال کے فرق سے بی اے کر گئے اور افضل خان نے دونوں کو واپس شاہ جہاں پور بلا لیا، وہ دونوں باپ کا ہاتھ بنانے لگے مگر دونوں کا دل یہاں کے ماحول میں نہیں لگا اور وہ باپ کی اجازت سے دلی بھائی کے پاس چلے گئے، یہاں پر ایک بڑا کاروبار تھا۔ میر خان اور جمال نے کہا کچھ دن دلی کی سیر کرو کاروبار تو اپنا ہے پہلے کام کے طریقہ کار کو سمجھو۔ ابا کے کاروبار میں اور دلی کے کاروبار میں بڑا فرق ہے یوں سمجھ لو کہ ابا کنویں میں ہیں اور تم کنویں کے اوپر کھلے آسمان تلے ہو، اس کی وسعت کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ ہم لوگ جو کاروبار کرتے ہیں یہاں پر نہ جانے کتنے ہم سے زیادہ ہیں ایک سے بڑھ کر ایک پڑا ہے۔ ہم لاکھوں کا کاروبار کرتے ہیں مگر یہاں پر کروڑوں کے پو پاری موجود ہیں، ابھی ہماری کتنی نہیں ہے بس یوں سمجھ لو کہ مارکیٹ میں موجود ہیں اور تھوڑی بہت سا کھ بھی ہے، ابھی ہم کو گردن جھکا کر محنت کرنی ہے۔ دادا کہتے تھے میں مزدور ہوں مزدوری کرتا ہوں ابھی ہم بھی مزدور ہیں سیٹھ نہیں ہیں مزدوری کرنی ہے دونوں چھوٹے بھائیوں نے بڑے بھائی کی باتیں یاد کر لیں اور کس کس پر مزدوری کرنے لگے۔

بڑے بھائی کے کہنے پر سب چلتے تھے اور محنت کرتے تھے۔ رستم اور کریم ہندوستان بھر کی منڈیوں میں جاتے، سودے کرتے اور مال خریدتے دلی میں ان کے

والوں نے یوپی سے جو مال اٹھایا ہے وہ مہنگا ہے اب عنین کو بھی دام گر کر مال نکالنا ہوگا ایک دن میں چنے نے مارکیٹ کو گرما دیا چھوٹے شہروں کے بیوپاری دھڑا دھڑ مال خریدنے لگے۔

”بھیا چننا تو گر گیا یہ کیا ہوا۔“ جمال نے بھائی کو کہا۔
منیر خان کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بولا۔ گرتا ہے تو گرنے دو تم ذرا سال مال بھی مارکیٹ میں نہ لانا کیونکہ اب اور مال یزن سے پہلے آنے والا نہیں ہے یہ دلی چال ہے، ہو سکتا ہے دمڑی مل نے یہ چال چلی ہو وہ دام گریں گے تو ہم بھی پریشان ہوں گے کہ شاید اور نہ گر پڑیں اور ہم بھی سودے کرنے لگیں گے۔ مگر میں جانتا ہوں یوپی میں جو مال تھا وہ سب بک چکا اور نہیں آئے گا ہمارے پاس جو ہے وہ ہے، گرنے دو دام، دمڑی مل کل کیا کرتا ہے یہ دیکھو میرا خیال ہے کل آج کا دام نہیں ہوگا ایک دم اوپر جائے گا یا شاید اور نیچے جائے مگر اس کی امید نہیں ہے اس لئے کہ ہم نے کوئی سودا نہیں کیا اگر کرتے تو ضرور دام اور گرتا یہ میرا اندازہ ہے شاید ٹھیک ہو، یاد رکھو ہم کو مال رکھنا ہے بیچنا نہیں ہے ہم اپنے حساب سے سودے کریں گے۔“

دوسرے دن دام کم نہ ہوئے وہی رہے دمڑی کے جاسوس اس کو بتا رہے تھے کہ عنین والوں کا مال مارکیٹ میں نہیں ہے اب دمڑی کو اپنی چال کے ناکام ہونے کا اندازہ ہوا۔ خرید سے بھی کم پر ہزاروں من مال فروخت کر دیا، نقد ادھار سب دیا اور پھر بات نہ بنی۔ یہ کڑوا گھونٹ تھا جو کہ اس نے خود پسپائی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اچانک چنے پر دام کس طرح گر گیا تھا مگر اس سے بہت سوں کو فائدہ ضرور ہوا نقصان صرف دمڑی مل کو اٹھانا پڑا مگر اس نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اس کو نقصان ہوا ہے وہ اتنی بڑی پارٹی تھا کہ یہ نقصان اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

منیر خان نے دو چار روز انتظار کیا اور اپنے مال کے سودے اپنے داموں پر کئے اور اس کو نقصان سے دو چار نہ ہوتا پڑا۔

منیر خان اور اس کے بھائی صرف اتنا ج پر ہی تو کام

دمڑی مل کا غصہ ذرا کم ہوا بولا۔ ”مگر اب سارے سال عنین کی مرضی کے مطابق چلنا ہوگا یوپی کی دالیں، گندم، چاول اور فروٹ پر اس کا کنٹرول ہو گیا ہے، پورے بھارت سے اس کے پاس آرڈر آرہے ہیں، گو دام بھرے ہوئے ہیں تم کیا کر رہے ہو یہ بتاؤ؟“ دمڑی مل بولا۔

”مال تو ہمارے پاس بھی کم نہیں ہے، سودے بھی ہو رہے ہیں، مال کی خریداری بھی جاری ہے کام بند تو نہیں، اب ہم نے بھی صوبوں میں جا کر خریداری کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔“ منیجر نے بتایا۔

دمڑی مل بولا۔ ”آدمی بڑھاؤ اور دل کھول کر خریداری کرو، عنین کے مقابلے پر چڑھ کر بولی دو میں دیکھتا ہوں یہ لوٹے کہاں تک جاتے ہیں چل کے رکھ دو، میں دس بیس لاکھ کی مارکھالوں کا مگر ان لوٹروں کو ایسا ٹھنڈا کر دوں گا کہ دلی چھوڑ کے شاہ جہاں پور دوڑ جائیں گے۔“
منیجر کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ چوس ہو گیا۔ جذبات اور غصے میں دمڑی مل منیجر کو آرڈر تو دے بیٹھا مگر آخر بیٹھا تھا خود سے بولا۔ ”دمڑی مل یہ کیا کہہ دیا، ارے نقصان ہوا تو پھر کیا ہوگا؟“

ارے میں نقصان اٹھاؤں میں سینٹھ دمڑی مل دلی کی مارکیٹ میرے ہاتھوں میں اور میں ہی نقصان کروں اپنا پر کوئی بات نہیں، تیل تو تلوں سے نکالنا ہے، آگے چل کر پورا کروں گا۔ مقابلہ تو کرنا ہے۔ آگے بڑھے قدم پیچھے تو نہیں آئیں گے۔“

دلی کی ہول سیل منڈی میں ایک خاموش مقابلہ شروع ہو گیا۔ اس مقابلے کے بارے میں صرف دمڑی مل جانتا تھا اس نے اپنا پہلا کارڈ پھینکا، چنے اور مال دونوں پر دام گرا دیئے۔ دمڑی مل کے پاس بہت مال تھا دام گرے تو چھوٹے بیوپاری پریشان ہو گئے۔ دمڑی مل کا مال مارکیٹ میں بکنے لگا سودے ہونے لگے مجبوراً چھوٹے بھی دام گرانے پر مجبور ہوئے وہ نہیں جانتے تھے کہ دمڑی مل نے دام کیوں گرائے ہیں مگر دمڑی مل جانتا تھا کہ عنین

نہیں کرتے تھے ان کے پاس تو ہر قسم کا مال تھا بیوپاری ان کے پاس آتا تو پھر اس کو مال خریدنے کہیں اور نہیں جانا پڑتا ضروریات زندگی کی ہر چیز ان کے پاس تھی بڑھیاں سے بڑھیاں اور کم سے کم دام کی ان کے دام بھی نہایت مناسب ہوتے تھے۔ دمڑی مل ان سے کم نہیں تھا دولت میں بھی اور ساکھ میں بھی مگر اس کو کارندوں پر بھروسہ کرنا تھا۔ کیوں کہ اس کے صرف دو ہاتھ مگر منیر خان کے آٹھ ہاتھ تھے۔

افضل خان بیٹوں کے بے حد اسرار پر شاہ جہاں پور کا سارا چلتا ہوا کاروبار فروخت کر کے دلی آگئے اور لال کنویں پر بڑا سودا گار خرید لیا اس کو از سر نو مرمت کروالیا اور سب وہاں پر رہنے لگے اب دو ہاتھ اور بڑھ گئے انہوں نے ذرا سی یہ تبدیلی کی کہ ایک دفتر کناٹ چیلس میں قائم کر لیا اور اس کو ہیڈ آفس قرار دے دیا۔ اب بڑے بڑے سودے یہاں ہونے لگے اور باہر سے مال منگوانے کے لئے پورا ایک اسٹاپ رکھ دیا اور وہ دنیا کی بڑی بڑی منڈیوں سے مال منگوانے لگا۔

اب دمڑی مل کا کاروبار عین ٹریڈنگ کمپنی کے برابر نہ رہا دلی میں عین کا ایک بڑا نام تھا جو ہر قسم کا کاروبار کرتا تھا اس کے پاس سائیکل سے لے کر ٹرک، بس اور کاریں سب ملتی تھیں۔ اس کے پاس ہزاروں آدمی کام کرتے تھے اور دلی کے ہر علاقے میں اس کے بڑے بڑے گودام اور شوروم تھے دمڑی مل دل میں چلتا تھا ہر طرح ان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا تھا مگر ان کی ساکھ کچھ ایسی بن گئی تھی کہ دمڑی مل کچھ نہیں کر پاتا تھا حالانکہ اس کا اپنا کاروبار بھی کم نہ تھا۔

وقت نے اور قدم آگے بڑھائے منیر خان اور جمال کی شادی ہو گئی۔ مگر سب رہتے لال کنویں پر ہی تھے۔ افضل خان بوڑھے تھے اب وہ گھر پر رہتے تھے۔ دمڑی مل کوشش میں تھا کہ کسی طرح عین کمپنی کو نقصان ہو اب وہ سمجھ چکا تھا کہ کاروباری طریقہ پر وہ مقابلہ نہیں کر سکتا اب کچھ اور طریقہ اپنایا ہو گا۔

”ارے کیا کریں عین نے تو دلی کی پوری مارکیٹ پر قبضہ کر لیا ہے ارے ہر جگہ کھڑا ہے اب سنا ہے بیٹری بنانے کا کارخانہ لگالیا ہے اور اس کا مال مارکیٹ میں آنے والا ہے۔“ دمڑی مل بولا۔

”ارے سیٹھ تو کیا ہوا آپ کی بھی تو احمد آباد میں کپڑے کی فیکٹریاں ہیں۔“ دیال چند نے کہا۔

”ارے وہ ہمارے باپ کے زمانے کی ہیں۔“ دمڑی مل بولا۔

”تو پھر بند کر دو بیٹری فیکٹری۔“ دیال چند بولے۔

”ارے ہم کیوں اپنے سر میں خود بند ہو جاوے گی سری۔“ دمڑی مل بولے۔

”لگتا ہے تم نے کوئی پروگرام بنا رکھا ہے۔“ دیال چند نے سوال کیا۔

”تم دیکھتے جاؤ میں کیا کرتا ہوں۔“ دمڑی مل بولے۔

”میری مانو تو کچھ نہ کرو تم اپنا کام کرو اور ان کو اپنا کام کرنے دو تم ان سے کم تو نہیں ہوتے ہمارے بھی نہ جانے کتنے دھندے ہیں بہت بڑا ملک ہے بڑی مارکیٹ ہے۔“ دیال چند نے کہا۔

”ارے وہ تو ٹھیک ہے پر تم اور میں خاندانی بیوپاری، پرکھوں سے یہی سب کرتے ہیں اور ایک باہر سے لیچھ آ کر تم پر جھا جائے کیسے برداشت کرو گے، میری یہ ضد ہے کہ میں دلی سے ان کو بھگا کر دم لون گا میں نے ان کی وجہ سے بہت گھانا اٹھایا ہے تم یہ بتاؤ دو چار دن کی فرصت میں ہو۔“ دمڑی مل بولے۔

”کہیں جانا ہے۔“ دیال چند نے پوچھا۔

”گر گڑھاؤں تک جانا ہے وہاں پر اپنا یار موتی چند ہے اس سے ملاقات کرنی ہے۔“ دمڑی مل بولے۔
 ”فرصت کا کیا ہے تمہارا کام ہے تو چلوں گا بولو کب چلو گے۔“

”ایسا کرتے ہیں، میں سویرے تمہارے گھر آ جاؤں گا اپنی گاڑی پر چلیں گے، رات تک واپس آ جائیں گے۔“ دمڑی مل بولے۔

”دمڑی مل کی موٹر میں دونوں ہی سویرے نکل گئے۔ مگر راستہ بہت خراب تھا شام ہو گئی۔ موتی چند اس دونوں کو دیکھ کر خوش ہوا۔“

”بڑا کشت اٹھایا سیٹھ خوب آئے۔“ موتی چند بولا۔ ”بات یہ ہے موتی کنوئیں کے پاس خود جانا پڑتا ہے تو آئے ہیں۔“ دمڑی بولا۔

”تو ضرور تم کو کوئی کام ہے ارے بولو ہم تمہارا کام تو گلے گلے کریں گے۔“ موتی چند نے کہا۔

”بات یہ ہے موتی کہ مقابلہ پڑ گیا ہے اور وہ بھی ایک پلیچ سے دھندے میں قابو نہیں آ رہا ہے اس کا بندوبست کرنا ہے۔“ دمڑی مل نے بتایا۔

اب دیال چند کی سمجھ میں یہاں آنے کی وجہ پتہ چلی۔ وہ بولا۔ ”تم نے پہلے نہیں بتایا تھا۔“

”اس کارن نہیں بتایا کہ تم ہو ایک نمبر کے ڈرپوک میرے ساتھ کب آتے۔“ دمڑی بولے۔

”ارے اب ایسا بھی نہیں ہے تم بتا دیتے۔“ دیال چند نے کہا۔

”بات یہ ہے دمڑی مل، تم بتاؤ تم کیسا بندوبست کرنا چاہتے ہو۔“ موتی چند نے پوچھا۔

”ارے سرے کا دھڑن تختہ ہو جائے بس یہ چاہتے ہیں۔“

”ارے بھی کاروباری نقصان ہو یا جانی نقصان یہ تو بتاؤ۔“ موتی بولے۔

”پہلے تو ذرا مالی جھٹکا لگے زور دار اس کے بعد

آئے چلیں گے۔“ دمڑی بولے۔

”بڑی دور جانا پڑے گا اور مشکل یہ ہے کہ جو گیوں کا کوئی ایک ٹھکانا تو ہوتا نہیں تلاش کرنا ہوگا خانہ بندوش ہیں وہ چلتے رہتے ہیں میری نظر میں تو وہی آدمی ڈھنگ کا ہے جو کہو گے کر دے گا اس کی مانگ تم کو پوری کرنا ہوگی آدمی کھرا ہے زبان کا پکا ہے مگر وصولی بھی ٹنگڑی کرتا ہے سوچ لو پھر بتاؤ۔“ موتی چند بولے۔

”تم اس کی فکر نہ کرو جو بولے گا کام ہونے پر اس سے زیادہ دوں گا۔“ دمڑی بولے۔

”اب تم دو چار دن موج کرو میں آدمی دوڑاتا ہوں، پتہ کرتا ہوں کس طرف کو گئے ہیں۔“ موتی نے کہا۔
 دیال چند بولے۔ ”میرا کرنا تو مشکل ہے، مجھے تو جانا ہوگا۔“

”تو پھر ایسا کرتے ہیں ہم دونوں واپس دلی چلے جاتے ہیں ان کا پتہ نشان مل جائے تو اطلاع کر دیتا میں خود آ جاؤں گا۔“ دمڑی مل بولے۔

چلو ٹھیک ہے جل پانی کر ہو جو جن کر واد آور اتندی نیند سو جاؤ۔“ موتی چند بولے۔

موتی چند کٹر متعصب ہندو تھا وہ ساری خرابیوں کی جڑ مسلمانوں کو قرار دیتا تھا اور سخت نفرت کرتا تھا مگر بزدل بھی اتنا تھا کہ کسی مسلمان بچے سے بھی ڈرتا تھا وہ کئی بار مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش بھی کر چکا تھا مگر گڑھاؤں کے مسلمانوں نے اس کی کئی دفعہ اچھی طرح پٹائی کر دی تھی تو دب گیا تھا اکیلا رہتا تھا مارے کنبھوی کے شادی نہیں کی تھی اور آئے گی تو خرچ بڑھ جائے گا اور بچے ہو گئے تو اور خرچ بڑھے گا سارے دن میں وہ ایک وقت دو پہر میں کھانا تھا وہ سویرے دکان پر آنے سے پہلے دو لوٹے پانی سے اشان کرتا پھر دو روٹی کا آٹا گوندھتا اس میں ذرا سا گھی ملاتا اور اس آٹے کے لٹو بنا لیتا پھر ایلو کی آگ جلاتا اور اس پر مٹی کی ہانڈی چڑھا دیتا اور دال ڈال کر پانی سے ہانڈی بھر دیتا۔ ذرا سا نمک اور لال مرچ ڈال دیتا اور ایلو کو

کہے گا تو خرچ بھی دے گا نہ خرچ دیا تو میں آگے قدم کیوں بڑھاؤں۔

اور وہ دمڑی مل کے پاس پہنچ گیا بولا۔ ”آدمی دوڑانے ہوں گے جوگی کی تلاش میں خرچ بھاری ہوگا اور بھیا تم جانو میں تو اتنا خرچ نہ کر سکوں۔“

”ارے تو بتاؤ کتنا خرچ ہوگا۔“ دمڑی چند نے پوچھا۔

”چارو دشاؤں میں آدمی روانہ کرنا ہوں گے کیا خبر کدھر ہو رہے تھے جوگی کا کیا بھر و سہ ان چاروں کا کرایہ بھاڑا کھانا پینا اور دہاڑی تو دینا ہوگا آج کل پیٹ پر پتھر باندھ کر کون کام کرتا ہے۔“ موتی بولے۔

”میں کب کہتا ہوں کہ پیٹ پر پتھر باندھ کر کام کرو، تم خرچ بتاؤ۔“

”زیادہ نہیں ابھی چار پانچ ہزار دو سو آگے اگر اور ضرورت پڑی تو نہ تم بھاگے جا رہے نہ میں، کام میں ہاتھ ڈالا ہے تو پورا تو کرنا ہوگا۔“ موتی نے جواب دیا۔

”روپے کی تم چنتا نہ کرو جو خرچ ہوگا کروں گا مگر کام ذرا جلدی کرو۔“ دمڑی چند بولے۔

”آدمی ایسے لوں گا کہ گو لی کی طرح جاویں گے۔“ موتی نے کہا۔

روپے پتھوری کی اندرونی جیب میں رکھ کر کھڑے ہو گئے اور بولے۔ ”اچھا اب آگیا دو کام بہت ہے۔“

اب موتی چند کے قدم زمین پر کب تھے، جب گرم تھی وہ گڑھ گام آ گئے۔ رات کو ہی انہوں نے گولو کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ گولو کی بیوی نے کھولا بولی۔ ”کیا بات ہے موتی سیٹھ! کیا کام پڑ گیا رات میں۔“

موتی چند بولے۔ ”ارے کام کا کیا ہے بھابی پڑتا ہی رہتا ہے گولو کہاں ہے۔“

”اے تو تم کا خبرنا ہی ہے نشہ میں دھت پڑا ہوگا جب ذرا اترے گی تو جو رو یاد آوے گی اور گرنا پڑتا گائے گا تا گھر کی اور آوے گا یہ تو روز کا دستور ہے اس کا۔“

عورت بولی۔

اس طرح کر دیتا کہ آگ جلی رہے ان ایلوں کے نیچے کسی کاغذ یا پتے میں لپیٹ کر آٹے کے لٹو رکھ دیتا اور اوپر رکھ ڈال دیتا اوپر آگ جلتی رہتی چولہے پر دال بکتی رہتی اور رکھ میں دبے آٹے کے لٹو بھی پکتے رہتے۔

وہ دکان پر آ جاتا خاندانی بنیا تھا دمڑی چند کا رشتہ دار بھی تھا روپیہ بھی بہت تھا مگر اس کا روپیہ کہاں رکھا تھا کسی کو پتہ نہ تھا نہ اچھا کھانا نہ پینا تھا ایک ایک پانی کو دانت سے پکڑتا تھا وہ پھر کو دکان بند کر کے گھر جاتا تو ہانڈی میں دال تیار ملتی وہ پھر وہ لوٹے سے اشان کرنا بڑے اہتمام سے آلتی پالتی زمین پر بیٹھا اور رکھ کے نیچے سے آٹے کے لٹو نکالتا اور ان سے رکھ جھاڑ کر ڈال دیتا ایک لٹیا پانی پاس رکھ کر ہانڈی پاس رکھ لیتا ایک ہری مریج آتے ہوئے لیتا آتا تھا ہانڈی میں ہاتھ ڈال کر کھانا شروع کر دیتا دوسرے ہاتھ میں ہری مریج دانتوں سے کترتا جاتا اور چٹارے لے کر کھانا جاتا ہر کھانے کے بعد کہتا۔ ”واہ بھگوان آج تو حرا آ گیا۔“

یہ اس کا روز کا دستور تھا، ہر روز اس کو حرا آ جاتا تھا اس کو کبھی کسی اور چیز کی ضرورت نہ پڑی۔ دکان میں سنوں گڑبورا بھرا تھا مگر ذرا سا اسلانی نہیں کھایا۔

دمڑی چند کے بارے میں وہ خوب جانتا تھا کہ موتی مرغی ہے بڑا کاروبار ہے معاملہ آن پڑا ہے تو خرچ بھی خوب کرے گا اپنی بھی کچھ نہ کچھ کمائی ہو ہی جائے گی اسی بات کو ذہن میں رکھ کر اس نے دمڑی چند سے وعدہ بھی کر لیا تھا مگر اب سوچ میں پڑ گیا تھا خانہ بدوش کدھر چلا جائے کیا پتہ میں اس کی کھوج میں کہاں مارا مارا پھروں گا میرا لگ نقصان ہوگا تو ایسا کروں کہ جوگی کی تلاش میں دو تین آدمی دوڑا دوں مگر مفت میں کون جائے گا کرایہ بھاڑا اور دہاڑی تو مانگے گا کام دمڑی مل کا اور دہاڑی میں دوں۔

”رام! رام۔“ تو پھر ایسا کروں دمڑی مل کے پاس

رات کو دکان بند کر کے چلا جاؤں اور سب بات بتا دوں

”تو پھر رات میں بات کرنا تو بے کار ہی ہوگا سویرے تک بھول جائے گا وہ۔“ موتی بولے۔

”ارے تم مجھے بتاؤ کام میں سویرے تمہارے پاس لے آؤں گی۔“ عورت نے کہا۔

”ارے کام ایسا بڑا نا ہی ہے ایک آدمی کو ڈھونڈنا ہے بس جو اس کی مزدوری ہوگی اور خرچ ہوگا دیں گے اس کی تم چنتا نہ کرو۔“ موتی بولے۔

”بات یہ ہے موتی چند جی ہم کا پتہ ہے گلو ہے بوتل کا رسیا جو تم دو گے سب دارواڑے پر دے آوے گا۔ میرے ہاتھ تو کچھ نہ آوے گا آدھی دھاڑی اور خرچ تم ہم کا دو تو پھر ہم تمہارے پاس لے آئیں گے۔“

”ارے ہم کو تم دینا ہے تم لے لینا پر کام چکھا ہونا چاہئے نہ ہوا تو تم ذمہ دار ہوگی بھابی یہ سمجھ لو۔“ موتی چند نے ٹھوک بجا کر بات کی کر لی۔

موتی چند تم فکر نہ کرو ہم سچ میں ہیں تو گلو کا باپ بھی پورا کام کرے گا۔“ عورت نے موتی چند کی اور عزت بڑھائی اب موتی چند کو بھی عورت کو بانس پر چڑھانا تھا بولے۔ ”بھابی بس تمہاری وجہ سے گلو کو میں کام دیتا ہوں کوئی گاڑی آجائے خالی کرنا ہو باروانہ چڑھانا ہو کام کتنا بھی ہو دھاڑی پوری دی بس تمہارا ہی خیال میرے دل میں رہا اب پتہ نہیں تم کا میرا کتنا خیال ہے۔“

”یہ تو تم نے خوب کہی مجھے خبر نہ تھی۔“ عورت بولی۔

”اب تو خبر ہوگئی نا، تو بس سویرے لے آؤ کام پر لگا دیں گے۔“ موتی چند بولے۔

گلو کو شراب نے ختم کر دیا تھا مگر اس کی عورت ماننی ابھی تک ہاتھ پیر کی ٹھیک تھی بھوک اور روز روز کی میاں سے جھڑپ نے اس پر اثر تو کیا تھا مگر پھر بھی موتی چند سے بہتر تھی موتی نے بھابی کہہ کر بہت کچھ کہنے کا راستہ ہموار کر لیا تھا۔

گلو کو لے کر ماننی سویرے ہی آگئی بولی۔ ”کرلو بات، میں لے آئی ہوں۔“

موتی چند بولے۔ ”دیکھ بھئی کام یہ ہے کہ تو نے بھی دیکھا ہوگا کہ میدان کے پرلی طرف خانہ بدوش آئے تھے ان سب کا ایک گرد بھی تھا سب اس کو ڈنڈوت کرتے تھے بہت بوڑھا کمزور سا نظر آتا تھا۔ مگر وہ ایسا نظر آتا تھا کمزور نہیں میں نے ابھی اس سے ملاقات کی تھی تو نے شاید کی ہو وہ سب کدھر گئے کسی کو پتہ نہیں ہے تیرا کام یہ ہے کہ تو پتہ چلائے کہ وہ کہاں ہیں کتنی بھی دور جانا پڑے تو جائے گا تیری دھاڑی تیری جو رو کو دے دوں گا اور جیب خرچ الگ دوں گا اور کرایہ بھی ملے گا کام تو پورا کرے گا یہ نہیں کہ پی کے کہیں پڑا رہے یا دیکھنا اگر ایسا کیا تو سب کھایا پینا نکال لوں گا تیری جو رو کو دھاڑی مل جائے گی اس کی تو چنتا مت کرنا محنت نہیں کرنی ہے بس پتہ کرنا ہے کہ وہ کہاں پر ہیں اور تجھے ترنت آکر بتانا ہے کہ جوگی کا ڈیرہ کس جگہ پر ہے۔“

”ارے موتی سیٹھ یہ تو کوئی کام ہی نہ ہوا بس سمجھ لو ہو گیا۔“ گلو بولا۔

”میں کیسے سمجھ لوں ارے گھر سے نکل، لوگوں سے پتہ کر کہ وہ قافلہ کدھر گیا ہے پھر اس طرف چل اور پتہ کرتا جا، گاؤں گاؤں کیا پتہ کتنا چلنا پڑے اور یہ پکڑ پچاس روپے سب کی نہ پی جانا ختم ہو جائے تو لاری پر واپس آ کر اور لے جانا تیرا پورا خرچ دوں گا ہر طرف آنکھیں کھول کر چلنا تیری جو رو بھوک نہیں رہے گی تیری روز کی دھاڑی ایک روپے چار آنے اس کو میں دیتا رہوں گا۔ جلدی کام ختم کرے گا تو پورے سو روپے انعام بھی دوں گا۔“

آج تو موتی چند بڑا دیا لو ہو رہا ہے ماضی نے سوچا اور بولی۔

”جوگی مہاراج سے کیا بہت ضروری کام پڑ گیا ہے۔“

”ہاں بہت بڑا پنم اس چکر میں نہ پڑو تم اپنا سوا روپیہ روز کا روز لو، کہو تو ہم شام کو خود لے آویں یا تم خود رات کو آ کر لے جاؤ گی جیسا کہو ہم تو راضی ہیں۔“

”گلو جلدی سے بولا۔ ”تم خود ہی پہنچا دینا موتی

چند یہ کہاں آوے گی رات کو۔“

”ارے ہم تو تمہاری سہولت سے کہہ رہے تھے

پہنچا دیں گے روز کے روز۔“

”بس تو کل سے ہماری ڈیوٹی شروع۔“ گولو بولا۔

اور شام کو دھاڑی پکی تھوڑی جاسوسی کرو لوگوں سے

پتہ کرو کوئی نہ کوئی تو ان کو جاتے وقت دیکھا ہوگا قدم قدم

آگے بڑھاؤ آگے بڑھتے جاؤ کوئی جوگی ملے سادھو ملے

ان سے جوگی کا پتہ کرو کوئی نہ کوئی ضرور جانتا ہوں۔“ موتی

چند بولے۔

”ارے یہ سب ہم کو پتہ ہے کہ لیں گے پتہ تم چنتا

نہ کرو۔“ گولو بولا۔

دوسرے دن شام کو موتی چند نے ماننی کا دروازہ

بجا دیا۔ ماننی نے دروازہ کھول دیا۔ ماننی کا مکان اور سب

کانوں سے دبا ہوا تھا دروازے پر بھی اندھیرا تھا اور دور

تک گلی خالی بڑی تھی موتی چند نے ہتھوڑی کی جیب سے

سوارو پیہ نکال کر ماننی کی تھیلی پر رکھ دیا اور بولتے۔ ”فکر نہ

کرنا جو ضرورت ہو کہہ دینا پوری کر دیں گے۔“

”بڑی مہربانی لالہ جی تمہاری، اس طرح تو گولو نے

بھی کبھی ہمارا خیال نہ کیا۔“ ماننی بولی۔

”ارے ہم گولو نہ ہیں موتی ہیں دونوں میں فرق تو

ہے نا۔“ موتی بولے۔

”فرق تو بڑا بھاری ہے وہ جتنی ہے اور تم۔“ وہ

خاموش ہو گئی۔

”ارے آگے تو بولو ہم کون ہیں۔“ موتی بولے۔

مگر ماننی خاموش رہی جواب نہ دیا۔

”اچھا اب ہم جاتے ہیں کچھ کام ہوئے تو دکان پر

آ جانا۔“ اور موتی چند واپس مڑ گئے۔

ماننی عورت تھی مگر مرد کی نگاہوں اور مہربانی کا مطلب

سمجھ رہی تھی مگر خوش بھی تھی کہ کوئی تو قدر دان اب بھی ہے

ارے گولو ہے بھی بس گھر آیا اور شراب کے نشے میں پڑ کر

سو گیا۔

گولو چلا گیا، ماننی نے دس گیارہ بجے کپڑے

بدلے نہائی اور موتی کی دکان پر آ گئی۔ موتی چند نے اس کو دیکھا تو بولا۔ ”آج تو چمک رہی ہو، بھگوان کی سو گندھ۔“

”ارے یہ سب تمہاری کرپا ہے۔“ وہ بولی۔

”کچھ ضرورت ہے تو بولو لے جاؤ۔“ موتی چند

ریشہ خطمی ہو گئے۔

”گڑا اور گھی دے دو شام کو چاول پکاؤں گی، رات کو

آؤ گے تو کھلاؤں گی تم کو۔“ وہ بولی۔

”ارے چاول بھی لے جاؤ۔“ وہ خوش ہو کر

بولے۔

رات کو موتی چند اندھیرا ہوتے ہی آگے دروازہ کھلا

تھا اندر آ گئے بولے۔ ”آج تو تم نے دروازہ بند بھی نہیں

کیا تھا۔“

”تم ہی آؤ گے پتہ تھا، اس کارن بند نہ کیا آؤ

چاول تیار ہیں کھا لو گرم گرم۔“ ماننی بولی۔

”آج بہت دن بعد عورت کے ہاتھ کا کھائیں

گے۔“ موتی چند بولے۔

”ارے ایسی کیا بات ہے تم روز کھالیا کرو، میں

پکالوں گی تمہارے لئے۔“ وہ بولی۔

موتی چند ہنس پڑے بولے۔ ”تمہاری مہربانی

ہے۔“

”تم پکانے کو دو گے میں پکا دوں گی، مہربانی کیسی،

میں بھی تمہارے ساتھ کھا لوں گی۔“ وہ بولی۔

”ایکلی گھبراؤ گی تو نہیں۔“ موتی ندس بولے۔

”گھبرائی تو تم کیا کرو گے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

اس کی مسکراہٹ موتی چند کو دعوت لگی بولے۔

”ارے تمہارے پاس رہ جاؤں گے رات کو اور کیا۔“

”سوچ موتی چند کسی نے دیکھ لیا تو بدنامی

ہو جاوے گی۔“ ماننی بولی۔

”تو پھر تم میرے گھر آ جاؤ۔“ وہ بولے۔

”اچھا آج چاول کھا لو پھر چلے جانا۔“ وہ بولی۔

دونوں قریب قریب بیٹھ گئے عورت قریب ہو تو مرد

موتی چند نے ایک منٹ دیر نہ کی اور فوراً اس کے ساتھ لدھیانہ کو چل پڑے۔ لدھیانہ پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی مگر موتی نے ذرا دیر نہ کی اور خانہ بدوشوں کے ڈیڑے کی طرف روانہ ہو گیا۔

شہر سے دور ایک بستی آباد تھی کپڑے کی چھو لداری لگی ہوئی تھیں ان میں روشنی ہو رہی تھی باہر عورتیں عارضی چولہے بنا کر کھانا پکا رہی تھیں ان کے گدھے الگ کھڑے تھے مگر کتے ہر طرف گردش کر رہے تھے موتی چند اور گولو ایک دم اندر آ گئے دوڑ کھڑے ہو گئے اور انتظار کرنے لگے کہ کوئی آئے تو پتہ کریں۔ کچھ دیر کے بعد ایک جوان مرد اس عارضی بستی سے باہر آیا تو موتی نے اس کو روک کر پوچھا۔

”بھیا کیا یہ جوگی مہاراج کا قافلہ ہے؟“

”ہاں ہے تو کا کام ہے؟“ موتی نے کہا۔ ”مہاراج سے کام ہے۔“

”تو پھر آ میرے ساتھ اچھا ہوا تو اکیلا اندر نہ آیا کتے چھاڑ کھاتے۔“ وہ بولا۔

اندر درمیان کے بہت پرانے خیمے میں وہ اندر چلا گیا اور کچھ دیر کے بعد واپس آ کر بولا۔

”جاؤ اندر مہاراج ہیں۔ دونوں پردہ اٹھا کر اندر چلے گئے زیادہ بڑی جگہ نہ تھی۔ ایک چراغ جل رہا تھا اس کی دھندلی روشنی میں ایک بہت بوڑھا آدمی زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کی داڑھی صرف ٹھوڑی پر تھی باقی چہرے پر بال نہیں تھے مگر ٹھوڑی کے بال خوب لمبے تھے اور ان کا رنگ سفیدی مائل سرخ تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر بوڑھے نے اشارہ سے کہا بیٹھ جاؤ۔ دونوں اس کے سامنے بیٹھ گئے بوڑھا بولا۔ ”بول بچہ کیسے آتا ہوا۔“

موتی چند بولا۔ ”میں گرہ گاؤں سے آیا ہوں ضروری کام ہے۔“

”میں بھی وہیں تھا وہیں مل لیتا۔“ بوڑھا بولا۔

”کام آپ کے جانے کے بعد آیا تھا۔“ موتی بولا۔

”میں بھی وہیں تھا وہیں مل لیتا۔“ بوڑھا بولا۔

”کام آپ کے جانے کے بعد آیا تھا۔“ موتی بولا۔

”میں بھی وہیں تھا وہیں مل لیتا۔“ بوڑھا بولا۔

”کام آپ کے جانے کے بعد آیا تھا۔“ موتی بولا۔

”میں بھی وہیں تھا وہیں مل لیتا۔“ بوڑھا بولا۔

”کام آپ کے جانے کے بعد آیا تھا۔“ موتی بولا۔

کتنا خوش ہوتا ہے اس کا اندازہ آج موتی کو ہوا۔ ایک نوالہ کھا کر بولے۔ ”ارے وہ کیسے بڑھیاں چاول پکائے ہیں دل خوش کر دیا تم نے۔“

”تم خوش ہو جاؤ ہمارے لئے یہ بہت ہے مگر گولو کبھی خوش نہ ہوا۔“ وہ بولی۔

”ارے وہ سسرانوار اجڑ کیا جانے وہ کھاوت ہے کہ بندر کیا جانے اور ک کا حرا۔“ موتی چند بولے۔

”ہاں مزے دار اور ک ذرا نمک لگا کر کھاؤ تو سو پیاریاں دور۔“ موتی بھی ہنس کر بولے۔

موتی چند بیٹھے چاول کھا کر مسرت ہو گئے اور رات گزر گئی تڑکے اٹھ کر گھر آئے دو لوٹے پانی سے اشان کیا اور دوڑے دکان پر بہت خوش تھے گولو کو کام پر لگا دیا اور خود بھی کام پر لگ گئے۔ تین دن کے بعد گولو آ گیا سیدھا دکان پر آیا بولا۔

”کچھ لوگوں نے بتایا ہے کہ لدھیانہ کی طرف گئے ہیں کہو تو لدھیانہ چلا جاؤں۔“

”ارے تو پوچھنے کیوں آیا چلا جانا۔“ موتی چند بولے۔

”کرا یہ اور خرچ کہاں سے لاتا۔“ وہ بولا۔

”پنی گیا سب کی۔“ موتی چند بولے۔

”ارے کہاں لالہ دوڑ بھاگ میں لگا رہا ہوں۔“ گولو بولا۔

”اچھا لے۔“ موتی چند نے ہتھوری کی جب سے پچاس روپے دیئے اور بولے۔ ”اب دوڑ جالاری ملے ریل ملے تو لدھیانہ چلا جا اگر ان خانہ بدوشوں کا ٹھکانہ مل جائے تو ترنت واپس آ جا اور مجھے بتا۔“

گولو کو روپے ملے تو وہ ہوا ہوا گیا گھر بھی نہیں گیا چار دن کے بعد وہ واپس آ گیا اور بولا۔

”شہر سے باہر خانہ بدوش ڈیرہ لگائے پڑے ہیں ان کے پاس گدھے اور کتے بہت ہیں عورتیں بڑی نکڑی نکڑی ہیں مرد کمزور کمزور سے ہیں تم دیکھ لو شاید وہی قافلہ ہو۔“

”اچھا اب کام بتا۔“ جوگی بولا۔

اس نے اشارے سے گولو کو کہا کہ وہ باہر جائے گولو باہر چلا گیا تو وہ بولا۔ ”بات ذرا راز کی ہے جو میں آپ کو بتا رہا ہوں۔“

”میرے سینے میں ہزاروں راز دفن ہیں، تیرا راز بھی دفن کر دوں گا تو بول۔“ جوگی بولا۔

”دلی شہر میں میرے ایک متر ہیں، بہت بڑے سیٹھ ہیں لاکھوں کا کاروبار ہے بڑی بڑی فیکٹریاں ان کی ہیں۔ کسی زمانے میں وہ کاروبار کے راجہ تھے دلی میں ان کے اشارے پر بھاؤ گرتے بڑھتے تھے مگر اب ایسا نہیں ہے ایک دوسری پارٹی ان سے بڑھ کر آگئی ہے وہ پارٹی مسلمان ہے اس کو گرانے کو میرے متر نے بڑے جتن کر لئے مگر کاروبار میں وہ پارٹی آگے ہی رہی بڑا نقصان میرے متر نے اٹھایا مگر وہ ان پر بھاری ہی رہا اور دن بدن اس کے کاروبار میں پھیلا رہا ہے۔ ہر طرف سے ابھر کر آپ کے در پر آئے ہیں اس کا کچھ بندوبست کر دیں۔“ موتی نے کہا۔

”ارے تو کیا مادیں اس کو۔“ جوگی بولا۔

”نہیں ابھی نہیں مگر تگڑی چوٹ ضرور دینا ہے کوئی گودام جل جائے یا کچھ اور مالی طور پر ذرا کمزور کرنا ہے اس کے بعد آگے سوچیں گے۔“ موتی نے کہا۔

”تیرے متر کا نام کیا ہے۔“ جوگی نے پوچھا۔ موتی

بولا

”اس کا نام سیٹھ دمڑی مل ہے اور رہتا دلی میں

ہے۔“ جوگی بولا۔

موتی نے جواب دیا۔ ”ہاں مہاراج۔“

”اس کو کہہ دے میں خود اس کے پاس آؤں گا پھر بات ہوگی کام بھاری ہے وہ خود بات کرے گا تو میں کام کروں گا تو درمیانی آدمی ہے تیرا کہنا کافی نہیں ہے۔“ جوگی نے کہا۔

”تو آپ کب تک آویں گے میں ان سے کیا کہہ

دوں۔“ موتی چند بولے۔

”کہہ دینا ہم کالی راتوں میں سفر کرتے ہیں کسی

کالی رات میں اس کے پاس آ جائیں گے انتظار کرے اور سن رکھ ہم سے بات کر لی ہے اب کسی اور سے بات نہ کرنا ورنہ دونوں نقصان اٹھاؤ گے اب تو جا۔“

بڈھے جوگی کی آواز جو ان تھی اس کا لہجہ رعب دار تھا اور انداز حاکمانہ تھا۔

موتی نے گردن ہلائی اور چھو لداری سے باہر آ گیا۔ باہر دو کتوں کے درمیان گولو کھڑا کانپ رہا تھا۔ کتے اس کے آگے اور پیچھے کھڑے تھے موتی کے آتے ہی کتے ایک طرف چلے گئے اور موتی چند نے گولو کو واپسی کا اشارہ کیا اور بستی سے باہر آ گئے۔

دلی واپس آ کر اس نے دمڑی سے ملاقات کی اور جوگی کا منصوبہ اس کو دے دیا اور کہا۔

”بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑی ہے ہر طرف آدمی دوڑائے تب جا کے جوگی مہاراج تک پہنچ پائے، خرچ بہت ہو گیا پر ذرا ذرا سی بات پر کام ادھورا چھوڑ کر آ تو نہیں سکتا تھا اس کا رن نہ آیا۔“

”ارے تو بتاؤ تا کہ تمہارا کیا خرچ ہوا۔“ دمڑی بولے۔

”چار ہزار روے تو خرچ ہے میں اپنی محنت کا تو مالکتا ہی نہیں۔“ موتی بولا۔

دمڑی چند نے پانچ ہزار موتی کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور کہا۔ ”آتے رہنا مہاراج نہ جانے کب آ جائیں۔“

”ہاں رہتے جوگی اور اڑتے تھے کسی کا کیا بھروسہ ہے مگر آویں گے ضرور یہ مجھے بھروسہ ہے۔“

☆☆☆☆☆

اماؤس کی کالی رات میں رات کے پچھلے پہر جوگی مہاراج نے دمڑی مل کے محل نما مکان میں قدم رکھا اور سیدھا اس کے کمرے میں آ گیا دروازہ اس کو نہ روک سکا تالہ خود بخود کھل گیا دمڑی مل کی آنکھ کھل گئی اس نے دیکھا ایک لمبی داڑھی والا بوڑھا جو کہ جسم سے ننگا ہے صرف ایک لنگوٹی میں اس کے سامنے کھڑا ہے۔ دمڑی مل بستر پر اٹھ

کر بیٹھ گیا اور بولا۔

”میرا خیال ہے آپ جوگی مہاراج ہیں۔“

”آدمی سمجھدار ہے، ہم جوگی ہیں جو نظر آتے ہیں وہ ہیں نہیں پر تیرا اندازہ ٹھیک ہے اس سے ظاہر ہوا کہ تجھے ہمارا انتظار تھا۔“ جوگی بولا۔

”ہاں مہاراج بہت انتظار تھا جب سے پتہ چلا کہ آپ پدھارنے والے ہیں من بیکل تھا درشن کو۔“ وہ بولا۔

”ہوتا ہے من میں آس ہو تو بے کلی بھی ہوتی ہے۔ یہ زندگی کی علامت ہے پرنتو ہم ان سب گھٹائیوں سے دور چلے آئے ہیں موت کا ڈر ہمارے اندر اب نہیں رہا اب ہم موت سے آزاد ہیں شریر آتما کے چکر سے آزاد ہیں۔“ جوگی بولا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا مہاراج“ دمڑی چند بولا۔
 ”تو یوں جان کہ منش کا شریر آتما کا گھر ہوتا ہے اور قید خانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ آتما اس گندے قید خانے میں قید رہتی ہے نکل نہیں سکتی مگر ہم نے ایسا کر لیا ہے کہ یہ شریر جو تجھے نظر آ رہا ہے یہ ہمارا اصلی شریر نہیں ہے ابھی جھوٹ دیں یہ سڑ جائے گا بدبو مارے گا اور ہڈیوں کا پیچر زمین پر ٹھوکریں کھائے گا ہم اسے گندے شریر کے غلام نہیں ہم آزاد ہیں ہماری آتما آزاد ہے جو شریر اس کو پسند آ جائے وہ اس کا ہو جاتا ہے ہم نے آتما اور شریر دونوں کو الگ الگ کر دیا ہے۔“

دمڑی مل نے حیرت سے جوگی مہاراج کی باتیں سنیں اور ڈرتے ڈرتے بولا۔

”بڑے بھاگ میرے کہ آپ میرے در پر آئے آپ استریا می ہیں دلوں کا حال بھی ضرور جانتے ہوں گے میری کیا بھاونیں ہیں آپ ضرور جان گئے ہوں گے۔“
 ”سب پتہ ہے ایک مٹیچھ نے تجھ پر آفت ڈھائی ہے مگر اس نے تیرا کیا بگاڑا ہے یہ تو بتا۔“

”جوگی مہاراج میری اور اس کی لڑائی کا رو باری بھی ہے اور دھرمی بھی وہ دوسرے علاقے کا مسلمان ہے

اور دلی میں میرے سر پر بیٹھ کر مونگ دل رہا ہے ہر جگہ مجھے بات ہو رہی ہے وہ چار بھائی ہیں اور چاروں بڑے ہوشیار تعلیم یافتہ میرے قابو سے باہر ہیں۔ اصل میں روپے کا نقصان میں برداشت کر لوں گا مگر بات دھرم کی آگئی ہے دلی کی ہندو برادری چاہتی ہے کہ اس مٹیچھ کا ستیا ناس ہو جائے ارے ہزاروں سال سے یہ ہم پر سوار ہیں اترنے کا نام نہیں لیتے بھارت ہمارا دلش ہے اور یہ ہم سے آگے ہیں مہاراج اصل لڑائی یہ ہے۔“ دمڑی مل نے بتایا۔

”اب ہم جاتے ہیں پھر آئیں گے ہمارے بارے میں کسی سے ذکر نہ کرنا۔ تیرا کام ہم کرتے رہیں گے۔ اور خود تیرے پاس آتے رہیں گے۔“ جوگی نے کہا۔
 ”آپ اپنا پتہ نشان بتا دیتے تو اچھا تھا شاید کبھی ضرورت پڑ جائے۔“ دمڑی مل بولا۔

”ہمارا پتہ کیا کرے گا لے کر ہمارا قبیلہ ایک نہیں کہیں ہم کچھ ہیں بھی ہم کچھ یہ تو تیری قسمت اچھی تھی کہ تیرا آدمی ہم تک آ گیا بس یہ سمجھ لے کہ تیرا کام ہونا تھا۔“ جوگی نے کہا۔
 ”میں آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔“ دمڑی مل چند بولا۔

”خدمت تو کرے گا رہنے دے جب ضرورت خدمت کی ہوگی کہہ دیں گے۔“ مہاراج دروازے سے باہر چلے گئے۔

مہاراج کے جانے کے بعد بھی دمڑی مل اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ڈرتا رہا یہ تو بہت اونچی چیز لگتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ الٹی آفتیں گلے میں پھنس جائیں ایسا نہ ہو کہ عین والوں کے ساتھ ساتھ میں بھی ٹھکانے لگ جاؤں کیونکہ اس کے تو ارادے ہی خطرناک نظر آتے ہیں یہ تو منش کا جانی دشمن ہے یہ میرا دوست کیسے ہو سکتا ہے مگر اب کیا ہو سکتا ہے میں نے خود مصیبت کو دعوت دے کر بلایا ہے۔ دمڑی مل مہاراج سے مل کر خوش نہیں ہوا مگر بات دمڑی مل کے قابو میں نہیں تھی اب جو ہوتا تھا جوگی کی مرضی سے ہوتا تھا۔

کے آئے۔“ بخواری نے کہا۔

”دھرم تو نہیں ہے پر یہ آگ مجھے اصل نہیں لگتی۔ یہ کسی کی پھیلائی اور بھیجی ہوئی لگتی ہے کیونکہ جہاں پر یہ آگ لگی وہاں پر آبادی بھی تھی پر کسی مکان یا کسی آدمی کو نقصان نہ ہوا، وہ گودام جلا کر ختم ہوئی اس پر پانی کا اثر نہ ہوا اور خود بخود جل کر بجھ گئی۔“ دمڑی نے اصلی بات نہ بتائی۔

”دمڑی مل جی آپ کی بات سمجھ میں تو آتی ہے پر یہ کون بلا وجہ کرے گا عین تو بہت اچھی پارٹی ہے اس کے کاروبار صاف ستھرے ہیں اخلاقی طور پر چاروں بھائی نفیس آدمی ہیں لین دین کے بھی اچھے ہیں پھر آخر ان کو کیوں نشانہ بنایا جا رہا ہے۔“ بخواری بولے۔

”ارے بخواری جی یہ دنیا ہے کیا پتہ ان کا کوئی پوشیدہ دشمن ہو۔“ دمڑی مل نے کہا۔

”ہاں سیٹھ درست کہا آج کے زمانے میں دوست دشمن کا پتہ کب چلتا ہے چہرہ دوست کا مگر ہے دشمن میں تو اس لئے ڈرتا ہوں کہ میرا تو ایک گودام ہے اور اس میں سوائے کاغذ کے کھنہیں ہے۔ میری تو راتوں کی نیند اڑ گئی ہے مارے فکر کے۔“ بخواری گھبرا کر بولا۔

”ایسا کرو آدمی بڑھادو پھرے داری سخت کر دو۔“ دمڑی مل نے کہا۔

”ارے اس سے کیا ہوگا آگ تو اوپر سے آتی ہے۔“ بخواری بولے۔

”سنا تو یہی ہے بس رام رام کرو پر اتھنا کرو البشور سے اور کیا ہو سکتا ہے۔“ دمڑی مل نے کہا۔

”یہ آگ دلی میں ہی کیوں آگئی ہے؟ میں تو آدھا رہ گیا ہوں سوچ سوچ کر۔“ بخواری بولے۔

”کرتے ہیں کچھ اپنے فکر نہ کر دلی میں تو میں بھی ہوں۔“ دمڑی مل بولے۔

بخواری سیٹھ خاموشی سے اٹھے اور ہاتھ ملتے ہوئے چلے گئے۔

رات کے آخری پہر مہاراج اپنے انداز میں دمڑی

تین دن کے بعد دلی میں ایک بہت بھاری آگ لگ گئی شہر بھر کی فائر بریگیڈ نے اور سینکڑوں آدمیوں نے آگ پر قابو پانے کی کوشش کی مگر آغ اس وقت خود بخود رک گئی جب پورا مال گودام کا جل گیا لاکھوں روپے کا مال اجیری گیٹ کے گودام میں تھا یہ گودام عین ٹریڈنگ کمپنی کا تھا یہ ایک بھاری نقصان تھا آگ کی وجہ پتہ نہ چلی، قریب کے لوگوں نے بتایا کہ یہ آگ کا گولہ آسمان سے گرا تھا۔

حیرت کی بات یہ بھی تھی کہ آگ کے شعلے آسمان تک تھے اطراف آبادی بھی تھی مگر کسی کے گھر کو نقصان نہیں ہوا کوئی آدمی زخمی نہیں ہوا اور آگ خود بخود ختم ہوئی، اس پر پانی نے اثر نہیں کیا۔

منیر خان ظاہر ہے پریشان ہوا مگر یہ سوچ کر یہ تو زندگی کے کھیل ہیں نقصان فائدہ تو ہوتا ہے خاموش ہو گئے مگر یہ سلسلہ رکا نہیں۔ تین بڑے گودام جل گئے کروڑوں کے چکر میں رہن کے آگئی مگر ان چاروں نے کاروبار بند نہ کیا جاری رکھا۔ (نقصانات) رہن کے ان بڑے نقصانات سے دمڑی مل بھی پریشان ہو گیا۔

کاغذی بازار کے سب سے بڑے ڈیلر لکھی رام بخواری پریشان ہو گئے اور وہ دوڑے دمڑی کی طرف اور بولے۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے دمڑی سیٹھ عین والوں کے تین بڑے گودام رکھ ہو گئے۔ ہزاروں کانٹیں کروڑوں کا بھاری نقصان ہو گیا اور کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آگ لگی کیسے۔“

”ہاں بخواری جی دیکھ رہا ہوں۔ میں خود پریشان ہوں۔“ دمڑی مل بولے۔

”عین والے بڑے لوگ ہیں نقصان برداشت کر گئے ارے میں تو کاغذی آدمی ہوں ایک چنگاری میری موت لے آئے گی کوئی بچاؤ کی ترکیب بتاؤ۔“ بخواری نے کہا۔

”میرا خیال ہے بخواری جی کہ ہندو کے کسی گودام تک یہ آگ نہیں جائے گی۔“ دمڑی بولے۔

”ارے آگ کا کوئی دھرم ہے کہ ہندو مسلمان دیکھ

مل کے کمرے میں تھے بولے۔
”بول خوش ہے ایک ٹانگ بین والوں کی ٹوٹ گئی

ہے۔“
”آج مجھے کیسے عزت بخش دی آپ نے۔“

”میر خان انسان ہمیشہ ایک سائیکس ہوتا کبھی اس

پر شیطان کا قبضہ ہوتا ہے اور وہ اس کے کہنے پر عمل کرتا ہے

کبھی اس پر شیطان کا قبضہ نہیں ہوتا اور وہ نیکی کی طرف

چلتا ہے میں بہت گناہ گار ہوں میں نے بہت بڑی غلطی کی

ہے مگر اب میں ہوش میں ہوں تم میری بات سن کر مجھے مار

سکتے ہو گالیاں دے سکتے ہو جو میرا حشر کرنا چاہو کر سکتے ہو

میں تم کو اس کی اجازت دیتا ہوں۔“

”جو جرمانہ ہر جانہ کہو گے وہ بھی دوں گا میں

چھپتا دے کی آگ میں جل رہا ہوں یہ آگ بڑی خوفناک

ہے، میں تم کو پوری بات بتا کر اپنے پاپوں کا پراچت کرنا

چاہتا ہوں۔“

اور دمزی مل نے پوری کہانی بیان کر دی اور میر

خان کے سامنے گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔ ”دمزی سیٹھ تم نے

اپنے گناہ تسلیم کر لئے جب کوئی گناہ گار اپنے گناہ تسلیم

کر لیتا ہے تو وہ معافی کا حق دار ہو جاتا ہے میں تم کو معاف

کرتا ہوں میرے نقصانات جو ہوئے شاید اس میں

میرے لئے کوئی سزا کا پہلو ہو میں نے کوئی غلطی کی ہو سکی کا

دل دکھایا ہو سکی کی بددعا ملی ہو میں تم پر الزام نہیں دیتا۔ یہ

دنيا جب سے وجود میں آئی ہے شیطان اس وقت سے اس

کو ختم کرنے میں لگا ہے مگر کامیاب نہیں ہوا اور کبھی انشاء

اللہ ہوگا بھی نہیں کیونکہ ہر دور میں برائی کو مٹانے والے

رہے ہیں ان کو ہم نہیں دیکھ پاتے مگر وہ ہوتے ہیں اور

بدی سے لڑتے رہتے ہیں شیطان کو دوڑاتے رہتے ہیں

ان کا ایک بلند مقام ہے یہ سلسلہ جاری ہے آج بھی ایسے

لوگ ضرور موجود ہیں جو شیطان کے ارادوں کو پورا نہیں

ہونے دیں گے۔ میر خان بولے۔

”تم نے میرے سر سے بہت بھاری بوجھ اتار

دیا۔“ دمزی مل بولے۔

”تم نے اصل بات بتا کر مجھے ہوشیار کر دیا اب

میں جانو اور وہ جوگی جانتے اس دلی میں ایسے لوگ موجود

”ہاں خوش ہوں مہاراج۔“ دمزی مل نے کہا۔

”اب اس کی فیکٹری چلے گی۔“ مہاراج بولے۔

”مہاراج ایک بات کہوں آپ کی آگیا ہو تو۔“

دمزی مل نے کہا۔

”بول آگیا ہے۔“ مہاراج بولے۔

”ان کا بہت نقصان ہو گیا میں کہوں اتنا جھکا بہت

ہے اب اور نہ کرو۔“ دمزی مل بولے۔

”اچھا اب تجھے اس پر رحم آرہا ہے، ارے مورکھ یہ

آگ اب رکنے والی نہیں ہے بین کو یہی ختم نہیں کرے گی

بلکہ پورے دلی کو جلائے گی اب کوئی نہیں بچے گا، ارے تو

لایا ہے اسے تو تیرا بھی نمبر آئے گا۔“ جوگی نفرت سے

بولا۔

”آپ کو یہ سب کرنے کی ضرورت کیا ہے،

مہاراج میں مانتا ہوں مجھ سے غلطی ہوگئی ہے میں انتقام

میں اندھا ہو گیا تھا مجھے معاف کر دو اور جو جرمانہ پلو میں

دینے کو تیار ہوں۔“ دمزی مل بولا۔

اگر تو غلطی نہ کرتا تو میں نہیں آسکتا تھا۔ جوگی نے

بڑا خوفناک مکروہ قہقہہ لگایا۔ اور اس کا قد بلند ہونے لگا اور

وہ ایک ہیبت ناک شکل اختیار کر گیا۔

دمزی مل اس کے سامنے بہت معمولی اور کمزور نظر

آنے لگا۔

جوگی چلا گیا اور دمزی مل چھپتا دے کے سمندر میں

غرق گیا۔ بڑی بھول ہوگئی میں نے بہت بڑا گناہ کر دیا یہ

ساری آفت میری لائی ہے میر خان اور اس کے بھائیوں

کی دشمنی میں میں نے ہزاروں کی زندگی خطرے میں

ڈسٹال دی ہے اب میں کیا کروں یہ شیطان میرے بس

میں تو نہیں آسکتا وہ چھپتا دے کے سمندر میں ڈوبا بین

والوں کے دفتر چلا گیا، آج پہلی بار وہ یہاں آیا تھا وہ کس

جذبے سے آیا تھا یہ صرف وہ جانتا تھا۔

ہیں جو اس جوگی کو جہنم تک چھوڑ آئیں گے۔“

دلی میں منیر خان رہتے تھے حکیم وقار کے بارے میں بھی جانتے تھے شام کو دفتر بند کر کے وہ ان کے مطب میں پہنچ گئے منیر خان بھی گناہ آدمی نہ تھے۔ حکیم صاحب سے بھی تقریبات میں ملاقات ہوتی رہتی تھی مگر کسی ضرورت کے تحت ان کی یہ پہلی ملاقات تھی۔

سلام دعا کے بعد حکیم صاحب بولے۔ ”فرمائیے خان صاحب میرے لئے کیا خدمت ہے۔“

”حکیم صاحب میری بات ذرا لمبی ہے آپ کے پاس وقت ہوتا تو اؤں۔“ منیر خان بولے۔

”ارے خان صاحب میں مریض تو دیکھتا نہیں بچے اور دوسرے حکیم کام کرتے ہیں مجھے فرصت ہی فرصت ہے آپ بے شک پوری رات سنا رہے ہیں۔“ حکیم وقار نے جواب دیا۔

اور منیر خان نے اپنی دلی آنے کی کہانی اور اس کے بعد کے حالات پورے بیان کر دیئے۔ دمڑی مل کے کردار کے بارے میں بھی بیان کر دیا۔ اس کی غلطی اور اپنے نقصان کا بھی بتا دیا اور پھر دمڑی مل کے ضمیر کی بیداری اور اپنے گناہ کو تسلیم کرنے کے بارے میں بھی بیان کر دیا۔

حکیم صاحب پوری روداد سننے کے بعد کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔

”انسان بڑی عجیب چیز ہے جتنی جلدی بگڑتا ہے بعض اوقات اس سے بھی کم وقت میں سنور جاتا ہے۔ اس پر نیکی کرنے کا جذبہ غالب آ جتا ہے دمڑی چند تہا رادشمن تو تھا مگر جوگی مہاراج کے ارادوں کو نہ کر اس کا ضمیر بیدار ہو گیا تمہارے ساتھ اور بہت سوں کی بربادی نظر آنے لگی اور وہ نیکی کی طرف پٹ گیا یہ بہت اچھا ہوا کہ اس نے خود سب قبول کر لیا۔ حکیم کامل موجود نہیں ہیں۔ وہ ہزاروں سال کے ایک پیچیدہ اسرار کی جانکاری کے سلسلے میں کسی دعوت پر مصر گئے ہوئے ہیں ان کا یہ منش بہت اہم ہے۔ مگر آپ فکر نہ کریں میں ان سے رابطہ کر کے سارے حالات بتاؤں گا اور انشاء اللہ یہ دلی جس طرح آباد ہے

رہے گی شیطانوں سے ڈرنا کیسے یہ تو ہر دور میں انسان کو پریشان کرتے رہے ہیں۔“

رات کو ہی حکیم وقار نے رولو کا سے رابطہ کر لیا اور پوری کہانی بیان کر دی۔ معاملہ سنگین لگتا ہے میں پوشیدہ طور پر اس کی نگرانی کروں گا یہاں مصر میں میری مصروفیات اتنی کے ساتھ کچھ زیادہ بڑھ گئی ہیں بہر حال مجھے آنا ہوگا۔“ رولو کا بولا۔

”اب تم جو مناسب خیال کرو وہ کرو۔“ حکیم صاحب بولے۔

”حکیم صاحب بقول ہندو مذہب کے مطابق آسمان سے آگ صرف آگن دیوتا برستا ہے اور اس پر حکم چلانے والا کوئی معمولی جادوگر نہیں ہو سکتا، اس کے ساتھ مقابلہ بھی تیاری کے بعد ہوگا، میں کل رات آپ کے پاس ہوں گا۔“ اور واقعی رولو کا رات کو دلی آ گیا۔

اور دوسرے دن وہ دمڑی کے پاس رات کو چلا گیا اور بولا۔ ”میں حکیم کامل ہوں۔ حکیم وقار کے ساتھ ہوتا ہوں۔ کچھ ضروری معلومات کرنے آیا ہوں۔“

دمڑی چند بولا۔ ”بڑے بھاگ میرے کہ آپ خود آگئے فرمائیے میں حاضر ہوں۔“

”یہ بتائیے کہ یہ جوگی آپ کو کہاں ملا تھا۔“ رولو کا بولا۔

”میں نے اس کی تلاش کو آدمی دوڑائے تھے یہ پنجاروں کے قافلے میں سفر کر رہا تھا مگر آگے جا چکا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت پڑ گئی اور میں نے موتی چند کو اس کام پر لگا دیا تھا اس نے ہی مہاراج جوگی سے پہلی ملاقات کی تھی اور پھر جوگی میرے پاس خود آ گیا تھا۔ میرے دماغ میں عین کے والوں کو نقصان پہنچانے کا سودا سہایا ہوا تھا میں نے جوگی کو کہہ دیا اور اس نے ان کے تین بڑے گودام جلا کر رکھ کر دیئے اور میرے پاس آیا تو پتہ چلا کہ اس کے ارادے تو بہت خطرناک ہیں، پورے دلی کو بھسم کرنے کا سوچ رہا ہے، دعوت میں نے اس کو آنے کی دی تھی میں ہی گناہ گاہ ہو گیا دیکھا جائے تو غلطی تو میری ہی تھی اب وہ

کہتا ہے میں تو بلانے پر آیا ہوں مجھے تو بہانہ چاہئے تھا وہ مجھ ل گیا ہے اب میں اپنی مرضی کروں گا۔“ دمڑی بولا۔

”موتی چند کہاں ہے۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”موتی چند گڑھ گاؤں میں رہتا ہے میری برادری کا ہے، وہاں پر اس کی دکان ہے۔ آدمی کنجوس ہے بال بچے خرچ کی وجہ سے نہیں رکھتا۔“ دمڑی مل نے بتایا۔

موتی چند کے پاس جاتے ہی رولوکا بولا۔

”تیرا نام موتی چند ہے۔“ آزداس متوازن اور رعب دار تھی۔ موتی ذرا سا گھبرا یا ضرور پھر خود سنبھال کر بولا۔

”ہاں جی میرا نام موتی چند ہے کیا کام ہے؟“

”میں دلی سے آیا ہوں تو یہ بتا کہ تجھے جوگی کہاں ملا

تھا۔“ رولوکا بولا۔

”وہ اپنے ڈیرے پر تھا شہر کے نکال پر وہ شہر اہوا

تھا۔“ موتی بولا۔

”چل اٹھ اور مجھے وہ جگہ دکھا۔“ رولوکا نے کہا۔

”میں کیا فالتو ہوں کہ تمہارے ساتھ چل پڑوں اپنا

کام کروں جاؤ اپنا کام کرو۔“ وہ بولا۔

”اور پھر رولوکا نے موتی چند کو اپنی گہری نظروں

سے دیکھا تو بے چوں و چراں موتی چند رولوکا کے ساتھ چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”دور جگہ ہے تو تانگہ کر لے کرایہ میں دے دوں

گا۔“ رولوکا بولا۔

موتی چند اور کیا چاہتا تھا فوراً اس نے تانگہ روکا اور

دونوں روانہ ہوئے پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ شہر سے باہر

تھے ایک بڑے میدان کے سامنے اس نے تانگہ روک لیا

اور بولا۔

”میدان تو یہی ہے اور ہاں ٹھیک ہے وہ کنواں بھی

ہے مگر وہ قافلہ اب چلا گیا ہے۔“

رولوکا موتی چند کے ساتھ کنواں کے پاس گیا اور

کنویں میں جھانک کر دیکھنے لگا۔ کنواں بہت گہرا تھا مگر

اس میں پانی نہیں تھا موتی چند نے بھی کنویں کے اندر

جھانکا مگر اس کو بھی پانی نظر نہیں آیا تو بولا۔ ”ارے اس میں ذرا پانی نہیں اور جب میں پہلے آیا تھا تو قافلے والے اس میں سے پانی نکال رہے تھے پانی کہاں روپ ہو گیا۔“

رولوکا میدان میں چکر لگانے لگا اور پھر اس نے جھک کر جو چیز اٹھائی وہ ایک ہڈی تھی یہ ہڈی گردن کے کسی حصے کی تھی اور زیادہ بڑی نہ تھی۔ موتی چند بولا۔ ”کیا مل گیا۔“

رولوکا بولا۔ ”موتی چند تیرے پاس کوئی نہیں آیا تو کسی کو لے کر اس میدان تک نہیں آیا یہ جگہ بھول جا کسی کو نہ بتانا ورنہ تو نے وہ کنواں دیکھا ہے اس میں ڈال کر اوپر سے بند کر دوں گا۔“

موتی چند ڈر کر بولا۔ ”میں سب بھول گیا شریمان

میں کبھی ادھر آیا ہی نہیں ہوں۔“

”تو صرف گولو اور اس کی جو روک یاد رکھ۔“ رولوکا

ہنس کر بول اور تانگے پر بیٹھ گیا۔

رولوکا نے ہڈی کا وہ ٹکڑا اپنے کارندے کے حوالے

کر دیا اور کہا۔ ”پتہ کر یہ قافلہ کدھر گیا ہے۔“ کارندہ روانہ

ہو گیا اور رولوکا حکیم وقار کے پاس آ گیا بولا۔

”معاملہ بڑا سنگین ہے جوگی پورا شیطان ہے گڑھ

گاؤں کے جس میدان میں وہ رکھا تھا اس کو بچر کرنے کو اس

نے دو بندوبست کئے تھے ایک تو کنویں کے پانی کو ختم

کر دیا۔ دوسرے زمین پر ایک ہڈی ڈال گیا کہ ہزار کوشش

کرنے پر بھی کوئی پودا وہاں نہ ہو مگر میں وہ ہڈی اٹھا لیا

وہی ہڈی اس کے بارے میں بتائے گی کہ وہ کہاں گیا ہے

اور وہ کنواں سوکھا رہے گا۔“ حکیم وقار نے پوچھا۔

”نہیں اوپر کا جادو ٹوٹ جانے پر کنویں میں پانی

خود بخود آ جائے گا اس کے سوتے کھل جائیں گے۔“

”کیا جوگی کو اندازہ ہو گیا ہے کہ اس کے مقابلے پر

کوئی آ گیا ہے۔“ حکیم وقار نے پوچھا۔

”شاید اندازہ ہو گیا ہے اس لئے اس کا وجود دلی

کے اطراف میں نہیں ہے۔“

”اگر وہ میرے بارے میں ذرا بھی جان گیا تو پھر روپوش ہو جائے گا، سامنے نہیں آئے گا میں اس کو اس کے قلعے میں آسانی سے گھیر لوں گا مگر یہ ایک خطرناک چال ہوگی اس کی فوج کو چھیڑنے کے بجائے مقابلہ اس سے ہو تو بہتر ہے میں کچھ عرصے کے لئے آپ سے جدا ہو رہا ہوں میں ناگہاں پر بت کی سب سے اونچی چوٹی پر قیام کروں گا جہاں پر کسی انسان کا زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔“ رولو کا بولا۔

”تو پھر تم نے کیا بندوبست کیا ہے۔“ حکیم وقار بولے۔

”آپ جانتے ہیں برف پر بھی پودے اور جڑی بوٹیاں تو ہوتی ہیں۔ قدرت کا کمال دیکھئے کہ برف میں پیدا ہونے والا ایک پھل جو نمٹا کر کے برابر ہوتا ہے کچا ہو تو پیلا اور پکنے پر سرخ ہو جاتا ہے اور برف کے اندر پورے سال پڑے رہنے پر پکتا ہے۔ اس کی تاثیر اتنی گرم ہوتی ہے کہ زمین پر اس کو کھسا کر آدی گرمی سے مر سکتا ہے اور برف پوش پہاڑی پر بڑی آسانی سے زندہ رہتا ہے اس پھل کا حاصل کرنا آسان نہیں پہاڑی ریچھ کو اس کی خوشبو آتی ہے اور وہ برف کھود کر اس کو نکال لیتا ہے کیونکہ وہ کئی کئی فٹ برف میں دبا رہتا ہے۔ میرے کارندوں نے ریچھ کا پیچھا کر کے وہ پھل ایک غار میں جمع کر لئے ہیں وہ کم از کم ایک سال کے لئے کافی ہیں کیونکہ ان کی ضرورت تو صرف مجھے ہی پڑے گی میرے کسی کارندے کو بھی ضرورت نہیں ہوگی میں چوٹی پر برف میں گھر بنا کر رہوں گا اور نیپال کی اس وادی پر نظر رکھوں گا اور جوگی کو باہر نکلنے پر مجبور کروں گا۔“

رولو کا پہاڑی پر چلا گیا اس نے جاتے ہی رات کے وقت نیپال کی اس وادی میں جہاں پر جوگی کا قلعہ تھا ہزاروں سن برف کی بارش کر وادی بھی اتنی دور اتنی برف لانا آسان نہیں تھا مگر رولو کا کارندے بہت پھرتی سے کام کرتے تھے اچانک برف باری اور اس وادی پر جہاں کبھی برف پڑتی ہی نہیں جوگی ہوشیار ہو گیا اور وار کرنے

واپس رولو کا کارندہ آ گیا اس نے بتایا قافلہ گورکھ پور کے ایک پہاڑی درے میں رکا ہوا ہے پورا قافلہ گدھوں پر سرفر کرتا ہے پھر اتنی دور اتنی جلدی جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ قافلہ خانہ بدوشوں کا نہیں ہے معاملہ اس سے آگے کا ہے گورکھ پور کے آگے تو پہاڑی سلسلے ہیں اور نیپال کی سرحد شروع ہو جاتی ہے مگر جانے آنے پر پابندی نہیں ہے شاید جوگی نے اس پہاڑی مقام کو محفوظ بنایا ہوا ہو۔“

کارندے کو دور دور رہنے کی ہدایت تھی اس کو پتہ نہیں چلا کہ جوگی قافلے میں موجود ہے کہ نہیں۔
”اگر یہ قافلہ انسان کا نہیں تو پھر کیا ہے؟“ حکیم وقار نے پوچھا۔

”ابھی اس کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ ہو سکتا ہے یہ قافلہ ہوائی لوگوں کا گروہ ہو، جادو اور سفلی علوم تو موجود ہیں۔ شیطانی قوتیں تو ہیں اور ان میں قوت بھی ہے دنیا میں ایک رحمانی قوت کے ساتھ یہ شیطانی قوت بھی مصروف عمل رہتی ہے اور انسان کو بہکانے کی کوشش کرتی ہے۔ میں نے خود کو اب تک اس طرح رکھا ہے کہ جیسے میں ہوں ہی نہیں۔ سارے کام کارندوں سے لے رہا ہوں دشمن بڑا ہوشیار ہے اگر ذرا سی بھی بھٹک پا گیا تو تلاش کرنا دشوار ہو جائے گا۔“ رولو کا بولا۔

”اب آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے۔“ حکیم صاحب بولے۔

”میں خود اس قافلے کے نزدیک نہیں جاؤں گا کیونکہ جو شخص آگئی دپوتا کو منا سکتا ہے وہ ضرور شیطانی قوت میں بہت آگے ہوگا میری موجودگی اس کو خبردار کر سکتی ہے۔ اس کا پہاڑی درے میں قیام بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ قلعہ بند ہو گیا ہے اس سے کم از کم یہ تو ہوا کہ دلی پر کوئی خطرہ نہیں ہے اس کے قلعہ بند ہونے سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو خود کچھ خطرہ نظر آ گیا ہے حکیم صاحب بولے درست فرمایا آپ نے اتنی شیطانی ودیا جاننے کے لئے یہ مشکل کام نہیں ہے رولو کا نے جواب دیا۔

روکا گیا اتنی ریت کہاں سے آ رہی تھی جبکہ دور دور ریگستان نہیں تھا جوگی کے لئے یہ نئی بات تھی ریت رکتی نہ تھی اور کوئی سامنے نہ تھا اس نے اس ریت کے طوفان کو روکنے کی ہر کوشش کر ڈالی مگر وہ ناکام ہوا اس نے وادی کو چھوڑ دینے کا اشارہ کیا اور اپنے خاص کرگوں کے ساتھ راہ فرار اختیار کر گیا۔

اس کے جاتے ہی ہوا لٹی چلنے لگی اور وادی میں جمع ریت واپس جانے لگی اور کچھ دیر کے بعد وادی میں ذرا سی ریت نہ تھی کون کہہ سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے اس وادی میں ہزاروں ٹن ریت بھر گئی تھی اب جوگی کا رخ جنگلات کی طرف تھا مگر جاتے جاتے وہ رولوکا کے بارے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کہاں ہے وہ چوٹی پر نہیں گیا مگر اس نے اپنے پیروں کے ذریعے رولوکا کے اترنے کے تمام راستے بند کر دیئے۔ مگر وہ جانتا تھا دشمنوں راستوں کا محتاج نہیں ہوگا۔

اب رولوکا چوٹی پر اور جوگی ہمالیہ کی نرالی کے جنگلات میں جوگی کی گھبراہٹ یہ تھی کہ اس کے پیر اندھے تھے اندھے ان معنوں میں کہ وہ رولوکا اور اس کے کارندوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ کالی شکتی میں بحیرہ طاقت وردیوتا ہے مگر وہ اندھوں کی طرح پھر رہا تھا۔

پھر پیدہ اور نہ جانے کالی شکتی کے بڑے بڑے پیر اندھیرے میں کھڑے تھے اور جوگی سے کہہ رہے تھے ہم کیا کریں جوگی کالی شکتی کی آخری سیڑھی پر کھڑا تھا وہ کھنڈولا تھا مگر اس کی بد قسمتی یہ ہو گئی کہ اس کو شیطانی قوت کا یہ رتبہ ملتے ہی اس کی مدد بھیڑ ہو گئی اور دشمن بھی ایسا ملا کہ جس کے بارے میں اس کی شکتی کچھ بتاتی نہ تھی بڑے سے بڑا پیر خاموش تھا۔

اور پھر وہ وقت آیا کہ جوگی کے بڑے بڑے پیر اور کالی شکتیاں اس کا ساتھ چھوڑتی گئیں۔

”اب میں کیا کروں گردو تو نے مجھے مہمان بنایا تھا تو نے شکتی دے کر میرا مان بڑھایا تھا آج یہ سب میرے

کے بارے میں سوچنے لگا مگر کس طرف دار کرے برف نو ہمالیہ کی طرف سے آئی تھی دشمن اسی طرف ہے ادھر ہی جانا ہوگا سردی بڑھ گئی تھی قرب و جوار کے لوگ حیران تھے یہ بے موسم برف باری اور سردی مگر جوگی حساب لگا رہا تھا۔

یہ بے موسم برف باری بظاہر ایک فصول کی بات نظر آتی ہے مگر ایسا نہیں تھا جوگی اس برف باری کے بارے میں اندازے لگائے گا برف کہاں ہے کہاں سے آسکتی ہے اور ان اندازوں پر دشمنی کی سمت کا تعین کرے گا اور پھر اپنی صف بندی کرے گا اگر اس کے پاس جنات کی فوج ہوئی تو اس کا انداز جارحانہ ہوگا کیونکہ جنات سردی برداشت کر لیتا ہے اور اگر مغلی علوم کے پیر ہوئے تو راہ میں دریاؤں سے گزرنا ہوگا جہاں پر یہ پیر بے کار ہوتے ہیں۔ جادو کے بہت اثرات کو بہتا پانی بہا کر لے جاتا ہے، اسی طرح سمندر کے پانی پر بھی جادو بے اثر ہوتا ہے۔

جوگی نادان نہ تھا۔ دشمن کی چال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اس کی توجہ دلی سے ہٹ گئی تھی، رولوکا کی یہ پہلی کامیابی تھی رولوکا کے جاسوس نیپال کی وادی کی گمرانی کر رہے تھے مگر اس جوگی کے پہرے داروں کی نظر سے دور یہ لڑائی بالکل اس انداز میں ہو رہی تھی جیسے دو ملکوں کے درمیان لڑائی ہوتی ہے جوگی کمزور نہیں تھا اس کے لڑائی کے لئے سامان بھی بہت تھا اس پر ہاتھ رکھنے والا پاور ہاؤس بھی تھا مگر اس کے باوجود وہ قطعاً بند تھا سامنے نہیں آ رہا تھا اس کی وجہ تھی کہ وہ اب تک دشمن کے بارے میں لاعلم تھا۔ دشمن کون ہے اس کے پاس کتنی طاقت ہے جبکہ رولوکا اس کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا جوگی کی یہ بہت بڑی کمزوری تھی اس کے پیر رولوکا کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ رولوکا کے کارندے کسی پیر کو نظر نہیں آتے تھے چھ مہینے گزر گئے یہ آنکھ پھولی جا رہی رہی اور پھر ایک دن اچانک نیپال کی پہاڑی وادی میں تیز ہواؤں کے ساتھ گرم گرم ریت اڑ کر آگئی جوگی نے اس ریت کو روکنے کی کوشش کی مگر ریت اس قسم کی تھی کہ جتنا اس کو

تھہار میرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں میں کیا کروں مجھے کچھ راستہ بتا مجھے کچھ طریقہ بتا۔“

آواز آئی۔ ”ارے نادان جب کچھ کر سکتا تو کرتا رہ اور نہ کر سکے تو بھاگ پھر دوبارہ آنے کے لئے اگر نہیں بھاگے گا تو بڑا نقصان اٹھائے گا میرا طریقہ یہی ہے بھاگنے کا راستہ پہلے نظر میں رکھ۔“

اور جوگی اپنے گرو کے حکم پر بھاگ کھڑا ہوا اپنا کمزور اور بوڑھا جسم جنگلات میں چھوڑ کر بھاگ گیا رولوکا کے کارندوں نے خبر دی جوگی جسم چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ اب رولوکا کا پہاڑ کی چوٹی پر رہنا بے کار تھا۔ وہ زمین پر آ گیا اس کو اطلاعات آ رہی تھیں جوگی زمین پر نہیں تھا۔ شاید کسی نے شریک تلاش میں تھا اور چولا بدل کر آنے کی تیاریاں کر رہا تھا مگر اس کی تیاری اتنی جلدی نہیں ہو سکتی تھی رولوکا واپس دلی آ گیا اور تمام احوال حکیم وقار کو بتا دیا حکیم صاحب بولے۔ ”اس کا مطلب ہے خطرہ ٹل گیا ہے۔“

”خطرہ تو ہے مگر ابھی نہیں مگر وہ بد ذات ہے اور اس کے پاس شیطان کی ہنستی بھی بہت ہے میں نے دو بد واس سے لڑائی اس لئے نہیں کہ ایک نیا تجربہ کر رہا تھا وہ تجربہ یہ ہے کہ دشمن کو نفسیاتی طور پر کمزور کرو اس کو زچ کر دو ایک وقت آئے گا کہ اس میں جھجھلاہٹ پیدا ہو جائے گی اور وہ ضرور غلطی کرے گا وہی ہوا جوگی نے برف پر آگ برسادی اور آگنی دیوتا کو ناراض کر دیا۔ یہ بہت بڑی طاقت تھی مگر اس کے ہاتھ سے جانی رہی اس کے جاتے ہی اس نے ضرور اپنے گرو کو یاد کیا ہوگا اور اس نے وہی اپنا راستہ بتایا ہوگا کہ بھاگ جا اور وہ بھاگ گیا۔“ رولوکا نے بتایا۔

☆.....☆.....☆

اصل نام کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہوں مگر ان کو سب فوجدار خان کے نام سے پکارتے تھے ان کے اس نام کی بھی ایک دلچسپی کہانی ہے۔

ان کی یہ عادت ہے کہ پورے محلے میں کای کسی کا ہود عورت ہوشادی ہو یہ موجود اور ان کے آتے ہی سارے

کام ان کے ہاتھ آ جاتے اور پھر یہ بھاگ بھاگ کر ہر کام کرتے۔ ہمت ہو گئی تو پہلے موجود شامیانہ اور دریاں لے آئے اور مسجد میں اعلان کر دیا، دوڑ کر کفن وغیرہ بندوبست کر دیا اور قبرستان دوڑ گئے کیونکہ ان کے آنے کے بعد صاحب خانہ بے فکر ہو جاتے، ان کی ان خدمات کو دیکھ کر ان کا نام خدائی فوجدار رکھ دیا تھا۔

کچھ دن گزرے کہ خدائی کٹ گیا اور صرف فوجدار رہ گیا اور پھر کسی ستم ظریف نے اس میں خان کا اضافہ کر دیا اور پورے علاقے میں جہار خان، فوجدار خان مشہور ہو گئے، یہ خدمت کرنے کے اتنے شوقین کے سارے سارے دن بھوکے اپنا کام دھندہ چھوڑ کر بے گار کرنے اور کسی سے کھلم نہ کرتے، کسی نے کچھ دے دیا تو کھالیا نہ دیا تو نہ کھایا، پورے محلے میں شادی کسی کی ہو یا کوئی اور تقریب یہ موجود ہر کام میں آگے آگے، ان کی خدمات کے سب قائل ان کے خلوص کے معترف مگر اکثر ایسا بھی ہوا کہ ان کی جیب خالی کیونکہ کئی دن سے کوئی کام نہیں ملا تھا ادھار پر گاڑی چل رہی تھی وہ روزن داری دہاڑی پر کام کرتے تھے ملازمت کی پابندی ان کے بس کی بات نہ تھی کام نہ ملا تو وہ اپنے کمرے میں پڑتے رہتے اور کوئی آگیا ارے فوجدار تم یہاں ہو اور غفور بھائی کی والدہ گزر گئیں تمہاری پکار پڑ رہی ہے۔ فوجدار خان کے بدن میں کرنٹ دوڑ گیا اپنی بھوک اور بے روزگاری بھول گئے اور سر پٹ غفور کے گھر پہنچ گئے ان کے جاتے ہی خود بخود سارے چارج ان کے پاس آ گئے اور غفور میاں بیٹھ گئے کسی کو پتہ نہیں کہ میاں فوجدار صبح سے بھوکے ہیں ایک کپ چائے ادھار لی تھی اور اب شام ہونے کو ہے۔

قبرستان سے آتے آتے شام ہو گئی واپس آ کر کڑدی روٹی پیٹ میں گئی تو ان کی جان میں جان آگئی فوجدار خان جیسے کردار کہیں کہیں اور بڑی مشکل سے ملتے ہیں زمانے کا چلن بدل رہا تھا نفسا نفسی بڑھ رہی تھی فوجدار کی عزت محلے کے ہر فرد کے دل میں تھی وہ ذرا اشارہ کرتے تو ان کے لئے لوگ بہت کچھ کرنے کو تیار

ہو جاتے مگر ان کی خودداری ان کے لئے مصیبت تھی۔ بے حد مجبوری میں ادھار لے لیا کرتے تھے مگر پیسے جیب میں آتے ہی ادھار دے دیا کرتے اس عادت کو بھی محلے کے سارے لوگ جانتے تھے اس لئے ان کو آسانی سے ادھار بھی مل جاتا تھا مگر وہ خود ادھار سے دور رہنے کی کوشش کرتے تھے اور جب لیتے تھے تو جس سے لیتے وہ سمجھ جاتا تھا کہ اب یہ سخت مجبوری میں ہیں۔ اس زمانے میں بلاوجہ کون اپنا وقت برباد کرتا ہے کام کا حرج کرتا ہے اور کبھی کبھی جیب سے خرچ بھی کرتا ہے کسی ستاس اور کسی قسم کا لالچ نہ رکھ کر کسی کی خدمت کرنا بہت مشکل کام ہے۔ فوجدار خان ہمیشہ سے مہکھو تھے اور مہکھو ہی رہے کیونکہ لگ کر کوئی کام نہ کر سکے کرنے لگتے تو کوئی کسی کی شادی آجاتی اس میں لگ جاتے کوئی میت ہو جانی سوئم تک بک ہو جاتے اور اپنا کام بھول جاتے اور اس لئے کوئی ان کو ملازم نہیں رکھتا تھا۔

کان پورا چھا بڑا شہر ہے بہت بڑے کاروبار یہاں پر ہیں کپڑے کی صنعت کا یہ مرکز ہے، محلہ پیراہن مسلمانوں کا محلہ ہے ساری آبادی مسلمانوں کی ہے۔ پیراہن محلے میں فوجدار کو بچہ بچہ جانتا تھا اردو ہندی لکھ پڑھ لیتے تھے اور کتابوں کے بے حد شوقین، کتاب ہوان کو مل جائے پوری پڑھیں گے کتابیں پڑھنے سے ان کی معلومات اچھی تھی اور یادداشت بھی بری نہیں، ان کی معلومات کے سامنے بڑے بڑے گھبرا جاتے، ان کی حالت سے ان کے بارے میں قیاس کرنا بہت مشکل، غریب تھے اس لئے بے قدری تھی۔

فوجدار خان میں ہزار خوبیاں تھیں مگر یہ خوبیاں ان کے کسی کام نہیں آ رہی تھیں۔ مگر وہ نہ کان پور چھوڑ سکتے تھے نہ پیراہن محلہ ان سے چھوٹ سکتا تھا۔

میں کان پور ملازمت کے سلسلے میں گیا تھا مجھے پیراہن محلے میں مکان کرائے پر مل گیا اور میں وہاں رہنے لگا۔ مکان مرزا رشید کا تھا وہ ریلوے میں گاڑ تھے میری پوسٹنگ بھی ریلوے اسٹیشن پر ہوئی تھی۔ میں ریلوے

ورکشاپ کا فورمین تھا۔ مجھے اجیر سے بلوایا گیا تھا میری ڈیوٹی جنرل ہوا کرتی تھی۔

مرزا صاحب کی دو لڑکیاں تھیں اور دونوں جوان تھیں مرزا رشید اکثر دو تین دن گاڑی پر ہوتے تھے گھر بہت بڑا تھا۔ بڑی لڑکی کی عمر شادی کی ہو کر اوپر چلی گئی تھی۔ میں مرزا کی بیوی کو بھائی کہا کرتا تھا۔ ”بھائی رشیدن کی شادی کر دو اب عمر بڑھ گئی ہے ذرا اور آگے گئی تو بہت دشواری ہو جائے گی۔“

بھائی یہ سن کر رونے لگیں میں نے کہا۔ ”بھائی ایسی کیا بات ہے کہ آپ رونے لگیں۔“

”ارے بھیا اس کی شادی کی بات جب بھی چلائی نقصان ہی ہوا اور دفعہ تو جس لڑکے سے رشتہ طے کیا تھا ان کے ہاتھ پیر ٹوٹ گئے اور وہ ایسے بھاگے کہ لوٹ کر نہیں آئے۔“ بھائی نے بتایا۔

”آخر کون ہے جو نہیں چاہتا کہ رشیدن کی شادی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

بھائی رشیدن میری کان کے پاس منہ لا کر آہستہ سے بولیں۔ ”اس پر سایہ ہے کسی جن کا وہ اس کو نہیں چھوڑتا۔“

میں نے کہا۔ ”ارے بھائی اکثر دیکھا ہے کہ لڑکیاں ڈرامہ کرتی ہیں ایسا تو نہیں۔“

بھائی بولیں۔ ”میرے خیال میں رشیدن ڈرامہ نہیں کرتی۔“

”یہ سلسلہ کب سے ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”رشیدن تیس سال کی ہونے کو ہے پانچ سال پہلے وہ ٹھیک تھی ٹھیک تو اب بھی ہے پانچ سال پہلے میں نے اس میں تہذیبی محسوس کی تھی۔“ بھائی نے بتایا۔

اس تہذیبی کے بارے میں بھائی سے نہ پوچھ سکا۔

میں نے بیوی سے ذکر کیا تو وہ بولی۔

”میں بھائی سے پوچھوں گی۔“ اور دوسرے دن

بیوی نے بتایا کہ رشیدن شادی کے نام سے دور بھاگتی ہے میں نے کہا۔ ”مگر کوئی وجہ تو بتاتی ہوگی۔“

”مردوں میں تو وہی آدی ہے، کوئی اور مرد تو میں نے کبھی نہیں دیکھا دو تین عورتیں نظر آتی ہیں مگر وہ سب ملازم عورتیں ہیں مالکن تو وہی عورت ہے جس کے بچے میرے پاس ہوتے ہیں۔“ رشیدن نے بتایا۔

”گھر کے ارد گرد اور بھی تو گھر ہوں گے وہاں بھی تو آبادی ہوگی۔“ ماں بولی۔

”نہیں اماں اس گھر کے چاروں طرف گھپ اندھیرا رہتا ہے دور دور کسی آبادی کا نشان نہیں ہے مگر اس گھر میں کیا نہیں ہے ایک اشارے پر چیز حاضر ہو جاتی ہے میرا کام تو صرف بچوں کی دیکھ بھال ہے ان کو کپڑا پہنانا ان کو کھانا، اماں مہجران ہوگی دو بچے ہیں اور ان کی عمریں بھی بہت کم ہیں، مالکن کا کہنا ہے کہ پانچ سال کے ہوئے ہیں مگر ان کی خوراک کیا بتاؤں اتنا کھاتے ہیں جتنا میں تین وقت میں بھی نہیں کھا سکتی۔“

”تو نے پوچھا نہیں اس عورت سے کہ میں کب تک اس کے پاس رہوں گی۔“ اماں بولی۔

”پوچھا تھا اماں۔“ رشیدن بولی۔

”تو پھر کیا کہا اس نے آخر تیری شادی بیاہ بھی ہونا ہے۔ اماں نے پوچھا۔

بولی اب تو شادی وادی بھول جا کیونکہ تجھے میرے بچے سنبھالنے ہیں، یہ تو بڑے ہو گئے مگر ان کے بعد بھی چھوٹے بچے آئیں گے تو انہیں کون سنبھالے گا، یہ سن کر میری تو سخی کم ہو گئی میں کیا کہتی۔“

اماں سر پر ہاتھ مار کر بولیں۔ ”ہائے رشیدن اب کیا ہوگا؟“

رشیدن نے بتایا کہ اس پر کھانے پینے پر پابندی نہیں ہے مگر وہ مفت کی نوکرائی بن گئی ہے۔

رشیدن کب اور کس طرح اس محل میں پہنچ جاتی تھی اس کے بارے میں بھی اس کو کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ مکان کہاں پر تھا اور کون لوگ تھے وہ نہیں جانتی تھی۔ رشیدن کے حالات میرے لئے حیرت کا باعث تھے۔

میں نے مرزا سے کہا۔ ”ارے ابھی کچھ بندوبست

”ہاں کہتی ہے مجھے اپنے گھر والے عزیز ہیں میں شادی نہیں کروں گی اگر میں نے شادی کر لی تو سب خطرے میں پھنس جائیں گے اور جو مجھ سے شادی کرے گا مارا جائے گا۔“

مرزا صاحب واپس آئے تو میں نے اس کا ذکر ان سے کر دیا۔ وہ بولے۔ ”بھائی یہ بات مجھے پتہ ہے مگر میں مجبور ہوں کیا کر سکتا ہوں نہ کوئی لڑکا ہے میری نظر میں ایسا کہ جو یہ قربانی دے اور نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ آسیب اس کو نقصان پہنچائے۔“

”آپ کو کس طرح یہ پتہ چلا کہ رشیدن پر کسی جن کا سایہ ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”بیوی نے بتایا تھا آدھی رات کے بعد رشیدن گھر میں نہیں رہتی، سویرے نماز کے بعد آتی ہے، کہاں جاتی ہے؟ کس طرح جاتی ہے؟ کس کے ساتھ جاتی ہے؟ نہ مجھے پتہ ہے نہ بیوی کو اندازہ ہے، کئی دفعہ بیوی نے اس سے پوچھا بھی مگر وہ خود بھی نہیں جانتی وہ کہتی ہے میری آنکھ ایک بہت بڑے محل میں کھلتی ہے وہاں پر ایک بڑی حسین عورت رہتی ہے اس سے بھی زیادہ حسین اس کا مرد ہے اور دو بچے ہیں میں جانتی ہوں تو وہ بچوں کو میرے حوالے کر کے میاں کے ساتھ چلی جاتی ہے اور سویرے آتی ہے وہ آئی ہے تو میں گھر آ جاتی ہوں رات میں میرا کام ان بچوں کی دیکھ بھال ہے، دونوں میاں بیوی بڑے اچھے ہیں۔ کہتے ہیں تم شادی نہ کرنا ہمارے پاس کام کرو اگر شادی کرو گی تو ہمارے پاس کیسے آؤ گی ہمیں تمہاری ضرورت ہے تمہاری ضرورت ہم پوری کریں گے پر شادی نہ کرنا۔“

”ماں نے پوچھا۔“ وہ مرد تجھے کچھ کہتا تو نہیں۔“

”اری ماں اس کی بیوی اتنی حسین ہے کہ میں تو اس کے سامنے کچھ نہیں ہوں اس کے بچے بھی بڑے پیارے ہیں کہتے ہیں تم ہمارے پاس دن میں بھی رہا کرو۔“ رشیدن نے بتایا۔

”اور کون کون ہے اس گھر میں؟“ ماں نے پوچھا۔

کر لو کی کو کہیں اور بھیج دو۔“

خوشبو بھرتی تھی کمرہ بڑا تھا اور زیادہ تر کم روشنی میں تھا مولوی صاحب کے تحت پر روشنی بھی بڑا رعب دار چہرہ تھا گول چہرہ بھری بھری داڑھی اور داڑھی پر مہندی کی گلکاری ہاتھ میں سٹیج، آنکھوں میں سرمہ اور آواز میں بھاری پن ان کو رعب دار بنار ہا تھا۔

یہ سن کر مرزا بولے۔ ”یہ سب میں کر چکا ہوں۔
اظہر صاحب مگر ایسا کرنے سے مجھے اور نقصان ہوا۔
رشدین رات کو وہاں سے بھی چلی گئی اور میری تائی جو کہ
دھول پور میں رہتی ہے پریشان ہو گئی اب آپ خود اندازہ
کر کہیں کان پورا اور کہاں دھول پور مگر رشدین پھر بھی چلی
گئی اور وقت پر واپس بھی آ گئی۔“

ہمارے بیٹھے ہی بولے۔ ”سائل کون ہے؟“
مرزا نے کہا۔ ”میں ہوں اور ایک بڑی پریشانی میں
بتلا ہوں۔“

میں نے حیرت سے کہا۔ ”بڑا مشکل مسئلہ درپیش
ہے ایک طریقہ اور ہے میرے ذہن میں۔“ میں نے کہا۔
”وہ بھی بتاؤ۔“ مرزا بولے۔

مولوی نے کہا۔ ”بیان کرو پریشانی۔“
مرزا نے کم سے کم الفاظ میں رشدین کا معاملہ پیش
کر دیا۔

”رشدین کا جتنی جلدی ہو عقد کر دیا جائے شاید
جان چھوٹ جائے۔“ میں نے کہا۔

مولوی عبدالقدوس نے غور سے سنان کی آنکھوں
میں ایک چمک پیدا ہوئی آواز اور بھاری ہو گئی اور وہ
بولے۔

”یہ بھی اتنا آسان کام نہیں ہے پہلی بات تو یہ کہ
رشدین کے بارے میں بہت لوگوں کو پتہ ہے کہ اس پر
آسب ہے کون راضی ہوگا، دوسرے اس کی عمر زیادہ ہو گئی
ہے، تیسری جس عورت کی چاکری کر رہی ہے وہ کب
برداشت کرے گی اس کو تو مفت کی نوکرائی مل گئی
ہے۔“ مرزا بولے۔

”اس لڑکی کو ہمارے سامنے پیش کرو۔“
”یہ بہت مشکل کام ہے مولوی صاحب۔“ مرزا
بولے۔

”مرزا تمہاری باتیں سب درست ہیں مگر اس طرح
ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا بھی تو درست نہ نہیں ہے، ارے
کسی سیانے کا مشورہ لو کسی مولوی کے پاس جاؤ کچھ تو
کرد۔“ میں نے کہا۔

”کیوں مشکل ہے؟“ وہ بولے۔
”اس لئے کہ اس کے جانے کا جب وقت ہوتا ہے
تو اس کو روکا نہیں جاسکتا۔“ مرزا نے کہا۔

”تم کہتے ہو تو ایک دفعہ پھر کوشش کرتا ہوں، میں
پہلے بھی کوشش کر چکا ہوں مگر ہوا کچھ نہیں تھا۔“

”ارے تو دن میں لے آؤ۔ رات کو ہم روکیں
گے۔“ مولوی بولے۔

”ایسا کرو اناؤ چلتے ہیں، سنا ہے وہاں پر مولوی
عبدالقدوس یہ کام کرتے ہیں شاید کچھ کریں۔“

”مولوی صاحب آپ ایسا کریں ہمارے ساتھ
چلیں، رات میرے غریب خانے پر گزارنا اور جب
رشدین جانے لگے تو روک لینا میں اس کو یہاں تو نہیں
لا سکتا۔“ مرزا بولے۔

”اناؤ کان پور سے پانچ چھ میل دور ہے ہم نے
واپسی کا تاغکہ کیا اور روانہ ہو گئے۔“

”ٹھیک ہے ہم تمہارے گھر پر رات گزاریں گے مگر
سویرے دوکانے پر مرغے اور ایک کالی چادر تیار کرھنا اس پر
کچھ کرنا ہوگا اس کے بعد بھی خرچ تو ہوگا بولو منظور ہے۔“

مولوی عبدالقدوس کے مکان پر پہنچے مولوی
صاحب آستانے پر موجود تھے ہم سے پہلے دو تین آدمی
تھے ہم اپنے نمبر پر آستانے پر اندر گئے مولوی صاحب
ایک تخت پر بیٹھے تھے، کمرے میں لوہان اور اگر تہیوں کی

وہ بولے۔
”آپ کام کرو مجھے سب منظور ہے۔“ مرزا
بولے۔

رہے اور صبح میں نے اور مرزا نے ان کو ان کے آستانہ اناؤ پہنچا دیا اس وقت تک ان کی حالت خراب تھی مگر آستانہ پر انہوں نے آنکھیں کھول دیں میں نے کہا۔ ”مولوی صاحب کالے مرغے کا کیا کریں؟“

”ارے تم کو مرغے کی پڑی ہے میری ہڈی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔“

مرزا بولے۔ ”مولوی صاحب ٹھیک ہو جاؤ تو ضرور آنا۔“

مگر مولوی صاحب کی آواز پھر نہ آئی۔ میں اور مرزا اناؤ سے واپس آ گئے۔ رات کو میں نے اور مرزا نے کھڑکی سے سب نظارہ کیا تھا مولوی کے ساتھ جو ہوا وہ بھی ہمارے سامنے ہوا مگر مولوی کو مارنے والا کوئی نظر نہیں آیا۔

رشیدان نے بھی یہی بتایا۔ اس واقعہ کے بعد مرزا اور ڈر گئے بولے۔ ”اب بتاؤ میں کیا کروں؟ وہ مولوی تو زندہ اس لئے بچ گیا کہ مفت کے مرغے اور بکرے کھاتا رہا تھا جسم میں جان تھی میں اتنا کب برداشت کر پاؤں گا۔“

بات مرزا کی درست تھی۔ ”انسان انسان سے لڑ سکتا ہے مگر جو چیز نظر ہی نہ آئے اس سے کس طرح لڑے گا مار ہی کھائے گا۔“ میں نے کہا۔

”تم نے خود دیکھا تھا رات کو رشیدان اپنے وقت پر کسی سحر زدہ معمول کی طرح خود بخود دروازے پر آ گئی تھی اسے نہیں پتہ تھا کہ وہ کہاں؟ اور کیوں جا رہی ہے؟ پھر بھی مار رہی تھی۔“ مرزا بولے۔

”مرزا ایسا نہ کریں کہ کسی ماہر حضرات سے ملیں اور اس سے پتہ کریں وہ حضرات کے ذریعے پتہ تو کرے کہ آخر رشیدان جانی کہاں ہے؟“ میں نے کہا۔

”تم جو کرنا چاہتے ہو، میرا کہا مانو نہ کرو، کچھ فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ جو لوگ یہ سب کرتے ہیں ان میں زیادہ تر جعلی ہیں وہ صرف لوگوں کے نفسیات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور مرغے کھاتے ہیں، ہم کس طرح پتہ کریں گے کہ وہ

مولوی عبدالقدوس موج میں آ گئے بولے۔ ”لڑکی کے کمرے میں کوئی نہیں رہے گا۔ میں اس کے دروازے پر ڈیرہ لگاؤں گا میرے نزدیک کوئی نہ ہو، ہو سکتا ہے مقابلہ ہو جائے مگر پھر بھی میرے پاس کوئی نہ آئے۔“ مولوی بولے۔

رشیدان کے کمرے کے دروازہ پر مولوی صاحب نے دری ڈال پر اس پر پنی چادر ڈلوائی اور اگر بتیاں جلا کر بیٹھ گئے۔

مرزا کا تو مجھے پتہ نہیں وہ مولوی کے بارے میں کیا سوچ رہا تھا مگر مجھے وہ مولوی نقلی لگتا تھا اس کی نقل و حرکت اور آنکھیں چلانے اور حکم چلانے کے انداز مجھے اچھے نہیں لگ رہے تھے ٹھیک گیارہ بجے رشیدان کا دروازہ کھل گیا اور رشیدان دروازے کے درمیان آ گئی۔

مولوی صاحب موجود تھے بولے۔ ”لڑکی اندر جا میں کہتا ہوں اندر جا۔“

مگر رشیدان پر اثر نہ ہوا وہ ایک قدم آگے آ گئی مولوی صاحب نے پھر وہی کہا مگر اب کے بھی اثر نہ ہوا۔ مولوی صاحب کھڑے ہو گئے اور چاہتے تھے کہ رشیدان کو پکڑ کر اندر لے جائیں کہ ان کے گال پر اتنی زور سے تھپڑ پڑا کہ اس کی آواز پورے گھر میں گئی۔

اس تھپڑ نے مولوی صاحب کے ہاتھ پیر ڈھیلے کر دیئے، چہرہ سرخی سے پیلا ہٹ کی طرف آنے لگا اور وہ راہ فرار کے لئے راستہ تلاش کرنے لگے مگر اب کے ان کی پیٹھ پر ایک زوردار لٹ پڑی اور وہ زمین پر گر پڑے مفت کے بکرے اور مرغے کھانے والے مولوی صاحب کو آج پتہ چلا کہ اصل اور نقل میں کیا فرق ہے وہ زمین پر اتنی زور سے گرے تھے کہ اٹھنا نہیں چاہتے تھے مگر کسی نے ان کو پکڑ کر کھڑا کر دیا اور پھر زمین سے اوپر اٹھا کر دروازے کے باہر پھینک دیا۔ ان کے زمین پر گرتے ہی رشیدان دروازے سے باہر چلی گئی اور مولوی صاحب دروازے پر بے ہوش ہو گئے ان کے جسم کی بہت سی ہڈیاں ٹوٹ پھوٹ گئیں پورے جسم کا نقشہ بگڑ گیا سویرے تک وہ پڑے

اصلی ہیں ان کے پاس واقعی علم ہے تم بھی سرکاری آدمی اور میری حالت تو تم جانتے ہو تمہارے کہنے پر میں نے اتنی بھاگ دوڑ کر لی اب اور میرے بس کی نہیں ہے۔“ مرزا نے کہا۔

رشیدن کے بارے میں پورے محلے میں سب کو پتہ تھا اس پر آسب کا سایہ ہے مگر یہ آسب کیا ہے یہ بہت کم لوگ جانتے تھے۔ رشیدن کی عمر ضرور بڑھ رہی تھی مگر اس کی صحت اور خوبصورتی اپنی جگہ برقرار تھی پہلے میں نے بھی رشیدن کی کہانی پر یقین نہیں کیا تھا کیونکہ نہ تو یہی سنا تھا کہ جن عورتوں اور لڑکیوں پر جن عاشق ہوتے ہیں ان کی حالت چند دن میں خراب ہو جاتی ہے مگر رشیدن نہ صرف تندرست تھی بلکہ اور اچھی ہو رہی تھی شاید اس کی وجہ اچھی غذا تھی اور وہ خود بھی خوش تھی اس کی ماں کو پریشانی تھی اور وہ صرف اس کی شادی نہ ہونے پر پریشانی تھی۔

رشیدن سے چھوٹی شکون بھی بھرپور جوان تھی اماں نے اس کے جوان ہوتے ہی بات لگادی اور پھر تھوڑے دن میں ہی اس کو گھر سے روانہ کر دیا اب رہ گئی رشیدن اس کے لئے لڑکا کہاں سے آئے۔ مرزا اور بھابی تو ناامید تھے اس لئے جو سنتا کانوں کو ہاتھ لگاتا ناؤ کے مولوی کے مشر کے بعد تو رشیدن سے سب ڈرنے لگے تھے۔

ایک دن اماں نے جل کر کہہ دیا۔ ”اری جنم جلی ارے کسی کے بچے کھلاتی گھر کا کام کرتی تو کچھ تو پانی مٹرتو تو مفت میں غلامی کرنے جا رہی ہے۔“

اماں کی یہ بات نہ جانے محل میں کس طرح پہنچ گئی۔ وہ عورت بولی۔ ”تیری ماں کی بات درست ہے، تجھے ہم نے اب تک کچھ نہیں دیا۔“ اور اس نے ایک کپڑے کی تھیلی رشیدن کے ہاتھ پر رکھ دی اور بولی۔ ”تیری اب تک کی خدمت کا صلہ ہے یہ۔“

تھیلی زیادہ بھاری نہ تھی۔ سویرے رشیدن نے وہ تھیلی اماں کے ہاتھ پر رکھ دی اور کہا۔ ”اماں تم کبھی تمہیں نا کہ اب تک کچھ نہ ملا تو اس رحم دل عورت نے یہ تھیلی دی ہے۔“

اماں اندر کمرے میں گئی اور اس نے بستر پر تھیلی الٹ دی۔ تھیلی الٹتے ہی اماں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں بستر پر سونے کی بڑی بڑی ڈالیاں چم چم چمک رہی تھیں ان کے ساتھ دو تری بڑی تیز روشنی دینے والے پتھر پڑے تھے۔

اس نے فوراً ان سب کو تھیلی میں ڈالا اور تالے میں رکھ دیا۔ اتنا سونا اس نے کب دیکھا تھا مرزا دوسرے دن دوپہر کے بعد آئے، بیوی کے پیٹ میں تو مروڑ اٹھ رہی تھی، مرزا کے آتے ہی وہ ان کو پکڑ کر اندر بڑے کمرے میں لے جانے لگی، مرزا کچھ سمجھے بولے۔ ”ارے بہت تھکا ہوں ذرا صبر تو کرو۔“

بیوی بولی۔ ”اندر تو چلو۔“ مرزا نہ سمجھتے ہوئے بھی اس کے ساتھ اندر آ گئے۔ بیوی نے لائٹیں جلائی کیونکہ اس کمرے میں دن میں بھی اندھیرا ہی رہتا تھا مرزا کی سمجھ میں اب تک کچھ نہیں آ رہا تھا بیوی نے ٹالا کھولا صندوق کا ڈھکن اوپر کیا اور ایک ریستی تھیلی نکالی اس کا دھاگہ جو منہ پر لپٹا تھا کھولا اور تھیلی پلنگ پر الٹ دی۔

تھیلی کے اندر سے جو بستر پر گرا تھا اس نے مرزا کے بھی ہوش اڑا دیئے، وہ حیرت سے بولے۔

”ارے یہ کیا ہے بیگم؟“

”یہ رشیدن لائی ہے کہتی تھی اب تک کی تنخواہ ہے۔“ بیوی بولی۔

”ارے یہ تو لاکھوں کا مال ہے اور یہ ہیرے بھی تو ہیں۔“ مرزا بولے۔

میں نے کل اس سے کہا تھا۔ ”اتنے دن سے مفت کی چاکری کر رہی ہے اور آج ہی اس کو اس عورت نے یہ تحفہ دے دیا۔“ بیوی بولی۔

”اری نیک بخت اور پتہ کر لینا میں تو پہلے ہی بدنام ہوں اگر یہ معاملہ چوری چکاری کا ہوا تو جتھوڑی بہت رہ گئی ہے وہ بھی چلی جائے گی پھر تو جائے گی تمہارا اپنے کیلے دور میں کسی گمنام اسٹیشن پر بدلی کرالوں گا۔ اب اور بدنامی برداشت کرنا میرے بس کی بات نہیں۔“ بیوی ڈر

سادہ ہے میری ماں، ارے میں بچی ہوں کہ کچھ نہ جانو۔
مرزا کے حالات بدل گئے۔ مرزا نے سرکاری
نوکری چھوڑ دی اور بہت بڑی حویلی بنوائی بہت بڑا
کاروبار کر لیا۔ رشیدن اسی طرح رہی اس کی صحت اور
جوانی ایک مقام پر آ کر رک گئی تھی اس سے چھوٹی بہن اس
سے بڑی لگتی تھی۔ پیراہین محلے کی تمام لڑکیاں بال بچے دار
ہو گئی تھیں مگر رشیدن ویسی ہی تھی اس بات پر حیرت تو سب
کو تو مردوں کو حیرت اس بات پر تھی کہ آسیب تو عورت کو
برباد کر دیتا ہے یہ کیسا آسیب ہے کہ رشیدن پر ذرا اثر نہیں
ہے۔

مرزا نے مکان میں چلے اور پیراہین محلے کا پورا
مکان میرے پاس تھا وہ میرے پاس آتے رہتے تھے
انہوں نے صرف مجھے بتایا تھا کہ ان کے پاس دولت کہاں
سے آئی ہے میں کیا ان کا راز دار تھا۔ میں نے ان کے
راز کو کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ کہنے کو میں کرایہ دار تھا مگر اب
وہ مجھ سے کرایہ نہیں لیتے تھے۔ بھابی کو بھی پتہ تھا کہ میں
ان کے بارے میں اور رشیدن کے بارے میں سب کچھ
جانتا ہوں۔ ایک دن میں نے رشیدن کو کہا۔
”رشیدن وہ عورت کہیں آتی جاتی نہیں کیا؟“
”جاتی ہوگی میں تو دن میں گھر پر ہوتی ہوں۔“
رشیدن بولی۔

”وہ اتنی رحم دل عورت ہے تو میں اس سے تمہارے
متعلق کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“
”چچا میں موقع دیکھ کر اس سے پوچھوں گی کیونکہ وہ
بہت کم بات کرتی ہے کسی بھی ملازم سے بات نہیں کرتی اور
بہت کم ہنسی یا مسکراتی ہے صرف اپنے مرد کو دیکھ کر خوش
ہوتی ہے پھر بچوں کو پیار کرتی ہے اور ساتھ چلی جاتی ہے
حیرت کی بات یہ ہے کہ سات آٹھ سال گزر گئے ان
دونوں کے معذرات میں ذرا فرق نہیں آیا نہ دونوں کی
صحت پر اثر پڑا دونوں اسی طرح ہیں ذرا نہیں بدلے۔“
رشیدن نے بتایا۔
”جلدی نہیں ہے موقع ملے تو ذکر کر دینا ناراض تو

گئی مگر جواب نہ دیا اور اندر سے باہر جانے لگی۔ مرزا
بولے۔

”ارے کیا بالکل ہی باؤلی ہو گئی ہے یہ تھیلی میں
ڈال اور صندوق میں تالہ لگا کر رکھ اور سن کی کو ذرا ہوانہ
لگے۔ میں خود رشیدن سے پتہ کر لوں گا۔“
رشیدن کے کمرے سے باہر مرزا نے آواز دی تو
رشیدن کی وازائی ”اندر آ جاؤ اب۔“ اور مرزا اندر چلے گئے
اور پوچھا۔ ”میتا وہ تھیلی کیسی ہے دیکھ عزت کی بات ہے سچ
بتانا۔“

”ابا وہ مجھے اس عورت نے خود دی ہے چوری کی
نہیں ہے اور اس نے کہا ہے کہ اب ہر ماہ وہ ادا کرے
گی۔“

اب اس سے زیادہ وہ کیا پوچھتے باہر آ گئے۔ ان
کے باہر آتے ہی اماں اس کے کمرے میں پہنچ گئیں بولی۔
”بیٹی چھپانا کچھ نہیں جو سچ ہو بتانا تیرا باپ بہت پریشان
ہے۔“

”اماں میں نے ان کو بتا دیا ہے۔“ رشیدن بولی۔
”اچھا ایک بات اور بتا کوئی کچھ دیتا ہے تو لیتا بھی
ہے تیرے بدن پر تو کوئی ہاتھ نہیں رکھتا تو سمجھ رہی ہے
میری بات۔“ اماں بولیں۔

”خوب سمجھ رہی ہوں اماں، میں رات بھر جہاں
رہتی ہوں اس محل میں مرد تو کوئی ہوتا ہی نہیں اب تو چار
بچے ہیں دو بڑے ہیں اور دو چھوٹے ہیں میرے قریب
کوئی نہیں آتا میں جو کھانا چاہوں منگوا لیتی ہوں اس
عورت کا مرد آتا ہے اس محفل میں وہ صرف اپنی عورت کی
طرف دیکھتا ہے کسی اور طرف دیکھتا ہی نہیں اماں دونوں
میں کتنی محبت ہے کہ بیان نہیں کر سکتی۔“

کنواری لڑکی کے منہ سے لفظ محبت وہ بھی میاں
بیوی کی محبت کے بارے میں سن کر اماں کو ذرا غصہ آ یا وہ
بولیں۔ ”اے تجھے کیا پڑی ہے کہ ان دونوں کی محبت کے
چونچلے دیکھے تو دور ہا کر ہاں۔“

رشیدن ماں کی نادانی پر دل میں ہنسی کتنی

معافی مانگ لیتا۔“ میں نے کہا۔

زمین کے ٹکڑے پر بنایا جاتا تھا اور دریا کے کنارے ہوتا تھا اس سے قلعہ کے اندر آدمیوں اور فوج کو پانی ملتا تھا کچھ تو اتنے بڑے قلعے تھے کہ سال بھر کا راشن بھی پیدا کر لیا کرتے تھے ضروریات زندگی کی ہر چیز اندر موجود ہوتی تھی اگر دشمن چھ مہینے بھی اندر والوں کو محصور کر دے باہر نہ آنے دے تو بھی اندر والے کسی قسم کی پریشانی میں مبتلا نہیں ہوتے تھے۔

چتوڑ کا قلعہ بہت بڑا قلعہ ہے آدھے سے زیادہ گر چکا ہے سامنے کے رخ کی اوپنی دیواریں موجود ہیں لوگوں کے رہائشی گھر اور سرنگیں موجود ہیں مگر دریائی اس قدر زیادہ ہے کہ اس طرف کسی کے جانے کی ہمت نہیں ہوتی برج اور ٹوٹے محلات کے اندر دن میں بھی کوئی نہیں جانتا زیر زمین جو مکانات شاہوں نے بنائے تھے اور ان کے باہر جانے کے راستے بھی تھے ان درختوں کو اس وقت استعمال کیا جاتا تھا جب قلعہ کے اندر کے لوگ شکست سے دو چار ہو جاتے تھے ان زیر زمین راستوں کے ذریعہ بادشاہ نکل جاتا تھا اور دشمن کے ہاتھ نہیں آتا تھا ان راستوں کے بارے میں اس زمانے میں بھی کم لوگوں کو علم ہوتا تھا پھر یہ راستے سیدھے اور آسان بھی نہیں ہوتے تھے زمین کے اندر بھی بھول بھلیاں ہوتی تھیں یہ اس زمانے کی ٹینک تھی اور اس میں وہ بڑی بد تک کامیاب تھے زیر زمین بھٹک جانے والے باہر نہیں نکل پاتے تھے، حیرت تھی کہ ان سرنگوں میں پانی اور روشنی تھی اور اونچائی اتنی تھی کہ کھوڑے پر سوار ہو کر جایا جاتا تھا سرنگوں کے منہ پر بڑے بڑے کنویں تھے ان سے سفر کرنے والوں کو پانی اور ہوا ملتی تھی بظاہر یہ کنویں اور بادلیاں زمین کے اوپر سفر کرنے والوں کی ہولت کے لئے بنائے جاتے تھے مگر ان کا اصل فائدہ زیر زمین سفر کرنے والوں کو ملتا تھا بادلیوں کو کچھ اس طرح بنایا جاتا تھا کہ اوپر کی ہوا کنویں کے اندر جائے اور پھر سرنگ میں نکل جائے اس زمانے کے معمار نے بڑی حیرت انگیز تعمیرات کی ہیں حیرت یہ ہوتی ہے کہ وسائل نہ ہونے کے باوجود اتنی حیرت انگیز تعمیرات کس

وقت گزرتا رہا کان پور میں میرے بھی دو بچے ہو گئے۔ مرزا صاحب میری بہت مدد کیا کرتے تھے ان کا سلوک میرے ساتھ چموتے بھائی والا تھا میری بیوی بھی ان کے گھر جایا کرتی تھی اور بھائی اس کو پسند کرتی تھی۔ مرزا کا کوئی لڑکا نہیں ہوا تھا اور میرے دو لڑکے تھے مرزا ان کو بڑا پیار کرتا تھا۔

رشیدن کو میری بات یاد تھی اور موقع کی تلاش میں تھی ایک دن مالکن بہت خوش تھی خود سے بولی۔ ”تو خوش ہے یہاں پر کچھ ضرورت نہیں اگر ضرورت ہے تو بول۔“ رشیدن نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”میرا ایک بچا ہے وہ آپ کی رحم دلی کا بڑا قدر دان ہے وہ کچھ آپ سے میرے متعلق بات کرنا چاہتا ہے۔“ ”مجھ سے بات؟“ وہ حیرت سے بولی۔ ”ارے بے وقوف تو نہیں جانتی کہ میں کون ہوں اور یہ گھر کہاں پر ہے اگر تیرا بچا یہاں آنا چاہتا ہے تو زندگی بھر سفر کرے گا پھر بھی اس مقام پر نہیں آئے گا، اس کو کہنا یہ خیال دل سے نکال دے میرا مرد تو نے دیکھا ہے وہ اس علاقے کا راجہ ہے اس کے اشارے پر اس علاقے کے کئین اس کے لئے قربان ہو جاتے ہیں تو روز اتنی دور آ جاتی ہے اور چلی جاتی ہے اگر نہ جائے تو تجھے تلاش کرنے والے تلاش نہیں کر پائیں گے مگر میں تیری اور تیرے ماں باپ کی بدنامی نہیں چاہتی اس لئے تجھے تیرے گھر پہنچاتی ہوں۔“ رشیدن بولی۔ ”آپ کی رحم دلی کی وجہ سے بچا کو شوق ہوا تھا۔“

”یہ بالکل ناممکن بات ہے میں کسی مرد کے سامنے نہیں آتی یہ میرے راجہ کا حکم ہے میں اپنے راجہ کے حکم کے خلاف کچھ بھی نہیں کرتی۔“

☆.....☆.....☆

یوں تو ہندوستان میں سینکڑوں قلعے ہیں جو بادشاہ حکومت پر آیا اس نے قلعہ ہوایا اس زمانے میں بادشاہت کو قائم رکھنے کے لئے قلعہ ضروری تھا۔ قلعہ بہت بڑے

طرح ممکن ہوئیں ہر قلعہ میں کچھ نہ کچھ خوبی رکھی گئی تھی۔ آزاد کر دیا اور یہ سمجھ لیا کہ بس اب رشیدن کی اور کوئی ضرورت نہیں رہی۔

رشیدن کے ماں باپ دونوں اس کی وجہ سے پریشان تھے اس کی صحت اور جوانی کو دیکھ کر کڑھتے تھے رشیدن کی صحت کو جو دیکھتا دیکھتا ہی رہتا وہ ایک تناور درخت تھی مگر پھل پھول سے محروم۔

کان پور کے بہت اچھے گھرانوں سے مرزا کے دوستانہ تعلقات تھے ان میں سلام خان اور ان کی بیوی زمرگس بیگم بھی تھیں۔

زمرگس بیگم نے رشیدن کو دیکھا تو وہ ان کی نگاہوں میں بس گئی۔ ”ہائے اللہ اتنی اچھی لڑکی موجود ہے اور میں دلدار میاں کے لئے لڑکی تلاش کرتی پھر رہی ہوں کتنی خوب صورت جوڑی ہے میرا دلدار بھی لمبا تر نکاح صحت میں کچھ کم نہیں ہائے دلدار کے ابا مجھے ایسا لگتا ہے کہ اللہ نے رشیدن کی شادی دلدار سے لکھ دی ہے بس تم بات چلاؤ۔“ سلام خان بولے۔ ”بیگم ہر بات میں ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی کوشش کرتی ہو تم رشیدن کے بارے میں کچھ نہیں جانتی؟“

”اتنی اچھی لڑکی ہے کیا خرابی ہے اس میں؟“ زمرگس بیگم بولیں۔

”بہت بڑی خرابی ہے سونگی تو کان پکڑ لوگی۔“ سلام بولے۔

”ارے بتاؤ تو پتہ چلے گا۔“ بیگم بولیں۔

”رشیدن پر آسب ہے وہ روز رات کو اس کے ساتھ چلی جاتی ہے کہاں جاتی ہے کسی کو پتہ نہیں ہے اور کب واپس آتی ہے کوئی نہیں دیکھتا۔“ سلام بولے۔

”ہیں کیا؟ واقعی۔“ وہ حیرت سے بولیں۔

”ہاں ایسا ہی ہے اور یہ سلسلہ سات آٹھ سال سے جاری ہے۔“ سلام بولے۔

”مجھے تو یقین نہیں آتا۔“ زمرگس بولیں۔

”کیوں، نہ یقین کرنے کی وجہ ارے اس کی ماں کو پتہ ہے پورے محلے کو پتہ ہے۔“

چتوڑ کا قلعہ گو کہ بہت گر گیا تھا مگر پھر بھی بہت باقی تھا اس ویران قلعہ میں جو آبادی تھی وہ قوم جنات کی تھی اور ایک پورا قبیلہ آباد تھا۔ مگر اس طرح آباد تھا کہ کسی انسان کو ان کے ہونے کا احساس نہیں تھا اس قبیلے کے قانون اور قاعدے سخت تھے وہ کسی انسان کو پریشان نہیں کرتے تھے اور بہت دفعہ تو خود راستہ چھوڑ دیا کرتے تھے۔ ان کا سردار جالوش تھا یہ قبیلہ جنگلات سے نقل مکانی کر کے آیا تھا جالوش سے پہلے اس کا باپ سردار تھا اس کے بعد جالوش سردار ہوا جالوش بھی اس قلعہ میں رہتا تھا اس کی رہائش زیر زمین تھی تمام سرنگوں اور زیر زمین راستوں پر اس کی قوم آباد تھی زیادہ آبادی رہن کے اندر تھی وہ آنے جانے کو پرانی باؤلیوں اور کنویں استعمال کرتے تھے۔

جالوش ایک رحم دل اور اصولی راجہ تھا کسی سے لڑائی جھگڑا کرنا پسند نہیں کرتا تھا مگر اس کا مطلب یہ نہ تھا وہ کمزور تھا یا ڈرتا تھا اس کا قبیلہ بہت بڑا تھا اس کے بعد وہ دلی اور آگرہ کے محلات اور قلعہ میں ایک بھاری آبادی جنات کی تھی اور ان آبادیوں میں جالوش کی عزت تھی جالوش ان سب سے ملاقات کرتا رہتا تھا اس کے تعلقات ان سب سے اچھے تھے۔

جالوش خود بہت بہادر اور طاقتور جن تھا۔ وہ اپنی بیوی کو بہت چاہتا تھا وہ تھی بھی بڑی حسین اس لئے اس وہ اس کا دیوانہ تھا۔ اس کی فرمائش پر ہی رشیدن کو لے کر آیا مگر اس نے کبھی رشیدن پر بری نظر نہیں ڈالی تھی اور کسی کی مجال نہ تھی کہ رشیدن پر کوئی بری نظر ڈالے رشیدن آج بھی ویسی ہی تھی جیسی آئی تھی۔ اس کو ایک بھروسے کی عورت کی ضرورت تھی جو کہ اس کے بچوں کی دیکھ بھال کرے رات میں ان کی ضرورت پوری کرے اگر رشیدن کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ رات کو نہیں رہ سکتی اور جالوش کو پھر کسی عورت کی تلاش ہوگی۔ جالوش رحم دل تو تھا مگر انسان کے فطری تقاضوں اور انسانی خواہشات کو نہیں جانتا تھا اس نے رشیدن کے خاندان کو معاشی پریشانیوں سے

”دیکھو دلدار کے ابا میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ رشیدن اب تک کنواری ہے شادی شدہ عورت اور کنواری میں جو فرق ہوتا ہے اس کو ہر سمجھدار عورت جانتی ہے۔ نہ گس بولیں۔

”نیگم اس معاملے میں تم مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہو تم نے جو کہا اس کو میں جھٹلا نہیں سکتا میں اس سلسلے میں مرزا سے بات کروں گا۔“

نیگم کی بات نے سلام کو تلابلی میں گرفتار کر دیا تھا اب ان کو چین کہاں دوسرے ہی روز مرزا کے پاس پہنچ گئے۔ مرزا بولے۔ ”آؤ ابھی سلام میاں خیریت تو ہے۔“

”ہاں سب ٹھیک ہے تم ٹھیک ہو۔“ سلام نے پوچھا۔

”ارے بھائی اب میری زیادہ مصروفیت نہیں ہے اگر موڈ ہوا تو پیراہن محلے چلا جاتا ہوں اظہر کے پاس۔“

”ہماری طرف بھی آ جایا کرو۔“ سلام میاں بولے۔

”آئیں گے ضرور آئیں گے۔“ مرزا بولے۔

”مرزا صاحب ایک بات بتائیں آپ کے پاس ماشاء اللہ، اللہ کا دیا سب کچھ ہے مگر آپ نے اب تک رشیدن کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔“

مرزا صاحب یہ سن کر اداس ہو گئے آواز بھاری ہو گئی وہ بڑی مشکل سے بولے۔

”بھائی سلام میں نے اور بیوی نے جتنا رشیدن کے بارے میں سوچا ہے اتنا تو ہم نے اپنے بارے میں بھی نہیں سوچا ہو گا تم شاید رشیدن کے بارے میں نہیں جانتے ہو۔“ مرزا بولے۔

”مجھے زیادہ نہیں کچھ کچھ پتہ ہے میری نیگم نے بتایا تھا۔ مگر میں اس پر یقین نہیں کرتا۔“ سلام بولے۔

”تمہارے یقین نہ کرنے سے حقیقت تو بدل نہیں سکتی۔“ مرزا بولے۔

”جنات اگر کسی عورت پر عاشق ہو جاتے ہیں تو سمجھ لو وہ عورت چند دن کی ہے میں نے تو یہی سنا ہے تم

نے بھی سنا ہو گا۔“ سلام نے کہا۔

”مگر معاملہ یہاں پر دوسرا ہے۔“ مرزا نے بتایا۔

”بتاؤ تو کیا معاملہ ہے؟“ سلام بولے۔

”رشیدن آٹھ سال پہلے جیسی تھی آج بھی ویسی ہی ہے اس کو کسی مرد نے ابھی تک ہاتھ بھی نہیں لگایا اور یہ کسی عورت کے پاس جاتی ہے جو کہ اس پر بڑی مہربان ہے اس کی ضرورت کا خیال رکھتی ہے رشیدن اس کے بچوں کا رات میں خیال رکھتی ہے اس کا مرد اپنے قبیلے کا سردار ہے اور نہایت شریف ہے اس نے اب تک رشیدن کو بھرپور نظر سے دیکھا بھی نہیں ہے اس کی شاید ایک وجہ یہ ہے کہ اس کی بیوی بہت خوبصورت ہے وہ زنانے میں صرف رات کو آتا ہے اور اس کی بیوی بچے رشیدن کے حوالے کر کے اس کے ساتھ چلی جاتی ہے سویرے رشیدن واپس آ جاتی ہے۔“ پوری بات مرزا نے ایک سانس میں بیان کر دی۔

”بات تو حیرت کی ہے مگر یقین اس لئے کرنا پڑے گا کہ ہمارے سامنے رشیدن موجود ہے۔“ سلام بولے۔

”بہت لوگ شک شبہ میں پڑتے ہیں میں اس کے لئے کیا کہہ سکتا ہوں۔“ مرزا نے کہا۔

”تم نے کہیں رشیدن کی بات چلائی اور نہیں چلائی تو تو میرے بیٹے دلدار کے بارے میں غور کرنا اس کے چال چلن کے بارے میں اطمینان کرلو۔“ سلام بولے۔

”ارے میاں ہزار دو ہزار میں ایک ہے دلدار اور تم جو موجود ہو غور کیا کرتا ہے۔“

”تو پھر اپنی نیگم سے بات کرو خدا کی قسم بڑی شاعرانہ جوڑی ہے۔“ سلام بولے۔

”ہاں کروں گا میری طرف سے تو تم ہاں سمجھ لو۔“ مرزا بولے۔

سلام کے جانے کے بعد مرزا نیگم کے پاس لپکتے ہوئے پہنچے۔

نیگم بولیں۔ ”اے ہے کیا آفت آئی ہے کہ بد حواس ہونے جا رہے ہو۔“

”نیگم بات یہ ہے کہ رشیدن کے لئے ایک بہت

”بہت خطرے والا کام ہے تم کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔“ مرزا بولے۔

”کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔“ انظہر نے کہا۔

”تم نے مولوی کا حشر تو دیکھ لیا ہے پھر بھی یہ کرو گے۔“ مرزا بولے۔

”مرزا صاحب اس آسب سے کسی نہ کسی طرح رابطہ تو کرنا ہوگا ان کورشدین کی زندگی کے بارے میں بتانا تو ہوگا وہ رحم دل ہیں جیسے کہ سنا ہے تو ضرور ہماری بات پر غور کریں گے شاید کوئی بہتر صورت نکل آئے۔“ انظہر نے کہا۔

اور رات کو انظہر مرزا کے پاس رک گئے اور بڑے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ رات گیارہ بجے ہر طرف سناٹا چھا گیا تو دروازہ خود بخود کھل گیا اور رشیدین دروازے پر آ گئی۔ انظہر اس کے پاس گئے اور بولے۔ ”رشدین اندر جاؤ۔“ مگر وہ کھڑی رہی انظہر نے اس کا ہاتھ پکڑا مگر زیادہ دیر نہ پکڑ سکے ایک لمحے کے بعد ان کے گال پر ایک زناٹے کا ٹھٹھیر پڑا اور وہ چکر اکر زمین پر گر گئے اور رشیدین چند قدم آگے بڑھی اور اندھیرے میں گم ہو گئی انظہر گال سہلاتے اندر آ گئے اور مرزا کو پوری روداد سنائی کسی نے ایک لفظ نہیں کہا۔ ”میں نے کسی کی آواز نہیں سنی نہ کسی گاڑی کی آواز انی کوئی بات کرتا تو میں اس سے کچھ پوچھتا مگر کی درخواست کرتا۔“

رات گزر گئی اور رشیدین واپس آ گئی اور مرزا سے بولی۔

”ابارات کو بچانے کیا حرکت کر دی بیگم صاحبہ نے کہا ہے کہ آئندہ کوئی ایسا نہ کرے اگر کرے گا تو جان کا نقصان ہو سکتا ہے ہم سے شکایت نہ کرنا۔“

مرزا بولے۔ ”بیٹا انظہر تمہاری ہمدردی میں مار کھا بیٹھا ہے اب نہیں کچھ کرے گا کہہ دینا۔“

انظہر اور مرزا پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ انظہر بولے۔ ”میں نے ایک آدمی کا پتہ چلایا ہے بانس بریلی میں رہتا ہے ہندو ہے مگر بڑا کارنگر ہے بڑے

اچھا رشتہ آیا ہے بہت دن کے بعد میں نے تو ہاں کر دی ہے۔“

”تم سنو گی تو تم بھی منع نہیں کرو گی۔“ مرزا بولے۔

”ارے میں نے تو کبھی منع نہیں کیا ہے مگر کیا کروں مجبور ہوں۔“ بیگم بولیں۔

”سلام میاں کے بیٹے دلدار کے بارے میں کیا خیال ہے۔“ مرزا بولے۔

”بہت اچھا ہے مگر تم آگے بات نہ چلاؤ کہیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔“ بیگم بولیں۔

”شرمندہ کیوں؟“ مرزا بولے۔

”اس عورت کا حکم ہے کہ رشیدین شادی نہیں کرے گی۔“ بیگم نے کہا۔

”میں خوشی میں بھول گیا تھا۔“ مرزا ادا سی سے بولے۔ کچھ دیر نہایت کبیر خاموشی رہی پھر مرزا بولے۔

”اچھا ہے کرلو مشورہ۔“ بیگم آہستہ سے بولیں۔

مرزا تھکے تھکے قدموں سے گھر کر باہر آ گئے اور تانگہ پکڑ کر انظہر کی طرف چل دیے۔ انظہر پوری بات سن کر بولے۔

”میں نے تو اس آسب سے ملاقات کرنا چاہی تھی آپ کو پتہ نہیں ہے مگر اس عورت نے کہا کہ وہ کسی سے ملاقات نہیں کرتی اور بات ادھوری رہ گئی۔“ انظہر نے کہا۔

”جو ہوا اس کو بھول جاؤ اب آگے کی سوچو۔“ مرزا بولے۔

”ایک طریقہ اور ہے، ہے تو خطرناک مگر خطرہ تو لینا ہوگا ڈرتے رہیں گے تو کبھی رشیدین کی شادی نہیں ہوگی۔“ انظہر نے کہا۔

”وہ طریقہ کیا ہے؟“ مرزا نے پوچھا۔

”رات کو روز ہی رشیدین جاتی ہے کس سواری پر جاتی ہے کسی نے وہ سواری نہیں دیکھی دروازے کے باہر آتے ہی وہ غائب ہو جاتی ہے اور اسی طرح واپس آ جاتی ہے اس کے جانے کے راستہ پر میں کھڑا ہو جاؤں کوئی تو اس کو لینے آتا ہوگا اس سے بات کروں۔“ انظہر بولا۔

بڑے آسیب کو قبا کو کر لیتا ہے میں اس کے پاس جا رہا ہوں
مرزا کیا کہتے ہو۔“

اظہر بانس بریلی چلا گیا۔ چپاوتی محلے میں ایک
بہت پرانے گھر میں پنڈت دل سکھ رہتے تھے۔ شکل سے
خود بھی کسی آسیب سے کم نہ تھے جسم نہایت لاغر مگر آواز
میں گھم گرج موجود تھی۔

بولے۔ ”میں جانتا ہوں تو کان پور سے آیا ہے اور
تیرے گال پر جو نشان ہے وہ مجھے پوری کہانی سنارہا ہے
اب کے اگر تو اس کے سامنے گیا تو اٹالٹک جائے گا سن
رکھ۔“

اظہر اس کی بات سن کر بہت متاثر ہوئے۔ بولے۔
”تو پنڈت جی پھر آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کیوں آیا
ہوں؟“

”سب سمجھ گئے ہیں مگر معاملہ بہت بڑا ہے بہت
مشکل کام ہے۔“ پنڈت بولے۔

”پنڈت جی کام کرنا تو ہے لڑکی کی زندگی کا معاملہ
آن پڑا ہے۔“ اظہر بولے۔

”تم جانو اس معاملے کو سنبھالنا آسان نہیں ہے بڑا
جو کسم ہے اور خرچ بھی ہے۔“ پنڈت نے کہا۔

”خرچ کی آپ فکر نہ کریں اور رہی جو کسم تو آپ
جیسے لوگ ہاتھ اٹھالیں گے تو کون کام کرے گا۔“ اظہر
بولے۔

”اچھا تو تو ایسا کر ایک ہزار روپے دے جا اور جا
میں تیاری کر کے کان پور آ جاؤں گا پتہ بتا جا کر یاد رکھ
میرے آنے میں ایک مہینہ بھی لگ سکتا ہے چنانچہ کرنا میں
آؤں گا بھروسہ ہے تو بول۔ نہیں تو تیرا راستہ کھلا پڑا ہے۔“

اظہر روپے لائے تھے ایک ہزار روپے انہوں نے
پنڈت کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور بولے۔ ”پنڈت کی جان
چھوٹ گئی تو آپ کو نہال کر دوں گا۔“

یہ بات صرف اظہر اور مرزا کو پتہ تھی دونوں خاموشی
سے پنڈت کا انتظار کرنے لگے۔

چوبیس دن کے بعد اچانک پنڈت آ گیا بولا۔

”رات کو کنیا روز جاتی ہے مجھے پتہ ہے جو لینے آتا ہے
آنے دے واپس نہیں جائے گا۔“

اور پنڈت آنس جا کر دروازے پر بیٹھ گیا رات
ٹھیک وقت پر دروازہ کھل گیا اور رشیدن دروازے پر آ گئی
مگر دروازے کے درمیان پنڈت موجود تھا اور اس نے
ایک لکیر بنا کر رشیدن کے باہر آنے کا راستہ بند کر دیا تھا
اور خود بھی اس لکیر کے اندر تھا رشیدن لکیر کے پاس آ کر
رک گئی آگے نہیں گئی۔ پنڈت آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہا
تھا رشیدن نے پھر کوشش کی مگر لکیر کے دوسری طرف نہ
جا سکی پنڈت نے آنکھیں کھول کر لکیر کے پاس دیکھا اور
گرج کر بولا۔

”چلا جا اب یہ کیا نہیں جائے گی نہیں جائے گا تو
بھسم کر دوں گا۔“ مگر آنے والے نے جواب نہیں دیا۔

پنڈت پھر گرج پڑا۔ اور کچھ پڑھ کر اس کی طرف ہاتھ
جھٹک دیئے اس کے ہاتھ جھٹکتے ہی ایک روشنی کا جھماکا ہوا
اور نہایت دردناک چیخ رات کے سناٹے میں ابھری اور
رشیدن بہت تیزی سے واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔
پنڈت نے مسکرا کر آسمان کی طرف دیکھا اور سویرے تک
دروازے پر بیٹھا رہا دن کی روشنی ہوئی تو وہ لکیر صاف
کر کے اندر آ گیا اور مرزا کو بولا۔

”ابھی تیرا آسیب تو ختم ہوا وہ رات آیا تھا میں
نے اس کو جلا کر ختم کر دیا۔ اب نہیں آئے گا۔“

مرزا بولے۔ ”کیا رات کو رشیدن نہیں گئی؟“

”ارے جاتی کیسے ہم نے اس کے سامنے دیوار
کھڑی کر دی تھی اور وہ دیوار کے اس ہاتھ ہم نے کہا چلا
جا اب کنیا نہیں جائے گی وہ نہ گیا اور پھر مارا گیا۔“ پنڈت
بولا۔

”یہ تم نے اچھا نہیں کیا پنڈت جی۔“ مرزا ڈر کر
بولا۔

”ارے اب ڈرنے کی کیا بات ہے وہ تو مارا گیا۔“
پنڈت بولا۔

”ارے پنڈت جی جو مارا گیا وہ تو صرف لینے آتا

تھا اس کا اصل مالک تو کوئی اور ہے۔“

”ارے تو ہوا کیا وہ آوے گا تو وہ بھی مارا جاوے گا۔“ پنڈت بولا۔

آٹھ سال میں پہلی دفعہ ہوا کہ رشیدن اپنے گھر رہی اور جانہ سکی۔

جالوش بیوی کے پاس آیا تو وہ بولی۔ ”آج رشیدن نہیں آئی۔“

”نہیں آئی اس کو لینے تو ملازم گیا تھا۔“ جالوش بولا۔

”گیا تھا مگر وہ بھی واپس نہیں آیا ضرور اس پر کوئی آفت آئی ہے۔“ عورت بولی۔

”وہ اتنا کمزور تو نہ تھا کہ مار کھا جائے۔“ جالوش نے کہا۔

”تم نے ان کے ہاتھ پیر باندھ دیئے ہیں وہ کسی سے لڑ نہیں سکتے آدم زاد جو دل کرے کرتا رہے ہمارے آدمی ان سے دور رہیں ذرا تم ان کو آزادی دو کہ وہ کچھ کریں۔“ عورت بولی۔

”اچھا تم ناراض نہ ہو میں پتہ کرتا ہوں ملازم کا کیا ہوا اور دوسرا ملازم مقرر کرتا ہوں اور اس کے ہاتھ پیر بھی کھول دوں گا اب تو خوش ہو۔“ جالوش نے کہا۔

جالوش دوسری رات خود ملازم کے ساتھ آیا اس نے دیکھا کہ دروازے پر ایک شخص بیٹھا ہے اور اس نے اپنے چاروں طرف لکیر بٹائی ہوئی ہے جالوش سمجھ گیا کہ یہ ضرور کوئی عمل کر رہا ہے اس نے اس کے عمل کو توڑنے کو اس لکیر پر دریا کا پانی ڈال دیا۔ پنڈت نے آنکھیں کھول دیں دوسرا اور جالوش نے یہ کیا کہ سمندر کا تازہ پانی پنڈت پر بہا دیا۔ اب پنڈت کا حصار ٹوٹ گیا اور کنڈل بیکار ہو گیا دوبارہ کنڈل قائم کرنے کا وقت جالوش نے نہیں دیا اور پنڈت کو زمین سے اوپر اٹھالیا اور بہت تیزی سے لے جا کر دریائے جننامی ڈال دیا اور پنڈت اپنی پوری ودیا کے ساتھ دریا میں ڈوب گیا اور رشیدن دوسرے ملازم کے ساتھ جالوش کی بیگم کے پاس آ گئی۔ رشیدن کو کسی نے

کچھ نہیں کہا اور وہ حسب معمول اپنا کام کرنے لگی۔

پنڈت کی لاش دریا سے نکل آئی مرزا بولے۔ ”مارا گیا پنڈت میں نے تو کہا تھا کہ تو نے برا کیا ہے مگر ایک کامیابی کے بعد اس کا دماغ آسان پر پہنچ گیا تھا۔“

”آپ نے دریت کہا مرزا صاحب یہ کوئی معمولی جن نہیں ہے اس سے جان چھڑانا بہت مشکل ہے۔“ اظہر بولے۔

”وہ تو اچھا ہے کہ تمہارا نام درمیان میں نہیں آیا۔“ مرزا بولے۔

”اب جو کرنا ہے بہت سوچ کچھ کر کرنا ہے۔“ اظہر نے کہا۔

”ارے بھائی کچھ نہ کرو کیوں اپنی زندگی کے پیچھے پڑے ہو اب بچے دار ہوا ان کا خیال کرو۔“ مرزا بولے۔

”ان ہی کا تو خیال ہے کہ اب تک کچھ نہیں کر سکا ہوں۔“ اظہر نے کہا۔

”اچھا تم کچھ دن آرام کرو پھر سوچیں گے۔“ مرزا بولے۔

”ارے مرزا آرام اپنے نصیب میں کہاں دلی سے بلاؤ آ گیا ہے کچھ سرکاری کام ہے۔“ اظہر بولے۔

”ارے تو کب جا رہے ہو دلی۔“ مرزا بولے۔

”کل جاؤں گا۔ صبح دلی سے۔“ اظہر بولے۔

”اور واپسی کب ہوگی کچھ پتہ ہے؟“ مرزا نے پوچھا۔

”اس کے بارے میں کہنا مشکل ہے۔“ اظہر نے جواب دیا۔

دلی میں اظہر کا قیام اس کے ایک دور کے رشتہ دار کے گھر تھا۔ سرکاری کام تو ایک ہفتہ میں ختم ہو گیا تھا مگر وہ بہت عرصہ کے بعد دلی آیا تھا اس نے سوچا دو چار دن دلی کی سیر کر لی جائے رشید خان نے بھی زور دیا۔ بولے۔

”ارے میاں روز روز تم کہاں آتے ہو سیر کر لو میں تم کو دلی کی سیر کراؤں گا۔“

”میں تو خود رکنا چاہتا ہوں مگر مجھے کان پور کی فکر

اس لئے ہے کہ میرے ایک عزیز ہیں وہ بڑے پریشان ہیں ان کو اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا۔“

”کیا پریشانی ہے بتاؤ تو شاید میں کچھ مدد کر سکوں۔“ رشید بولے۔

”ان کی لڑکی پر ایک آیب ہے اور تقریباً دس سال سے ہے پریشان تو نہیں کرتا بلکہ ان کی مدد ہی کرتا ہے مگر لڑکی کی عمر بڑھ رہی ہے وہ اس کو شادی کی اجازت نہیں دیتا۔“

”دس سال سے اس پر ہے اور لڑکی زندہ ہے۔“ رشید حیرت سے بولے۔

”معاملہ عجیب و غریب نوعیت کا ہے رشید بھائی۔“ اظہر نے کہا۔

”میں سمجھا نہیں تفصیل بتاؤ تو پتہ چلے۔“ رشید نے پوچھا۔

”لڑکی اب تک پاک صاف ہے اس کو کسی نے اب تک ہاتھ تک نہیں لگایا ہے لڑکی رات کو جاتی ہے اور اس کے بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے اور سویرے اس کو پہنچا دیا جاتا ہے پتہ نہیں کہاں جاتی ہے لڑکی کا کہنا ہے کہ وہ ایک بڑے اور حسین محل میں جاتی ہے وہاں پر ایک عورت ہے جو کہ بہت حسین اور خوب صورت ہے پہلے اس کے دو بچے تھے اب چار ہیں لڑکی ان بچوں کے پاس رہتی ہے۔

بچے اس سے مانوس ہو گئے ہیں یوں سمجھ لو کہ لڑکی کو زبردستی ملازمہ بنایا ہوا ہے ایک دو دفعہ اس سے جان چھڑانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔“ اظہر نے بتایا۔

”یار معاملہ بڑا پر اسرار اور خطرناک نظر آتا ہے۔“ رشید بولے۔

”اب تم بتاؤ کوئی طریقہ کار ہو سکتا ہے۔“ اظہر بولے۔

”دلی میں ایک حکیم ہیں ان کی بڑی شہرت ہے اس معاملے میں۔“ رشید بولے۔

”اماں حکیم بے چارہ کیا کرے گا یہ تو معاملہ ہی اور ہے۔“ اظہر نے کہا۔

”وہ حکیم ہونے کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے تم ان سے ملاقات کر لو۔“ رشید نے کہا۔

”ملاقات کرنے کو میں تیار ہوں چلو رات کو چلتے ہیں۔“

”معاملہ حکیم صاحب کچھ عجیب نوعیت کا ہے۔“ اظہر نے حکیم وقار کو بتایا۔

”میاں تم بیان کرو پھر اس پر غور کریں گے۔“ حکیم صاحب بولے۔

اور اظہر نے پوری تفصیل حکیم صاحب کے گوش گزار کر دی۔

”واقعی یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار گمبیر ہے مگر خیر ایسا زیادہ مشکل نظر تو نہیں آتا میرے ساتھی حکیم کامل یہ کام کرتے ہیں وہ کل تک آ جائیں گے آپ کو کل پھر آنا ہوگا اور ان کو تفصیل بتانا ہوگی کیونکہ وہی یہ کام کرتے ہیں۔“ حکیم وقار بولے۔

آپ کل رات تشریف لے آئیں، حکیم وقار نے اس رات رولو کا سے رابطہ کیا، رولو کا وقفاً وقفاً حکیم وقار کا کام کر کے مصر میں اتنوی کے مشن کے لئے چلا جاتا تھا، حکیم وقار کے رابطہ کرنے پر رولو کا نے دوسرے دن رات میں آنے کا وعدہ کر لیا۔

دوسرے دن اظہر پھر حکیم وقار کے مطب میں موجود تھے۔ حکیم کامل یعنی رولو کا نے پوری تفصیل سننے کے بعد کہا۔ ”معاملہ بڑا آسان اور سادہ نظر آتا ہے۔ مگر شاید ایسا نہ ہو، کان پور کا پتہ بتادیں، میں خود آپ کے پاس آؤں گا۔“

”میرے عزیز مرزا صاحب کی یہ لڑکی ہے میں ان سے دور رہتا ہوں میرا مطلب ہے میرا مکان ذرا دور ہے۔ آپ کو مرزا صاحب کے پاس آنا ہوگا اور وہیں پر قیام کرنا ہوگا۔“ اظہر بولے۔

”ٹھیک ہے آپ جاؤں گا آپ مرزا صاحب کو میرے بارے میں اطلاع کر دیجئے گا۔“

اظہر اور رشید واپس آ گئے۔ اظہر بولے۔

”بڑی سرسری انداز میں حکیم صاحب نے بات لی ہے، میرا تو خیال ہے شاید ہی آئیں۔“ اظہر نے کہا۔

”تمہارا خیال درست نہیں ہے، یہ جس سے وعدہ کرتے ہیں اس کے پاس ضرور جاتے ہیں اور اس کا کام بھی کرتے ہیں۔“ رشید نے بتایا۔

”چلو تم کہتے ہو تو مانے لیتا ہوں مگر مجھے بھروسہ نہیں۔“ اظہر نے جواب دیا۔

اظہر واپس کان پورا آ گئے اور مرزا صاحب کے پاس گئے تو ان کو پتہ چلا کہ حالات وہی ہیں۔ پھر وہ بولے۔

”میں دلی میں ایک بہت مشہور حکیم صاحب سے ملا تھا ان سے میں نے رشید کے حالات بتائے تو وہ بولے میں خود آؤں گا۔ خیال رکھنا شاید آجی جائیں۔“

”ارے بھئی یہ معاملہ کسی اور نوعیت کا ہے اور تم مشورہ حکیم سے کر رہے ہو میری تو سمجھ میں تمہاری بات نہیں آئی مارو گھنٹہ پھوٹے آنکھ یہ تو وہی بات ہوئی۔“

مرزا نے کہا۔

”مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا مگر یہ سب کام کرتے ہیں ان کا نام حکیم کامل ہے۔“ اظہر بولے۔

”چلو تمہیک ہے اندھا کیا چاہے دو آنکھیں آنے دو۔“ مرزا بولے۔

مگر خلاف توقع رولوکا دو روز کے بعد مرزا کے سامنے تھا۔ مرزا اس کو دیکھ کر خوش ہوئے اور بولے۔

”حکیم صاحب میری امید کے خلاف آپ آئے ہیں مجھے امید نہ تھی آپ کے آنے کی۔“

”میاں وعدہ اگر کر لیا تو جانا بھی فرض ہو گیا۔ آپ میری ملاقات لڑکی سے کروائیں آپ بھی ساتھ رہیں۔

کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ رولوکا نے کہا۔

”آئیے میرے ساتھ رشید ان اپنے کمرے میں ہے۔“

رشید نے باپ کے ساتھ ایک انجمنی کو دیکھا تو ذرا حیران ہوئی مگر بولی نہیں۔

مرزا نے کہا۔ ”بھئی یہ حکیم صاحب ہیں دلی سے آئے ہیں یہ تم سے کچھ بات کریں گے جو پوچھیں ان کو سچ بتانا کیونکہ یہ دلی سے صرف تمہارے علاج کو آئے ہیں۔“

”مگر ابو میں تو تندرست ہوں مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔“ رشید بولی۔

مرزا بولے۔ ”بیماری تم سمجھ نہیں رہی ہو۔“

رولوکا نے مداخلت کی اور بولا۔ ”انسان کے لئے ہزاروں بیماریاں ہیں کچھ جسمانی کچھ روحانی اور کچھ ایسی

کہ انسان چاہتا ہے مگر اس بیماری سے جان نہیں چھڑا پاتا میں جانتا ہوں کہ تم اس بیماری میں مبتلا ہو اللہ نے ہر بیماری کا علاج بھی رکھا ہے میں جو پوچھتا ہوں ان سوالات کا

جواب یاد کر کے غور کر کے دو، میں تمہارے لئے جو کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔“

”تم یہ بتاؤ کہ تم روز رات کو خود جاتی ہو۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”نہیں مجھے تو آج تک پتہ نہیں چلا کہ میں چند منٹ میں کس طرح اس محل میں پہنچ جاتی ہوں۔“ وہ بولی۔

”کسی سواری پر جاتی ہو۔“ رولوکا بولا۔

”میں دروازے تک تو خود آتی ہوں اس کے بعد میری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور میں محل میں پہنچ جاتی ہوں۔“ وہ پھر بولی۔

”تمہارے ساتھ محل میں مکینوں کو برتاؤ کیا ہے۔“ رولوکا بولا۔

”بہت اچھا ہے اس عورت نے مجھے کبھی کچھ نہیں کہا اور اس کا مرد تو اتنا شریف ہے کہ اس نے میری طرف کبھی

دیکھا بھی نہیں اس محل میں اس مرد کے علاوہ کوئی مرد نہیں آتا عورت سخت پردے میں رہتی ہے ان کا مجھے پتہ نہیں

رات میں تو محل میں صرف نوکرانیاں رہتی ہیں اور بچے ہوتے ہیں میں بچوں کے پاس رہتی ہوں بچوں کی غذا تیار

رکھی رہتی ہے میں صرف ان کو بٹھا کر کھلا دیتی ہوں اور وہ سو جاتے ہیں میں بھی سو جاتی ہوں بہت آسان سا کام

ہے سویرے میرے لئے نہایت عمدہ ناشتہ ایک نوکرانی لے آئی ہے اور میں گھر آ جاتی ہوں۔“
”تمہیں کبھی کسی نے جسمانی یا ذہنی اذیت پہنچانے کی کوشش کی ہے۔“ رولوکا بولا۔

”نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا عورت کا صرف یہ کہنا ہے کہ تو شادی نہ کرنا کرے گی تو تیرا مرد مر جائے گا تو میرے بچوں کی دیکھ بھال کر اور جو تجھے ضرورت ہے بتا میں تجھے دوں گی۔“ رشیدن بولی۔

”اور مرد کیا کہتا ہے۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”اس نے آج تک مجھ سے بات ہی نہیں وہ آتا ہے اور بیوی کو لے کر چلا جاتا ہے کہاں جاتا ہے مجھے یہ بھی نہیں پتہ ہے۔“ رشیدن بولی۔

”تم نے کبھی کوئی فرمائش کی عورت ہے۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”مجھے کبھی اس کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ ہر ماہ وہ اتنا دیتی ہے کہ ہم سب کے لئے بہت ہوتا ہے۔“ رشیدن بولی۔

”اب تم میرے آخری سوال کا جواب دو تمہارے ماں باپ تمہاری شادی کر کے تمہیں آباد کرنا چاہتے ہیں اگر تمہاری اس ملازمت سے جان چھڑادی جائے تو تم خوش ہوگی۔“ رولوکا بولا۔

”میں اپنی مرضی سے تو نہیں جاتی یں کب تک ان کی غلامی کروں گی۔“ رشیدن بولی۔

”ٹھیک ہے بیٹی میں کوشش کروں گا میری اور تمہاری جو بات ہوئی ہے وہ کسی کو نہ بتانا۔“

رولوکا کے لئے اپنی نوعیت کا نرالا کیس تھا یہ تو رولوکا سمجھ چکا تھا کہ کوئی جنات کا گروہ ہے اس کے سردار نے رشیدن کو بچوں کی ملازمت بنایا ہوا ہے مگر وہ شریف بھی ہے اس کی بیوی بھی ٹھیک ہے، رشیدن پر صرف ملازمت کی سختی ہے اور ہر معاملے میں وہ آزاد ہے اس کے گھر پر بھی کسی قسم کا پہرہ نہیں ہے دن میں وہ جو چاہے کرے مگر شادی پر پابندی ہے۔

ایسے مہربان کے خلاف کچھ کرنا رولوکا کے لئے بہت مشکل تھا اس نے ذہن میں ایک طریقہ وضع کیا اور رات کو روپوشی کی حالت میں دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا، ساڑھے دس بجے باہر کا دروازہ کھل گیا اور رشیدن اپنے کمرے سے باہر آ گئی اور دروازے کی طرف چلی رولوکا نے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ رشیدن کے باہر آتے ہی رولوکا نے دیکھا کہ ایک ڈولی رکھی ہے اس میں رشیدن سوار ہو گئی اور ڈولی ہوا میں پرواز کرنے لگی اس ڈولی کے لے جانے والے بہت قوی ہیکل جن تھے رولوکا ان کے اتھ تھا چند منٹ کے بعد رولوکا نے دیکھا کہ یہ ڈولی ایک قلعہ کے اوپر تھی پھر ایک سرنگ میں آ گئی اور پھر زیر زمین ایک محل کے دروازے پر کھڑی ہو گئی رشیدن اتر کر اندر چلی گئی اور ڈولی واپس چلی گئی۔ ڈولی کے کھاروں نے اور ان کے چیف نے رولوکا کو نہیں دیکھا تھا دروازے پر کسی قسم کا پہرہ نہیں تھا رولوکا محل کے اندر چلا گیا۔ ایک بہت شاندار محل تھا اس میں روشنی بھی تھی اور ہوا بھی تھی محل کے کمرے نہایت کشادہ اور ضروری سامان بھی موجود تھا ملازمائیں اپنے اپنے کاموں میں لگی تھیں کوئی کسی سے بات نہیں کر رہی تھی رشیدن کو اپنا کمرہ پتہ تھا وہ اس میں چلی گئی۔

رولوکا محل کے اندرونی کمرے دیکھتا رہا پھر وہ ایک بہت خوبصورت کمرے میں پہنچ گیا اس کمرے کی سجاوٹ کسی ملکہ کے کمرے جیسی تھی دیواروں پر قیمتی پتھر جڑے تھے اور کمرہ جگمگ جگمگ کر رہا تھا ایک بہت بڑے پتھر گھٹ پر ایک نہایت حسین عورت بیٹھی تھی اور اس کے سر کے پیچھے دو عورتیں اس کے بالوں میں کھینچ کر رہی تھیں اس کے سامنے دو جھولے رکھے تھے ان میں دو بچے سو رہے تھے، بچے بھی عورت کی طرح خوب صورت تھے، رولوکا ایک کونے میں خاموش کھڑا تھا وہ سمجھ چکا تھا کہ یہی عورت ہے جس کے بچوں کی خدمت کے لئے رشیدن کو لایا جاتا ہے۔ رولوکا اس جگہ کا ماحول دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے کھڑا تھا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اس عورت سے

بھی بڑھ کر حسین مرد کرہ میں آیا اور سیدھا عورت کی طرف گیا اس کو دیکھ کر خدمت گار عورتیں کمرے سے باہر چلی گئیں۔ مرد نے بیوی کا ہاتھ پکڑا اور اس کو چوم لیا پھر بولا۔ ”ملازمہ آگئی ہے بچوں کو اس کے پاس بھیجو اور چلو دیر ہو جائے گی سفر لمبا ہے“ تہنیل گھاٹی جانے ہے گبانو قبیلہ میں شادی ہے۔“

دو عورتیں اندر کمرے میں آ گئیں اور دونوں بچوں کو رشیدن کے کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ مرد اور عورت ایک کبھی نماز ولی میں سوار ہوئے اور ایک طرف کو روانہ ہو گئے۔ اب رولو کا دوہاں رکنے کا کام نہیں تھا وہ سرنگ سے باہر آ گیا اور قلعہ کے کھنڈرات کی سیر کرنے لگا قلعہ غیر آباد نہیں تھا جگہ جگہ جنات کی آبادیاں تھیں یہ ایک خوشحال قبیلہ تھا یہاں کے مرد تندرست اور عورتیں حسین تھیں بچے بھی اسی طرح تھے جگہ جگہ وہ ایک دانرے میں بیٹھے تھے اور خوش گپیاں کر رہے تھے رولو کا واپس چلا اور اس نے پتہ چلا لیا کہ یہ چتوڑ کا قلعہ ہے تو روزانہ کان پور سے چتوڑ تک رشیدن آتی ہے اور واپس چلی جاتی ہے عام حالات میں یہ ممکن نہیں مگر جنات کی سواری اور انسان کی سواری میں بہت فرق ہے۔

راتوں رات وہ کان پور واپس آ گیا اور کسی کو پتہ نہ چلا کہ رولو کا ساری رات کان پور سے سینکڑوں میل دور چتوڑ میں تھا مگر اس کیس میں وہ ابھن کا شکار تھے وہ طے نہیں کر سکا تھا کہ وہ کیا کرے اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ قبیلہ بہت طاقتور ہے مگر اس کے باوجود جھگڑا انہیں ہے پر اس ہے اور انسانوں سے دور ویران جگہ پر آباد ہے ان سے کس طرح بات کی جائے۔

دو تین دن وہ رشیدن کو صرف جاتے دیکھتا رہا اس کے ساتھ نہ گیا اس لئے کہ وہ طے ہی نہیں کر سکا تھا کہ آگے کیا کرنا ہے۔ بات مقابلے کی ہوتی تو وہ پہل بھی کر لیتا مگر لڑائی کس سے کرے۔

بڑے غور و فکر کے بعد اس نے سردار جالموش سے ملاقات کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس کو اب پتہ تھا کہ سردار کا

ٹھکانا کہاں ہے دن میں جالموش قبیلہ کے لوگوں سے ملاقات کرتا تھا ان کے مسائل سننا تھا ان کو حل کرتا تھا۔ رولو کا آج اس کے ساتھ تھا قلعہ چتوڑ کے کھنڈرات کی اس عظیم ہستی میں رولو کا جالموش کے ساتھ مگر اس کو اور کسی کو اس کا احساس نہیں تھا۔ جالموش دو پہر کو ایک بہت بڑے گرے ہوئے برج کے پاس کھڑا تھا اس نے کھڑے ہو کر وپس سے آواز دی۔ ”استاد محترم میں آیا ہوں، ندر آنے کی اجازت دیں۔“

اندر سے آواز آئی۔ ”اکیلے آ جاؤ۔“
”میں تو اکیلا ہی آیا ہوں استاد محرم۔“ جالموش بولا۔
”تمہارے ساتھ جو ہے اس کو کہہ دو سب اندھے نہیں ہیں۔“ آواز آئی۔

جالموش نے حیرت سے ہر طرف دیکھا اور استاد کے حکم کے مطابق بولا۔ ”سب اندھے نہیں ہیں۔“
رولو کا حیران ہوا، آج پہلی دفعہ اس کے ساتھ یہ ہوا تھا۔ رولو کا ظاہر نہ ہوا اور محلات کی طرف چلا گیا اور جالموش استاد کے پاس ادب سے کھڑا تھا۔

استاد نہایت بوڑھا جن تھا اس کے بال سفید تھے لمبی داڑھی تھی چہرہ سرخ تھا آنکھیں روشن تھیں چہرے پر فکر مندی کی علامت نمایاں تھیں چند منٹ خاموشی رہی پھر استاد کی بھاری اور رعب دار آواز جالموش کے کانوں میں آئی۔

”زنہ گی میں پہلی دفعہ میں نے ایسا نظارہ کیا ہے وہ تیرے ساتھ تھا تیری آنکھیں اس کو دیکھنے سے قاصر تھیں میں نے بھی صرف ایک ہیولا ساد دیکھا تھا مگر محسوس پوری طرح کر لیا تھا۔ وہ کوئی معمولی چیز نہیں تھا وہ ضرور غیر معمولی انسان تھا تیرے ساتھ کیوں لگا تھا تو نے کچھ ایسا تو نہیں کیا کہ انسان ناراض ہوں اور وہ تیرے پیچھے لگ گیا ہو۔“ استاد نے پوچھا۔

”نہیں استاد میں اور میرا قبیلہ انسانوں سے دور رہتا ہے۔“ جالموش بولا۔

”اچھا کرتا ہے یہ ضروری ہے تو بے شک بے حد

طاقتور جن ہے مگر یاد رکھنا انسان کی طاقت لامحدود ہے مگر اس کو اپنی طاقت کو استعمال کرنے کا طریقہ پتہ چل جائے تو کوئی اس کے سامنے نہیں رک سکتا ہے وہ اپنی طاقت کا استعمال نہیں جانتا اس کے باوجود بھی کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہوتا ہے جو جانتا ہے اس سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔“

”ڈرنے کی ضرورت آخر کیوں اگر میرا کردار اچھا ہے میں کسی کو ستاتا نہیں اور میرے قبیلے کے لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں تو پھر ڈر کیسا استاد محترم۔“ جالموش نے پوچھا۔

”یہ قلعہ جب یہاں پر نہ تھا یہاں پر ایک دریا بہا کرتا تھا پھر یہاں کے راجہ نے اس دریا کا رخ موڑ دیا اور ایک بہت بڑا اور شاندار یہ قلعہ بنایا ہزاروں سپاہیوں کے رہنے کو مکانات بنائے اور اس کی چار دیواری کے اندر اتنا تاج پیدا ہوتا تھا کہ سب کی ضرورت پوری ہو جاتی تھی دریا اس کے اندر سے گزرتا تھا اس قلعہ نے بڑی بڑی لڑائیاں دیکھی ہیں اس کے اندر اور باہر ہزاروں سر قلم ہوئے ہیں میں نے اس قلعہ کو پہلے دن سے دیکھا ہے یہ ہندو مذہب کے راجاؤں کا مرکز تھا اور اس کی وجہ سے ان کی طاقت تھی حملہ آور اس کو فتح نہیں کر سکتا تھا مگر پھر مسلمان ہندوستان میں آ گئے اور انہوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا د۔ ہندو اس کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور مسلمانوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ آج یہ ویران کھنڈر ہے یہاں انسان نہیں آتے تم میری عمر کا اندازہ کرو میں نے اس قلعے کے عروج و وصال کا زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے مگر آج جو دیکھا وہ میری زندگی کا انوکھا واقعہ ہے تم سمجھ نہیں سکتے کیونکہ میں بھی ایسا انسان پہلے نہیں دیکھا۔“ استاد نے کہا۔

”استاد محترم انسان مرجاتا ہے تو سنا ہے اور تجربہ بھی ہے کہ اس کی اصل یعنی روح دنیا میں بھٹکتی رہتی ہے کیونکہ اس کا جسم تو ختم ہو چکا ہوتا ہے۔“

”تم نے ضرور ایسی بھٹکتی ہوئی روحوں کو دیکھا ہوگا“

مگر ہر روح نہیں بھٹکتی جس انسان کی دلی تمنائیں پوری نہ ہوں وہ دولت کا پجاری ہو اس کی روح اوپر جانے پر راضی نہیں ہوتی اور دنیا میں بھٹکتی رہتی ہے ان بھٹکتی روحوں کو جادو گرا اپنے گندے علوم کے ذریعے قابو کر لیتے ہیں اور وہ ان کی غلام ہو جاتی ہیں جادو گرا ان سے بڑے بڑے کام کرواتا ہے تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ بدکردار جنات کو بھی جادو گر قید کرتے ہیں اور وہ بھی ان جادو گر کے لئے کام کرتے ہیں۔“ استاد نے کہا۔

”استاد ایسا بھی تو ہو سکتا ہے آپ نے جو دیکھا وہ کوئی ایسی ہی روح ہو۔“ جالموش نے کہا۔

”سینکڑوں سال کے تجربے کو تم غلط ثابت نہیں کر سکتے۔ وہ زندہ انسان تھا اور ہے تمہاری ہستی میں موجود ہے تم اس کے کتنے بھی قریب ہو تم کو پتہ نہیں چلے گا وہ تم کو دیکھ سکتا ہے تم نہیں دیکھ سکتے۔ یہاں پر آ کر تم زور ہو اس کے پاس کچھ نہ ہو تب بھی تم اس کا کچھ نہیں کر پاؤ گے۔“ استاد نے کہا۔

”تو پھر اگر اس سے مقابلہ کرنا پڑا تو کیا حکمت عملی ہونا چاہئے۔“ جالموش نے پوچھا۔

”بہترین حکمت عملی یہ ہے کہ اس سے جھگڑا ہی نہ کرو۔“ استاد نے کہا۔

”استاد محترم بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی لڑائی ہو جاتی ہے۔“ جالموش بولا۔

”تو پھر اس لڑائی کو اپنی ذات تک رلھنا پڑا انے کی کوشش نہ کرنا یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تو خود بہت طاقتور ہے اس کے برابر ہے کہ نہیں پتہ نہیں مگر میں تیری مدد کو یہاں پر ہوں تجھے اس کے برابر کرنے کی کوشش ضرور کروں گا وہ پھر تیرے پاس آئے گا اس کو ضرور تیری تلاش ہے۔“

جالموش بے حد طاقتور جن تھا اور وہ اپنے قبیلے کا خوبصورت جن بھی تھا اس کی بیوی بھی ایسی ہی تھی نہ جانے کب سے وہ اولاد کی خواہش رکھتا تھا مگر شادی کے سو سال کے بعد اس کی اولاد ہوئی تھی۔ جنات کی رسم اور

فرخانے تھا آگ بگولہ ہوگئی۔ وہ بگڑ کر جالموش سے بولی۔
 ”دیکھ لیا تم نے مروت اور نرمی کا نتیجہ، ارے یہ انسان اس
 لائق نہیں ہوتا کہ اس پر رحم کیا جائے، میں نے اس کے
 ساتھ تمہارے کہنے سے کتنا اچھا سلوک کیا تھا اور وہ
 احسان فراموش کیا کر رہی ہے، ضرور اس نے ہی کوئی
 کارروائی کروائی ہے۔“

غصہ تو جالموش کو بھی تھا مگر وہ بولا۔ ”ذرا صبر کرو
 بیگم، میں پتہ کرتا ہوں۔“

”کرلو پتہ اور اگر تم نے اس کے خلاف کچھ نہ کیا تو
 میں اپنے بھائیوں کی مدد لوں گی، تم تو رنج دلی کے مرض
 میں مبتلا ہو، تم کچھ کرو گے نہیں۔“
 ”ارے ذرا صبر تو کرو اتنی غلٹ اچھی نہیں ہوتی۔“
 جالموش بولا۔

فرخانے پر بھائیوں کا اثر تھا مگر شاد کیے بعد
 جالموش نے اس کو اپنی لائن پر لگالیا تھا مگر خون کے اثرات
 اور فطری جوش تو اس میں اب بھی ویسا ہی تھا۔
 جالموش نے کہاؤں کے چیف کو بلایا اور پوچھا۔
 ”تم کیوں خالی آئے، رشیدن کیوں نہیں آئی؟“

”سردار! بڑا سخت پہرہ تھا اور عجیب پہرے داران
 کے چہرے نظر ہیں آتے تھے مگر ہم سے زیادہ ہوشیار اور
 چالاک تھے، آسان پر بھی موجود تھے، انہوں نے صرف یہ
 کہا واپس چلے جاؤ، اب نہ آنا، آؤ گے تو نقصان ہوگا، سزا
 ملے گی۔“ چیف نے بتایا۔

”تم سب اتنے کمزور تھے کہ ان سے ڈر گئے۔“
 جالموش نے کہا۔

”سردار! ان کی طاقت کا میں نے اندازہ کیا تھا وہ
 ہماری تھے نقصان ہمارا ہی ہوتا، میں نے ان کی بات مان
 لی اب جائیں گے تو تیاری کر کے جائیں گے۔“ چیف
 نے بتایا۔

جالموش بولا۔ ”جانا تو ہے اور رشیدن کو لانا بھی
 ہے۔ کل رات کی تیاری کرو۔“

رولوکا جانتا تھا کہ آج کی ناکامی ضرور رنگ لائے

طریقوں سے اپنی اولاد کی پرورش کرنا نہیں چاہتا تھا اس
 کو انسانی طریقہ پر پرورش کرنا اچھا لگتا تھا۔ اس کا اور
 بیوی کا خیال تھا اس طرح بچے انسانوں سے بھی مانوس
 رہیں گے اور دوسرے قبیلے کے جنات کی طرح انسان کو
 چھوت نہیں سمجھیں گے۔ دنیا میں انسانوں کے ساتھ
 رہنے کے لئے کچھ انسانیت کی ضرورت تو ہوتی ہے اس
 کے علاوہ وہ خود بھی صلح پسند تھا بلا وجہ لڑائی جھگڑا پسند نہیں
 کرتا تھا۔

رولوکا بہت کچھ سمجھ چکا تھا وہ جالموش سے لڑنے کے
 موڈ میں بھی نہیں تھا۔ اس کے خیال میں وہ نیک جن تھا اور
 اس کا استاد تجربہ کار تھا وہ جالموش کے ساتھ تھا ان حالات
 میں اب کیا کرنا تھا کہ رشیدن کی جان بچوٹ جائے اور
 اس کی شادی ہو جائے اور کسی قسم کا کوئی ناخوشگوار واقعہ بھی
 نہ ہو۔

جالموش بیوی کی وجہ سے مجبور تھا اس کو ایک نوکرانی
 کی ضرورت تھی وہ رشیدن کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔
 جالموش کے لئے رشیدن ہونہ ہو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر
 اس کی بیوی کی گرفت اس پر بہت تھی اور اس کی بھی وجہ
 تھی بیوی جنات کے ایک بہت بڑے گروہ کے سردار کی
 لڑکی تھی اس کے بے حساب بھائی تھے اور وہ باپ کے
 کنٹرول سے باہر تھے۔ وہ جالموش کو بھی آ کر تنگ کیا
 کرتے تھے۔ بہن اپنے بھائیوں کے زدم میں من مانی
 کرتی تھی اور جالموش سے اپنی مرضی کے کام بھی کر دیا
 کرتی تھی۔ رولوکا کو ایک آسان کیس نظر آنے والا کیس
 الجھن میں ڈال رہا تھا۔

آخر اس نے ایک فیصلہ کر لیا اور مرزا کے گھر پر
 پہرے لگا دیئے۔ رات گیارہ بجے ڈولی آگئی۔

☆.....☆.....☆

اور رشیدن دروازے پر آگئی۔ پہرے داروں
 نے چار کہاؤں اور ان کے چیف کو پکڑ لیا اور کہا۔ ”اب
 آئندہ نہ آنا آؤ گے تو سزا ملے گی۔“ اور ڈولی خالی واپس
 چلی گئی۔ رشیدن کے نہ جانے پر جالموش کی بیگم کا نام

چمادی تھی۔ فرخانے لگ بیچ تاؤ کھا رہی تھی اب اس کو انسانوں سے سخت نفرت ہو رہی تھی اس کا بس چلتا تو وہ تمام انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتی۔

جاملوش اپنے استاد محترم کے رو برو کھڑا تھا۔ ”میں بہت شرمندہ اور پریشان ہوں میری ناکامی صرف میری نہیں ہے جنات قوم کی ناکامی ہے۔ مجھے راستہ بتاؤ استاد محترم۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں نے تجھ سے کہا تھا کہ وہ غیر معمولی انسان ہے۔ اس نے تیری طاقت کے بارے میں پورا اندازہ کر لیا اور دروازہ بند کر دیا، تم نے طاقت کے اندھے نشے میں اس دروازے کو کھولنا چاہا اور نقصان اٹھا کر آ گئے۔ ارے بے وقوف تم کو سمجھ لینا چاہئے تھا کہ تم خود نکام ہوئے، تم نے غور نہیں کیا لڑائی کس سے لڑنے گئے تھے، کسی نے تم کو دروازے تک جانے سے روکا، یہ اس کی ایک چال تھی تم کو اس نے جال میں پھانس لیا تھا مگر پھر بھی اس نے اس جال کا منہ بند نہ کیا اور تم واپس چلے آئے ورنہ تم نے خود اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا تھا۔ تم کو وہاں پر جانے کی ضرورت نہیں تھی صرف ایک نوکرانی کی خاطر اور اپنی بیوی کے جوش دلانے پر تم نے بے وقوفی کر ڈالی۔“ جاملوش نے استاد محترم کی باتوں پر غور کیا تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے گردن جھکا کر اعتراف کر لیا اور کہا۔ ”مجھے راستہ دکھائیں۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”تو خود کمزور نہیں، معاملہ تیرا ہے۔ تجھے ہی لڑنا ہے اگر اس معاملے میں کسی اور کو شامل کرے گا تو لڑائی زیادہ پیچیدہ ہو جائے گی۔ چوڑے قلعے سے تیری قوم بے گھر ہو جائے گی کیونکہ تیرا دشمن تیری قوم کی آبادی دیکھ گیا ہے، وہ کچھ بھی کر سکتا ہے اس طرح جو تیری قوم، تجھ پر جان نچھاور کرتی ہے تیرے خلاف ہو جائے گی تیرے باپ دادا کے زمانے کی سیرداری خطرے میں پڑ جائے گی اور صرف نوکرانی کی خاطر نادانی کی بات ہے تیری بیوی اپنی انا کی خاطر تجھ کو اور تیری قوم کو داؤ پر لگا رہی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ اس نوکرانی کو بھول

گی۔ جاملوش لاکھ پسند ہو مگر سب تو ایسے نہیں ہوں گے اور یہ معاملہ تو اس کی نیگم کا ہے وہ ضرور جاملوش کو اسے گے کی جوش دلائے گی اس لئے اس نے پورا انتظام کر لیا تھا۔ جاملوش نے اعلان کر دیا تھا کہ کل رشیدن کو ہر حالت میں لانا ہے۔ فرخانے نے اپنے بھائیوں کو طلب کر لیا تھا اور اچھی خاصی فوج کشتی کی صورت پیدا ہو گئی تھی مگر وہ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں تھے وہ اندازہ نہ کر سکے وہاں پر کیا صورت حال پیش آ سکتی تھی۔

گیارہ بجے دروازے پر ڈولی آ گئی اس کے دروازے تک آنے میں کوئی رکاوٹ نہ آئی جاملوش اور اس کے سالوں کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ ڈولی کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے مگر ان کی کوشش کے باوجود دروازہ نہ کھلا تو جاملوش خود آگے بڑھا اور چاہتا تھا کہ دروازے کو توڑ ڈالے کہ ایک تیز روشنی کی باریک کر ان کے چہرے پر پڑی اور جاملوش کو ایسا لگا کہ اگر وہ جلد کو اس کرن سے نہ بچایا تو وہ جسم کے پار نکل جائے گی اور وہ دروازے سے دور ہو گیا۔

اس کے بعد اس کا ایک نہایت طاقتور سالہ آگے بڑھا اور جوش میں دروازہ پر جا کر ایک زوردار لٹ ماری مگر یہ کیا ہوا اس کا پیر دروازے پر چپک گیا اور جسم سے الگ ہو گیا، وہ تکلیف سے ہڈاڑا مگر دوبارہ اس کی آواز نہ آئی اور جسم ساکت ہو گیا۔

یہ دیکھ کر جاملوش اور اس کے ساتھی بھر گئے مگر سوال تھا کہ وہ کس سے جنگ لڑیں، کس کو ماریں، دروازے تک جانے کا انجام ان کے سامنے تھا آخر جاملوش کی سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے سب کو کہا۔ ”سب خاموش ہو جائیں، دشمن نظر آئے تو لڑائی ہوتی ہے اب ذرا عقل کے استعمال کی ضرورت ہے۔“ وہ دشمن کو پکارتا رہا جوش دلاتا رہا غیرت دلاتا رہا۔ مگر کسی طرف سے جواب نہ آیا اور رات گزر گئی اور جاملوش کو واپس جانا پڑا۔

ناکام واپس جانا اور پھر زبردست جنگ کے چھڑنے پر جنگ کی ہولناکی نے پورے قبیلے میں کھلبلی

جا، ابھی کچھ نہیں بگڑا مگر آگے نظر آ رہا ہے اپنی بیوی کے دماغ کو ٹھنڈا اور اس نظر نہ آنے والے انسان سے دور ہو جا۔“ استاد نے اپنے تجربے کی روشنی میں مشورہ دیا۔
 جالوش واپس آ گیا اور بیوی سے بولا۔ ”استاد محرم کا مشورہ ہے کہ اس جھگڑے کو یہیں پر ختم کر دیا جائے اور نوکرانی کو فراموش کر دیا جائے۔“
 ”تم اپنی بزدلی اور کمزوری کو چھپانے کو استاد کا سہارا لے رہے ہو میں جانتی ہوں۔“

”تم جانتی ہو بیگم کہ میں بزدل نہیں ہوں میرے پاس میرے باپ دادا کا اثاثہ بھی ہے اس کے علاوہ استاد محترم کا دست شفقت بھی ہے۔ میں جنگ سے گھبراتا نہیں ہوں مگر اندھی جنگ کرنا خلاف عقل ہے، ہم نے اپنے دشمن کو نہیں دیکھا اس کی طاقت کا اندازہ ہم کو نہیں اور اس کے ارادوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں، اب جنگ تو ہوگی مگر پہلے دشمن کے قریب ہو کر اس کے بارے میں معلومات کرنا لازمی ہے اس کی جاسوسی کرنا ہوگی۔ بے خبر ہو کر جنگ کرنا اپنا نقصان کرنا ہے تم نے دیکھا کہ اندھے حملے میں تمہارا ایک بہت لڑاکا، تمہارا بھائی کام آ گیا اب میں ایسی غلطی ہرگز ہرگز نہیں کروں گا۔“ جالوش نے کہا۔
 ”اس طرح تو سالوں گزر جائیں گے۔“ فرخانے کہا۔

”میں نے کام شروع کر دیا ہے اور ایک نہایت ہوشیار جاسوس کو لگا دیا ہے اس کام پر۔“

مگر وہ ہوشیار جاسوس پکڑا گیا اس کو رولوکا کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ رولوکا اس کے سامنے نہیں آیا مگر اس کی آواز جاسوس سن سکتا تھا۔

”تم جانتے ہو کہ تم کہاں پکڑے گئے ہو بتاؤ تم کس کے حکم پر یہاں آئے ہو۔“ رولوکا بولا۔

”میں بھٹک کر ادھر آ گیا تھا کسی ارادے یا پروگرام سے نہیں آیا ہوں۔ وہ بولا۔

”تم کس علاقے کے رہنے والے ہو؟“ رولوکا نے پوچھا۔

”میں کوالیا کے ضلع میں رہتا ہوں۔“ جاسوس بولا۔

”دیکھو میں تم پر ظلم کرنا نہیں چاہتا تم خود کچ بتا دو تو میں تم کو چھوڑ دوں گا اور اگر نہیں بتاؤ گے تو سزا ملے گی اور پھر بھی تم کو بتانا تو ہوگا۔“

”جو کچھ تمہا میں نے بتا دیا ہے۔“ جاسوس نے کہا۔
 ”ٹھیک ہے کچھ دیر میں تم خود بتلاؤ گے۔“ رولوکا

نے جاگتے لو کو اشارہ کیا جو جاسوس کی طرف بڑھا۔ جاسوس جن کو جاگتے الو کی شکل نظر آئی تو اس کے بدن پر گچکی طاری ہوگئی حالانکہ وہ خود کچھ کم خوفناک شکل کا نہ تھا مگر جاگتے الو کی تو ہیئت ہی نرالی تھی۔ اس کو اپنا انجام نظر آنے لگا۔ وہ فوراً بولا۔ ”رک جاؤ میں بتاتا ہوں۔“ الو رک گیا تو وہ بولا۔

”میں جالوش کا غلام ہوں اور اس کے حکم پر تمہارے حالات معلوم کرنے آیا تھا۔“

رولوکا نے کہا۔ ”ہاں اب تم نے سچی بات بتائی ہے۔ اب تم معافی کے مستحق ہو گئے ہو یہ بتاؤ جالوش کہاں ہے۔“

”وہ اپنی قیام گاہ چتوڑ کے قلعے کے زیر زمین محفل میں ہے اور میرا انتظار کر رہا ہے۔“ جاسوس بولا۔

”تو پھر تم آزاد ہو مگر یاد رکھنا تم اکیلے نہیں جا رہے ہو میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔“ رولوکا بولا۔

جاسوس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

اور جاسوس کے ساتھ رولوکا روانہ ہوا۔ چتوڑ کے قلعے کے نیچے محلات کے ایک بہت شاندار کمرے میں جالوش اپنی بیگم کے ساتھ موجود تھا۔ جاسوس نے دروازے پر دستخط دی دروازہ کھلا اور جالوش نے جاسوس کو دیکھا تو بولا۔ ”تم جلدی واپس آ گئے کچھ کام ہوا؟“

جاسوس بولا۔ ”میری جان پر بن گئی تھی میں اکیلا نہیں ہوں میرے ساتھ آپ کا دشمن بھی ہے آپ سے ملاقات کرنے آیا ہے۔“ اس کی بات سن کر جالوش نے ہر

طرف نظریں دوڑائیں مگر کچھ نظر نہیں آیا۔

رولوکا اس کے سامنے کھڑا تھا اور مسکرا رہا تھا بولا۔
”تم ابھی اپنے استاد کی منزل سے دور ہو تم کو کچھ نظر نہیں
آئے گا پرسکون ہو جاؤ میں دشمن کرنے نہیں آیا ہوں تم کو
مشورہ دینے آیا ہوں۔“ جالموش نے حیرت سے رولوکا کی
آواز سنی اور بولا۔ ”یہ کیسی ملاقات ہے کہ میں ملاقاتی کو
دیکھ نہیں سکتا اور پھر بھی ملاقات کروں۔“

”تم نے آواز سنی لی اور تمہارے لئے یہ بہت ہے
کتنوں نے آواز سننے کی حسرت کی اور نہ سن سکے، سنو تم
غلط سمت میں جا رہے ہو تم اپنی مرضی سے نہیں چل رہے،
دوسروں کے کہنے پر چلنے والے اکثر نقصان میں رہتے
ہیں، تم ایک ملازمہ کے لئے کتنی بڑی غلطی کر رہے ہو، تم
جانتے ہو۔“ رولوکا نے کہا۔
”میں اپنی بیگم سے مجبور ہوں اس نے اپنی انا کا
مسئلہ بنایا ہوا ہے۔“ جالموش بولا۔

”اس کے حسن کے تم غلام ہو تم اس کے کہنے پر چلو
گے تو تباہی کی طرف جاؤ گے یاد رکھو۔“ رولوکا بولا۔
ابھی جالموش نے جواب نہیں دیا تھا کہ کمرے کے
اندر سے آواز آئی۔

”بزدل دشمن تو کیا سمجھتا ہے میں کمزور ہوں تو ہم کو
ڈرانے آیا ہے میرا شوہر اگر بزدل ہے تو میری برادری کی
آبادی ہے۔ جالموش کو تو اکیلا نہ سمجھنا۔ اس کے ساتھ
میرے باپ کی حکومت بھی ہے تو کس کس سے لڑے گا
میں ساہا سال جنگ کرنے کی قوت رکھتی ہوں اور اگر تو
اس جنگ سے بچنا چاہتا ہے تو رشیدن کو لے آؤ میری
غلام ہے خود اس کو آزاد کر دوں گی اس کے علاوہ کوئی
صورت نہیں ہے اب تو جاسکتا ہے گھر آئے دشمن پر ہم حملہ
نہیں کرتے اس لئے چھوڑ رہے ہیں۔“

رولوکا نے نخل اور سکون سے فرخانے کی استراحتی سنی
تھی پھر سکون سے بولا۔

”محترم عورت میں آپ کو عورت اس لئے کہہ رہا
ہوں کہ عورت جذبات اور غصے میں ہو تو عقل اس سے دور

چلی جاتی ہے اور وہ صرف جذبات کی غلام ہو جاتی ہے۔ تم
نے ایک بہت معمولی بات کو انا کا مسئلہ بنالیا ہے نوکرانیاں
تم کو اور بھی مل سکتی ہیں۔ تم نے ذرا غور نہیں کیا کہ انسان کو
تم نے غلام بنالیا، تم نے اس کی زندگی کے دس قیمتی سال
برباد کر دیئے انسان کی عمر ہزاروں سال نہیں ہوتی اس کے
پاس صرف ساٹھ، ستر سال ہوتے ہیں مگر خواہشات اور
آرزوئیں بہت ہوتی ہیں، اس کی جوانی بڑی مختصر ہوتی ہے
اسی مختصر جوانی میں وہ اولاد پیدا کرتا ہے، اپنی خواہشات کی
تحکیم کرتا ہے اور واپس اپنے رب کے پاس چلا جاتا
ہے۔ تم جنات ہزاروں سال کی زندگی کے مالک ہوتے
ہو تم کو اندازہ نہیں ہے کہ انسانی زندگی کا ہر دن اس کے
لئے بڑا اہم ہوتا ہے تم نہ معلوم کب تک اسی طرح رہو گے
اور رشیدن تمہاری غلامی کرتے کرتے اپنی عمر طبعی پوری
کر کے مر جائے گی پھر تم بتاؤ تم کیا کرو گی کیونکہ تم سو
سال کے بعد بھی پیدا کرنی ہو گی۔“

جالموش نے جواب دیا۔ ”میرے ان دیکھے دشمن
تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔“

اندر سے فرخانے کی پھر آواز آئی۔ ”جالموش تم
اسنے کمزور ہو اس کا اندازہ مجھے اب ہوا ہے تم اس جنگ
سے ہٹ جاؤ اب یہ میری جنگ ہے، اے اچھی دشمن تم
جاسکتے ہو۔“

رولوکا واپس روانہ ہو گیا۔ رولوکا کے جاتے ہی
فرخانے دروازے سے باہر اٹھی اس وقت وہ سخت غصے
میں تھی اس کا حسن ہنست ناک شکل اختیار کر گیا تھا وہ
جالموش سے بولی۔

”تم نہایت بزدل ہو سرداری کے قابل ہرگز نہیں
ہو میں اب تمہارے پاس نہیں رہ سکتی۔ میں جا رہی ہوں
اپنے باپ بھائیوں کے پاس اور تم دیکھنا کہ میں رشیدن کو
کس طرح حاصل کرتی ہوں۔“ اور فرخانے اپنے چاروں
بچوں کو لے کر جالموش کی بات سننے بغیر پرواز کر گئی۔

فرخانے کا جانا جالموش کے لئے عزت کا معاملہ
بن گیا تھا اس نے کسی معاملے پر کبھی کسی سے امداد طلب

کروں گی آپ اور جالموش سرداری کی جاست میں اٹھے ہوئے ہو اقتدار اور کرسی نے آپ دونوں کو کچھ نہ کچھ بزدل ضرور بنا دیا ہے۔“ فرخانہ بولی۔ باپ بیٹی کی بات سن کر ہنس پڑا اور بولا۔

”نادانی کی بات نہ کرو تم جنگ کرو گی اور ہم الگ بیٹھ کر تماشہ دیکھیں گے۔ جنگ میں پھول نہیں برستے خون بہتا ہے۔ لاشیں گرتی ہیں تم نے گھر اور اس کے اندر دیکھا ہے میدان جنگ تم نہیں دیکھ پاؤ گی اور جنگ بھی اس دشمن کے خلاف جس کے بارے میں استاد محترم اور جالموش نہ لڑنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔“ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”آپ اس کو میری ضد کہہ لیں، میں باز نہیں آؤں گی اکیلے ہی لڑوں گی۔“ فرخانہ بولی۔

”ہرگز نہیں میں تم کو کچھ بہترین جوان دیتا ہوں مگر ان کو کسی بھٹی میں نہ جھونک دینا، وہ بہترین لڑاکے ہیں تمہاری حفاظت کریں گے۔“ باپ نے کہا۔

”میرے جسم میں آپ کا خون دوڑ رہا ہے میں اتنی بھی کمزور نہیں ہوں۔ ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کروں گی۔“ فرخانہ نے جواب دیا۔

باپ نے اپنے مضبوط میٹ لڑاکے فرخانہ کے حوالے کر دیئے۔ ان بیس جوانوں میں دس اس کے بھائی تھے۔ فرخانہ ان جوانوں کو لے کر چوڑا آگئی۔ بچوں کو اس نے باپ کے پاس جھانسی میں چھوڑ دیا۔ رانی جھانسی کا قلعہ بھی کچھ کم نہ تھا اس میں بھی زمین دوز سرنگیں اور محلات بنے ہوئے تھے اور ہر کھائی کم اور فوجی نقطہ نظر سے اس کی پائیداری زیادہ تھی مگر رانی کے بعد انگریزوں کے دور حکومت میں یہ بھی ویران تھا اور یہاں پر بھی قوم جنات آباد ہو گئی تھی جن کی پوری برادری اس میں آباد تھی اس کے علاوہ اطراف کی پہاڑیاں بھی ان سے بھری پڑی تھیں۔ فرخانہ خوش خوش بیس جوان کو لے کر چوڑا آگئی۔

جالموش نے پوچھا۔ ”بچے نہیں آئے۔“ تو وہ بولی۔

”بچے میں باپ کے پاس چھوڑ آئی ہوں کیونکہ

نہیں کی تھی فرخانہ باپ کو سارے حالات بتائے گئے اور وہ بزدل برقرار دے دیا جا رہا ہوگا۔ جالموش دو طرف سے پریشانی کا شکار تھا۔ اس کی سرال کا قبیلہ زیادہ تربت پرست تھا مگر فرخانہ کا باپ بت پرست نہیں تھا۔ جو بت پرست جنات تھے وہ اس قبیلے میں رہتے تھے مگر مرضی اپنی کرتے تھے فرخانہ کا باپ ایک نہایت طاقتور سردار تھا۔ اگر وہ ذرا کمزور ہوتا تو اس کے قبیلے کے بت پرست جن سرداری چھین لیتے مگر وہ اب تک اپنی مرضی نہیں کر سکے تھے اور اسے سردار ماننے پر مجبور تھے انسانوں میں ان کے اپنے مسائل تھے تو ان مسائل سے کوئی مبرا نہیں تھا ان کی اپنی سیاست تھی یہاں پر بھی اقتدار کے لئے جنگ سرداری ناگ کھینچنے کو دوسرے امیدوار تیار تھے۔

سردار نے بیٹی کی بات سنی اور بولا۔ ”فرخانہ بات اتنی بڑی لگتی نہیں جتنا تم نے اس کو بنا ڈالا ہے۔“

فرخانہ بولی۔ ”بات عزت کی ہے بابا، عزت بڑی چیز ہے۔“

”بے شک یہ بات درست ہے مگر ہر معمولی معمولی بات پر جنگ کرنا خلاف عقل بھی ہے۔ جالموش بڑا حوصلے والا سردار ہے۔ اس نے میرے خیال میں درست فیصلہ کیا ہے۔“

”آپ میرے باپ بھی ہیں اور بہت عظیم سردار بھی ہیں مگر میں جالموش کی بزدلی کے فیصلے کو نہیں مانتی اس نے لڑنے کی یا انتقامی کارروائی کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔“ فرخانہ بولی۔

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو ان حالات میں کہ دشمن پردے میں ہے اس کی طاقت کا اندازہ کسی کو نہیں یہاں تک استاد محترم جو کہ سب کے لئے قابل احترام ہیں ان کو بھی اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے تو پھر جنگ کرنا اپنی موت کو دعوت دینا ہے مگر تم کو میں ناراض کرنا بھی نہیں چاہتا حالات جو ہوں تم بتاؤ تم کیا چاہتی ہو۔“ فرخانہ کے باپ نے بیٹی سے پوچھا۔

”آپ مجھے طاقتور فوج دیں میں اپنا فیصلہ خود

”مرزا صاحب مجھے پہچانا۔“ مرزا نے غور سے اس کو دیکھا اور بولا۔ ”یاد نہیں آ رہا آپ کون صاحب ہیں؟“

”میں آپ کے ساتھ اکثر ٹرین میں سفر کرتا رہا ہوں پھر آپ نے ملازمت چھوڑ دی میں نے کئی دفعہ آپ سے ملاقات کرنے کی کوشش کی مگر آپ کے گھر پر تو بڑا سخت پہرہ لگا رہتا ہے آپ تک نہ آ سکا۔ آپ ٹھیک ہیں۔“ جالموش نے فوراً ایک فرضی کہانی سنائی۔

”میرے ملاقاتی سب آتے ہیں کسی نے یہ شکایت نہیں کی پہرے کا تعلق میں سمجھا نہیں، آپ نے کیا محسوس کیا ہے۔“ مرزا بولے۔

جالموش خود اپنی کئی بات میں پھنس رہا تھا۔ بولا۔ ”ارے میرا مطلب تھا میں رات میں آیا تھا اور تمہاری گلی کے کت تو یہ تو یہ میں ڈر گیا۔“

”کتے اور میری گلی میں میاں کسی اور گلی میں چلے گئے ہونگے۔“ مرزا بولے۔

”شاید ایسا ہی ہوا ہو اور رات میں غلطی ہو سکتی ہے۔“

اس بلاوجہ کی گفتگو سے جالموش نے اندازہ لگایا کہ پہرہ موجود ہے۔ وہ بولا۔

”مرزا صاحب پھر کسی دن حاضری دوں گا گاڑی کا وقت ہو رہا ہے اجازت دیں۔“

اور وہ تیزی سے ایک گلی میں داخل ہوا اور ہوا ہو گیا۔

رولوکانے مرزا سے پوچھا۔ ”آج تم کو کوئی سرراہ ملا تھا وہ کون تھا؟“

”ارے حکیم صاحب میرے لئے تو اجنبی ہی تھا۔“ مرزا نے کہا۔

”وہ پھر آئے گا اب کے آئے تو اس کی خاطر کرنے کو گھر لے آئیں۔“

فرخانہ نے پوچھا۔ ”کچھ خبر ملی۔“

”میں مرزا کی کھلی تک جاسکا ہوں ایک دم تو اس

میرا ارادہ کان پور رشیدن کے پاس جانے کا ہے۔“ وہ بولی۔ ”اس طرح اچانک بغیر وہاں کے حالات جانے جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔“ جالموش نے کہا۔

”تم اور میرا باپ دونوں سردار ہو تمہاری سوچ ایک جیسی ہے دور کی چیزیں نظر آتی ہیں تم کو اور قریب نظر نہیں آتا، میں قریب اور دور خود دیکھوں گی اور فیصلہ کروں گی۔“ فرخانہ بولی۔

”جلد بازی میں کیا گیا فیصلہ درست نہیں ہوتا۔ یہ تم نے سوچا ہے۔“ جالموش بولا۔

”میں پہلے کان پور کے حالات پتہ کروں گی۔“ فرخانہ بولی۔ ”اور اس نے ایک جاسوس کان پور روانہ کر دیا۔ مگر وہ جاسوس واپس نہیں آیا۔ پھر دوسرا روانہ کر دیا، وہ بھی نہیں آیا۔ اب ذرا فرخانہ کو تشویش ہوئی۔

جالموش کو سب پتہ تھا وہ فرخانہ کو سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”تم نے دشمن کو بے وقوف سمجھا تھا دوڑ کے جوان غائب ہو گئے پتہ نہیں مارے گئے کہ قید ہوئے اب کہو۔“

”میں تم کو ہرگز جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔“ جالموش نے کہا۔

”تم نہیں جاسکتے، مجھے تو جانا ہوگا۔“ فرخانہ بولی۔

”میں اتنا کمزور اور بے غیرت نہیں ہوں کہ میں گھر میں بیٹھا رہوں اور تم لڑنے چلی جاؤ میں پتہ کرتا ہوں۔“ اور جالموش کان پور روانہ ہوا مگر سیدھا رشیدن کے مکان کی طرف نہیں گیا۔

پہلے وہ شہر میں پھر کر حالات کا جائزہ لیتا رہا اس کا حلیہ ایک سفید کالے بلبے کا تھا اور وہ گلیوں گلیوں بو سوگھ رہا تھا وہ حیران تھا کہ شہر میں کسی قسم کا پہرہ نہیں تھا، وہ بڑی سست روی سے رشیدن کے مکان کی طرف بڑھ رہا تھا، ابھی وہ رشیدن کے مکان سے دور تھا کہ اس نے دیکھا کہ رشیدن کا باپ مرزا گلی سے باہر آ رہا ہے

وہ مرزا کو پہچانتا تھا وہ فوراً چون بدن کر انسانی روپ میں مرزا کے سامنے آ گیا اور بڑھ کر اس کو سلام کیا اور بولا۔

☆ ☆ (255) ☆ ☆

کے گھر میں نہیں جاسکتا وہاں پر جال بھی ہو سکتا ہے۔“
جالوش بولا۔

”اب کے اس کے گھر ضرور ہو جانا۔“ فرخانہ بولی۔

”کوشش کروں گا یہ تو اندازہ ہے کہ مرزا اطمینان سے بیٹھا ہے ضرور اس کی پہرہ داری ہو رہی ہے اور ہمارے دوسو سپاہی گرفتار ہوئے یا مارے گئے۔ یہ بھی تو خطرے کی بات ہے ان کا بھی پتہ چلانا ہے۔“ جالوش بولا۔ ”کہو تو میں پکڑ لگاؤں۔“ فرخ بولی۔

”تم نہ جانا تمہارے لئے ہر چیز نئی ہوگی تم ان کی اصلیت اور طاقت سے پوری طرح واقف بھی نہیں ہو تمہارا جانا سخت خطرناک ہوگا۔“

مگر فرخانہ کو تو بے چینی تھی۔ بے صبری تھی اور اس کی فطرت میں حاکمانہ پن تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ باپ کے گھر باپ کی اکلوتی تھی بھائی تو بے شمار تھے مگر وہ اکیلی تھی شادی کے بعد شوہر بھی بڑا سردار ملا یہاں پر بھی حکم چلاتی رہی اس کی خدمت کو نوکر چاکر اس کے حکم کے منتظر رہتے تھے اس ماحول میں رہنے والی فرخانہ کہاں برداشت کر سکتی تھی کہ وہ انتظار کرے وہ خاموشی سے رات کو جالوش کو بتائے بغیر کان پور روانہ ہوگئی اور سیدھی مرزا کے مکان کی طرف چلی اس کا روپ ایک سفید ناگن کا تھا۔

مرزا کے مکان کے قریب اس کو رک جانا پڑا کیونکہ اس کے سامنے کئی خونخوار نیولے آگئے تھے اس کی سمجھ میں فوراً آ گیا کہ پہرہ سخت ہے وہ واپس پلٹی اور چاہتی کہ کسی آڑ میں چھپ جائے مگر وہ ایسا نہ کر سکی کیونکہ اب اس کے چاروں طرف موت کھڑی تھی اب اس کو چولا بدلنا ضروری ہوا اور وہ ایک گائے کی شکل اختیار کر گئی مگر جو نیولے تھے وہ بھی بدل گئے اور گائے کے سامنے کئی بھیڑیے اپنے نوکیلے دانت نکالے کھڑے تھے اور پھر ان کی تعداد بڑھنے لگی۔ فرخانہ نے ہر طرح راہ فرار کی کوشش کی، لڑنے کا تو سوال ہی نہیں تھا مگر اس کو راہ فرار نہ ملی پھر اس نے دیکھا کہ اس کو ایک طرف جانے کا راستہ دیا گیا اور

اس طرف چلنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اب تک کسی نے اس تک آنے یا کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی اب اس کا بہروپ بدلنا اس کو بے کار لگ رہا تھا۔

وہ اپنی اصلی شکل میں بھی نہیں آ سکتی تھی کیونکہ وہ جالوش کی پردہ دار بیوی تھی۔ جالوش ایک بڑا سردار تھا اور کبھی پسند نہ کرتا کہ فرخانہ اچھی انسانوں کے سامنے بے پردہ ہو جائے۔ وہ پھر ناگن کا روپ اختیار کر گئی اور نیولوں کے اشارے پر ایک بنجرے کی طرف چلی۔ بنجرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس کو اندر جانا پڑا اور اس کے جاتے ہی دروازہ بند ہو گیا اور سردار جالوش کی پیاری بیوی اور سردار باپ کی ضدی بیٹی قید ہو گئی۔

دو دن گزر گئے جالوش یہ تو سمجھ گیا کہ فرخانہ کی جلد بازی اور ضد نے ضرور اس کو مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ ضرور کان پور مرزا کے مکان پر گئی ہوگی اور وہیں پر اس کے ساتھ کچھ ہوا ہے جالوش جانتا تھا کہ مرزا کا مکان اس کے دشمن کا قلعہ ہے اور شاید فرخانہ نے اس قلعہ کے اندر جانے کی کوشش کی ہوگی اور اس کے پھیلانے جال میں پھنس گئی ہو۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ اس کے پلان کے خلاف بھی تھی وہ کسی دوسرے طریقہ پر اس مسئلے کو حل کرنا چاہتا تھا مگر فرخانہ کی بخلت نے اس کے لئے بہت زیادہ پریشانیاں کھڑی کر دی تھیں۔

وہ استاد محترم کے حضور کھڑا تھا اور پوری صورت حال بیان کر دیا تھا۔

استاد محترم نے پوری بات سننے کے بعد فرمایا۔ ”آج پھر وہی مسئلہ میرے سامنے آیا ہے جو ایک دفعہ پہلے بھی آچکا ہے اور اس کو بھی اس انداز میں حل کرنا ہوگا جس انداز میں میرے محترم استاد نے رخ کیا تھا آج سے کئی سو سال پہلے بھی انسان اور جنات کی جنگ ہوئی تھی اور شاید اس کے نتیجے میں جنات کو سخت نقصان سے دوچار ہونا پڑتا کہ ایسا انسان درمیان میں آ گیا جس پر جنات کا بس نہیں چلتا تھا اس کی طاقت کے سامنے جنات بے بس تھے مگر اس نے اس پر بھی جنات کو اپنی مرضی پر نہیں چلایا۔“

فیصلے کو ماننا ہے۔“ استاد محترم نے پوچھا۔

”میرے بزرگ میرے محترم استاد! میں آپ کے حکم کے خلاف جانے کی سوچ بھی نہیں سکتا آپ کا رتبہ بہت برا ہے میں آپ کے حکم کے آگے سر جھکاتا ہوں۔“ جالموش نے گردن جھکا کر کہا۔

”تو سن خوش خبری یہ ہے کہ فرمانہ زندہ ہے اور عزت و احترام سے رکھی گئی ہے جیسی کہ وہ رہتی تھی۔ اس کے سامنے کسی انجمنی مرد کو نہیں رکھا گیا۔ اس کی خدمت پر مونٹ رکھی گئی ہیں۔ اس سے اب تک کوئی سوال جواب نہیں کیا گیا صرف اس کی واپسی کے راستے بند ہیں اور انتظار کیا جا رہا ہے کہ اس کی رہائی کے لئے کوئی آئے مگر تیرے لئے وہاں جانا ٹھیک نہیں ہوگا تیرے لئے مجھے کان پور جانا ہوگا، میرے فیصلے کو ماننے گا۔“ استاد نے پوچھا۔

”میں نے خود کو آپ کے حوالے کر دیا ہے میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند ہوں۔“ جالموش بولا۔

”تو اب تیرا کام ختم ہوا میں خود تیرے پاس آؤں گا۔“

رولوکا جانتا تھا کہ چوڑ میں ایک ہی ایسا ہے جو میری موجودگی کو محسوس کرتا ہے وہ کوئی معمولی چیز نہیں ہو سکتا۔ رولوکا کان پور میں ہی رہا اس نے چوڑ آنے کی کوشش نہیں تھی کہ جو بات پردے کی ہے پردے میں رہے تو بھرم قائم رہتا ہے بھرم وہ پردے ہے جو صرف ایک بار قائم ہوتا ہے اگر ٹوٹ جائے تو دوبارہ بھرم قائم نہیں ہوتا مگر بعض حالات میں ہر مصیبت کو خود پلایا جاتا ہے اور جب آ جاتی ہے کہا جاتا ہے کہ مصیبت آگئی ہے اگر مسلمان ہے تو اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے مگر پہلے اپنی ضرورت کی بات کرتا ہے اپنی مصیبت کی بات کرتا ہے پھر سیدھا راستہ پکڑنے کی بات کرتا ہے ہندو ہے تو کسی بت پر پھول چڑھا کر گھنٹی بجا کر کہتا ہے پر بھور بڑی گھنٹائیوں میں پھنسن گیا ہوں میرا یہ کام کر دے۔ پھر تیری سیوا کرتا رہوں گا تیرے چہنوں میں پڑا رہوں گا۔ گویا یہاں پر بھی پہلے اپنی بات کرتا ہے انسان بڑا مطلب پرست ہوتا ہے۔

اس نے کہا۔ ”تم ویرانے اور کھنڈرات میں رہو گے تمہاری غذا انسانوں سے الگ ہے تم ان کے قریب نہ جاؤ اور ان سے رابطہ نہ کرو۔“ کس میں اتنی جرأت تھی کہ اس کی بات کو نہ مانے میرے دل میں اس کی باتیں اتر گئیں میں نے اس کو اپنا استاد مان لیا انسان کو انسان کہتے تھے اور جنات اس کو جن کہتے تھے وہ کون تھا کہاں سے آیا تھا اس کی باتیں آج تک میں یاد کرتا ہوں۔

”آخر وہ عظیم ہستی اس کے بعد کہاں چلی گئی۔“ جالموش نے پوچھا۔

”اس کے آنے اور جانے کے بارے میں کوئی نہیں جانتا مگر اس کے اصولوں پر جنات اور انسان آج بھی چل رہے ہیں جو اس کے قاعدے کو توڑتا ہے وہ ضرور نقصان اٹھاتا ہے میں تم سے کہوں کہ تم خطا وار ہو تو بولوم کیا کہو گے۔“ استاد محترم نے پوچھا۔

”آپ کا حکم میں کسی جیلہ بہانے کے بغیر مان لوں گا۔ یہ بے شک درست ہے کہ اس کہانی کا آغاز میری طرف سے ہوا ہے، رشیدان کو نوکرائی بنانے کو میں لایا تھا اور اس کے بعد کی تمام باتیں میری غلطی سے جڑی ہیں۔ آج میں اس مقام پر کھڑا ہوں کہ میں نہیں جانتا کہ میری بیوی فرمانہ کہاں پر ہے اور کس حال میں ہے۔“

جالموش نے اعتراف کیا۔ ”میری تعلیمات کا اثر تم پر ہے میں تم سے ناخوش بھی ہوں۔ تم سے جو غلطی ہوئی ہے یہ مادہ کے لئے زلزلتا آیا ہے اور زلزلتا رہے گا تو کتنا بھی عقل کل ہوتا غلطی تو ضرور کرتا مگر کوئی بات عقل دانش سے دور نہیں ہوتی ہر مسئلے کا حل طاقت نہیں ہے ہزاروں مثالیں ہیں کہ آدمی طاقت کے ذریعہ حالات کو خراب کرتا ہے اور گفتگو کے ذریعہ بڑے سے بڑے مسئلے کو حل کرتا ہے۔ تیرے لئے صرف ایک راستہ ہے کہ تو جنگ کی باتیں طاقت کی باتیں نہ کرے اور اپنی غلطی کو بر ملا تسلیم کرے یہ تجھے کسی اور کے سامنے نہیں کرنا ہے میرے پاس تو موجود ہے کیا تو اپنی خطا کو تسلیم کرتا ہے اور میرے

آئے کتنے اللہ کے نیک بندے آتے رہے ہیں مگر انسان کی فطرت خدہ ہے، وہ وہی کرتا ہے جو کرنے سے روکا جاتا ہے مگر اس کے باوجود دنیا نیک لوگوں سے خالی نہیں ہے سب اپنا کام کر رہے ہیں شیطان بھی اپنا کام کر رہا ہے۔“
 ”دوست کہا آپ نے جنات میں بھی یہی حال ہے ان کو ایک لیکر دے دی گئی ہے مگر شریک ہند اس کی پرواہ نہیں کرتے اور تصادم کی صورت پیدا ہو رہی جاتی ہے۔ مگر انفرادی اور اجتماعی تصادم میں فرق ہے میں کسی کو چھڑانے یا ان کی معافی کے لئے نہیں آیا ہوں میرا مطلب اس لڑائی کو روکنا ہے جو انسانوں اور قوم جنات میں بہت معمولی بات پر ہونے جارہی ہے۔“ استاد نے کہا۔

”میرے محترم دوست آپ کے دل میں اپنی قوم کے لئے نرم گوشہ تو ہونا ہی چاہئے مگر میں سمجھتا ہوں آپ انسانوں کے لئے اسی انداز میں سوچتے ہیں۔ آپ کو حالات کا اندازہ ہوگا آپ پوری معلومات کے بعد آئے ہوں گے ابتدا کہاں سے ہوئی اور اس غلطی کو آگے بڑھانے میں کس کا ہاتھ تھا۔ ہماری طرف سے حسن سلوک اس لئے کہ رشیدین کے ساتھ سوائے اس کے کہ اس کو نوکرائی بنایا گیا اس کے علاوہ اس کو ہر طرح آرام پہنچایا گیا، آپ کے دو سپاہی اور محترم خاتون ج کہ اس کہانی کے محرک بھی ہیں ان کو عزت اور احترام کے ساتھ رکھا گیا ہے کیونکہ وہ اس کی مستحق بھی تھیں ان سے کسی نے کچھ نہیں پوچھا مجھے سردار جابلوش کے آنے کی امید تھی مگر آپ نے آ کر میری عزت بڑھادی آپ حکم کریں اور خود فیصلہ سنا دیں مجھے منظور ہوگا۔“ رولوکا بولا.....

”میرے بہادر دوست تم نے میرا مان رکھ کر مجھے خرید لیا ہے۔ میں اس بات پر شرمندہ نہیں ہوں گا کہ میں خود تمہارے پاس آیا۔ میری قوم نے غلطی کی ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں۔“ استاد نے کہا۔

”بہادر لوگ ہی اعتراف شکست کرتے ہیں ان کا اعتراف ان کی بہادری کی دلیل ہوتا ہے۔“ رولوکا بولا.....

استاد محترم انسان نہیں تھا اس کے سوچنے کے انداز اور طرز زندگی انسانوں سے الگ تھا مگر نیکی اور بدی کے بارے میں اس کے نظریات انسانوں سے قریب تھے اور جو ہزاروں سال سے طریقہ کار چلا آ رہا تھا جب اس کی خلاف ورزی کوئی کرتا تھا تو مصیبت آتی تھی پریشانیاں آتی تھیں استاد سمجھ چکا تھا کہ قوم جنات پر یہ سخت وقت ہے کیونکہ انہوں نے غلطی کی ہے اور اپنی اس غلطی کو ختم کرنے کے بجائے فرخانہ نے اس کو جاری رکھنے کی بھی ضد کی ہے وہ فرخانہ یا اس کے سپاہیوں کو چھڑانے کی بھی کوشش کرتا چاہتا تھا۔

اس نے کان پور میں قوم کو کھا اور رولوکا کو خبر ہو گئی۔ رولوکا اس کا مقام اور مرتبہ جانتا تھا تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ اس کے استقبال کو خود نہ آئے۔ وہ حکیم کامل کے روپ میں اس کے سامنے کھڑا تھا اور استاد محترم چہواہے کے روپ میں اس کے سامنے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پرکھ لیا تھا وزن کر لیا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ وزن دار تھے۔ دونوں کے نظریات میں ہم آہنگی تھی۔ دوستی اور محبت کے جراثیم تھے دونوں کے اصل روپ چھپے ہوئے تھے مگر پھر بھی ایک دوسرے کے بارے میں اندازہ ٹھیک ٹھیک لگا رہے تھے۔ دونوں کی خاموشی دونوں کی زبان تھی۔ رولوکا آگے بڑھ کر بولا۔ ”محترم دوست مجھے آپ کا ہی انتظار تھا۔“

استاد نے کہا۔ ”تم صاحب بصیرت ہو، اس کے ساتھ ساتھ صاحب بصارت بھی ہو تم اندر باہر ہر طرف دیکھ سکتے ہو میرا تجربہ اور عمر مجھے بتاتی ہے میری زندگی میں تم جیسے بہت کم آئے۔ میں دو سو سال کے بعد اپنے مقام سے باہر آیا ہوں صرف اپنی قوم کی ایک غلطی کی معافی کی خاطر۔“

رولوکا نے کہا۔ ”میں جنات کے بارے میں کیا کہوں کیونکہ میں آپ سے زیادہ نہیں جانتا مگر انسان کے بارے میں اتنا جانتا ہوں کہ ابتدائے تہذیب سے دیکھ لیں۔ آج تک انسان کو سمجھانے کتنے دانا آئے کتنے پیغمبر

”سردار جالموش کے سارے جھگڑے ختم ہوئے۔“ استاد محترم بولے۔

”سردار جالموش سے کوئی جھگڑا تھا ہی نہیں ان کی بیگم کی ضد تھی مگر اب ان سے کوئی بھی جھگڑا نہیں ہے آپ ان کو عزت و احترام کے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔“ رولوکا بولا.....

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ چتوڑ کی طرف سے تم کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“ استاد نے کہا۔

”بہت شکریہ میرے محترم دوست۔“ رولوکا نے جواب دیا اور استاد محترم چلے گئے۔

رولوکا نے مرزا کو کہا۔ ”لو مایاں اب ہمارا کچھ کام نہیں رہا تم جہاں چاہو رشیدن کی شادی کر دو اب کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔“

مرزا نے گردن جھکا کر کہا۔ ”میں آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔“

رولوکا زور سے ہنس پڑا اور بولا۔ ”میری بہترین خدمت یہ ہے کہ تم روزانہ کوئی نیکی کر دیا کرو چاہے چھنی معمولی ہو۔ یہ میرے لئے بہت بڑی خدمت ہوگی۔“

مرزا نے حیرت سے رولوکا کو دیکھا، رولوکا مسکرا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

دنیا کے کسی گوشے میں آپ جائیں لوگ جادو اور شیطان کے ٹھوس وجود کو مانتے ہیں۔ یورپ میں ڈریکولا کے بارے میں ہزاروں کہانیاں لکھی جا چکی ہیں۔ شیطان پرستی پہلے بھی تھی اور آج بھی موجود ہے۔

ترقی یافتہ شہروں میں بھی شیطان پرستی ایک زندہ قوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ آج متدن شہروں میں کچھ لوگ سحر جادو کے شکل میں اسی طرح خفیہ طور پر مشغول رہتے ہیں جس طرح افریقہ کے پراسرار گوشوں میں جشی اور نیم وحشی انسان غلطی عملیات میں مصروف رہتے ہیں۔ شہروں میں بڑے بڑے بورڈ آپ کو نظر آئے ہیں جو کہ عملیات کرنے والوں کے ہیں ہر بگڑے کام کو یہ درست کرنے کا دعویٰ

کرتے ہیں ناراض محبوبہ کو پل بھر میں قدموں میں لانے کا دعویٰ کرتے ہیں یہ شیطانی علم یا ہمزاد کے ذریعہ اپنا کام کرتے ہیں مگر کتنے حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر دور ہوتے ہیں جو کچھ نہیں کرتے صرف انسانی نفسیات سے کھیلتے ہیں۔ یہ جرب زبان اور اپنے بہرہ ور سے انسانوں کو متاثر کرتے ہیں ان کے پھیلانے جال میں بھولی بھالی عورتیں زیادہ آتی ہیں۔

جو دھپور سے چندہ بیس میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی آبادی ہے۔ ”کنارای“ اس کا نام ہے اس جگہ کی زیادہ اہمیت نہیں ہے اس لئے کہ یہاں پر آبادی زیادہ نہیں ہے مگر شدید ہونی ہے پانی کی دستیابی بھی مشکل ہے، کنوؤں میں پانی ختم ہو جاتا ہے چاروں طرف ریگستان ہے اور گرم ہواؤں کے ساتھ ریت اڑ کر جسم پر پڑتی ہے تو آدمی بے چین ہو جاتا ہے غربت بہت ہے کم لوگ گرمیوں کے موسم میں یہاں پر رہتے ہیں ان کا گزارہ گزرتی گاڑیوں اور مسافروں پر ہے، ایک بازار اب سرک ہے۔ گاڑیاں رکتی ہیں تو مقامی لوگ دوڑ کر ان کے قریب جاتے ہیں اور مسافروں کی خدمت کرتے ہیں اور کچھ پاتے ہیں۔ چائے کے ایک دو خستہ حال ہوٹل ہیں اور ایم چیز ایک پیٹرول پمپ ہے اس میں دو ملازم ہیں ایک بوڑھا کیشیئر جس کا نام کش لال اور ایک پیٹرول ڈالنے والا نوجوان اس کا نام رامو ہے۔

بوڑھا کش لال کچھ نہیں کرتا سارا کام رامو کرتا ہے ایک بڑا پمپ اس کے پاس ہے اس کے ذریعہ بیروں سے چلا کر بڑی محنت سے وہ ہوا بھی بھرتا ہے یہ پمپ کسی مستری کی ایجاد ہے مگر رامو اس کو چلا چلا کر اس کا ماہر ہو گیا ہے پوری ہوا بھرنے پر دو آنے دے لیتا ہے اگر پیچھے ہو تو اس کے پیسے الگ، مشکل کام ہوا بھرتا ہے۔ کشن لال رامو کی محنت میں سے بھی کچھ نہ کچھ روزانہ لے ہی لیتا ہے۔

گرمیوں میں لو اور ریت کے گرم ذرات انسان کو بے حال کرتے ہیں تو سردیوں میں راتیں بہت ٹھنڈی ہوتی ہیں، برسات میں کچھ چین ملتا ہے مگر زیادہ جھڑی لگ

جائے تو الٹی مصیبت گلے پڑ جاتی ہے۔ ان حالات میں کون یہاں پر رہ سکتا ہے۔ کناری کی آبادی روز بروز کم ہو رہی ہے۔

اس بازار میں سال میں تین دن بڑی رونق ہوتی ہے، تین دن تک عارضی دوکانیں بھی لگ جاتی ہیں۔ ہار پھول اور بتاشے، ریوڑی کی نئی دوکانیں آ جاتی ہیں اطراف کے گاؤں سے بھیڑ بکریاں بھی آ جاتی ہیں، لہذا یہ تین دن اپنے پورے رونق پر ہوتے ہیں۔ یہاں پر ایک میلا لگتا ہے اس کا نام ہے لال کا میلا، کناری کے بازار سے فرلانگ جنوب کی جانب ایک کنواں بنا ہوا ہے وہ کنواں کس نے بنایا تھا اور کیوں بنایا تھا؟ کسی کو پتہ نہیں ہے۔ یہ کنواں بہت چوڑائی لئے ہوئے ہے اور گہرائی بھی پچاس فٹ سے کیا کم ہوگی اس کے کنارے بیس فٹ کی دوری پر ٹوٹی پھوٹی باولیاں بنی ہیں جو کہ جگہ جگہ سے گری ہوئی ہیں اس طرح عام دنوں میں کوئی نہیں آتا مقامی لوگ تو کسی کام سے بھی ادھر نہیں جاتے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں پر رات میں بڑی عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں، کنویں کے چاروں طرف آدمی پھرتے نظر آتے ہیں اور وہ نہ معلوم کس زبان میں باتیں کرتے ہیں۔

کسی کو نہیں پتہ کہ لال کون تھا؟ ہندو تھا مسلمان تھا کیا کرتا تھا؟ ایک زمانہ گزر گیا کسی نے غور نہیں کیا تھا کسی کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ ان معاملات پر غور کرتا مقامی آبادی کو تو روٹی کی فکر ہی بہت تھی دوسرے علاقے کے لوگوں کے لئے یہ اتنی اہمیت کی بات نہ تھی۔

جو گندر سنگھ نوجوان آدمی تھا بڑا بڈرا، وہ ٹرک ڈرائیور تھا ایک شہر سے دوسرے شہر روزانہ سفر کرتا تھا، دلی سے چلتا تھا چودھوڑے پورا اور راجستھان کے کئی شہروں میں مال پہنچاتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا کلیئر شولو پرشاد ہوا کرتا تھا، جتنا بہادر جو گندر تھا شولو اتنا ہی ڈر پوک تھا۔ دونوں جوان تھے اور رات میں سفر کرتے تھے دن میں کسی بھی ٹھکانے پر رک جاتے تھے کیونکہ راجستھان میں دن میں گرمی شدید ہوتی ہے اور گاڑی گرم ہو جاتی ہے انجن

کے علاوہ ٹیوب کے پرانے پمپ بھی لیک کر جاتے ہیں اتفاق سے جو گندر کو کنارے آتے آتے شام ہوگئی کنارے کا بازار سونا ہو گیا بوڑھا پیٹرول پمپ کا کلیئر بھی چلا گیا اکیلا رامو پیٹرول پمپ پر موجود تھا جو گندر نے گاڑی وہیں پر ایک طرف کھڑی کر دی اور آواز دی، ”ارے اوشلو پرشاد“ جو گندر نے پھر آواز دی، شولو ٹرک کے اوپر سے اتر کر آ گیا بولا۔ ”کہو استاد کیا بات ہے۔“

”ارے بات کیا ہوگی، آگے تو اب جانے سے رہے رات یہیں گزاریں گے تو ذرا دیکھ تو بازار میں کچھ ہے کھانے کو۔“

شولو کے جانے سے پہلے ہی۔ رامو بولا۔ ”ارے کبابت کرے ہو بھایا، سب بند ہے رات ما کون رکے ہے۔“

”ابے تو کیا بھوکا سونا پڑے گا۔“ جو گندر خود سے بولا.....

”لاگت تو ای ہے۔“ رامو بولا۔ ”تو کچھ کر سکتا ہے، میں تجھے پیسے دوں گا بول۔“ جو گندر نے بوچھا۔

”کوشش کروں ہوں۔ شاید کچھ ہو جائے۔“ رامو بولا۔

”تو یہ پکڑ ایک روپیہ اور جو ملے لے آ۔“ جو گندر بولا۔

”تم میری کھاٹ پر بیٹھو، ذرا ستالو، میں جات ہوں بس ذرا خیال رکھنا۔“

”ہاں، ہاں تو جابا میں اور شولو ہیں۔“ آدھے کھنے کے بعد رامو آ گیا۔ باجرے کی چار موٹی موٹی روٹی اور آم کا چار ایک منگی میں لسی لے کر، روٹی گرم گرم تھیں۔ بولا۔ ”لو بھایا جلدی کھا لو تازی پکوائی ہے۔“

جو گندر اور شولو نے چار پائی پر روٹی رکھی اور آم کے اچار سے کھانے لگے روٹی گرم تھی اور بھوک تیز اچار

بولی۔

رامو پولہ۔

.....

نے کہا۔

بولی۔

”اچھا تو جائے گا لہر۔ جو کندر بولا۔

سویرے کرے ن لال اوے ہوا اھاوے ہ۔ راجو
نکا

رامو نے دن بھر میں بارہ آنے کمائے تھے
دوروے جو ملے تو اس کی طبیعت میں ترنگ آ گیا مسکرا کر
بولے۔

سویرے کشن لال نے اس کو اٹھا دیا بولا۔ ”کون ہے رے..... ارے جو گندر کا رات میں سفر کرنا چھوڑ دیا کہہ سوتے پڑے ہو۔“ کشن لال بولا۔

.....

بولے: "لو وہ آ گیا۔"

چند روز گزشتہ کہ لوالہ ”بات تو آدمی کا مسلک سے تیری“

جائے تو الٹی مصیبت گلے پڑ جاتی ہے۔ ان حالات میں کون یہاں پر رہ سکتا ہے۔ کناری کی آبادی روز بروز کم ہو رہی ہے۔

اس بازار میں سال میں تین دن بڑی رونق ہوتی ہے، تین دن تک عارضی دوکانیں بھی لگ جاتی ہیں۔ ہار پھول اور بتائے، ریوڑی کی نئی دوکانیں آ جاتی ہیں اطراف کے گاؤں سے بھیڑ بکریاں بھی آ جاتی ہیں، لہذا یہ تین دن اپنے پورے رونق پر ہوتے ہیں۔ یہاں پر ایک میلان لگتا ہے اس کا نام ہے لال کا میلا، کناری کے بازار سے فرلانگ جنوب کی جانب ایک کنواں بنا ہوا ہے وہ کنواں کس نے بنایا تھا اور کیوں بنایا تھا؟ کسی کو پتہ نہیں ہے۔ یہ کنواں بہت چوڑائی لئے ہوئے ہے اور گہرائی بھی پچاس فٹ سے کیا کم ہوگی اس کے کنارے بیس فٹ کی دوری پر ٹوٹی پھوٹی باولیاں بنی ہیں جو کہ جگہ جگہ سے گری ہوئی ہیں اس طرح عام دنوں میں کوئی نہیں آتا مقامی لوگ تو کسی کام سے بھی ادھر نہیں جاتے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں پر رات میں بڑی عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں، کنویں کے چاروں طرف آدی پھرتے نظر آتے ہیں اور وہ نہ معلوم کس زبان میں باتیں کرتے ہیں۔

کسی کو نہیں پتہ کہ لال کون تھا؟ ہندو تھا مسلمان تھا کیا کرتا تھا؟ ایک زمانہ گزر گیا کسی نے غور نہیں کیا تھا کسی کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ ان معاملات پر غور کرتا مقامی آبادی کو تو روٹی کی فکر ہی بہت تھی دوسرے علاقے کے لوگوں کے لئے یہ اتنی اہمیت کی بات نہ تھی۔

جو گندر سنگھ نوجوان آدی تھا بڑا نڈر، وہ ٹرک ڈرائیور تھا ایک شہر سے دوسرے شہر روزانہ سفر کرتا تھا، دلی سے چلتا تھا چودھپور جے پور اور راجستھان کے کئی شہروں میں مال پہنچاتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا کلینر شولو پرشاد ہوا کرتا تھا، جتنا بہادر جو گندر تھا شولو اتنا ہی ڈر پوک تھا۔ دونوں جوان تھے اور رات میں سفر کرتے تھے دن میں کسی بھی ٹھکانے پر رک جاتے تھے کیونکہ راجستھان میں دن میں گرمی شدید ہوتی ہے اور گاڑی گرم ہو جاتی ہے انجن

کے علاوہ ٹیوب کے پرانے پمپ بھی لیک کر جاتے ہیں اتفاق سے جو گندر کو کنارے آتے آتے شام ہوگئی کنارے کا بازار سونا ہو گیا بوڑھا پیٹرول پمپ کا کیشیر بھی چلا گیا اکیلا رامو پیٹرول پمپ پر موجود تھا جو گندر نے گاڑی وہیں پر ایک طرف کھڑی کر دی اور آواز دی، ”ارے اوشو لو پرشاد۔“ جو گندر نے پھر آواز دی، شولو ٹرک کے اوپر سے اتر کر آ گیا بولا۔ ”کہو استاد کیا بات ہے۔“

”ارے بات کیا ہوگی، آگے تو اب جانے سے رہے رات یہیں گزاریں گے تو ذرا دیکھ تو بازار میں کچھ ہے کھانے کو۔“

شولو کے جانے سے پہلے ہی۔ رامو بولا۔ ”ارے کابات کرے ہو بھایا، سب بند ہے رات ما کون رکے ہے۔“

”ابے تو کیا بھوکا سونا پڑے گا۔“ جو گندر خود سے بولا۔۔۔۔۔

”لاگت تو ای ہے۔“ رامو بولا۔

”تو کچھ کر سکتا ہے، میں تجھے پیسے دوں گا بول۔“

جو گندر نے پوچھا۔

”کوشش کروں ہوں۔ شاید کچھ ہو جائے۔“ رامو بولا۔

”تو یہ پکڑ ایک روپیہ اور جو ملے لے آ۔“ جو گندر بولا۔

”تم میری کھاٹ پر بیٹھو، ذرا سستالو، میں جات ہوں بس ذرا خیال رکھنا۔“

”ہاں، ہاں تو جا، میں اور شولو ہیں۔“

آدھے گھنٹے کے بعد رامو آ گیا۔ باجرے کی چار موٹی موٹی روٹی اور آم کا چار ایک منگی ملی لسی لے کر، روٹی گرم گرم تھیں۔ بولا۔ ”لو بھایا جلدی کھا لو تازی پکوائی ہے۔“

جو گندر اور شولو نے چار پائی پر روٹی رکھی اور آم کے اچار سے کھانے لگے روٹی گرم تھی اور بھوک تیز اچار

اور روٹی نے دونوں کو بڑا مزہ دیا لیسی پی کر دونوں ست ہو گئے جو گندر بولا۔ ”بھئی مزہ آ گیا آج تو۔“
 رامو بولا۔ ”میرا گھر قریب ہی ہے میں نے گھر جا کر روٹی پکوائی اور لے آیا۔ لیسی تو تھی ہی۔“
 جو گندر بولا۔ ”تیری گھر والی نے روٹی پکائی ہے۔“
 ”ہاں اور کون پکا تا بازاری تو کچھ ملنے سے رہا۔“ رامو بولا۔

”یار اتنی جلدی یہاں پر سنا تا چھا جاتا ہے۔“
 ”کا کریں ڈرائیور صاحب ڈرت ہیں سب۔“
 رامو بولا۔

”کس بات کا ڈر۔“ جو گندر بولا۔
 رامو جو گندر کے قریب آ کر بولا۔ ”ارے وہ لال کا کنواں ہے یہاں پر وہ بڑی خطرناک جگہ ہے۔“
 ”اے تو کیا بھوت پریت ہیں کنویں پر۔“ جو گندر بولا۔

”لاگت تو ایسا ہی ہے استاد۔“ رامو نے کہا۔
 ”ارے کیا تم لوگ بڑے ڈر پوک ہو؟“ جو گندر نے کہا۔

”نہ مانو! پر یہ بات سچ ہے کہ کنویں پر رات کو کوئی نہیں جاتا اور جو گیا وہ واپس نہیں آیا اور جو بھی آ گیا تو پاگل ہو کر آیا سب بڑوں سے یہی سنا ہے بھائی۔“ رامو بولا۔

”یہ کنواں کیوں بنایا تھا اور کس نے بنایا تھا کچھ اس کا بھی پتہ ہے۔“ جو گندر نے پوچھا۔
 ”میں کا بتاؤں سویرے چا چاشن لال آوے گا وہ پرانا آدمی ہے شاید وہ بتلائے دے۔ پر مونے تو ایسا لاگت ہے کہ شاید ہی بتلائے۔“ رامو بولا۔

”اچھا تو جانے گا گھر۔“ جو گندر بولا۔
 ”جو روا کیلی رہے گی نہ جاؤں گا تو فکر کرے گی میں سب تالے ڈالے دیتا ہوں میری کھاٹ پر سو جاؤ سویرے تڑکے کن لال آوے گا تو اٹھا دے گا۔“ رامو نے کہا۔

”اچھا تو پھر جب تو آئے تو لیسی اور روٹی لے آئیو اور سن روٹی پر ذرا کھن چڑا دینا سواد آ جائے گا یہ لے پکڑ اپنی جو رو کو دے دینا۔“ جو گندر نے ایک روپیہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔
 رامو نے دن بھر میں بارہ آنے کمائے تھے دو روپے جو ملے تو اس کی طبیعت میں تڑک آ گیا مسکرا کر بولا۔

”تو فکر نہ کر بھائی مزہ آ جائے گا۔“ اس کے جانے کے بعد جو گندر کھاٹ پر لیٹ گیا اور شلو ٹرک پر پڑھ گیا اور دونوں بے خبر سو گئے۔

سویرے کشن لال نے اس کو اٹھا دیا بولا۔ ”کون ہے رے۔۔۔۔۔ ارے جو گندر کا رات میں سفر کرنا چھوڑ دیا کہ سو تے پڑے ہو۔“ کشن لال بولا۔

”ارے چا چا کیا بتاؤں پرانی گاڑی ہے مالک سر خرچ کرنے پر تیار نہیں تھوڑا تھوڑا چلتا ہوں تم کو پتہ ہے راجستھان کی سڑک پر تو پانی نہیں ملتا سوائے ریت کے بیچ میں کبھی پھنس گئے تو کون مدد کرے گا اس لئے رک گیا تھا اب دن میں تھوڑا تھوڑا کر کے آگے چلوں گا یہ ماتو پہنچانا ہے۔“ جو گندر بولا۔

”تو میرے جانے کے بعد آیا شاید۔“ کشن لال بولا۔
 ”ہاں رامو نے بتایا تھا، رامو نہیں آیا ابھی تک۔“ جو گندر نے پوچھا۔

”آتا ہی ہوگا کیوں کچھ کام ہے؟“ کشن بولا۔
 ”میری اور شلو کی روٹی لائے گا گھر سے میں نے کہہ دیا تھا۔“ جو گندر نے بتایا۔

اتنے میں رامو سانسے سے آنا نظر آ گیا کشن لال بولا۔ ”لودہ آ گیا۔“

رامو نے روٹی کی پوٹلی کھاٹ پر رکھ دی اور لیسی کی مٹکی زمین پر رکھ کر بولا۔ ”اب جلدی کھالے گرم گرم روٹی پر کھن، چڑک لایا ہوں اور بڑا بڑھیا چار بھی رکھ دیا ہے۔“ جو گندر خوش ہو کر بولا۔ ”یا تو آدمی کام کا ہے تیری

گھر والی نے غصہ تو نہیں کیا۔“

کیا تھا وہ بھی جاٹ ہی تھے۔ لال خان جوان ہوا تو اس نے گاؤں کے لوگوں کی حالت دیکھی ہر آدمی پریشان تھا وہ خود بھی کم پریشان نہ تھا اس سے بڑی دو بہنیں راجہ کے آدمی لے گئے تھے۔ وہ اکیلا بوڑھے باپ کے ساتھ تھا دن بھر ریگستان میں بکریاں چراتا پھرتا تھا رات کو تھکا ہارا آتا تو کوئی نہ کوئی گاؤں میں ٹٹا سنتا، وہ کیا کر سکتا تھا وہ کڑھتا رہتا اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کسی سے جھگڑا کرتا بچپن خوف کے عالم میں گزرتا تھا ڈرا سکے اندر موجود تھا وہ کبھی کبھی سوچتا ضرور تھا کہ بھگوان نے اس کو کیوں پیدا کیا ہے صرف ظلم سہنے کے لئے ہمارا کیا قصور ہے ہم نے کسی کا کیا گناہ کیا ہے، ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیوں ہوتا ہے راجہ کے محل میں کیا کمی ہے کہ وہ ہمارے جانور لے جاتا ہے عورتوں کی کیا کمی ہے کہ عورتیں لے جاتا ہے مگر اس کے پاس ان سب باتوں کا جواب نہ تھا وہ بہت خاموش طبیعت کا جوان تھا کہتا تھا سوچتا زیادہ تھا۔

ایک دن دو پہر میں وہ ایک بیری کے نیچے اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کے چاروں طرف اس کی بکریاں چر رہی تھیں وہ جت پڑا تھا دور دور کسی انسان کا پتہ نہ تھا اس کی آنکھ لگ گئی۔ پتہ نہیں کتنی دیر گزری تھی کہ کسی نے اس کو آواز دیکر اٹھا دیا اس کے سامنے ایک ننگ ڈھرنگ آدمی موجود تھا۔ اس آدمی کے بدن صرف ایک دھبی نما کپڑا نیچے بدن پر تھا بال اس کے بڑے بڑے اور انہوں نے اس کا آدھا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ بدن پر چل کی کالک نظر آتی تھی مگر آواز کڑک دار تیز سی لال اٹھ کر بیٹھ گیا بولا۔

”کاپات ہے بابا جی کا بھوکے ہو؟“

وہ اجنبی پاگل نما آدمی اپنی گود جا آواز میں بولا۔ ”تین دن سے بھوکا ہوں کچھ ہے تیرے پاس تو دے۔“ لال بولا۔ ”دو روٹی ہیں میرے پاس وہ تم کھا لو..... کہو تو بکری کا دو دھنکال دوں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے دے جلدی سے۔“ وہ پھر

بولا.....

لال خان نے بیری کی شاخ پر لٹکتی پوٹلی کھولی اور

”ارے نہیں بھایا وہ تو روپیہ پا کر ناچن لاگی بہت دنوں بعد اس کے ہاتھ میں پورا روپیہ آیا تھا۔ بولی بڑا دیا لو ڈر پور ہے پورا روپیہ دے دیا۔“ رامو بولا۔

”میرا خرچ گاری کے خرچ میں لگ جاتا ہے اس لئے کھلا کھاتا ہوں مالک سسر اکہاں دینے والا ہے۔“ جو گندر نے کہا۔

اور پوٹلی کھول کر آواز دی۔ ”شلو آ جائیں تو سب کھا جاؤں گا۔“

کشن لال اس کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا تو

جو گندر بولا۔ ”چاچا یہ تو بتا یہ لال کے کنویں کا کیا چکر ہے؟“

”تو کیا کرے گا پوچھ کر بھاری چکر ہے۔“ کشن

لال بولا.....

”ارے بتا تو کچھ پتہ تو چلے۔“ جو گندر بولا.....

”میرے پرکھوں نے مجھے بتایا تھا کہ برابر کے گاؤں میں ایک مسلمان رہتا تھا، اس کا نام لال خان تھا

بہت غریب تھا یہ وہ زمانہ تھا جب لاری موٹر نہیں چلی تھی جو جس گاؤں میں پیدا ہوا وہیں مر گیا، بس وہی گاؤں اس نے دیکھا غربت بہت زیادہ تھی راجہ کے ہر کارے

گھوڑوں پر گاؤں گاؤں پھرتے تھے اور ہر آدمی کے گھر کا حال جانتے تھے کس گھر میں کتنی چھوری ہیں ان کی عمریں

کیا ہیں کب کون سی جوان ہونے والی ہے۔ ان کے خلاف کوئی نہیں بولتا تھا وہ ان غریب لوگوں کے بھگوان بنے ہوئے تھے۔ کوئی چیز غریب کی محفوظ نہیں تھی نہ ڈھوڑ

نگر نہ عورت ان کے نزدیک عورت اور بکری میں فرق نہ تھا وہ جس طرح بکری کو گھوڑے پر ڈال کر لے جاتے تھے اسی طرح لڑکی کو لے جاتے کوئی ان کے خلاف آواز نہ اٹھاتا

اور جو اٹھاتا تو مارا جاتا۔ گاؤں کے غریب تو سسے کے ستائے تھے۔ لال خان اس برے سسے میں پیدا ہوا اس کے گاؤں میں سب جاٹ رہتے تھے بس ایک دو گھر مسلمانوں کے تھے مسلمان

اس کے سامنے رکھ دی وہ آدمی بہت بھوکا تھا فوراً کھانے لگا لال خان اٹھ کر گیا اور ایک گول لوٹے میں ایک بکری کا دودھ نکال کر لے آیا۔

اجنبی نے لوٹے کو منہ سے لگایا اور پورا پی گیا تو لال بولا۔ ”اور لے آؤ کہو تو“

”ہاں تیری مہربانی۔“ لال پھر دوسری کا دودھ لے آیا اجنبی روٹی تو ختم کر چکا تھا، اس کو بھی پی گیا اس طرح وہ تمام بکریوں کا دودھ پی گیا لال خان نے اس کا پیٹ بھر دیا۔

”تیری ساری بکریوں کا دودھ میرے پیٹ میں چلا گیا تو کیا کرے گا۔“ اجنبی بولا۔۔۔۔۔

”تو کیا ہوا ارے تیرا پیٹ تو بھر گیا، میرا کا ہے ایک دن نہ ملے گا تو گزارہ کر لوں گا۔“ لال بولا۔۔۔۔۔

”تو نے میری بڑی خدمت کر لی ہے اب میں تیری خدمت کروں گا۔“ اجنبی نے کہا۔

”ارے سادھو مہاراج میں غریب آدمی اور تمہاری حالت تو میرے سامنے ہے کا خدمت کرو گے۔“

”میری حالت پر مت جا تو کب تک ظلم برداشت کرے گا تیرا کیا ہے سب راجہ کا ہے، تیری بھیڑ بکریاں بھی

راجہ لے جائے گا، تیری جو رو کو بھی لے جائے گا، تیرے پاس کیا رہے گا، بھوک بیماری کمزوری اور تو ایک دن ظلم کی چلی ہیں پتے پتے اس زمین کے اندر چلا جائے گا، بول

میں نے جھوٹ کہا ہے۔“ اجنبی نے پوچھا۔

لال خان بولا۔ ”سادھو مہاراج پر نہ میرے بس میں کچھ ہے نہ میں کچھ کر سکتا ہوں، اس دنیا میں میرا کام ظلم

سہنا ہے وہ میں ہوں گا، راجہ کا کام ظلم کرنا ہے وہ کرے گا میں بھی مجبور ہوں وہ بھی مجبور، دونوں اپنا اپنا کام کر رہے ہیں یہ تو نصیب کی بات ہے؟“

”جھوٹ بولتا ہے تو۔“ سادھو جلدی سے بولا

”تیری سوچ غلط ہے، یہ سوچ تیرے ماحول کی پیداوار ہے، ایسا نہیں ہے آدمی بہت کچھ کر سکتا ہے تو ظالم بن سکتا ہے اور ظالم مظلوم بن سکتا ہے، ہر چیز بدل سکتی ہے، پراس

میں محنت اور کوشش کرنا پڑتی ہے، ہمت کی ضرورت پڑتی ہے تو پکڑے گا ہمت بول۔“

لال خان بولا۔ ”ہمت تو کر لوں گا مگر مجھے تو اندھیرا ہی نظر آوے ہے۔“

”اس اندھیرے کو تو دور کر سکتا ہے۔“

”کہو سادھو مہاراج کہ میں کیا کروں؟“

”میں جو کہتا ہوں تجھے وہ کرنا ہے اس کام میں تیرے لئے مشکلات تو بہت ہیں مگر تو کر سکتا ہے۔ اس کام

کو کرنا بہت مشکل ہے مگر تیرے جیسے حالات کا آدمی ہی یہ کرتا ہے کیونکہ اس کی زندگی تو پہلے ہی گھٹنا یوں میں گھری ہوئی ہے آسان زندگی بسر کرنے والا ہر گز ہر گز یہ مشکل کام نہیں کرتا۔“

”مجھے کیا کرنا ہوگا سادھو مہاراج۔“ لال خان بولا۔

”میری بات غور سے سن، انسان کے شریر میں روحیں ہوتی ہیں ایک زندگی کی روح ہے جو کہ اس وقت

شریر میں آتی ہے جب بچہ ماں کے پیٹ میں چھ مہینے کا ہوتا ہے، یہ روح شریر سے باہر نہیں آ سکتی اس کے باہر

آنے کا مطلب انسان کی موت ہے۔ دوسری روح کا تعلق انسان کے شعور سے ہے ہم لوگ اس کو سیلانی روح

کہتے ہیں۔ انسان کے خوابوں کا تعلق بھی اس سے ہوتا ہے سونے کے دوران یہ سیلانی روح شریر سے باہر آ جاتی ہے

اور آزادانہ سفر کرتی ہے یہ ماضی میں چلی جاتی ہے اور پرانی باتیں دکھاتی ہے یہ خواب ہوتا ہے اس کے پھرنے پر

پابندی نہیں ہے انسان کے جاگنے پر یہ واپس آ جاتی ہے ہم اس کی ہمزاد بھی کہتے ہیں اس ہمزاد کو اگر جسم سے باہر

نکال لیا جائے تو تم اس سے بہت سے کام کروا سکتے ہو یہ تم کو وقت سے پہلے ہر بات سے آگاہ کر سکتا ہے یہ تم کو ہر

چیز دے سکتا ہے روپیہ پیسہ عورت ہر چیز تم کو لا کر دے سکتا ہے۔ یہ تمہارا بے دام غلام ہو جائے گا اس کو اپنے جسم سے

باہر نکالنا پڑتا ہے اور یہ آسانی سے نہیں نکلتا اس کے لئے کچھ پڑھنا پڑتا ہے، قبرستان میں قبروں پر بیٹھ کر اندھیری

”یہ تو بڑی مشکل بات ہے، میں کیسے کروں گا
 “لال گھبرا کر بولا۔

”اگر آسان کام ہوتا تو ہر کوئی اپنے ہمزاد کو خود
 سے الگ کر کے کالا مال نہ ہو جاتا، مشکل ہے اس لئے تو
 ہزاروں میں کوئی ایک کامیاب ہوتا ہے مگر میں دیکھ رہا
 ہوں تو ضرور کامیاب ہوگا تیرے حالات اور تیری طبیعت
 میں مجھے یہ خوبی نظر آ رہی ہے۔ میں تیرے ساتھ ہوں
 جلدی کی ضرورت نہیں ہے، تو نے مجھ پر احسان کیا ہے
 میں اس کے بدلے تجھے کچھ دینا چاہتا ہوں، میرے پاس
 یہی علم ہے میں تیرے سینے میں وہ متر اتار دوں گا کہ تو
 ہمزاد کو قابو کر لے گا مگر ایک بات یاد رکھنا یہ بات کبھی کسی کو
 نہ بتانا کہ تیرے پاس کیا ہے اور میرے بارے میں بھی
 کسی سے ذکر نہ کرنا، میں روز تیرے پاس آؤں گا، تیرا ڈر
 اور خوف دور کرنے جب تو چنی طور پر پوری طرح تیار ہوگا
 تب کام شروع کریں گے جو لوگ جلد بازی میں قبرستان
 چلے جاتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ میں تجھے
 کامیاب کرنے کو وہی طریقہ اختیار کروں گا جو کہ میرے
 گرو نے بتایا تھا۔“ سادھو مہاراج نے کہا۔

”گرو یہ بتاؤ تم نے اپنے ہمزاد کو قابو کر لیا ہے۔“
 لال نے پوچھا۔

”کر لیا تھا اور پھر آزاد کر دیا، میں اس منزل سے
 اوپر چوہو گیا تھا مجھے ہمزاد کی اور دنیا کی ضرورت نہیں رہی
 تھی، مگر وہ نہ کہا۔ بول کیا چاہئے دنیا کی دولت یا اس سے
 بڑی حکومت تو میں نے پوچھا بڑی حکومت کون سی ہے تو
 گرو نے کہا آزادی حکومت تو سارے دیش میں آزاد
 پنچھی کی طرح اڑے گا جہاں چاہے گا چلا جائے گا تجھ پر
 کسی کا حکم نہیں چلے گا تو اگر چاہے تو حکم چلا سکتا ہے تیرے
 پاس ہمتی ہے زور ہے، مایا تجھے باندھ دے گی تو پتھر کی
 طرح اس پر جم جائے گا۔ مایا ایسی چیز ہے جو جتنی آ جائے
 منش کو کم لگتی ہے اور وہ اور زیادہ کی طلب کرتا ہے لیکن میں
 نے کبھی مایا کی طرف آنکھ اٹھا نہیں دیکھا میں اس کے چکر
 سے دور ہوں میرا ہمزاد میرے قابو میں ہے مگر میں نے

راتوں میں تنہا رہنا ہوتا ہے ڈر خوف کو دور کرنا پڑتا ہے
 چالیس راتیں قبرستان میں گزارنا پڑتی ہیں شروع سے آخر
 تک تجھے اس کام سے روکنے کی کوشش کی جائے گی ڈرایا
 جائے گا تیرے سامنے تیرے عزیزوں کو لایا جائے گا ان
 کے ساتھ وہ کیا جائے گا جو تو برداشت نہ کر سکے اور اپنے
 کنڈل سے باہر آ جائے تیرا ہر آنا ہی تیری موت ہے۔
 کنڈل کے اندر تو محفوظ ہے باہر تیرے سامنے جو ہوگا وہ
 تجھے ڈرانے اور بہکانے کے لئے ہوگا، جو تجھے بتایا جائے
 گا پڑھتا رہے گا اور کنڈل کے اندر رہے گا تو تیرا کچھ نہیں
 بگڑے گا۔

تو اگر ذرا بھی کنٹرول کے باہر ہونے والے منظر
 سے متاثر ہوا تو بہک جائے گا تیرے من میں یہ بات ہونا
 چاہئے کہ یہ سب ڈرامہ بازی ہے اصل کچھ نہیں ہے تیرا
 کنڈل ہی تیری حفاظت کرے گا اس کے اندر سوائے
 تیرے کوئی نہیں آ سکتا یہ بات اپنے من میں تجھے اتارنی
 ہوگی تب ہی تو خود پر قابو رکھ سکے گا۔ کام مشکل ہے مگر جتنا
 کی ضرورت نہیں، میں تیرے ساتھ ہوں مگر قبرستان میں تو
 اکیلا ہی ہوگا۔“

”قبرستان میں اکیلا یہ تو بہت خطرناک بات ہوگی
 میں تو نہیں کر سکتا۔“ لال ڈر کر بولا۔

”ڈرنے کی بات نہ کر، میں تیرے ساتھ جو
 ہوں، تو اکیلا نہیں ہے تیرا کنڈل تیری حفاظت کرے گا جو
 لوگ گرو کے بغیر یہ عمل کرتے ہیں یا جن کا گرو پورا نہیں
 ہوتا ان کے لئے ضرور خطرہ ہے میں نے بتایا ہے تیرا
 کنڈل تیرا محافظ ہے اس کے باہر جو تجھے اس پر غور نہیں
 کرنا ہے وہ سب تجھے بہکانے اور کنڈل سے باہر آنے
 کے لئے ہوگا تو کنڈل کے اندر رہے گا تو سارے کھیل
 تماشے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔“
 ”اور اگر میں گھبرا کر کنڈل سے باہر آ گیا تو پھر۔“
 لال نے پوچھا۔

”تو پھر تو دنیا کے قابل نہ ہوگا اور اگر موت سے بچ
 گیا تو پاگل ضرور ہو جائے گا۔“ گرو بولا۔

اس سے کبھی کام نہیں لیا۔“

اجنبی گرو روز لال کے پاس آتا رہا۔ اس کا ڈر خوف دور کرتا رہا جو واقعات اس کے ساتھ پیش آ سکتے تھے وہ بتلاتا رہا اور ان کا توڑ بھی بتاتا رہا اور پھر لال خان دہنی طور پر پوری طرح تیار ہو گیا۔

جو دھپور کے شمال میں ایک قدیم قبرستان ہے، بڑی پرانی قبریں ہیں کسی کو پتہ نہیں کہ یہ قبرستان کب سے ہے۔ قبروں پر کوئی نہیں آتا مرنے والوں کے رشتہ دار عزیز بھی نہیں آتے، قبرستان ویران پڑا ہے رات تو رات ہے دن میں بھی لوگ اس طرح سے نہیں گزرتے حالانکہ کبھی کوئی واقعہ بھی نہیں ہوا ہے۔ قبرستان کے درمیان ایک گول گنبد بنا ہوا ہے اور کسی بزرگ کا مزار ہے یہ کون ہیں کسی کو پتہ نہیں ہے قبریں کچھ لال پتھر کی بنی ہیں مگر زیادہ تر بجی ہیں اور بہت تو زمین میں ڈھنس چکی ہیں قبرستان سے دور دور کوئی آبادی نہیں ہے کسی گاؤں میں مسلمان مرنے تو اس قبرستان میں لایا جاتا ہے قبرستان سے بہت دور گورکن کا گھر ہے۔ اس کو پہلے اطلاع دینا پڑتی ہے رات میں وہ مردے کو دفنانے نہیں آتا صرف دن میں قبر تیار کرتا ہے اور مردے کو قبر میں اتارتا ہے دور کے گاؤں کا مردہ ہوا تو چار چھ آدمی ہی ہوتے ہیں، سارا کام گورکن کرتا ہے۔

لال خان کو لے کر گردون میں اس قبرستان میں چلا گیا اور دونوں نے پورا قبرستان گھوم بھر کر دیکھا لال خان بولا۔ ”یہ تو دن میں خوفناک لگتا ہے رات میں تو اور ڈراؤنا ہوگا۔“

”ڈراؤنا تو ہوگا مگر ڈرنے کی کوئی بات ہے نہیں، یہ مردے نہ معلوم کب سے سوئے ہیں تیرا کیا لگاؤ الیں گے یہ بے چارے تو خود نہ معلوم قب کے اندر کیا سزا بھگت رہے ہیں ان کو تیرا کیا ہوش ان سے کیا ڈرنا، تیرا ڈر بے کار ہے اس ڈر کو باہر نکال دے یہ بہت ضروری ہے جب ڈر تیرے اندر نہیں رہے گا تو تیری منزل آسان ہو جائے گی۔“

اور اس طرح وہ گرو کے ساتھ روز دن میں کبھی رات میں قبرستان آتا رہا اور پھر اکیلا بھی آتا رہا اور آخر گرو نے اس کو وہ بول یاد کرائے جو اس کو پڑھنا تھے۔

اور لال خان قبرستان کے ویران اور ڈراؤنے ماحول میں ایک کچی قبر کے کنارے کنڈے بنا کر بیٹھ گیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ آدمی رات کے بعد اس نے دیکھا کہ قبرستان میں روشنی ہو رہی ہے، مردے اپنی اپنی قبروں سے باہر آ رہے ہیں پھر ان کا اجلاس ہو رہا ہے مگر اس کے نزدیک کوئی نہیں آیا رات بھر قبرستان میں جھپل جھپل رہی اس کے ارد گرد بھانت بھانت کی شیطانی گردش کرتی رہی مگر اس کے نزدیک کوئی نہیں آیا وہ گرو کے بتائے ہوئے سنتر کا چاپ کرتا رہا اور سویرے یہ سب تماشے ختم ہوئے اور وہ کنڈل سے باہر آ گیا مگر قبرستان سے باہر نہ گیا کچھ ہی دیر میں گرو آ گیا اور اس کے لئے کھانے کو لے آیا۔

گرو بولا۔ ”رات کو تجھے پھر کنڈل قائم کرنا ہے اگر دن میں کسی ضرورت سے باہر جائے گا تو کنڈل بے اثر پڑ جائے گا اس لئے دوبارہ اس کو قائم کرنا ہوگا۔“ گرو نے رات کا ماجرہ نہ پوچھا اور نہ لال نے اس کو بتایا۔

سورج غروب ہوتے ہی وہ پھر اپنی جگہ آ گیا اور اس نے پھر سے گرو کے بتائے ہوئے عمل سے کنڈل قائم کر لیا۔

اور پھر اپنا ورد شروع کر دیا آدمی رات تک کچھ نہ ہوا آدمی رات کے بعد اس نے دیکھا کہ پتھر کی کچی قبر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے اور اس سے سفید کفن میں لپٹی ہوئی لاش باہر آ گئی ہے پھر اس لاش نے اپنے منہ پر سے کپڑا ہٹایا اور لال کو دیکھ کر بولی۔ ”تو نے میری نیند خراب کر دی، چل بھاگ جا۔“ مگر لال اپنی جگہ جمنا بٹھا رہا۔

لال نے کفن اتار کر ایک طرف ڈال دیا اور بولی۔ ”ارے جاتا ہے کہ تجھے اس قبر میں بند کر دوں تو جاتا ہے میں کون ہوں، میری دہشت سے بڑوں بڑوں کی دھوٹی بیگ جاتی تھی۔ میرے نام کا ڈنکا بجاتا تھا، میں نامی گرامی

طرف دوڑا چلا آ رہا ہے اس کے کنڈل کے قریب کھڑا ہو کر بولا۔

”ارے لال تو یہاں بیٹھا ہے اور تیرے باپ کی حالت خراب ہے آخری وقت ہے تجھے بہت یاد کر رہا ہے میرے ساتھ چل نہیں تو وہ مر جائے گا۔“ یہ سن کر لال کو ایک دھچکہ لگا، اس نے کہا اٹھ جا اور باپ کی خبر لے مر گیا تو زندگی بھر ملال رہے گا۔ مگر پھر فوراً خیال آیا یہ کنڈل سے باہر نکالنے کا طریقہ بھی ہو سکتا ہے اس نے پھر اپنا دھیان کام کی طرف کر لیا وہ شخص کنڈل کے قریب رو رو کر بیان کرتا رہا اور پھر چلا گیا۔ دیر کے کچھ نہ تھا وہ کنڈل سے باہر آ گیا اور گرو نے اس کے کان میں پرہاتھ رکھ دیا۔

ڈاکو تھا، بھاگ جائیں تو بے موت مارا جائے گا۔“ لاش اس کے کنڈل کے نزدیک کھڑی ہو گئی۔ لال جانتا تھا کہ یہ سب گیدڑ بھبکیاں ہیں یہ لاش ہے کنڈل کے اندر قدم نہیں رکھ سکتی وہ اطمینان سے اپنا کام کرتا رہا اور لاش باقی ساری رات اس کے گرد منڈلاتی رہی اور نہ جانے کیا کیا اتاپ شناپ کہتی رہی مگر لال پر اس کے ذکر کا اثر نہ ہوا اس نے کام جاری رکھا اور سویرہ ہو گیا۔

لال نے ورد روک دیا اور قبر پر نظر ڈالی، قبر پہلے کی طرح تھی لال گرو کا انتظار کرنے لگا۔ گرو پٹلی میں کھانا لے کر آ گیا۔ لال نے کھانا کھالیا، آج بھی گرو نے رات کا ماجرہ نہ پوچھا اور کچھ دیر کے بعد چلا گیا۔

لال کے سامنے ہر رات ایک نیا منظر ہوتا تھا مگر گرو نے اس کے دل سے ڈر و خوف دور کر دیا تھا اور وہنی طور پر وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ سب فضول ہے، مجھے بہکانے اور ڈرانے کو ہور ہے ہیں ان کا کوئی وجود نہیں ہے میں اس کنڈل کے اندر محفوظ ہوں۔ وہ ان تماشاؤں سے ڈرنے کی بجائے مزے لیتا تھا اور اپنا کام جاری رکھتا تھا سویرے پہ سب کھیل تماشے ختم ہو جاتے تھے اب قبرستان کی ویرانی لال کو پریشان نہیں کرتی تھی وہ روز بروز اس کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ دن میں بھی کبھار کوئی آ جاتا تھا تو وہ چپ جاتا تھا ان کے سامنے نہ جاتا تھا۔

میں راتیں گزر گئیں تو گرو نے کہا۔ ”تیرا آدھا کام ختم ہوا۔ اب تیرا آخری پڑاؤ ہے یہ ذرا پہلے سے ٹھن ہو گا مگر تیرا طریقہ اور سوچ وہی ہونا چاہئے جواب تک رہا ہے۔“ گرو چلا گیا۔

میں راتیں گزر گئیں تو گرو نے کہا۔ ”تیرا آدھا کام ختم ہوا۔ اب تیرا آخری پڑاؤ ہے یہ ذرا پہلے سے ٹھن ہو گا مگر تیرا طریقہ اور سوچ وہی ہونا چاہئے جواب تک رہا ہے۔“ گرو چلا گیا۔

رات ہوتے ہی اس نے نئے سرے سے کنڈل بنایا اور اس میں جا کر بیٹھ گیا۔ آدھی رات گزری تھی کہ اس نے دیکھا ایک گاؤں کا آدمی ہاتھ میں لائیں لئے اس کی

ہر رات ایک نیا ڈرامہ اس کے سامنے تھا مگر وہ جما رہا۔ گرو نے اس کی تیار اس طرح کرانی تھی کہ وہ ڈرامہ سمجھ لیا۔ اب صرف دو راتیں رہ گئی تھیں۔ گرو نے سب اونچے اس کو بتایا اور چلا گیا۔ آج کی رات لال پر بڑی بھاری بڑی، وہ اس کو گویا حالانکہ وہ کچھ چکا تھا اس نے رات میں جو کچھ بھی دیکھا وہ صرف ایک ڈرامہ تھا مگر وہ پھر بھی اس کو کنڈل سے باہر آ گیا اور قبر کے اوپر بیٹھ گیا بیری کا سایہ بھی اس پر نہ تھا وہ دھبہ میں اس کو بیٹھا تھا اس نے نہیں دیکھا کہ گرو کدھر سے آیا، گرو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ ”شباباش میں جانتا تھا تو ہی ہے جو یہ اذیت برداشت کر سکتا ہے مگر ان باتوں کو دل پر کیوں لیتا ہے یہ سب تو تیرے بہکانے کو تھا تیری زبان کھلوانے کو تھا تجھے اپنی جگہ سے ہلانے کو تھا مگر تو نے جبراً بن کر ان کو بردایا۔ اب صرف آج کی رات ہے، تجھے پھر پھر بننا ہے اگر آج کی رات اسی طرح گزار دی اس کے بعد تیری ساری بھلاؤتائیں پوری ہوں گی۔ ساری راتوں کا پھل تیری جھولی میں ہو گا تو اس راجہ پر بھی راج کرے گا تیرا پرور راج کرے گا جو دل کرے گا پائے گا مگر میں تیرے پاس تیرے پھل ہونے کے بعد نہیں آؤں گا کیونکہ ایک مگرمی میں صرف ایک کی محبت ہوتی ہے تو جو کرنا چاہئے گا جو خواہش تیری ہو گی وہ تو پوری

کر سکے گا تجھے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔“

جلدی سے گوشت ہٹاؤ اور باورچی کو دو۔ جلدی کرو۔“
دو جوانوں نے اس کی جوان بہن کو پکڑ کر بکری کی
طرف زمین گرا دیا اور ایک نے اس کے گلے پر فوراً تلوار
مار دی، بہن کا سر ٹکڑ کر دوڑ جاگرا۔ لال خان کی چیخ نکلتے
نکلتے رہ گئی اس کی حالت یہ منظر دیکھ کر خراب ضرور ہوئی
لیکن گرو کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ ”آج بڑی
بھیا نک رات ہے آخری حربہ استعمال ہوگا۔“ وہ اپنی جگہ
پھر مضبوط ہو گیا۔

بہر حال وہ پتھر بنارہا پوری رات کنڈل کے باہر
جو ہوا اس نے اس کا اثر اپنے کام پر نہیں ڈالا۔

اور پھر رات ہار گئی سویرے کی آمد ہوئی اور سب
مناظر ختم ہوئے قبستان سونا تھا دور دور کسی کا پتہ نہ تھا
سورج کے نکلنے ہی وہ کنڈل سے باہر تھا باہر آتے ہی اس
کے کان میں آواز آئی۔

”کھو میرے آقا میں تمہارا ہمزاد ہوں، حکم کر دیا
کا م ہے؟“

یہ سن کر لال خان نہال ہو گیا وہ سمجھ گیا کہ میں اپنی
محنت سے کامیاب ہو گیا ہوں ہمزاد نظر نہیں آ رہا تھا مگر اس
کے وجود کا احساس ضرور ہوتا تھا۔

چالیس دن کی محنت کا پھل اس کے پاس تھا اور
اس کے حکم کا منتظر تھا۔ اس کے بدن میں اعتماد اور غرور کی
ایک لہر اٹھ رہی تھی چہرہ خوشی سے تھمتارہا تھا اور اس کے
قدموں میں مضبوطی تھی۔ وہ بولا۔ ”میرے لئے بہت عمدہ
ناشتہ کا بندوبست کر دو چالیس دن سے نہ جانے کیا کھا رہا
تھا۔“

ہمزاد نے جواب دیا۔ ”ابھی حاضر کرتا ہوں۔“
اور چند منٹ کے بعد بیری کے نیچے دسترخوان لگا تھا اور
اس پر ہر طرح کے کھانے موجود تھے۔ لال نے ڈٹ کر
ناشتہ کیا اس کے بعد دودھ پیا اور چاک و چونہ ہو گیا اور
گھر کی طرف چلا اس کے قدم زمین پر کب تھے۔ وہ گھر
پہنچا تو پوچھا۔ ”اماں کیا ہوا تم بہت پریشان ہو؟“

اماں کو کھانسی کا دورہ پڑا اور بڑی مشکل سے بولی

گرو چلا گیا اور رات ہوتے ہی لال کنڈل میں
آ گیا۔ آدھی رات تک کچھ نہ ہوا آدھی رات کے بعد اس
نے دیکھا کہ سارے قبرستان کے مردے اپنی اپنی قبروں
سے باہر آ رہے ہیں۔ بڑی روشنی ہو رہی ہے مردے
بھاگ بھاگ لکڑیاں جمع کر رہے ہیں بڑے بڑے چولہے
بنائے جا رہے ہیں ایک طرف بے شمار دیگیں رکھی ہیں
باورچی چار پائوں پر مصالے تیار کر رہے ہیں کچھ عورتیں
بھی نظر آ رہی ہیں ان کے چہرے دمک رہے ہیں بوڑھے
جوانوں کو کام بتا رہے ہیں جوان دوڑ دوڑ کر کام کر رہے
ہیں۔

پھر ایک بوڑھے نے پوچھا۔ ”ارے چھوڑو گوشت
آ گیا کنڈل نہیں پلاؤ کس کا بنے گا۔“
ایک نوجوان بولا۔ ”ارے ناکا گوشت تو بھول
گئے اب کیا ہو۔“

بوڑھا غصے میں اٹھ کر بولا۔ ”ارے تم سرسوں کا
سب کام ادھورا ہے مجھے یہی کچھ کرنا پڑے گا۔“ وہ بوڑھا
لال کی طرف تیزی سے آیا اور بولا۔ ”ارے پھوڑا کاٹ
ڈالو اس جوان کو۔“ ایک نوجوان اس کی طرف تلوار لے کر
آگے بڑھا اور کنڈل کے قریب آ کر بولا۔
”ارے کا کا اس میں کتنا گوشت نکلے گا اور کچھ کرو

۔“
بوڑھا بولا۔ ”اچھا تو پھر اس کے باپ کو لے آؤ۔“
دونو جوان اس کے باپ کو لے آئے تو بوڑھا بولا۔
”ارے عقل کے اندھو اس میں ہڈی ہی ہڈی ہے
سارا پلاؤ خراب ہو جائے گا۔ اس کی ماں کو بھی لاؤ شاید
اس سے دعوت ہو جائے۔“ پھر دونو جوان اس کی ماں کو
لے آئے مگر بوڑھا راضی نہ ہوا۔
”ارے بے عقلو بوڑھے بوڑھے لار ہے ہو
جوان گوشت پلاؤ میں ہوگا تو سودا آئے گا۔“

اور پھر دونو جوان اس کی دونوں بہنوں کو لے
آئے تو بوڑھا بولا۔ ”ہاں اب بات بنی۔ اب ایسا کرو

راجہ نے پرورش کرنے کو کسی عورت کے حوالے کر دیئے ہیں۔ چھوٹی دیوان کے گھر میں چولہا پاؤں کی کرتی ہے اس کو بچہ نہیں ہوا مگر وہ دیوان کے پاس سوئی ہے دیوان کی بیوی اس کی دشمن ہے ہر روز اس کو مارتی ہے مگر دیوان کی وجہ سے حویلی سے نکال نہیں سکتی۔“

یہ سن کر لال کی حالت خراب ہو گئی اس کا غصے کے بارے دماغ پھٹنے لگا وہ غصے سے بولا۔ ”میں کیا کروں میری حالت یہی رہی تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

”تمہارے ساتھ جو ہوا ہے تم بھی ایسا ہی کرو جو غصہ اور رنج ہوا ہے دشمن کو بھی دو۔“ ہمزاد بولا۔

”وہ کس طرح۔“ لال نے پوچھا۔

”اپنا دکھ راجہ کو لوٹا دو، تو پھر اس کو بھی وہی دکھ ہوگا جو تم کو ہوا ہے۔ میں راجہ کی لڑکی کو لے آتا ہوں۔“ ہمزاد بولا۔

”تیری بات سمجھ میں آتی ہے۔“ لال نے جواب دیا اور ہمزاد روانہ ہوا اور چند منٹ کے بعد واپس آ کر بولا۔

”ابھی وہ نہیں۔ ہے دو روز کے لئے کسی سہیلی کی شادی پر اتر میں گئی ہے اس طرح میرا جانا ٹھیک نہیں ہے کئی دریا درمیان میں پڑتے ہیں تم کہو تو رانی کو لے آؤں۔“ ہمزاد بولا۔

لال کے بدن میں تو جل رہی تھی انتقام کی آگ وہ بولا۔ ”مگر دن میں نہ لانا رات کو لانا کوئی دیکھ لے گا تو بات پھیل جائے گی۔“

گاؤں میں رات جلد ہو جاتی ہے لال چھت پر چلا گیا رات اندھیری تھی آسمان پر نہ چاند تھا نہ کوئی تارہ نظر آتا تھا چند منٹ میں ہمزاد آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی اس نے بڑی اچھی ساڑھی باندھی تھی وہ چھت پر آتے ہی ہوش میں آ گئی اس کے سامنے لال تھا وہ بولی۔

”تو کون ہے رے اور میں کہاں ہوں۔“

لال نے کہا۔ ”تو میرے پاس میرے گھر کی

”تو کہاں تھا بیٹا..... تیرے جانے کے بعد راجہ کے آدمی ساری بکریاں لے گئے گھر میں کھانے کو کچھ نہ رہا تیرا باپ اور میں بھوک سے مر رہے ہیں۔“

لال کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا بولا۔ ”اماں فکر نہ کرو اب راجہ کو میں دیکھ لوں گا۔“ اور بولا۔

”چل جلدی کھانے کا بندوبست کر۔“ ہمزاد اس کے قریب تھا اس نے چند منٹ میں کھانا لا کر سامنے رکھ دیا۔ اماں حیران ہوئی باپ نے بیٹے کے کارنامے کو حیرت سے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

لال نے کہا۔ ”آؤ اماں کھانا کھا لو۔“ اور وہ بھی بیٹھ گیا ماں باپ دونوں کو کوئی دن کے بعد روٹی ملی تھی دودھ ملا تھا کھانے کے بعد ان کے بدن میں جان آ گئی باپ بولا۔ ”تو کہاں چلا گیا تھا۔“

”میں اپنی غربت اور مجبور کا علاج ڈھونڈنے گیا تھا تم خوش ہو جاؤ کہ میں کامیاب ہو کر آیا ہوں اب راجہ ہم پر ظلم ستم نہیں کر سکتا۔ میں اس کی ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔“

”ایسا نہ کرنا بیٹا وہ راجہ ہے اس کے پاس بہت آدمی ہیں دولت ہے، ہمارا اس کا کیا مقابلہ تو اس سے دور رہنا اور میں تو کہتا ہوں اس ریاست سے ہی دور چلے جائیں، اس گاؤں۔“ ہمیں کیا دیا ہے دکھ بھوک اور روز کی نئی نئی پریشانیاں دوسے زبان لڑکیوں کا داغ، پتہ نہیں بے چاری کس حال میں اور کہاں ہوں گی، ان کے بارے میں پتہ نہیں، یہ داغ میرے سینے پر رہے گا اور میں مر جاؤں گا۔“ باپ کے آنسو نکل آئے اور ماں بھی رونے لگی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ہمزاد سے بولا۔ ”پتہ کر میری بہنیں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔“

باپ کی باتوں نے اس کو اداس کر دیا تھا اس کا خون کھول رہا تھا اور وہ سب کرنے کو تیار تھا جو کر سکتا تھا کچھ دیر کے بعد ہمزاد نے اس کے کان میں کہا۔

”تیری بڑی بہن راجہ کے محل میں رانی کے پاس ہے اور خدمت گار ہے اس کے دو بچے ہو چکے ہیں اور بچے

کرایک، ایک عورت کو اپنا نشانہ بنایا اب اس کی عادت پڑ گئی کہ ہر رات ایک نئی عورت اس کے بستر پر ہوتی کنواری شادی شدہ کوئی ہو مگر اس کے لئے نئی ہو۔ درباریوں راجہ کے عزیز اور ملازمین تک کو اس نے نہیں چھوڑا۔

مگر کون ہے اس کا پتہ کسی کو نہ تھا۔
لال کی ماں مر گئی۔ ماں کے بعد باپ نے بھی منہ پھیر لیا اس نے ان دونوں کو قبرستان میں دفن کر دیا اور کنارہ کی گاؤں سے دور چلا گیا۔

ہمزاد سے اس نے کہا۔ ”تو ایسا کرایک بہت چوڑا اور گہرا کنواں کھود مجھے اس جگہ رہنا ہے۔“

ہمزاد کو تو کام کی ضرورت تھی وہ اس کام میں لگ گیا اور چند روز میں اس نے بہت چوڑا اور گہرا کنواں تیار کر دیا مگر اس میں پانی نہیں تھا لال نے کہا۔ ”یہ کنواں کیسا ہے اس میں پانی تو ہے نہیں اس میں پانی تو بھر۔“ اور ہمزاد اس کام پر لگ گیا دور دور پانی نہیں تھا ہر طرف سوکھا پڑا تھا مگر لال کے کنویں میں پانی آ رہا تھا اور ایک وقت آیا کہ کنواں پورا بھر گیا۔

پھر اس کے اطراف میں درخت و پودے لگائے گئے اور ویران اور اجاڑ جگہ ہری بھری نظر آنے لگی چاروں طرف کے دیہات کے لوگوں نے حیرت سے اس کو دیکھا اور پھر ڈرتے ڈرتے اس کنویں کے پاس جانے لگے وہاں پر پانی ہی پانی تھا وہ حیران ہوتے ہمارے کنویں سوکھے اور یہ کنواں اوپر تک بھرا ہوا اور اتنا بڑا کنواں دور دور نہ تھا لوگ یہاں سے پانی لے جانے لگے۔ لال نے منع نہ کیا پھر کسی مصیبت کے مارے نے اپنی پریشانی لال کو بیان کر دی اور ہمزاد نے اس کا حل لال کو بتا دیا اور اس پریشان حال کا مسئلہ حل ہو گیا پھر یہ بات پھیلی گئی اور لوگ اپنی اپنی پریشانیوں لے کر آنے لگے اور لال ان کو بتاتا رہا اور وہ ایک ہمدرد اور پہنچا ہوا مشہور ہوتا گیا۔ مگر اندر سے وہ ایسا نہ تھا اس کی عادت بگڑ چکی تھی۔ ہمزاد اس کے لئے ہر روز کہیں تاکہیں سے لڑکی لاتا تھا لال نے لوگوں کی مدد اور ان کے کام بھی اسی لئے کرنا شروع کر دیے تھے تاکہ لوگ

چھت پر ہے۔ تیرے پتی نے میری بہنوں کو خراب کیا ہے میرے سارے جانوروں لے گیا ہے۔ میرے ماں، باپ بھوکے مر رہے تھے اور تو محل میں عیش کر رہی تھی تیرا پتی اپنی رعایا کی بہو، بیٹیوں کو خراب کر رہا تھا اس کے کارندے اس کی آڑ میں اس سے زیادہ کر رہے ہیں اب راجہ کی باری ہے تو اور تیری لڑکیاں میرے قبضے میں ہیں راجہ نے جو کرتا تھا کر لیا اب میرا نمبر ہے میں راجہ سے پورا پورا بدلے کا حساب لوں گا۔“

”مگر میرا کیا قصور یہ سب تو راجہ کرتا ہے۔“ وہ گھبرا کر بولی۔

”میری بہن برباد ہوئی مجھے دکھ ہوا، تو برباد ہوگی راجہ کو دکھ ہوگا۔“

اور لال نے بھوکے بھیڑیے کی مانند اس پر چھلانگ لگادی اور پھر عزت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی وہ تھک کر ایک طرف منہ ڈھانپ کر رونے لگی، لال نے ہمزاد کو اشارہ کیا اور وہ اس کو لے کر غائب ہو گیا۔

ہر رات محل کی عورتیں اس کے پاس آنے لگیں راجہ پریشان ہو گیا، یہ کیا ہو رہا تھا راجہ کی بہو، بیٹیاں رات میں خراب ہو کر آ رہی تھیں سارے پہرے دار موجود مگر عورتیں غائب ہمزاد جب واپس پہنچا تھا تو عین راجہ کے سامنے ان کو پہنچا تا وہ دروازہ کراپنا حال بیان کرتیں راجہ کے بعد دیوان کی حویلی کا نمبر آ گیا دیوان کی ادھیڑ پتی پہلے نشانہ بنی اس کے بعد لڑکیاں اور اس کے بعد دوسری رشتہ دار عورتیں لڑکیاں یہ ہر روز کا پکڑ تھا دیوان نے گھبرا کر راجہ سے کہا ”یہ کیا ہو رہا ہے سرکار اندھرا بن چا ہوا ہے ہماری عزت نیلام ہو رہی ہے ہر رات کوئی نہ کوئی لڑکی خراب ہو رہی ہے کچھ پائے کرو۔“

راجہ کو سب حالات پہلے ہی پتہ تھے اس کو تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جواب کیا دیتا۔

ان دونوں کے گھرانے کو گندہ کرنے کے بعد راجہ کے خاص خاص کارندوں کا نمبر آ گیا اور بات پھیلی گئی کسی گھرانے کی کوئی عورت لال سے نہ بچی اس نے گن گن

اس کے قریب رہیں اور وہ ان کی عورتوں اور لڑکیوں پر نظر رکھے مگر روز روز جو لڑکیاں آ رہی تھیں وہ تو اس کو جان گئی تھیں اس کے ڈھونگ کو پہچان گئی تھیں وہ بڑا مہربان تھا گاؤں والوں کے بہت سے کام ہمزاد سے کروادیا کرتا تھا ان کو پانی بھی دیا کرتا تھا۔ مردوں میں کم لوگ اس کے کردار سے واقف تھے کیونکہ اکثر عورتیں اور لڑکیاں ان پر گزری واردات کو چھپا جاتی تھیں ان کو اپنی عزت کی فکر ہو جاتی تھی مرد جب لال کی تعریف کرتے تو وہ دل ہی دل میں اس کو گالیاں دیا کرتی تھیں۔ بظاہر پارسانظر آنے والا لال عورتوں کا شکاری تھا وہ ہر رات شکار کرتا تھا اور پھر بھی پارسانہ ہوا تھا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب دور دراز کے گاؤں والوں کے پاس وسائل نہ تھے جو جہاں پر تھا وہیں پر تھا ان کو برابر کے گاؤں کے بارے میں بھی پتہ نہ تھا وہ اپنے علاقے تک محدود تھے راجہ کے لوگ ان کے خدا بنے ہوئے تھے مگر لال کے آنے کے بعد راجہ کے کارندے ڈرنے لگے تھے وہ کسی پر ظلم کرتے تھے تو لال ان سے بدلہ لیا کرتا تھا، اس کا بدلہ بڑا ہی نیک ہوتا تھا وہ عورتوں کی بے عزتی کرتا تھا ان کو اپنے پاس رکھتا تھا اور مردوں کو ہمزاد سے بری طرح پھونکتا تھا ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مارکون رہا ہے لال کے جادو کا رعب ان پر چھا گیا تھا۔ راجہ بھی ہوش میں آ گیا تھا اس کے گھرانے کی کوئی عورت لال سے نہیں بچی تھی یہ بات راجہ جانتا تھا اس کے لئے یہ بڑی شرم کی بات تو تھی مگر اس کے اپنے کردار اور اس کے کارندوں کے کردار کے لئے نئی نہ تھی جیسا وہ کرتے آئے تھے وہی ان کے ساتھ ہوا تھا۔

راجہ پوری طرح سمجھ چکا تھا کہ لال خان کنویں والے کے سوا کوئی نہیں ہے مگر اس کے پاس اس کے خلاف قدم اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ لال خان سے ڈرتا تھا اس کے جادو سے ڈرتا تھا اس لئے خاموش تھا۔

لال خان نے ہر سال ایک میلا لگانے کا فیصلہ کیا یہ اس لئے کہ دور دور کے گاؤں والے آئیں گے اور اس کا

ہمزاد ان عورتوں پر نظر رکھے گا پہلے سال کم لوگ آئے لال نے ان کے کھانے، پینے کا بڑا اچھا انتظام کروایا اب اس کے پاس کام کرنے والوں کی کمی نہ تھی اس کی خاطر مدارات کی بات چھپی نہیں رہی۔ گاؤں گاؤں اس بات کا چہچاہو دوسرے سال پھر ملا ہوا اس دفعہ بازار میں گاؤں والوں کی ضرورت کی چیزیں بھی فروخت ہوئیں کھیل تماشے بھی ہوئے اور تین دن بارش رہا کنویں کے برابر ایک بڑا سا ہال بنایا گیا تھا اس میں لال خان روز بیٹھا تھا لوگ اس کو نذر پیش کرتے تھے اور وہ ان کو ان کے بارے میں وہ باتیں بتایا کرتا تھا جو صرف وہ ہی جانتے تھے۔ گاؤں کے لوگ اس کی بتائی باتیں حیرت سے سنتے تھے

اور لال خان کی شخصیت کا رعب ان پر پوری طرح غالب آ جاتا تھا۔ ہندو کیا اور مسلمان کیا سب ایک ہی رنگ میں رنگ گئے تھے لال کو وہ جھگوان سمجھتے تھے اوتا سمجھتے تھے اور اس کی پوجا کرنے لگے تھے اور یہ دبا پھیلتی ہی جا رہی تھی۔ ان حالات میں لال کے خلاف آواز اٹھانے والا کوئی نہ تھا مگر ہر عروج کا زوال تو لازمی ہے۔

پورا میلا بھرا ہوا تھا سینکڑوں لوگ موجود تھے دیہات کے لوگوں کے لئے یہ میلا ایک تہوار کی شکل اختیار کر گیا تھا دور دور نیل گاڑیاں کھڑی تھیں کھیل تماشے ہو رہے تھے کنویں پر لال کے نام کے بکرے کٹ رہے تھے اور بڑے ہال میں لال خان بڑے کردار سے موجود تھا اس کے برابر اس کا ہمزاد موجود تھا۔

ایک دروازے سے ایک فقیر ہال میں داخل ہوا اور ایک کونے میں کھڑا ہو گیا اس کو لال خان اور اس کا ہمزاد صاف نظر آ رہا تھا وہ دیکھ رہا تھا کہ ہر آنے والا لال کو جھک کر سجدہ کرتا ہے اور کچھ نذر کرتا ہے ہمزاد آنے والے کے بارے میں لال کے کان میں کچھ کہتا ہے اور لال وہی بات کرنے والے کو کہہ دیتا ہے آنے والا حیرت کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے۔

فقیر غیر محسوس انداز میں آہستہ آہستہ آگے کی جانب بڑھ رہا تھا اور وہ بھیڑ میں اتنا قریب آ گیا کہ ہمزاد

اس کے سامنے تھا۔ فقیر نے اپنا طاقتور ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور ہمزاد کی گردن اس کے ہاتھ میں آگئی اور وہ اس کو لے کر ہال سے باہر آ گیا اور کنویں کی طرف چلا کنویں پر بہت بھیر لگی تھی مگر فقیر اس کو لے کر چلا جا رہا تھا۔ کنواں پورا پانی سے بھرا ہوا نہ تھا آدھا تھا۔ فقیر نے لال کے ہمزاد کو دہا پانوں پر اٹھا کر کہا۔ ”تو اس کے اندر رہے گا تیرا آقا بھی آتا ہے باہر آنے کی اجازت نہیں۔ آئے گا تو سخت سزا ملے گی۔“

اور ہمزاد کو کنویں کے اندر ڈال دیا اور پھر دوبارہ ہال میں آ گیا۔ لال خان اپنی جگہ موجود تھا مگر پریشان لگتا تھا وہ اب کسی کو کچھ نہیں بتا رہا تھا۔ آج پہلی دفعہ یہ ہوا تھا کہ اس کا غلام ہمزاد اس کے قریب نہ تھا وہ اندھا اور بہرہ بنا ہوا تھا فقیر اس کے قریب چلا گیا اور کڑک کر بولا۔

”اب میرے بارے میں بتا، دلوں کے حال بتانے والے، شجہ بے باز تیرے پاس کچھ ہے تو بول۔“

”تو کون ہے؟“ لال خان نے پوچھا۔ فقیر سکرایا اور بولا۔ ”میں کون ہوں تو بتا، تو بتانے والا ہے پھر پوچھتا کیوں ہے؟“ لال خان نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”میرا بتانے والا نہیں ہے۔“

”اور سن لے اب وہ تیرے لئے بیکار ہے اس کو تو نے خود سے جدا کیا ہے اب وہ تیرے اندر نہیں آ سکتا تو نے اپنے شعور کو خود سے الگ کیا ہے تو وہ الگ ہی رہے گا تیری طاقت تجھ سے الگ ہوگئی ہے تو ایک منڈک کی طرح ہے جو کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تیرا کھیل ختم ہوا کچھ دن جاتے ہیں کہ تجھے جحدہ کرنے والے تیری بوٹی بوٹی الگ کر دیں گے اور تو عبرتناک موت مر جائے گا۔“

فقیر ہال سے باہر آ گیا اور ایک طرف چلا گیا۔ کچھ ہی دن میں لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ لال خان

کے پاس اب کچھ نہیں عورتیں اس سے بیزار تھیں اور وہ عورت کے بتا رہے نہیں سکتا تھا۔ پہلے عورت بے بس تھی مگر ہمزاد کی طاقت ختم ہونے کے بعد کوئی عورت لال خان کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی اور پھر ایک رات اس پر عورتوں

نے حملہ کر دیا اور لال خان کے جسم کو سینکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ کنواں اجڑ گیا کیوں کہ کنویں کے اندر سے ہمزاد کے دھاڑنے کی آوازیں بڑی بھیا نک آ رہی تھیں۔ کنویں کے نزدیک دوسرے دن کوئی نہ آیا اور جیل کو لال خان کے جسم کے ٹکڑوں کو کھاتے رہے اور پھر خوفناک سنناٹا چھا گیا۔ کنویں کے اندر سے کبھی کبھی آوازیں ضرور آتی رہیں اور ان آوازوں نے لوگوں کو کنویں سے دور کر دیا۔ لال کے کنویں کا خوف لوگوں کے دلوں پر چھا گیا رات میں اور دن میں کنویں کے اندر سے آوازیں آتی ہیں مگر میلے پر کوئی آواز نہیں آتی۔ ہاں وقت مقررہ پر میلا نہ ہو تو بہت خوفناک وڈراوٹی آوازیں ضرور آتی ہیں۔ ایک زمانہ گزر گیا وقت بدلتا گیا مگر میلے کی ریت اب تک باقی ہے لوگوں میں خوف اب تک ہے اس کی وجہ وہ آوازیں ہیں جو کنویں سے آتی رہتی ہیں اس کے قریب آج بھی کوئی نہیں جاتا۔“

کشن لال نے اپنی بات ختم کی تو جو گندر نے پوچھا۔

”تو چاچا وہ ہمزاد کیا اب بھی شور کرتا ہے۔ کنویں میں.....“

”ہاں آج بھی بڑی درد ناک اور خوفناک آوازیں آتی ہیں مگر تعجب یہ ہے کہ میلے کے وقت وہ خاموش رہتا ہے۔ اس کے پہلے اور بعد میں برابر چلاتا ہے۔“

”کنویں میں تو اب پانی نہیں ہوگا۔“ جو گندر بولا۔

”نہیں بھائی کنویں میں اب بھی آدھا پانی موجود ہے مگر اب وہ استعمال کے قابل نہیں رہا۔“ کشن لال بولا۔

”کہو تو میں دیکھ آؤں کنواں۔“ جو گندر بولا۔

”یہ ہرگز نہ کرنا بڑا خطرناک کنواں ہے کہتے ہیں اس ہمزاد کی آواز اتنی بھیا نک ہے کہ آدمی کا دماغ الٹ جاتا ہے وہ اسی کنویں میں کود جاتا ہے یا پھر پاگل ہو جاتا

ہے، میں نے تجھے ساری کھاس لئے تو نہیں سنائی کہ تو ہم سب کے لئے مصیبت کھڑی کرو۔“
کشن لال ناراض ہو کر بولا۔

”اچھا چاچا نہیں جاتا میں تم غصہ نہ کرو۔“ اور پھر اس نے اپنے کلیںز کو آواز دی۔ ”شولو چل بھی تیار کر۔“ اور جو گندر ٹک پر چڑھ گیا اور آگے روانہ ہوا..... اس کی منزل دھول پور تھی۔ وہاں پر اس نے مال اتارا اور اوڑے پر کھڑا رہا دوسرے دن اس کو اچھیرے کا مال ملا اور وہ روانہ ہوا۔

اچھیرے کے بعد گوالیار جانا پڑا اور گوالیار سے دلی کا مال مل گیا اور اس نے شکر کیا اور روانہ ہوا اگر گاڑی درست حالت میں چلے اور چلتی رہے تو چھ سات گھنٹے کا سفر ہے مگر جو گندر جانتا تھا کہ وہ ایک سانس میں نہیں چل سکتا وہ آگرہ آ کر کمر گیا پھر مقرر امیں قیام کرنا پڑا اس کے بعد بچہ گڑھ میں دو گھنٹے قیام کرنا پڑا تب کہیں وہ دلی میں داخل ہوا اور سیدھا اوڑے پر جا کر رکا۔ دلی جا کر اس نے گاڑی کی چابیاں مالک کے سامنے ڈال دیں اور بولا.....

”مجھے معاف کر دو سردار، تم اپنی گاڑی سنبھالو ایک گھنٹہ کا سفر میں تین، چار گھنٹے میں کرتا ہوں وہ بھی ڈر کر کے نہ انجن قابو میں ہے اور نہ پاؤں، میرا حساب کر دو۔“

سردار سنگھ بولا۔ ”فکر نہ کر پتہ توں تھکا ہوا آیا ہے آرام کر میں تیری گڈی کو دیکھتا ہوں ایک دم نئی کر کے دوں گا تو کھائی سو کر جب گڈی ٹھیک ہوگی تو آگے جانا چنگی طرح چیک کر کے ہو بول۔“

”نہیں سردار تم ہر دفعہ مجھے دم دلا سے دیتے رہتے ہو اور تھوڑا بہت چالو کام کروا کر روانہ کر دیتے ہو بھگتتا مجھے پڑتا ہے اب میں اس گڈی پر نہیں جاؤں گا تم کسی اور ڈیور کا انتظام کر لو۔“ جو گندر نے اپنا فیصلہ سنا ڈالا.....

سردار سنگھ نے مزاج کا آدی تھا جو گندر کے بیزار ہونے کی وجہ سمجھ رہا تھا بولا۔ ”اوئے پتہ توں تو ناراض ہی ہو گیا میں کہہ جو رہا ہوں کہ اب کے پورا کام کراؤں گا انجن

اتر دیتا ہوں رنگ پسٹن اور اندر کا سب کام کرواتا ہوں پاؤں پر بھی کام کرتا ہوں کمائیوں وغیرہ کو چیک کرواتا ہوں اور کیا ہوتا ہے گاڑی میں ٹیوب نائر سب چیک کر لیتا ہوں اب کے تو یہ سمجھ لےتی ہو جاوے گی دور کی خبریں لائے گا فکری نہ کر۔“

جو گندر بولا۔ ”مجھے لگتا نہیں ہے کہ تم اتنا کام کراؤ گے۔“

”ارے پتر جب تو سلف لگائے گا تو گڈی خود تجھے سلام کرے گی اور تو بس کر اس کا جواب دے گا حرا آ جائے گا۔“

اب جو گندر کیا کہتا مگر پھر بھی بولا۔ ”ٹھیک ہے سردار جی تیری بات ماننے لیتا ہوں پر میری بات بھی یاد رکھنا میں خوار نہیں ہوں گا جہاں اس گاڑی نے مجھے پیٹھ دکھائی میں اس کو وہیں چھوڑ دوں گا۔ خورای سے لئے نہیں پھروں گا کہیں مسز میلتا ہے کہیں نہیں ملتا۔ خود بھی محنت کر دو مسز یوں کے نخرے برداشت کر دو بھوکے پیاسے رہو تم کو کیا پتہ کیا کیا ہوتا ہمارے ساتھ۔“

گاڑی میں کام اتنا تھا کہ پندرہ دن درکشاپ میں کھڑی رہی جو گندر سنگھ اور شولو دلی کی سیر کرتے رہے پندرہ دن کے سردار نے بتایا۔ ”ہن گڈی تیار ہے میں نے پاؤں پر رنگ بھی نیا کروا دیا ہے انجن کا پورا کام کر دیا ہے پورا لوڈ بھر کر چلے گا تو بھی منہ نہیں موڑے گا پر ذرا خیال رکھنا نیا انجن ہے۔“

دوسرے دن گاڑی جو گندر کے حوالے کر دی اور اس کو رام پور کا مال بھی مل گیا اور وہ روانہ ہو گیا۔ گاڑی اب کے سردار نے اچھی بنائی تھی رام پور سے پندرہ بیس میل پہلے مین روڈ سے آدھے فرلانگ پر بڑی بھیڑ تھی جمو لے اور پنڈولے لگے تھے بازار بھی لگا تھا کھیل تماشے بھی ہو رہے تھے شام کا وقت تھا رام پور پہنچتے پہنچتے اور رات ہو جاتی رات میں گاڑی خالی کون کرتا سویرے تک تو رکنا ہی تھا جو گندر نے گاڑی روڈ کے کنارے لگائی اور شولو سے بولا۔

اور آدھے گھنٹے میں وہ رام پور میں تھے۔ گاڑی اڑے پر کھڑی کر کے جوگندر بولا۔ ”تو گاڑی پر رہ میں ناشتہ کرتا ہوں، یہاں پر کوئی ڈھنگ کا ہوٹل نہیں ہے دور جانا پڑے گا میرے بعد تو چلے جانا گاڑی پر رہنا اور چوکس رہنا، منٹ میں ٹائر اتر جاتے ہیں بڑا استاد ہیں۔ یہاں کے بندے۔“

اور جوگندر ایک طرف چلا گیا۔

”رام پور چھوٹا سا شہر ہے۔ آبادی زیادہ تر ہندوؤں کی ہے۔ ناشتہ کر کے ہوٹل سے باہر آیا ہی تھا کہ اس کے سامنے گوپال ترپاٹھی آ گیا اور اچک کر گلے لگ گیا۔“

”کیونکہ ترپاٹھی کا قد جوگندر سے بہت کم تھا۔ بولا۔
”اوئے تو کب آیا۔“

جوگندر بولا۔ ”سویرے ہی آیا ہوں مال اتر رہا ہے میں ناشتہ کرنے آیا تھا۔“

”اوئے میں تو چار روز سے پڑا ہوں گاڑی میں کام کروا رہا ہوں۔“

”اے بے تو یوں کہہ کر موج کر رہا ہے۔“ جوگندر بولا۔

”تو اور کیا کروں دن میں تو گاڑی پر ہوتا ہوں رات کو پورے سواری ہوتی ہے تو ذرا موج کرتا ہوں تو جانتا ہے ذرا بیوروں کی زندگی کتنی فضول سی ہوتی ہے شہروں شہروں پھرتے ہیں اور اپنا شہر بھول جاتے ہیں گھر بھول جاتے ہیں ساری زندگی ہوٹلوں کا کھاتے ہیں اور پھر کسی اسپتال میں مر جاتے ہیں۔ نہ گھر نہ بیوی بچے، بنا گھر اس چلتی پھرتی زندگی میں ذرا کبھی کبھی رنگ بھرنے کو موقع ملتا ہے تو میں اس سے ضرور فائدہ اٹھاتا ہوں۔ آ تو بھی رک جا، آج موج کرادوں گا۔“

”ہاں یا تو نے ٹھیک کہا کبھی کبھی دل کرتا ہے یہ کام چھوڑ دوں اور گاؤں چلا جاؤں باپو کے ساتھ مل چلاؤں مگر یہ سسری لائن ایسی ہے کہ ایک دفعہ اس میں جو آ گیا پھر جاتا نہیں۔“ جوگندر بولا۔

”رام پور جانا تو بے کار ہے۔ کیوں نا ذرا میلا دیکھیں کھائیں پیتیں۔“

شولو کے تو من کی بات تھی بولا۔ ”ہاں ٹھیک ہے استاد مگر یہ میلا کس کا ہے۔“

”ارے ہمیں کیا کسی کا ہو ہم تو تفریح کریں گے کھیل تماشے دیکھیں گے اور کھائیں گے تو گاڑی بند کر دے۔“

دونوں میلے کی طرف آگے بڑھے یہ بڑی جگہ میں میلا لگا تھا ایک سرکس بھی لگا تھا اور دوکانیں بھی اچھی بنی ہوئی تھیں کیونکہ یہ میلا پورے ہفتہ کا تھا جوگندر نے پتہ کیا تو کسی نے بتایا کہ یہ سیتا کا میلا ہے۔ دونوں نے ایک اچھے ہوٹل میں کھانا کھایا اور میلا گھومتے رہے یہاں پر دیہاتیوں کی بھر مار تھی۔ دور دور سے دیہاتی اپنی اپنی بیل گاڑیوں میں آئے تھے ان کی عورتیں ہری پتلی ساڑھیوں میں ہر طرف سودا سلف خریدتی نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف بڑا سامندر بنا ہوا تھا اور سیتا دیوی کی مورتی بنی سنوری کھڑی تھی۔ اس کے گلے میں گیندے کے لال پیلے پھولوں کی مالائیں بڑی تھیں پنڈت اس کے پیروں میں بیٹھے تھے اور چڑھاوے وصول کر رہے تھے۔ مندر

میں زیادہ تر عورتیں تھیں مرد ایک دو نظر آتے تھے جوگندر نے کچھ دیر دور سے یہ نظارہ کیا اور شولو کو لے کر سرکس میں جا بیٹھا، سرکس شروع ہونے والا تھا رات کے بارہ تک میلا پورا بھرا ہوا تھا عورتیں اپنی اپنی گاڑیوں میں جا رہی تھیں اور مرد بھی سونے کی تیاری کر رہے گاڑیوں کے آگے انہوں نے پردے ڈال دیئے تھے۔

جوگندر کی آنکھیں بھی نیند کے مارے بند ہوتی جا رہی تھیں دونوں گاڑی پر آگئے شولو ترپالوں کے اوپر سو گیا اور جوگندر اندر لیٹ گیا۔ سویرے نو بجے شولو اٹھ گیا اور اس نے جوگندر کو اٹھا دیا۔ ”استاد چلنے کی تیاری کرو۔“ جوگندر بولا۔ ”کیا وقت ہوا ہے؟“ شولو بولا۔ ”تو کا ہوگا۔“ ”اوے جلدی کر، میں ذرا منہ دھو لوں پھر چلتے ہیں۔“ اور چند منٹ کے بعد رام پور کی طرف روانہ ہوئے

”اس شہر کی ریت زالی ہے موج کرنے کی جگہ شہر سے باہر رکھ دی ہے۔“

”اچھا ہے شہر کی آب ہوا سے دور ہے۔ ضرورت مند ہی وہاں پر جائے گا۔“ جوگندر بولا۔

دونوں تانگے پر بیٹھے اور ترپاشی بولا۔ ”ہیرا بازار لے چل۔“

”تو پھر رک رہا ہے آج۔“ ترپاشی نے پوچھا۔

”مال تو اتر گیا ہوگا تیری گاڑی درکشاپ میں کھڑی ہے تو ایسا کرنا شام کو اڑے پر آ جا مال مل بھی گیا تو بھی میں ایک رات رک جاؤں گا اور کل سویرے نکلوں گا۔“ جوگندر بولا۔

”چل ٹھیک ہے میں تیرے پاس آ جاؤں گا۔“

ترپاشی بولا۔

اڈے پر شولو گاڑی دھلوار ہاتھ بولا۔ ”استاد بڑی دیر کر دی۔“

”ارے اپنا ایک پرانا یا رل گیا تھا تو ناشتہ کر لے۔“

”میں نے پوری حلوہ کھایا استاد ضرورت نہیں ہے تم مال کا پتہ کرو کہاں کا ہے۔“ شولو نے کہا۔

جوگندر دفتر کی طرف چلا گیا۔ پتہ چلا اسی مال ہے ہی نہیں کل تک آئے گا پھر پتہ چلے گا۔

جوگندر واپس آ گیا اور گاڑی میں سو گیا پانچ بجے اس کی آنکھ کھلی تو شولو نے کہا۔ ”استاد رات رکنا پڑے گا مال تو ہے نہیں۔“ جوگندر آنکھیں مل کر بولا۔ ”تو کیا ہوا شہر میں کھڑے ہیں جنگل میں تو نہیں ہیں۔“

”جھ بچے ترپاشی آ گیا بولا۔“ کیا رہا بھی مال ملا۔“ جوگندر بولا۔ ”سویرے پتہ چلے گا مال ابھی کہیں کا بھی اڈے پر نہیں۔“

”آج رات تو پھر تیری ہے۔“ ترپاشی بولا۔

”ہاں کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔“ اور پھر شولو کو آواز دے کر قریب بلایا اور بولا۔ ”میں جا رہا ہوں شاید رات دیر ہو جائے آنکھیں کھول کر رکھنا یہاں پر بڑے بڑے استاد پڑے ہیں۔“

”پر جا کہاں رہے ہوا استاد۔“ شولو نے پوچھا۔

”اوئے تو میرا ماما لگتا ہے کہ تجھے سب باتیں بتاؤں تو وہ کر جو میں نے کہا ہے۔“ جوگندر بولا۔

اور وہ ترپاشی کے ساتھ چل پڑا۔ ”کتنی دور جانا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

تانگے والا مسکرا کر بولا۔ ”ٹھیک ہے جی۔“ اور تانگہ چل پڑا چندرہ منٹ کے بعد تانگہ ایک بازار میں کھڑا تھا دونوں اتر پڑے کرایہ ادا کیا اور ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ بازار میں ہوٹل کھلے تھے خوب روشنی بھی تھی گیس کی بٹیاں جل رہی تھیں مگر گلی میں زیادہ روشنی نہ تھی دروازوں پر پچیس پڑی تھیں اندر سے سازوں کی آوازیں آرہی تھیں کسی کسی دروازے پر سولہ سنگھار کئے کوئی عورت کھڑی تھی ان دونوں کو دیکھ کر مسکرائی اور اندر آنے کا اشارہ کیا مگر وہ دونوں اس کے قریب سے گزر گئے عورت نے آواز دی۔ ”میں رام پور کی پری ہوں یاد کرو گے۔“

جوگندر بولا۔ ”واہ ری پری کا گاہک خود بلا رہی ہے۔“

”ترپاشی زور سے ہنس پڑا۔“

”تو کہاں جا رہا ہے کوئی خاص جگہ ہے۔“ جوگندر بولا۔

”ہاں خاص ہی ہے۔“ چند قدم کے بعد ترپاشی ایک زینہ پر چڑھنے لگا زینے پر اندھیرا تھا۔

پہلی منزل پر زینہ ختم ہو گیا اور محسن میں روشنی تھی کئی کمرے زینے کے سامنے تھے اور ان پر پردے پڑے تھے ایک بڑے کمرے میں ترپاشی داخل ہوا دروازے کے عین سامنے ایک طاق پر ایک مورتی رکھی تھی وہ پہچان گیا یہ مورتی اس نے میلے میں دیکھی تھی وہ بڑی تھی اور یہ چھوٹی تھی اس کو یاد آ گیا یہ ستا دیوی کی مورتی تھی۔

اب دونوں اس کمرے میں داخل ہوئے جس میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک دریاں پڑی تھیں اور ان پر سفید چاندنی پڑی تھی ایک طرف چند سازندے اپنے ساز درست کر رہے تھے۔ دیوار کے کنارے کنارے

جو گندر کو نہ ہوا اور رات بوڑھی ہوتی گئی اور تماشائی کم ہوتے ہوتے سب چلے گئے۔ اب صرف ترپا بھی اور جو گندر تھے۔ بائی جی بولی۔ ”کیا حکم ہے مہربان؟“
 ترپا بھی بولا۔ ”ہم تو بندیا رانی کے غلام ہیں کبھی کبھی آتے ہیں اور کیا کہیں۔“
 بائی جو گندر کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”اور یہ کیا کریں گے رک کر۔“

جو گندر بولا۔ ”میں آپ سے باتیں کروں گا شاید کبھی پھر زندگی میں اس کا موقع نہ ملے۔“
 ”ارے مجھے سے باتیں کر کے کیا کرے گا کیا جیب خالی ہو گئی ہے۔“ بائی جی بے حیائی سے بولی۔
 ”یہ بات نہیں ہے بائی جی، میں شوقین نہیں ہوں ترپا بھی کی خوشی کی خاطر آیا تھا وہ یہاں رہے گا تو میں تم سے باتیں کروں گا بات نئی تو ضرور ہے مگر مجھے نئی نئی باتیں جانے کا شوق ہے تم اپنے تجربے کی باتیں سناؤ گی اور میں شوق سے سنوں گا۔“ جو گندر بولا۔

”لگتا ہے تو مجھے رات بھر جگانے کا چل ٹھیک ہے اس عمر میں کوئی تو قدر دان ملا۔“ وہ بولی۔ ترپا بھی زور سے ہنس پڑا۔

کمرے میں صرف ایک جی جی جی رہی تھی جو گندر ایک گاؤں کے سہارے بیٹھا تھا بولا۔ ”میں جب تمہارے گھر میں داخل ہوا تو میری پہلی ملاقات ایک مورتی سے ہوئی بیٹا دیوی کی صورت سے۔ رام پورا آتے ہوئے ایک میلا لگا ہوا ہے میں اس میں گیا تھا وہی صورت وہاں پر پوجی جا رہی تھی مجھے نہیں پتہ یہ کون ہے، تمہارے گھر میں بھی یہ موجود ہے اس کی کیا وجہ ہے؟“ جو گندر نے پوچھا۔
 ”واہ رے بھولے ماتھارے یہ ہماری دیوی ہے اس کو اس لئے پوجتے ہیں اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔“ وہ بولی۔

”میں بڑے بڑے شہروں میں پھرتا ہوں کسی اور جگہ میں نے اس کا مندر نہیں دیکھا۔“ وہ بولا۔
 ”تم نے نہیں دیکھا ہوگا مگر ہوتا تو ہوگا یہ علاقائی

مولے مولے گاؤں تک پڑے تھے اور ایک طرف بڑا سا پاندان اور اگال دان رکھا تھا دو تین تماشائی بیٹھے تھے اور سگریٹ پی رہے تھے ایک کے سامنے بوتل بھی رکھی تھی اور آدھا گلاس شراب اس میں تھی کچھ دیر گزری تھی کہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت بنی ٹھنی نیلی ساڑھی میں پاندان کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی اور سب سے پہلے ترپا بھی سے بولی۔
 ”کیسے ہو بیٹھ بہت دن میں درشن کرائے۔“

”ہائی تم تو جانتی ہو ہم تو سیلانی آدمی ہیں ایک جگہ تو رہتے نہیں ہاں رام پور میں ہوں گے تو درشن ضرور دیں گے۔“ ترپا بھی نے کہا۔

”ہاں یہ تو مجھے پتہ ہے تم بنا آئے نہیں جاتے اس لئے تو ہم بھی تمہارا خیال کرتے ہیں۔“ وہ بولی پھر دو لڑکیاں بائی جی کے پاس آ کر بیٹھ گئیں، اور بیروں میں گھنگرو باندھے لگیں۔

سازندوں کی تیاری پوری ہو گئی دونوں لڑکیاں کھڑی ہو گئیں۔ دونوں نوجوان اور غضب کی تھیں اور ناچ کے نرت بھاؤ جاتی تھیں دس منٹ تک سازوں کی لے پردہ ناچتی رہیں اور پھر بیٹھ کر سنا لگیں ان دس منٹوں میں تماشائی آتے رہے اور دیوار کے کنارے سارے گاؤں تک بھر گئے اب وہ آئے جس کے لئے ترپا بھی آیا تھا۔ اس کا نام بندیاتھا مگر اس نے بندیانہیں لگائی تھی۔

سفید ساڑھی میں وہ بڑی حسین لگ رہی تھی۔ سب تماشائیوں کی نظریں اس پر تھیں اس نے بیروں میں گھنگرو باندھے اور کھڑی ہو گئی سازندوں نے اس کے اشارے پر ایک دھن بجائی اور غالب کی غزل شروع کر دی اس کی آواز اور انداز ادائیگی اتنا خوبصورت تھا کہ ہر شعر بنا لگتا تھا تماشائی اس پر نونوں کی بارش کر رہے تھے اور وہ بڑی وجہ سے غزل گارہی تھی۔ ”ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن۔“

اس نے اس بندے کو جتنی بار گایا ہر بار ترپا بھی اور جو گندر نے اس کو نوٹ دیئے وقت کے گزرنے کا احساس

میرا پیشہ تمہارے سامنے ہے مگر میں جو ہوں وہ نظر نہیں آتا ہوں، میں دھرم کو اپنی جگہ اور پیشہ کو اپنی جگہ پر رکھتی ہوں۔“

”سمجھ آ گیا جو نظر آئے وہ بھی اصل نہیں ہوتا۔“
جو گندر بولا۔

”دیکھو دن کی سفیدی نظر آ رہی ہے۔“
”ہاں تمہاری رات میں نے بے آرام کر دی اس کا کیا ہوگا۔“ جو گندر بولا۔

بائی جی زور سے ہنس پڑی بولی۔ ”میں لوگوں کے کہنے سے کھانسناتی ہوں ان سے کچھ نہیں لیتی دھرم کا کام سمجھ کر پن کے طور پر سناتی ہوں بہت ساری باتیں جو لوگ نہیں پڑھتے صرف سنتے ہیں اور سن کر ان کا دھرم پختہ ہوتا ہے یہی ایک کام ہے جو شاید ٹھیک ہے۔“

ترپاشی بھی آ گیا اور بولا۔
”ارے تم دونوں ہمیں پر بیٹھے ہو اب تک۔“
جو گندر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”ہمیں سے واپس جائیں گے۔“

بائی جی نے کہا۔ ”یہ بھی ہزاروں کی طرح ہے جو کچھ نہیں جانتے۔ تم بھی دھرم کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تم صرف بنڈیا کے دیوانے ہو کبھی میرے پاس رکھو کچھ تم کو بھی پتہ چلے۔“

”ارے بائی جی اتنی فرصت کہاں ہے، ہمارے پاس پیر میں تو ایک چکر ہے۔“ ترپاشی بولا۔

”چکر تو ہر جگہ پر ہے تم ٹرک میں چکر لگاتے ہو اور ہم سب پیدل چکر میں ہیں، میں مانتی ہوں میں بہت خراب عورت ہوں میری زندگی گناہوں کی گود میں گزری ہے مگر میرا تعلق دھرم سے کبھی نہیں ٹوٹا آ دی ہندو ہو یا مسلمان وہ ابھڑ کا پیدا کردہ ہے، پیدا ہونے کے بعد تفریق ہوتی ہے کچھ لاد مذہب ہو جاتے ہو جاتے ہیں مگر وہی میرے خیال میں بد نصیب ہوتے ہیں مگر زیادہ تر مذہب کے دائرے میں آ جاتے ہیں مذہب کیا ہے ایک دیوار ہے اس دیوار کی آڑ میں انسان شیطان کے عملوں

دیوی دیوتا ہیں یہاں پر اس کے ماننے والے زیادہ ہیں اسی طرح پورے ہندوستان میں کسی ایک کی پوجا تو نہیں ہوتی ہر جگہ کے الگ الگ دیوتا ہوتے ہیں۔ بہر حال آج میں تمہیں ”مہا بھارت۔“ جو کہ بڑی معتبر کتاب ہے اس کی تھوڑی بہت باتیں سناتی ہوں۔

”تم یہ سمجھ لو کہ ہندو روایات میں مہا بھارت اس عظیم جنگ کا نام ہے جو کوروں اور پانڈوں کے درمیان لڑی گئی جو کہ ہندی تاریخ کے جیتے جاگتے کردار تھے اس جنگ میں بقول معتبر کتابوں کے ساڑھے اٹھانوے لاکھ کے لگ بھگ افراد مارے گئے تھے اور محض گیارہ افراد زندہ بچے جن میں پانچ پانڈو بھائی اور چھ دوسرے تھے لیکن ہندی تاریخ میں مہا بھارت نام کی ایک اور کتاب بھی ہے جسے ہندوستان کی معتبر اور عظیم کتب میں شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں کائنات کی ابتداء انسان کے آغاز کوروں اور پانڈوں کا احوال اور دیگر حکایات و روایات درج ہیں۔“

مہا بھارت کے مصنف کا نام بیاس دیو ہے لیکن کسی تاریخ میں اس کتاب کا سن تصنیف درج نہیں چونکہ اس کتاب میں کوروں اور پانڈوں کی جنگ کا ذکر ہے اس لئے اغلب خیال یہی ہے کہ یہ کتاب اس جنگ کے بعد لکھی گئی ہے۔

بیاس دیو، اس جنگ کے بعد حیات تھا اور اس نے کوروں اور پانڈوں کا دور اقتدار اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا تو تواریخ میں یہ ذکر بھی ملتا ہے کہ مہا بھارت غالباً راجہ یدھشٹر کے زمانے میں لکھی گئی راجہ یدھشٹر کوروں کا چچا زاد بھائی تھا اور ان کی آدھی سلطنت کا حصہ دار اور مہا بھارت کا امیر ترین کردار تھا مہا بھارت میں وہی کوروں کے مرنے کے بعد راجہ بنا اور اسے مورخین ہندوستان کا ”سب سے پہلا درجہ قرار دیتے ہیں۔“

”واہ دیوی جی بہت خوب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مہا بھارت خوب پڑھی ہے۔“ جو گندر بولا۔
”ہاں میرے پاس ہے اور میں روز پڑھتی ہوں

سے کسی حد تک بچا رہتا ہے پوری طرح نہیں کہہ رہی اس لئے کہ میں خود اپنے آپ کو نہیں بچا سکی ہوں اور آج بھی گناہوں کے ڈھیر سر پر اٹھائے ہوں۔“ بائی جی نے کہا۔

”سمجھ میں بات آئی نہیں جس کو یہ احساس ہو جائے کہ وہ غلط کام کر رہا ہے اور پھر بھی کرتا رہے اس کا کیا مطلب ہے چھوڑ دو ایسے کام جو طبیعت کے خلاف ہیں۔“

جوگندر بولا۔

”بہت آسانی سے تم نے یہ بات کہہ دی مگر اس کی گہرائی میں اترو یہ ہندو معاشرہ یہ شرافت کے ٹھیکیدار مجھے قبول کریں گے۔ جب برائیوں کو چھوڑنا ہوگا تو جھوٹ کو پہلے چھوڑنا پڑے اور سچ اٹانے کا ہوگا کہ کسی کو ہضم نہیں ہوگا کھوم پھر کر یہی مقام ایسا ہے جہاں پر شرافت کے ٹھیکیدار منہ پر رومال باندھ کر آتے ہیں اور رات کے اندھیرے میں پھر اپنی شرافت کی نوکری ویسی کی ویسی ہی لے جاتے ہیں ہم ان کی حفاظت کرتے ہیں ان کی مرضی کرتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ہم کو اپنی دنیا میں برداشت نہیں کریں گے۔“

”واہ بائی جی تم نے تو پڑھ لکھے لوگوں کی طرح بات کر دی۔“ ترپاشی بولا۔

”میں نے زندگی کی کتاب پڑھی ہے انسانوں کے چہرے پر لکھی تحریروں کو پڑھا پاسا اور شرافت کے میک اپ میں آئے انسانوں کے من کے اندر کی تحریروں پڑھی ہیں میں جاہل عورت نہیں ہوں۔“

بہر حال دونوں واپسی کے لئے چل پڑے اور سیزھیان اتر کر سڑک پر آ گئے۔ ”یار یہ عورت تو توپ کا گولہ ہے کتنی کھری اور صاف باتیں کرتی ہے میں تو حیران ہوں۔“ جوگندر بولا۔

”ہاں، مجھے بھی اندازہ نہیں تھا اس جگہ ایسی عورت۔“ ترپاشی نے کہا۔

”تیری گاڑی ٹھیک ہوگئی کہ نہیں.....“ جوگندر نے پوچھا۔

”اس پر رات کو مال لوڈ ہونا تھا ہو گیا ہوگا میرا کلینر

انتظار کر رہا ہوگا مجھے آج ہی سینا پور جانا ہے۔“

”واہ! رام پور سے سینا پور جائے گا میرا تو کچھ پتہ نہیں کہ کہاں کا مال ملے۔“

دونوں باتیں کرتے ہوئے اڈے پر آ گئے۔

یہاں پر جوگندر کو پتہ چلا کہ گوالیار کا مال لوڈ ہے۔

ہر آبادی میں ایک کہانی ہے جہاں انسان ہیں وہاں پر ان کے مسائل ہیں ان کے دکھ میں خوشیاں ہیں ہیں کسی کو محسوس ہوتا ہے اور کوئی بے خبر رہتا ہے بے خبر رہنے والے بے حس لوگ کسی کے کام نہیں آتے وہ اپنی کھال میں چلتے رہتے ہیں کسی کی طرف نہیں دیکھتے یہ لوگ جب خود کسی کپڑے میں آتے ہیں تو اوروں کی طرف دیکھتے ہیں اور مرد کے طالب ہوتے ہیں۔

ایسے گوالیار شہر کے دینا لال تھے وہ صرف اپنی طرف دیکھتے تھے بڑے خالیم یو پارٹی مشہور تھے۔ اپنا ایک آنا بھی معاف نہیں کرتے تھے دولت مند تھے مگر بے انتہا کج سواخت کے بنیا تھے اور نام کے بنیا ہی تھے۔ بوڑھے ہو گئے تھے آنکھوں سے پوری طرح نظر نہیں آتا تھا۔ ان کی اولادوں میں دولہ کے اور چھ لڑکیاں تھیں لڑکیاں بڑی تھیں اور یہ ان سب کو رخصت کر چکے تھے کہتے ہیں بنیانہ خود کھاتا ہے نہ کھلاتا ہے مگر وہ مقام ایسے ہیں کہ وہ دل کھول کر خرچ کرتا ہے پلٹ کر نہیں دیکھتا ایک مقام تو شادی کا ہوتا ہے شادی لڑکی کی کرے یا لڑکے کی خوب خرچ کرتا ہے مہمانوں پر دل کھول کر خرچ کرتا ہے۔

دوسرا موقع ہولی دیوالی پر جوئے سٹے کا ہوتا ہے کوڑیوں پر ہزاروں روپے داؤ پر لگاتا ہے اور لگاتا ہی چلا جاتا ہے لکشی دیوی کو خوش کرنے کا یہ موقع پر باند نہیں کرتا اس ہار جیت پر وہ غم نہیں کرتا ایک ایک پائی کو دانتوں سے پکڑنے والا شخص کس طرح ہزاروں کے داؤ لگاتا ہوگا مگر ایسا ہی ہوتا ہے آج بھی ہولی دیوالی پر کھلے عام جوا ہوتا ہے بازاروں کے چوک پر سڑکوں پر اس دن کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔ جوگندر ہولی سے ایک روز پہلے گوالیار کے اڈے پر پہنچا۔ تہوار کی تیاریاں ہندو بہت

نے گاڑی کھڑی کر دی اور منیم کے ساتھ اس کے ٹوٹے پھوٹے دفتر میں آ گیا۔

منیم نے جابی اس کو پکڑا دی اور بولا۔ ”لے بھی یہاں تو آرام کر لائیں رکھی ہے تیل نہ ہو تو ڈلوالینا۔ تجھے دو تین دن تک آرام کرنا ہے، موقع ملا تو میں آ جاؤں گا نہیں تو ہولی کے بعد ہی ملاقات ہو دے گی۔“ اور منیم چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد شلو بولا۔ ”استاد کیا چکر ہے؟ ٹھہرنا پڑے گا کیا؟“

”کل ہولی کا تہوار ہے تجھے نہیں پتہ اس تہوار پر لوگ موج میلا کرتے ہیں کام کوئی نہیں کرتا تو بھی جاگھوم پھر ہولی کا مزالے میں بھی بیبی کروں گا۔“ جوگندر نے جواب دیا۔

”میں تو استاد پہلی دفعہ آیا ہوں مجھے کچھ یہاں کے بارے میں پتہ نہیں ہے۔“ شلو بولا۔

”اچھا تو پھر تو رک جادوؤں ساتھ چلیں گے۔“ کچھ دیر میں جوگندر نے منہ ہاتھ دھو لیا اور تیار ہو کر دونوں اڈے سے باہر آ گئے۔

بازار بھرے ہوئے تھے ہر طرف رونق لگی تھی عورتوں کی ٹولیاں نیلی پیلی ساڑھیوں میں ماتھے پر بندیا لگائے پورے نگھار کے ساتھ ٹولیوں میں ہاتھوں پر کالسی کی تالیاں ان میں جلتے ہوئے دیئے اور پوجا کے پھول لئے مندروں میں جا رہی تھیں۔ ان ٹولیوں کے ارد گرد نوجوان لڑکے منڈلا رہے تھے کوئی کوئی اشارے بھی کر رہا ہے اور اس کے ارے کا جواب بھی آ رہا تھا۔ کوئی کسی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا سب اپنی اپنی دھن میں مست تھے۔ وعدے ہو رہے تھے اقرار ہو رہے تھے ہنسی مذاق کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

یہ تہوار خوشی کا تہوار ہے رنگ کا تہوار ہے اس میں سب خوش رہنا چاہتے ہیں کسی فکر کو کسی غم کو وہ قریب نہیں آنے دیتے۔ بڑی سے بڑی بات کو خوشی سے برداشت کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آج کے دن جو خوش ہو گا وہ

کرتے ہیں اڈے پر مال اتارنے کو کوئی مزدور نہ تھا جس پارٹی کا مال تھا اس کا آدمی آ گیا تھا مگر وہ کیا کرتا۔

جوگندر بولا۔ ”منیم جی گاڑی خالی کرو آؤ آگے جانا ہے۔“

منیم بولا۔ ”تو میں کاروں گاڑی تو ہولی کے بعد خالی ہوگی۔“

”تو پھر اس کا ہر جانہ دینا ہوگا اور میرا اور کلیز کا خرچ بھی دینا پڑے گا۔“ جوگندر بولا۔

”وہ تو سیٹھ کرے گا۔“ منیم نے جواب دیا۔

”تیرا سیٹھ کون ہے؟“ جوگندر نے پوچھا۔

”ارے تو نیا ہے کیا، سیٹھ دینا لال کو بیس جانتا اس کا مال ہے ابھی تو اس کی ضرورت بھی نہ ہے۔ فرصت میں ہی اترے گا دیکھ ہر طرف ہولی کی تیاریاں ہو رہی ہیں سب اپنے اپنے کام میں مست ہیں مٹھائیاں اور کھیل

بتائے خریدے جارہے ہیں۔ آتش بازی کی دوکانیں بھی ہوئی ہیں جاتو بھی ہولی کھیل موج کر جوان آدمی ہے ارے یہ تہوار تو جوانوں کا ہی ہے جس کو دل کرے پچکاری

مار دے رنگ منہ پر لگا دے سینے پر لگا لے کوئی برا نہیں مانے گی۔ ارے میں تیری عمر کا تھا تو سارے سال ہولی کا انتظار کر رہے تھا۔“

”تمہاری بات تو ٹھیک ہے منیم جی پر دو تین دن تک میں گاڑی میں سوؤں گا کیا۔“ جوگندر بولا۔

”ارے! اپنے کی تو نے اچھی کہی، میں دفتر کھولے دیتا ہوں اس میں کوئی زیادہ کہا تو ہے نہیں ایک

بستر بھی ہے تم دونوں سو جاؤں گے اور رہی گاڑی اس کی تو فکر ہی نہ کر اڈے پر آگئی اب ہم جائیں اور یہ جانے، مال

تو ہمارا لوڈ ہے تو حفاظت بھی ہم کریں گے۔“ منیم بولا۔

”اور خرچ پانی کون دے گا؟“ جوگندر بولا۔

”ارے تو کیوں چتا کرتا ہے میں دوں گا، حساب ہوتا رہے گا بعد میں سردار سے تو ہمارا حساب چلتا ہی رہتا ہے۔“ منیم بولا۔

اور اس طرح جوگندر کو گوالیار میں رکنا پڑا۔ جوگندر

ہیں کا تیرا گھر نہ ہی ہے۔“

”ہم دونوں مسافر ہیں ہمارا یہاں کوئی نہیں ہے اور روٹی تو کھانی ہے۔“ جوگندر بولا۔

”روٹی ضرور کھا بھایا، پر ہوٹل میں نہیں ملے گی۔ میرے گھر ملے گی آ میرے ساتھ یہاں پر میرا گھر.....“ وہ آدمی کھڑا ہو گیا تو جوگندر بولا۔ ”ارے بھیا گھر میں تمہاری گھر والی کو تکلیف ہوگی۔“

”تکلیف ارے بھلے مانس وہ تو خوش ہوگی کہ ہمارے گھر بھی بھگوان کی کرپا سے مہمان آئے، آ جا اوپر میرے ساتھ۔“

جوگندر نے شولو کو اشارہ کیا اور دونوں اس کے ساتھ زینہ چڑھنے لگے..... زینہ ختم ہوا تو ایک کھلا آنگن ان کے سامنے تھا اس شخص نے زینہ ختم ہوتے ہی آواز لگائی۔ ”انجلی اری اوانجلی۔“

دور سے آواز آئی۔ ”میں رسوئی میں ہوں آ جاؤ۔“

”اری میرے ساتھ تیرے مہمان ہیں۔“ پھر آواز آئی۔ ”اچھا میں آ رہی ہوں تم ان کو بیٹھک میں بٹھاؤ۔“

ایک دروازے کو اس نے کھولا اور بولا۔ ”آؤ اندر آ جاؤ۔“

کمرے میں فرش پر درمی پڑی تھی اور سر کی کے مونڈھے رکھے تھے کمرہ صاف تھرا تھا دونوں بیٹھ گئے تو وہ بولا۔ ”میرا نام لکھی چند ہے میں ہوٹل چلاتا ہوں گھر میں تو شاید تیرا ہوا ہی کھانا بنتا ہے اب تم اپنا پرستے کرادو۔“

”میرا نام جوگندر سنگھ ہے، میں ڈرائیور ہوں شہروں شہروں سڑک سڑک میں پھرتا ہوں یہ میرا کلبز ہے بس ہماری زندگی تو مسافروں کی ہے گرد دار تو گاؤں میں ہے، مہینوں گزر گئے جانا نہیں ہوا۔“

انجلی کمرے میں داخل ہوئی ہری ساڑھی اور اسی رنگ کا بلاؤز بھرا بھرا جسم اور مناسب قد عمر چالیس کے لگ بھگ وہ آتی ہی بولی۔ ”بھگان کی لیلیا ہے میں سوچ رہی

سارا سال خوش رہے گا، اپنے غم و تفکرات کو وہ شراب میں ڈبو دیتے ہیں اور خوب پیتے ہیں، عورتیں تک شراب اور بھنگ پیتی ہیں اور اتنی جیتی ہیں کہ ان کو اپنا ہوش نہیں رہتا اس بے ہوشی کے دوران ان پر کیا گزر جاتی ہے ان کو پتہ نہیں چلتا، آدھی رات کے بعد ان کے پروگرام شروع ہو جاتے ہیں آتش بازی اس قدر ہوتی ہے کہ کان پڑی آواز بھی سمجھ نہیں آتی۔

ہولی کے دن یوں تو ہر گھر میں بہترین پکوان پکتے ہیں اور کھانے کھلائے جاتے ہیں۔ چوراہوں پر سڑک اور کسی بھی مناسب جگہ کھلے عام جوا ہوتا ہے اس پر پابندی نہیں ہوتی لاکھوں کا جوا کھلے عام کھیلا جاتا ہے اور اس کو دھرم کا لڑی حصہ قرار دے دیا گیا ہے شہر چھوٹا ہو بڑا ہو یہ پروگرام چلتا ہے ہارنے والا افسوس نہیں کرتا جیتنے والا خوش ہوتا ہے، لکشی دیوی جس پر چاہے مہربان ہو جائے۔

ہولی کا دن شروع ہوتے ہی شہر رنگین ہو گیا ہر کوئی رنگ بھری پچکاریاں لئے کھڑا تھا عورت مرد کی تمیز نہ تھی وہ ہر ایک کو رنگ رہے تھے لوگ خوش ہو رہے تھے ان کے کپڑے رنگین ہو رہے تھے مگر وہ ہنس رہے تھے ہندو، مسلمانوں پر رنگ ڈال رہے تھے اور مسلمان خاموشی سے برداشت کر رہے تھے کسی جگہ شربت بھرا رکھا تھا تو کسی جگہ گرم گرم چٹیلی تیار ہو رہی تھیں لوگ خوشی میں ایک دوسرے کو میٹھا کھلا رہے ہندوؤں کے جتنے تہوار ہیں ان میں کثرت استعمال مٹھائی کا ہے یہ بہت زیادہ میٹھا کھاتے ہیں ہر موقع پر ہر دعوت میں یہ ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

شولو اور جوگندر کا اس شہر میں کوئی نہیں تھا وہ تو صرف بازار میں بلا ضرورت پھر رہے تھے۔ دو پہر تک پھر

تے پھرتے شولو کو بھوک لگ گئی وہ ایک ہوٹل میں داخل ہوئے ہوٹل میں بھیڑ نہیں تھی کاؤنٹر پر ایک آدمی بیٹھا تھا ان دونوں کو دیکھ کر بولا۔ ”کا بات ہے کا لوگے۔“

جوگندر بولا۔ ”کھانا ملے گا۔“ وہ آدمی کھڑا ہو کر بولا۔ ”موسنو ہوٹل میں آج کھانا، ارے بھلے مانس کوئس کھائے گا گھر گھر پکوان کپکے

۔ بازاروں کا کھاتے کھاتے اچانک اس کو اتنی محبت سے گھر کا کھانا ملا تو اس کو اپنی ماں یاد آ گئی وہ بھی اسی طرح اس کو کھلائی تھی جو گندر کھاتے کھاتے اداس ہو گیا۔ انجلی بولی۔ ”کیا بات ہے تم خاموش ہو گئے۔“

جو گندر بولا۔ ”تمہاری محبت نے مجھے میری ماں یاد دلادی ہے ایک مدت کے بعد میں اس محبت بھری فضاء میں کھانا کھا رہا ہوں تم نے کمال خوبی سے میری حالت کا اندازہ کر لیا۔“

”عورت مرد سے زیادہ حساس ہوتی ہے تم میرے کوئی نہیں ہو مگر میں نے تم کو دیور قبول کر لیا ہے اب تم میرے دیور ہی رہو گے، یہ لوگلاب جاسن بڑی بڑھیا بنائی ہیں۔ بناتے وقت میں سوچ رہی تھی کہ میرے گھر تو کوئی آتا نہیں کس کو کھلاؤں گی کون میری محنت کو سراہے گا مگر بھگوان نے تم کو بھیج دیا۔“

جو گندر نے جواب دیا۔ ”بہت بڑھیا بنائی ہیں۔“ انجلی ہنس پڑی۔ ”میرا دل رکھ رہے ہو شاید۔“

”نہیں اچھی ہیں تو کہہ رہا ہوں۔“ جو گندر بولا۔۔۔۔۔ انجلی ہنس کر بولی۔ ”یہ تمہارے ساتھ جو لڑکا ہے کیا گونگا ہے۔“

اب جو گندر ہنس پڑا بولا۔ ”نہیں گونگا نہیں ہے بولتا ہے مگر اس میں یہ خوبی ہے کہ بڑوں کی بات میں دخل نہیں دیتا۔“

انجلی بولی۔ ”کھانے میں شرمانا نہیں تمہارا گھر ہے۔“

شولو نے پہلی بار زبان کھولی۔ ”ٹھیک ہے بھابی۔“

لکھی چند ہنس کر بولا۔ ”لے نیک بخت اب تو تیرے دود پور ہو گئے۔“

انجلی ہنس کر بولی۔ ”گو الیا میں کب تک ہو؟“ ”دو تین دن رکنا ہوگا۔“ جو گندر نے جواب دیا۔ ”بھرا نا ہوگا ہمارے گھر۔“ لکھی چند بولا۔۔۔۔۔

تھی میرے گھر کون آئے گا میں کسے پکوان کھلاؤں گی پر بھگوان نے تم کو بھیج دیا دانے دانے پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے آج ہولی ہے آج سب خوش ہیں میں بھی خوش ہوں۔“

جو گندر نے اس کی آواز اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ لگایا کہ وہ کبھی عورت ہے مگر خود کو خوش ظاہر کر رہی ہے جو گندر بولا۔ ”میں تم کو بھابی کہوں تو برا تو نہیں مانو گی۔“

”کہہ لے بھابی، میرا کوئی دیور نہیں ہے تو دیور بن جا، میں خوش ہوں گی۔“

”بھابی میں آج تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا پر کل میں ضرور پوچھوں گا۔“ جو گندر بولا۔

”تو نے بھابی کہہ دیا ہے تو لکھی چند بھائی ہوا، ساری رام کہانی یہ جانے ہے سب بتلائے دے گا آج تو تو کھا اور سوچ کر۔۔۔۔۔“ انجلی بولی۔

لکھی چند بولا۔ ”میں راجستھانی دی ہوں ہم اپنے مہمان کی خاطر کے لئے جان لڑا دیتے ہیں تو کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اچھا ہے برائے؟ آگے ہمارے ساتھ کیا کرے گا؟ ہمیں پتہ نہیں پر ہم تیری خدمت کریں گے کیونکہ تو ہمارا مہمان ہے۔“

انجلی اٹھ کر رسوئی میں چلی گئی اور صحن میں اس نے کھانا چن دیا اور آواز دی۔ ”کھانا لگ گیا ہے آ جاؤ۔“

لکھی چند بولا۔ ”لے بھائی تیری بھابی نے کھانا لگا دیا ہے آ جا۔“

جو گندر نے شولو کو اشارہ کیا اور کمرے کے باہر آ گئے۔ باہر سفید چاندنی پر کھانا لگا ہوا تھا انجلی اور لکھی چند ان دونوں کے سامنے بیٹھ گئے لکھی چند بولا۔ ”بس اب شروع ہو جا بھابھا۔“ جو گندر بولا۔

”بھابی اتنا کھانا تم نے رکھ دیا یہ تو بہت ہے۔“ ”تم راج کے کھاؤ زیادہ نہیں ہے۔“ جو گندر نے پوری اٹھائی اور سبزی پلیٹ میں ڈال کر کھانے لگا راستہ بھی ایک پلیٹ میں لے لیا۔ شولو نے بھی کھانا شروع کر چکا تھا

”نیچے ہیں آج سے ان کا کام تو شروع ہو گیا ہے
- انجلی نے بتایا۔

ناشتہ کے بعد انجلی بولی۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“ جو
گندر کھڑا ہو گیا تو انجلی دروازے سے باہر آگئی اندر بر
آمدے کے آخری سرے پر بنے دروازہ پر آ کر رک گئی
اور پھر آہستہ سے دروازے کو دھکا دیا دروازہ کھل گیا تو اس
نے جو گندر کو اندر آنے کا اشارہ کیا، جو گندر بھی دروازے
سے اندر چلا گیا۔ اچھا بڑا کمرہ تھا مگر بے ترتیب ایک کونے
میں ایک بڑی سی مسہری پڑی تھی اس پر بستر بھی صاف تھا
اور اس بستر پر ایک جوان لڑکی لیٹی تھی۔ اس کی آنکھیں بند
تھیں جسم اس کا لاغر تھا اور چہرہ پیلا پڑا تھا بہت پرانی
مریضہ معلوم ہوتی تھی۔

انجلی نے اس کو آواز ادا کی۔ ”کون کون“ لڑکی نے
آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی انجلی کے بعد
اس کی نظر جو گندر پر پڑی تو وہ زور سے بولی۔ ”تو پھر آ گیا
کتنی بار مجھے برا کر دے گا مانتی یہی ہے۔ وہ ظالم جس
نے میری زندگی خراب کر دی ہے اس کو نکال یہاں سے۔“
اور پھر اس کی زبان سے نت نئی گالیاں برآمد ہونے لگیں
انجلی نے جو گندر کو اشارہ کیا، باہر لے آئی اور کٹری بگادی
بولی۔ ”اس کی یہی حالت ہے کسی بھی مرد کو دیکھ کر وہ یہی
کرتی ہے میری زندگی کا یہ روگ بن گئی ہے۔“ اور وہ
رونے لگی۔

”یہ حالت کب سے ہے؟“ جو گندر نے پوچھا۔
”دو سال پہلے یہ ٹھیک تھی۔ بچپن سے یہ ٹھیک تھی
بڑی چیخ بڑی ہنس لکھ اس نے بچپن سے جوانی تک مجھے
تھک نہیں کیا قسمت میں صرف یہی اولاد لکھی اس کے بعد
کوئی اولاد مجھے نہ ہوئی اب تم سمجھ لو کہ یہ کتنی پیاری ہوگی
اس کے باپ کی تو یہ حالت ہے کہ یہ زبان سے کسی چیز کا
نام لے دے اور وہ کچھ کریں وہ چیز لے آئیں گے ایسے
لاڈ پیاری کی مالی میری بیٹی دو سال پہلے تک اچھی تھی ہوئی
کے بعد بھی ٹھیک تھی پھر اچانک نہ جانے اس کو کیا ہوا کہ
بہکی بہکی باتیں کرنے لگی اور ایک رات پتہ نہیں کس وقت

”ارے بھیا کیوں نہ آؤں گا۔ اب تو گوالیار میں
میرے بھیا کا گھر ہے کوشش کر کے آؤں گا۔“ جو گندر نے
کہا۔

”تو پھر رات کو میرے گھر ہٹاؤں پر کیا کرے
گا۔“ لکھی چند منجبت سے کہا۔

”ٹھیک ہے مجھے کیا اعتراض ہے، کیوں شلو؟“
جو گندر نے شلو کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

دونوں ک بستر اسی بیٹھک میں لگ گئے اور
دونوں موگے سویرے انجلی کی آواز پر جو گندر کی آنکھ کھلی
اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا انجلی بولی۔ ”بڑے بے خبر ہوئے بھیا تم
تو۔“

”ارے بھابی ایک مدت کے بعد گھر میں اور بستر
پر سویا تھا۔ ورنہ گاڑی کی سیٹ پر سویا کرتا تاہم تو آتا تھی
بڑا آئندہ ہے۔“
انجلی بولی۔ ”اپنے کلینز کو بھی اٹھا دے میں ناشتہ
تیار کرتی ہوں۔“

ناشتہ پر جو گندر نے محسوس کیا انجلی کے چہرے پر
کل والی خوشی نہیں تھی اس کی جگہ اداسی کی لگ رہی تھی وہ
بولا۔ ”بھابی ایسا لگتا ہے ہولی گئی تو تمہاری مسکراہٹ بھی
لے گئی بدلی بدلی سی نظر آ رہی ہو۔“
انجلی کی اداسی اور گہری ہوئی بولی۔ ”تم نے ٹھیک
کہا ہے بھیا، میرے نصیب میں خوشی ایک دن کو آتی ہے
۔“

”ایسا کیا ہے بھابی بتاؤ تو شاید میں کچھ
کر سکوں؟“ جو گندر بولا۔

ہمدردی کے دو بول نے انجلی کو اور اداس کر دیا اس
کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بھرائی ہوئی آواز میں
بولی۔ ”ضرور بتاؤں گی میں نے کہا تھا نارت کو کہ میرے
گھر کوئی نہیں آتا تو اس کا کارن بھی بتاؤں گی تم ناشتہ کر لو
آرام سے پھر بتاؤں گی۔“ انجلی نے کہا۔

”بھیا کہاں گئے سویرے سویرے۔“ جو گندر بولا

گھر سے باہر چلی گئی اور تین دن تک نہ آئی۔ ہم اپنی عزت کی خاطر خود تلاش کرتے رہے یہ بات کسی کو نہ بتائی تین راتوں کے بعد یہ پھر کسی وقت واپس آگئی مگر اس کی حالت خراب تھی بہت کمزور اور اذہاں اور سب کو گالیاں بکتی تھی کسی مرد کو قریب دیکھ کر یہی کہتی تھی جو تم سے کہہ رہی تھی۔ دو سال میں ہمارے تعلقات سب عزیزوں سے ختم ہو گئے میں نے خود ختم کر لئے اس لئے کہ اس کی حالت بگڑ جاتی تھی اب میرے گھر کوئی نہیں آتا۔“

”اس کے بعد کیا یہ پھر کبھی کہیں گئی جیسی پہلے گئی تھی۔“ جو گندر نے پوچھا۔

”گئی تو نہیں مگر اس کمرے میں، میں بھی رات کو نہیں رہ سکتی نہ معلوم کیا بات ہے، بڑا ڈر لگتا ہے، کمرے کی چیزیں حرکت کرتی ہیں اور یہ بڑی خوفناک آواز میں چیخ و پکار کرتی ہے اس وقت اس کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور پھر خاموش لیٹ جاتی ہے اس کی چیخ و پکار اتنی خوفناک اور درد ناک ہوتی ہے جیسے اس کو کاٹنا جا رہا ہے سخت تکلیف میں ہے میں اس کی یہ حالت نہیں دیکھ سکتی اور اسے کمرے میں سوئی ہوں، پہلے یہ حالت روز ہوتی تھی مگر اب کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے میں تو بھگوان سے پراہٹنا کرتی ہوں اس کو اٹھا لے یا ٹھیک کر دے۔ تم خود اندازہ کرو کہ کوئی ماں اپنی اکلوتی بیٹی کے لئے یہ پراہٹنا کن حالات میں کرتی ہوگی میری زندگی سخت دشواریوں میں گھری ہے میں نے اس کے ہر طرح کے علاج کروائے مگر کچھ نہ ہوا علاج کرنے والے تھک کر بھاگ گئے اس کا باپ وقت سے پہلے بوڑھا ہو رہا ہے اس کی ساری کمائی اس کے علاج پر خرچ ہو رہی ہے مگر اس کی حالت گرتی جا رہی ہے۔“

جو گندر انکلی کی بات سن کر اداس ہو گیا اور بولا۔ ”بھابی آپ بڑی دل والی عورت ہیں۔ آپ ان حالات میں اپنا دامنی توازن برقرار رکھے ہوئے ہیں، میں تو سن کر ہی پریشان ہو گیا ہوں۔ مگر انسان کو ناامید نہیں ہونا چاہئے امید کی ڈوری اگر ٹوٹ جائے تو آدمی ہار مان لیتا ہے بھگوان کے پاس دیر ہے اندھیر نہیں ہے اس مصحوم لڑکی پر

جو قسم کر رہا ہے اس کا ضرور حساب ہوگا۔“

”بس بھی تم دعا کرتے رہنا۔“ انکلی بولی۔

”میں شہروں پھرتا ہوں یاد رکھوں گا اگر اس کا علاج کوئی کرنے والا ملا تو ضرور اس کو ملوں گا اور اس کو لے کر آؤں گا۔“ جو گندر بولا۔

”میری تو آس ٹوٹی جا رہی ہے۔“ انکلی رونے لگی۔

”بھابی ایسا نہ کہو۔ امید کا دامن مت چھوڑو بھگوان کوئی راستہ نکال دے گا۔“

انکلی نے کوئی جواب نہ دیا روتی رہی پھر بولی۔ ”اب کب آؤ گے؟“

”ان حالات میں میرا من جانے کو نہیں کرتا مگر جانا ضروری ہے پھر مجھے اس کا علاج بھی تلاش کرنا ہے میں بہت جلد آؤں گا اور ساتھ اس کا علاج بھی لاؤں گا۔ تم چھتا نہ کرو اور اب اجازت دو۔“

وہ بیٹھک میں آیا شلو کو اشارہ کیا اور دروازے کے باہر زینہ پر آ گیا۔ زینہ اتر کر وہ لکھی چند کے پاس گیا اور بولا۔ ”بھابی میں جا رہا ہوں، پر جلدی آؤں گا، تم نے میری خدمت کی ہے میں بھولوں گا نہیں کتنی عجیب بات ہے کہ میں گوالیار میں جب آیا تھا تو میرا کوئی نہیں تھا، پر اب میرے بھائی کا گھر ہے جہاں پر محبت کرنے والی بھابی ہے، حیرت کی بات ہے کتنے جلدی رشتے بن جاتے ہیں اور بنے بنائے ٹوٹ جاتے ہیں۔“

”تو نے ٹھیک کہا، محبت رشتے بناتی ہے، یہ کسی بھید بھاء کو نہیں دیکھتی۔ نفرت رشتے ختم کرتی ہے یہ بھی اپنے پرانے نہیں دیکھتی دونوں ہی اندھی ہیں اور دونوں کا وجود بھی موجود ہے تو جب آیا تھا تو ابھی تھا مگر صرف ایک رات کے بعد جا رہا ہے تو اپنا سا لگتا ہے کاش تو میرے پاس رہ سکتا میرا کون ہے دنیا میں؟ ایک اولاد بھگوان نے دی تو نے اس کی حالت دیکھ لی ہر روز خون کے آنسو بہاتا ہوں میرا جینا اب مشکل ہے۔“ لکھی چند کی آواز بھرا گئی۔

پھر وہ ہنسی لے کر رونے لگا۔

جو گنڈر اڑے سے باہر آ گیا اور آہستہ آہستہ شہر سے باہر آتا گیا آخری پیٹرول پمپ پر وہ کھڑا ہوا اور پیٹرول ڈلوایا اور روانہ ہوا اور بغیر کے چلتا رہا۔ شولو حیران بیٹھا رہا وہ خاموش بیٹھتا تھا تو استاد کہتا تھا۔ ”اے کیا نیند آ رہی ہے تو سوئے گا تو مجھے بھی جھوٹا آئے گا بات کرتا رہ۔“

اور آج استاد خاموش ہے اس سے رہا نہیں گیا بولا۔
”استاد کیا بات ہے تم بہت خاموش ہو؟“

جو گنڈر بولا۔ ”ہاں میں آج بہت اداس ہوں۔“
”بھائی نے کچھ کہہ دیا ہے۔“ شولو بولا۔

”وہ غریب مصیبت زدہ کیا کہے گی، میں تو اس معصوم لڑکی کے بارے میں سوچ رہا ہوں جو کہ بے گناہ کسی نادیدہ قوت کا شکار ہے اور بے وجہ ظلم ستم برداشت کر رہی ہے۔“ جو گنڈر بولا۔

”وہ کون لڑکی ہے استاد مجھے تو بتاؤ۔“ شولو نے کہا۔

”وہ کبھی چند کی لڑکی ہے اور کسی آسیب نے اس کو پکڑ رکھا ہے اور اس کی حالت بہت خراب ہے، میں نے اس کی حالت دیکھی ہے اس کو دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے تو تم اندازہ کرو اس کی ماں تو روز اس کو دیکھتی ہے اس کی حالت کیا ہوتی ہوگی؟“

”اب تم کیا کرو گے استاد، یہ کام تو کسی جھاڑ پھونک کرنے والے کا ہے۔“ شولو بولا۔

”وہ لوگ بہت علاج کر چکے ہیں مگر فائدہ نہیں ہوا مگر دلی میں، میں نے سنا ہے ایک آدمی ایسا ہے جو یہ کام کرتا ہے اگر مال دلی کا نہ ملتا تو مجھی میں دلی ضرور جاتا مجھے اس معصوم لڑکی کا بڑا خیال ہے ذرا سوچ تو وہ اکلوتی اولاد ہے اس کے ماں، باپ کی کیا حالت ہوگی۔ کتنے ارمان ان کے دل میں ہوں گے کتنی محنت اور لاڈ پیار سے انہوں نے اس کو پالا ہے اور آج دونوں خون کے آنسو رو رہے ہیں حد یہ ہے کہ اس کے مرنے کی دعائیں کر رہے ہیں لڑکی کے دکھ ان سے دیکھے نہیں جا رہے۔“ جو گنڈر بولا۔

جو گنڈر نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رک کر کہا۔ ”فکر نہ کرو بھیا اس مصیبت کا انت تو ضرور ہے، میں کوشش کروں گا، میں چین سے نہیں بیٹھوں گا، میرے اندر بھی اس ظالم کے خلاف لگتی جل گئی ہے، میں ضرور اڑوں گا اور پھر تمہارے پاس رہوں گا، تمہارا ہاتھ بٹاؤں گا، تم اپنے آپ کو سنبھالو اور اچھے کی امید رکھو یہ دن ہمیشہ رہنے والے نہیں ہیں۔“ کبھی چند نے جو گنڈر کو گلے لگایا اور بولا۔
”میں تیرا انتظار کروں گا۔“

جو گنڈر شولو کے ساتھ ٹرک پر آ گیا وہ خاموش تھا اور اس کے چہرے پر غم کے بادل منڈلا رہے تھے شولو حیران تھا آج استاد کو کیا ہوا ہے کہ اتنا اداس ہے وہ بولا۔
”استاد تانگہ کر لوں۔“

جو گنڈر نے اس کی بات سنی اور بولا۔ ”ہاں پکڑ لے۔“

شولو نے ایک تانگہ روکا اور اس میں دونوں سوار ہو کر اڑے پر پہنچے اڑے پر گاڑی پر مال لوڈ تھا اور ٹیم گاڑی کے پاس کھڑا تھا جو گنڈر کو دیکھ کر بولا۔ ”بھئی استاد میں نے تیرا کام کر دیا ہے۔ تیری گاڑی لوڈ کھڑی ہے اور مال لال کنویں کی منڈی کا ہے کچھ گیانا دلی میں لال کنواں ہے۔ تیری بڑی مہربانی۔“

”نیم جی۔۔۔۔۔ مجھے بھی دلی ضرور جاتا ہے۔“
”تو پھر جا شام تک دلی میں ہوگا مگر خیال رکھنا سامان میں دتین کریٹ کا بچ کے رتن بھی ہیں۔“ نیم بولا۔

”کریٹ اوپر رکھے ہیں کہ نیچے دیکھ بھال کر رکھے ہیں۔“ شولو بولا۔

”ارے ہاں اچھی طرح باندھ دیا ہے کچھ نہیں ہوگا بس ذرا اچھل کود۔ مت کرنا۔“ نیم بولا۔

شولو نے ٹرک کے چاروں طرف چکر لگایا رسیوں کو چیک کیا اور بولا۔ ”استاد نیم جی نے کام پکا کیا ہے۔“
جو گنڈر گاڑی پر چڑھ گیا اور سلف لگا کر اسٹارٹ کر دی نیم نے کہا۔ ”بھگوان تجھے خیر سے لے جائے۔“

”سردار یہ محبت کی بات ہے دل جس کو جو مان لے وہی رشتہ پکا ہوتا ہے لکھی چند میرا کچھ نہیں ہے مگر ایک رات میں وہ میرا سب کچھ بن گیا ہے اب تم اس کی تفصیل نہ پوچھنا۔“ جو گندر بولا۔

”نہیں پوچھتا دیکھ تو نے کچھ بتایا تو میری سمجھ میں بھی آ گیا اور اس کا صل بھی سمجھ میں آ گیا تو فکر ہی نہ کر اپنی دلی میں سب کچھ ہے پیارے میں ایک آدمی کو جانتا ہوں جو مفت میں یہ کام کرتا ہے سویرے اس کے پاس چلیں گے۔ وہ یہ کام ضرور کرے گا۔“ سردار بولا۔

”تم حکیم وقار کی بات تو نہیں کر رہے۔“ جو گندر نے پوچھا۔

”ہاں تیرے کو پتہ ہے اس کے بارے میں۔“ سردار بولا۔

”میں نے صرف نام سنا ہے میں ان کے لئے ہی دلی آیا ہوں۔“ جو گندر نے کہا۔

”چل پھر ٹھیک ہے فکر نہ کرو تو آرام کر روٹی شوٹی کھا سویرے میں آ جاؤں گا۔“ سردار چلا گیا۔

سردار بہت سویرے ہی آ گیا اور دونوں حکیم وقار کے دواخانے پہنچ گئے، ابھی حکیم صاحب نہیں آئے تھے دونوں انتظار کرنے لگے ٹھیک دس بجے حکیم وقار دواخانے آ گئے۔

سردار اور جو گندر ان کے پاس پہنچ گئے تو جو گندر بولا۔

”حکیم صاحب ہم دونوں میں سے مریض کوئی نہیں ہے مریض گوالیار میں ہے آپ اجازت دیں تو پوری کہانی بیان کروں۔“

حکیم وقار یہ سن کر حکیم بولے۔ ”میرے بھائی اس قسم کا کام حکیم کامل کرتے ہیں۔ آج کل وہ ایک انوکھے مشن پر مصروف ہوئے ہیں۔ آج رات میں ان سے رابطہ کروں گا۔ لہذا آپ کل شام کے وقت تشریف لائیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کا کام ہو جائے گا۔ دوسرے دن دونوں مطب پہنچ گئے، وہاں پر رولو کا موجود تھا۔ ان سے

”ہاں استاد بات تو بڑے غم کی ہے اور آدمی کے بس سے باہر کی بھی ہے آدمی سامنے والے سے لڑ سکتا ہے اس کی منت سماجت کر سکتا ہے اس کے پیر پکڑ سکتا ہے مگر جو نظریہ نہ آئے اس کا وہ کیا کرے۔“

جو گندر بہت تیز آیا اس نے کہیں پر آرام بھی نہیں کیا گاڑی بھی اس کا ساتھ دیتی رہی اور وہ رات آٹھ بجے لال کنویں پر آ گیا اور مال اتار دیا۔ مال اتار کے وہ سیدھا سردار کے پاس آ گیا اور بولا۔

”سردار اب میں کچھ دن آرام کروں گا میرے کچھ کام ہیں وہ کرنے ہیں اگلے پھرے کے لئے آدمی کا بندوبست کر لے اور میرا حساب کردے پیسوں کی ضرورت ہے۔“

”اوئے ایسا کیا کام پڑ گیا مجھے بول میں کروں گا۔“

”نہیں سردار یہ کام میں خود کروں گا ابھی تو رات ہوگئی ہے سویرے سے میں اس کام پر لگ جاؤں گا، کل ہی میرا حساب دے دینا، میں تمہارا کام نہیں چھوڑ دیا تمہارا کام میں کروں گا مگر دو چار پھیرے نہیں لگاؤں گا۔“ جو گندر نے جواب دیا۔

”اوئے تو کام تو دس۔“ سردار نے بولا۔

”بات بتانے والی نہیں ہے سردار، تو خود سمجھ دار ہے۔“ جو گندر بولا۔

”اوئے ایک سے بھلے دو ہوتے ہیں۔ آپس میں مشورے سے بڑے بڑے مسئلے حل ہو جاتے ہیں بتائے گا تو فائدہ ہی ہوگا نقصان نہیں ہوگا مجھ پر اعتبار کر۔“ سردار بولا۔

”اچھا تو سنو گوالیار میں میرا ایک بھائی ہے اس کی ایک اکلوتی لڑکی ہے اس پر بوازدہ دست کوئی آسیب ہے اس لڑکی کی حالت خراب ہے، علاج گوالیار میں بہت کرایا، پر فائدہ نہیں ہو رہا یہ کام ہے۔“

”پہلے تو یہ بتاؤ گورداں پور کا ہے تیرا بھائی گوالیار میں کہاں سے آ گیا۔“ سردار بولا۔

رولوکا بولا۔ ”پوری تفصیل بتائیں اور خیال رکھیں کہ وہ قطعی طور پر سچ ہوا گرا اپنی کمزوری بھی ہے تو بھی بیان کر دیں آپ کے کام ہونے ہیں آپ کی سچائی ضروری ہے۔“

جو گندر نے اپنا تعارف کر دیا سردار کا تعارف کرایا اور اس کے بعد گوالیار جانے اور لکھی چند کی پوری روداد بیان کر دی۔ پوری تفصیل سننے کے بعد رولوکا نے کہا۔ ”لکھی چند کے پاس کل صبح ہی صبح چلے جائیں میں کل رات تک اس کے پاس آ جاؤں گا، آپ میرا انتظار کرنا کام جلدی کا ہے کیونکہ لڑکی کی جو حالت ہے وہ خطرناک ہے۔“

سردار جو گندر واپس ہوئے تو سردار بولا۔ ”تو ایسا کراسٹیشن چل جو گاڑی ملتی ہے پکڑ لے آ کرہ کی ملے تو ہسپتالوں سے گوالیار زیادہ دور نہیں ہے۔“

اور جو گندر روانہ ہوا۔ شام چھ بجے کہیں رکے بغیر وہ لکھی چند کے سامنے تھا۔ لکھی چند اس کو دیکھ کر حیران ہو گیا اور بولا۔ ”ارے جو گندر اتنی جلدی آ گیا ٹھیک تو ہے۔“

جو گندر بولا۔ ”میں ٹھیک ہوں تھوڑی دیر میں حکیم کامل آنے والے ہیں۔ میں نے ان کو پورے حالات بتادیئے ہیں۔“

”حکیم صاحب کیا علاج کریں گے۔“ لکھی چند حیرت سے بولا۔

”وہ سب علاج کرتے ہیں تم فکر نہ کرو۔“ اور انہوں نے دیکھا تھوڑی دیر میں حکیم کامل ان کے سامنے کھڑے تھے۔

جو گندر حیرت سے بولا۔ ”حکیم صاحب میں بڑی تیزی سے آیا ہوں اور ابھی پہنچا ہوں، آپ کس طرح آ گئے اتنی جلدی۔“

”میں بھی آپ کی طرح تیزی سے آیا ہوں، مریفہ کہاں ہے۔“

”آئیے میرے ساتھ۔“ لکھی چند بولا۔ اور سب اوپر آ گئے اعلیٰ بھی جو گندر کو دیکھ کر حیران ہوئی اور

اس نے مریفہ کا کمرہ کھول دیا اور سب سے پہلے اندر داخل ہوئی اور آواز دی۔ ”کرن اد کرن دیکھ کون آیا ہے؟“ سب کمرے میں تھے۔ کرن نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور ایک دم کھڑی ہو گئی اور مردانہ آواز میں دھاڑ کر بولی۔ ”حرامی! تو باز نہیں آئے گا۔“ اس کی نظریں لکھی چند پر تھیں۔ ”روز کسی نہ کسی کو لے کر آ جاتا ہے، میں جانے والا نہیں ہوں۔“ کرن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں باہر نکلی پڑ رہی تھیں اس کا لہجہ تحسانہ تھا اور آواز میں سانپ کی جیسی پتہ کا تھی۔

رولوکا نے لکھی چند کو اشارہ کیا کہ وہ انجلی کو باہر بھیج دے اور انجلی کمرے سے باہر چلی گئی اب کمرے میں لکھی چند رولوکا اور جو گندر تھے رولوکا بولا۔

”بہت اچھل کود تو نے کر لی ذرا اپنے گرد آنکھیں کھول کر دیکھ اگر دیکھ سکتا ہے تو میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو اس لڑکی کے جسم کو چھو نہ دے اور باہر آ جا، تو نہیں آئے گا تو میں تجھے باہر نکال دوں گا۔“

کچھ دیر کرن خاموش رہی اور پھر بولی۔ ”تیرے جیسے بہت آئے اور چلے گئے تو کیا چیز ہے میں باہر نہیں آتا بول تو کیا کرے گا۔“

”تو سخت غلطی کر رہا ہے میں تجھے سمندر کی تہہ میں دفن کر سکتا ہوں تیرے چاروں طرف کے راستے بند ہیں تو طاقت کے نشے میں ادھر نہیں دیکھ رہا ہے۔“ رولوکا بولا۔

”یہ کام میرا نہیں ہے میں جس کا غلام ہوں اس کے حکم کا باندہ ہوں۔“ کرن بولی۔

”تو پھر بتا تو کس کا غلام ہے اور اس معصوم لڑکی پر ستم کیوں کر رہا ہے؟“

”تجھے بتانے کا میں باندہ نہیں ہوں۔“ کرن بولی۔ رولوکا نے لکھی چند کو کہا۔ ”ایک چھوٹے منہ کی بوتل لاؤ اور اس پر ڈھکن بھی ہو۔ کچھ لو بان آگ بھی لے آؤ۔“

کرن نے کہا۔ ”تو کیا کرنا چاہتا ہے میں ہرگز باہر نہیں آؤں گا۔“

۔ کچھ دیر کے بعد اس نے بتایا کہ کرن ہوش میں آ گئی ہے۔

”اس کو وہ دوا کھلا دو۔ جتنی وہ کھاسکتی ہے کھانے دو اس کے بعد آدھے گھنٹے میں اس کو نرم غذا دو وٹوہ وغیرہ کیونکہ معدہ بالکل خالی ہے۔“

شام کو رولو کا کرن کے کمرے میں گیا تو وہ بیٹھی تھی رولا کا اس کے قریب بیٹھ گیا اور بولا۔ ”اب تم کیسا محسوس کرتی ہو کی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں آپ کون ہیں.....“ کرن بولی۔

”میں تمہارا معالج ہوں تمہارا علاج کرنے آیا ہوں۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”میں کہاں پر تھی آپ مجھے یہاں لائے ہیں۔“ کرن نے پوچھا۔

”بیٹی تم یہ بتاؤ کہ تم کہاں سے غائب ہوئی تھیں اور تم پر کیا گزری ہے میں تمہارا معالج ہوں مجھ سے پردہ نہ کرنا کیونکہ ابھی تمہارا علاج پورا نہیں ہوا چھپاؤ گی تو میں پورا علاج نہ کر سکوں گا تم جو بتاؤ گی وہ میرے سینے میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائے گا۔“ رولو کا بولا۔

”یہ بات شاید دو تین سال کی بات ہے، میں قلعہ کے قریب سے گزر رہی تھی میرے ساتھ میری دو تین دوست بھی تھیں ہم لوگ شاید کچھ کھا رہے تھے کہ اچانک ہمارے سامنے ایک آدمی آ گیا۔ وہ صاف ستھرے کپڑوں میں تھا بہت کچھ شہم جسامت کا آدمی تھا۔ اس کا چہرہ بڑا عجیب تھا ٹھوڑی بہت لمبی تھی اور دہانہ چوڑا آنکھیں بڑی بڑی اور ان کا رنگ سرخ تھا۔ سر پر ایک بال بھی نہیں تھا اور ماتھے پر سرخ رنگ کی لکیریں پڑی تھیں وہ ہمارے سامنے کھڑا تھا اور ہم سب اس کو دیکھ کر ڈر رہی تھیں۔ وہ عجیب سی آواز میں بولا۔ ”میرے ساتھ کون کون جائے گی؟ مجھے صرف ایک کی ضرورت ہے۔“

میں ڈر کر اپنی ایک دوست کی آڑ میں ہو گئی اور بھاگنے لگی اس نے سب کو چھوڑ دیا اور میرے پیچھے آیا اور

”تو ابھی خود کہے گا کہ مجھے باہر نکالو۔“ رولو کا بولا۔
لکھی چند کچھ ہی دیر میں سب چیزیں لے آیا کوئلے جل رہے تھے رولو کا نے لوہان ہاتھ میں پکڑا اور نہ معلوم کس زبان میں کچھ کہا اور آگ پر لوہان ڈال دیا۔ بوتل کا ڈھکن کھول کر بوتل زمین پر رکھ دی لوہان کا دھواں کمرے میں گردش کرتا رہا اور خاص طور سے کرن کی طرف خود بخود جانے لگا کرن کو کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ بڑی مشکل سے بولی آواز مردانہ تھی۔ ”بند کر، ارے بند کر میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

رولو کا نے کہا۔ ”باہر آ جا یہ بند ہو جائے گا۔“ مگر جواب نہیں آیا۔

چند منٹ تک کرن کے کھانسنے کی آواز آئی آواز میں وہ گھن گرج نہیں تھی۔ ”بند کر دے میں باہر آتا ہوں۔“

”فرار ہونے کی کوشش مت کرنا، سارے دروازے بند ہیں اس بوتل میں راستہ ہے۔ بس.....“ رولو کا بولا۔

”مجھے قید کرے گا تو.....“ کرن بولی۔
”شکر کہ صرف قید کر رہا ہوں ورنہ تیری زندگی ختم کرنے کو یہ دھواں ہی کافی ہے۔“ رولو کا بولا۔

کرن بستر پر گر پڑی اور بوتل میں دھواں بھر گیا۔ رولو کا نے بوتل پر ڈھکن لگا دیا۔ چند منٹ میں لوہان کا دھواں ختم ہو گیا اور دھواں صرف بوتل میں منڈلاتا رہا۔ رولو کا نے کرن کی نبض دیکھی۔ زبان دیکھی اور لکھی چند کو ایک دوا لانے کو کہا اور بوتل لے کر باہر آ گیا انگلی دروازے پر کھڑی تھی۔ رولو کا نے کہا۔ ”لڑکی کا مرض اس بوتل میں ہے۔ دوا آ جائے تو جتنی کھا سکے کھلا دینا اس کو آدھے گھنٹے کے بعد خوراک دینا۔ لڑکی اب ٹھیک ہے۔ مگر کام ابھی باقی ہے مجھے رکنا ہوگا۔“

لکھی چند بولا۔ ”آئیے میں آپ کو کمرے میں پنچا دوں۔“

اور رولو کا ایک صاف ستھرے کمرے میں آ گیا

اپنی باریک منمنائی آواز میں بولا۔ ”تو ہی جائے گی۔“ اور اس کے بعد مجھے نہیں پتہ کہ میں کہاں ہوں۔ اس نے میرے ساتھ کیا کیا مجھے ہوش نہیں ہے مگر میرا جسم گواہی دیتا تھا کہ میں کیا سے کیا ہو گئی ہوں۔ کبھی کبھی میں خود کو اس کمرے میں پاتی تھی۔ ماما جی میرے پاس ہوتی تھیں میں اپنی حالت پر روتی تھی مگر پھر بے خودی کے عالم میں چلی جاتی تھی اس حالت میں بھی شاید میں تڑپتی تھی یہ بات ماما جی بتاتی تھیں وہ کون تھا اور مجھ سے کیا چاہتا تھا میں پوچھنا چاہتی تھی مگر پھر کبھی میرے سامنے نہیں آیا صرف یہ ہوا کہ اس کے آتے ہی میں بے ہوشی کی حالت میں ہو جاتی پہلے ہر وقت یہ کیفیت تھی اب کبھی کبھی ایسا ہو رہا تھا۔“

رولوکا بولا۔ ”اب تم پر بے ہوشی نہیں ہوگی اور تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی میں نے تمہارا جرم پکڑ لیا ہے، دوا کا استعمال کرو اور خوب کھاؤ اب تمہارا صرف جسم کمزور ہے اندر کی بیماری ختم ہو گئی ہے۔ میں ابھی تمہارے پاس ہوں تمہاری ماما بتاتا تمہارے ساتھ ہیں۔“

رولوکا بولا۔ ”حکیم صاحب یہ کیا چکر ہے۔“

”تمہاری سمجھ میں یہ چکر نہیں آئے گا کیونکہ اس دنیا میں صرف انسانوں کی آبادی نہیں ہے نہ معلوم خدا کی کتنی مخلوق بھی آباد ہے کچھ تو انسان کی ضرورت کے تحت پیدا کی گئی ہے مگر اس کے علاوہ بھی ہزاروں قسم کی مخلوق اس دنیا میں آباد ہے کچھ کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے مگر کچھ کے بارے میں نہیں بتایا کبھی کبھی تصادم ہوتا ہے تو کچھ پتہ چلتا ہے ہر مخلوق میں اچھے برے ہوتے ہیں جس طرح انسانوں میں ہیں۔“

میں نے بوتل میں جس کو قید کیا ہے یہ ایک نہایت بد کردار جن ہے ایسے بد کردار جنات کو جادو مंत्र کرنے والے بڑی آسانی سے قابو کر لیتے ہیں مگر یہ جنات ان کے حکام ہونے پر بھی اپنے مطالبات رکھتے ہیں کام وہ آقا کی مرضی کا ضرور کرتے ہیں مگر اپنی ضرورت بھی آقا سے

اپنی باریک منمنائی آواز میں بولا۔ ”تو ہی جائے گی۔“ اور اس کے بعد مجھے نہیں پتہ کہ میں کہاں ہوں۔ اس نے میرے ساتھ کیا کیا مجھے ہوش نہیں ہے مگر میرا جسم گواہی دیتا تھا کہ میں کیا سے کیا ہو گئی ہوں۔ کبھی کبھی میں خود کو اس کمرے میں پاتی تھی۔ ماما جی میرے پاس ہوتی تھیں میں اپنی حالت پر روتی تھی مگر پھر بے خودی کے عالم میں چلی جاتی تھی اس حالت میں بھی شاید میں تڑپتی تھی یہ بات ماما جی بتاتی تھیں وہ کون تھا اور مجھ سے کیا چاہتا تھا میں پوچھنا چاہتی تھی مگر پھر کبھی میرے سامنے نہیں آیا صرف یہ ہوا کہ اس کے آتے ہی میں بے ہوشی کی حالت میں ہو جاتی پہلے ہر وقت یہ کیفیت تھی اب کبھی کبھی ایسا ہو رہا تھا۔“

رولوکا بولا۔ ”اب تم پر بے ہوشی نہیں ہوگی اور تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی میں نے تمہارا جرم پکڑ لیا ہے، دوا کا استعمال کرو اور خوب کھاؤ اب تمہارا صرف جسم کمزور ہے اندر کی بیماری ختم ہو گئی ہے۔ میں ابھی تمہارے پاس ہوں تمہاری ماما بتاتا تمہارے ساتھ ہیں۔“

رولوکا بولا۔ ”حکیم صاحب یہ کیا چکر ہے۔“

”تمہاری سمجھ میں یہ چکر نہیں آئے گا کیونکہ اس دنیا میں صرف انسانوں کی آبادی نہیں ہے نہ معلوم خدا کی کتنی مخلوق بھی آباد ہے کچھ تو انسان کی ضرورت کے تحت پیدا کی گئی ہے مگر اس کے علاوہ بھی ہزاروں قسم کی مخلوق اس دنیا میں آباد ہے کچھ کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے مگر کچھ کے بارے میں نہیں بتایا کبھی کبھی تصادم ہوتا ہے تو کچھ پتہ چلتا ہے ہر مخلوق میں اچھے برے ہوتے ہیں جس طرح انسانوں میں ہیں۔“

میں نے بوتل میں جس کو قید کیا ہے یہ ایک نہایت بد کردار جن ہے ایسے بد کردار جنات کو جادو مंत्र کرنے والے بڑی آسانی سے قابو کر لیتے ہیں مگر یہ جنات ان کے حکام ہونے پر بھی اپنے مطالبات رکھتے ہیں کام وہ آقا کی مرضی کا ضرور کرتے ہیں مگر اپنی ضرورت بھی آقا سے

اپنی باریک منمنائی آواز میں بولا۔ ”تو ہی جائے گی۔“ اور اس کے بعد مجھے نہیں پتہ کہ میں کہاں ہوں۔ اس نے میرے ساتھ کیا کیا مجھے ہوش نہیں ہے مگر میرا جسم گواہی دیتا تھا کہ میں کیا سے کیا ہو گئی ہوں۔ کبھی کبھی میں خود کو اس کمرے میں پاتی تھی۔ ماما جی میرے پاس ہوتی تھیں میں اپنی حالت پر روتی تھی مگر پھر بے خودی کے عالم میں چلی جاتی تھی اس حالت میں بھی شاید میں تڑپتی تھی یہ بات ماما جی بتاتی تھیں وہ کون تھا اور مجھ سے کیا چاہتا تھا میں پوچھنا چاہتی تھی مگر پھر کبھی میرے سامنے نہیں آیا صرف یہ ہوا کہ اس کے آتے ہی میں بے ہوشی کی حالت میں ہو جاتی پہلے ہر وقت یہ کیفیت تھی اب کبھی کبھی ایسا ہو رہا تھا۔“

رولوکا بولا۔ ”اب تم پر بے ہوشی نہیں ہوگی اور تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی میں نے تمہارا جرم پکڑ لیا ہے، دوا کا استعمال کرو اور خوب کھاؤ اب تمہارا صرف جسم کمزور ہے اندر کی بیماری ختم ہو گئی ہے۔ میں ابھی تمہارے پاس ہوں تمہاری ماما بتاتا تمہارے ساتھ ہیں۔“

گرددس کرتا دھواں باہر آنے لگا اور پھر ایک بھیاک شکل اختیار کر گیا۔

”تیرا آقا آیا تھا، تجھے مانگ رہا تھا، کہتا تھا، میں سخت سزا دوں گا میرا غلام مجھے دے دے، میں نے منع کر دیا اگر میں تجھے چھوڑ بھی دوں تو تیرا آقا تجھے نہیں چھوڑے گا اور میں کسی کو غلامی میں نہیں رکھتا دوسرے تو اس قابل بھی نہیں ہے کہ تجھ کو غلام بھی بنایا جائے تیرے بارے میں تیرے آقا نے بتایا ہے کہ تو نہایت بدکردار ہے نہ جانے تو نے کتنی لڑکیوں کو خراب کیا ہے کیا یہ بات درست ہے۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”ہاں میری یہ کمزوری ہے مگر میں بہت طاقتور ہوں تیرا بڑے سے بڑا کام کروں گا۔“ وہ بولا۔
”اور گندے کام بھی کرے گا، معصوم لڑکیوں کی زندگیاں برباد بھی کرے گا۔“ رولوکا بولا۔
”اور گندے کام بھی کرے گا، معصوم لڑکیوں کی زندگیاں برباد بھی کرے گا۔“ رولوکا بولا۔

”نہیں کروں گا، میری توبہ ہے تو مجھے معاف کر دے پھر کبھی گوالیار کی سرحد تک نہ آؤں گا۔“
”گوالیار کے باہر تو باز نہیں آئے گا میں تجھ پر اور تیرے آقا پر اعتبار نہیں کرتا تو یہ بتا جنتا تو تیرے جیسے نہیں ہوتے تو کس قوم کا ہے شاید میرے دل میں تیرے لئے کچھ نرم گوشہ نکل آئے۔“ نرم گوشے کی بات رولوکا نے اس لئے کی کہ وہ اپنے بارے میں سچ بتائے۔

”میرا باپ کو کو قبیلہ کا سردار ہے یہ قبیلہ آگرہ کے شاہی محلات میں رہتا ہے میرے باپ نے آگرہ کے دروازے میرے لئے بند کر دیے ہیں میں وہاں نہیں جاسکتا میں اپنی فطرت سے باز نہیں آسکتا میں بہت برا ہوں تو مجھے معاف کر دے۔“

”تو نے خود کہہ دیا کہ تو اپنی بری فطرت سے باز نہیں آسکتا اب تیرے لئے کوئی کنجاش نہیں نکل سکتی میں آگرہ کے گونو جنتا سے واقف ہوں وہ ایک زمانے سے انسانوں کے درمیان اپنے اپنے مقامات پر رہتے ہیں ان

”تو کون ہے؟ اور تو نے یہ ظلم و ستم ایک معصوم لڑکی پر کیوں کیا؟ یہ بتا۔“ رولوکا بولا۔
”تو نہیں جانتا تو سن کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا نام سن کر تیری دھوتی خراب ہو جائے میرا نام گوتم کلڑ ہے تو نہیں جانتا کلڑ کے نام سے بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔“ یہ سن کر رولوکا بولا۔ ”تو اگر کلڑ ہے تو میں لوہا ہوں کلڑ آگ میں جلتا ہے لوہا غصے سے سرخ ہوتا ہے۔“
”یہ تو سے بتائے گا کون جلتا ہے؟ تو سامنے آ اور بات کر۔“

”تیری شکل میرے سامنے ہے تو بڑا بد شکل اور کرہہ آدمی ہے تجھے میں اپنی شکل کیا دکھاؤ اگر دیکھ سکتا ہے تو اپنی دوپا کام میں لے اور مجھے اپنے سامنے لے آ۔“ تجھے خود اپنی طاقت کا اندازہ ہو جائے گا۔“ رولوکا نے اس کو غصہ دلانے کو کہا۔
”تو چوری سے کام کرتا ہے پردے میں رہ کر مردوں کی طرح سامنا کر.....“ وہ بولا۔
”اپنی کمزوری کو مجھے چور کہہ کر چھپا رہا ہے۔“

رولوکا بولا۔
”اچھا میرا غلام میرے حوالے کر میں جاتا ہوں۔“
”تیرے غلام نے جرم کیا ہے اس کو سزا ملے گی۔“ رولوکا بولا۔

”میں اس کو سزا دوں گا اس بد بخت کی مانگ ہی یہی تھی نہ معلوم وہ کتنی لڑکیوں سے کھیلتا ہے۔ میں نے اس کو یہ کرنے کو نہیں کہا تھا، تو مجھے دے میں اس کو سخت سزا دوں گا.....“ کلڑ بولا۔

”میں تجھ پر اور تیرے وعدے پر اعتبار نہیں کرتا۔“ رولوکا بولا۔

مگر کلڑ نے جواب دینے کی جائے زمین پر لوٹ لگائی اور غائب ہو گیا۔ رولوکا اپنی شکل میں لوٹ آیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ پلنگ کے نیچے سے اس نے بول نکالی اور اس کا ڈھکن کھول کر بولا۔ ”باہر آ جا۔“

سے انسانوں کو ذرا شکایت نہیں ہے تجھے ضرور تیری بد چلتی کی وجہ سے تیرے باپ نے آگرہ بدر کیا ہوگا چل بوتل میں چلا جا۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں اب کچھ نہیں کروں گا۔“ وہ گڑگڑا کر بولا۔

”تو نہیں کرے گا اس کو مجھے امید نہیں تو آزاد نہیں رہ سکتا تیرا آقا تیرے پاس آ جائے گا اور تجھے سے گندے کام کروائے گا میں تجھے اور تیرے آقا کو ایسا موقع نہیں دوں گا، اندر جا اب تیسری بار نہیں کہوں گا۔“

اور وہ پھر دھواں بن کر بوتل کے اندر چلا گیا رولوکا نے ڈھکن بند کر کے ایک طرف اشارہ کیا اور ایک کارندے کو بوتل دے کر کہا۔ ”اس کو گہرے سمندر میں دفن کر دے، سو سال کے لئے شاید اس کی فطرت دو سو سال کی قید کے بعد بدل جائے۔“ اور کارندہ بوتل لے کر ہوا ہو گیا۔

کرن ایک ہفتہ میں ٹھیک ہو گئی اور گھر میں چلنے پھرنے لگی۔ لکھی چند اور اس کی بیوی رولوکا کی بہت عزت کرتے تھے دونوں بہت خوش تھے ان کی خوشیاں لوٹ آئی تھیں رولوکا ان کے بہت اصرار پر کبھی کبھی کھانا بھی کھا لیا کرتا تھا وہ لکڑا کا انتظار کر رہا تھا لکڑ نہیں آیا تھا آخر رولوکا نے اس کو تلاش کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک نہایت ہوشیار اور طاقتور کارندے کو لکھی چند کے مکان کی حفاظت پر مقرر کر کے وہ لکھی چند سے بولا۔

”آپ کی لڑکی اب ٹھیک رہے گی جو بد معاش تنگ کرتا تھا اس کو میں نے دفن کر دیا ہے۔ مگر ایک چابی اور ہے میں اس کے انتظار میں رکھتا ہوں وہ ہوشیار ہے آیا نہیں ہے اس کی تم سے دشمنی بھی نہیں ہے مگر شیطان پر بھروسہ بھی کیا اس کی اور میری دشمنی ہے وہ تمہارے گھر اب نہیں آئے گا اور اگر آئے گا تو بھی کچھ نہ کر سکے گا تم فکر نہ کرو میں تم سے دور نہیں ہوں گا مگر مجھے اس کی تلاش میں جانا ہے۔“

رولوکا رات بارہ بجے لکھی چند کے گھر سے روانہ ہوا

اور اندازے کے مطابق ایک بستی میں چلا گیا وہ بستی چماروں کی تھی ہر طرف چڑے کی بد بو پھیلی ہوئی گھروں کے سامنے گند کی بھی کوڑا کرکٹ بکھرا پڑا تھا دروازوں پر بری بری شکلیں بنی ہوئی تھیں۔ جاسوس کارندہ اس کے ساتھ تھا وہ ہر گھر کے اندر جا کر جائزہ لے رہا تھا۔

ایک نہایت گندے گھر کے سامنے رولوکا کھڑا ہو گیا اور جاسوس اندر چلا گیا کچھ دیر میں اس نے آکر بتایا گھر تو خالی ہے۔ رولوکا روپوشی کی حالت میں گھر کے اندر چلا گیا اور اندر ایک کمرے میں رک گیا اس کمرے میں ایک چراغ جل رہا تھا اس چراغ میں نہ معلوم کون سا تیل جل رہا تھا کہ اس کی بڑی ناگوار بد بو پورے کمرے میں پھیل رہی تھی۔ روشنی اتنی کم تھی کہ کمرے کی دیواریں نظر نہیں آرہی تھیں۔ دروازہ صرف ایک تھا اور کمرے میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا فرش پر کچھ سامان پڑا تھا اس میں سندور اندھے اور ہڈیاں نظر آرہی تھیں زمین تنگی تھی مگر اس سامان کے پاس ایک چوکی نظر آرہی تھی چند منٹ کے بعد اس چوکی پر ایک آدمی بیٹھا نظر آ رہا تھا وہ کوئی اور نہیں لکڑا تھا وہ آسن لگائے آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہا تھا رولوکا اس سے ساتھ، آٹھ فٹ دور تھا لکڑ کنڈل کے اندر تھا۔

رولوکا سمجھ گیا کہ لکڑی یہاں پر تھا اور وہ اپنی روپوشی کو طول دینے کا منتظر پڑھ رہا ہے۔ وہ وہیں پر کھڑا ہوا آگے نہیں بڑھا کیونکہ کنڈل میں لکڑ محفوظ تھا مگر اس کو باہر تو آنا تھا۔ ساری رات گزر گئی لکڑ نے آنکھ نہیں کھولی مگر سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ کھڑا ہو گیا پھر اس نے زمین پر تین دفعہ پیر مارا اور کنڈل سے باہر آ گیا۔ باہر آتے ہی اس نے فضاء میں سوگھا اور بولا۔ ”بھیرو تیرے ہوتے کیا ہو رہا ہے؟ مگر اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں آیا۔

دن کی روشنی جادو کے بہت سے اثرات کو ختم کر دیتی ہے بڑے سے بڑا پیر بھی دن میں اندھا ہوتا ہے لکڑ اب تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ کچھ ہے مگر کیا ہے اس نے

کھڑے کھڑے ایک منتر پڑھا ایک نہایت بد ہیئت بوڑھا اس کے سامنے کھڑا تھا وہ بولا۔ ”مہاکنت اندر کوئی ہے۔“ مہاکنت نے جواب دیا۔ ”مالک اندر کون آئے گا۔“

کنڈل ختم ہو گیا تھا۔ بھیرودن کی روشنی کے ڈر سے بھاگ گیا تھا مہاکنت شاید اکیلا دن کا بیر موجود تھا رولوکا کے کارندے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ مہاکنت اچانک اچھل پڑا کیونکہ اس کی گردن کسی آہنی نیچے میں پھنس چکی تھی اس نے چولا بدلنے کی کوشش ضرور کی مگر بدل نہ سکا اور ایک کمزور چوہے کی طرح زمین پر گر پڑا پھر اس کا بد ہیئت جسم پانی بن گیا۔ اب لکڑی کی سمجھ میں پوری بات آگئی۔ وہ چیخ کر بولا۔

”چھپ کر کیا اور کرتا ہے سامنے آ تو تیری درگت بناؤں۔“

رولوکا نے اپنے کارندے کو اور خاص طور پر سے جاگتے لوگو کو اشارہ کیا اور اچانک اپنے افریقی اور اصلی روپ میں نمودار ہو گیا لکڑی کے سامنے ایک ساڑھے چھ فٹ کا کالا آدمی کھڑا تھا اس نے لکڑی کو گردن سے پکڑا اور ایک خرگوش کی طرح اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا، لکڑی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے ساتھ یہ ہوگا اس کو اپنے کسی بیر کو بلانے کا موقع ہی نہ ملا وہ زمین پر پڑا تھا اس کی زبان پر شاید کوئی منتر تھا مگر وہ منتر پورا نہیں ہوا اور ایک طوفانی ٹھوکرنے اس کی کھوپڑی کے ٹکڑے کر دیئے اور بھیجا باہر نکل کر فرش پر آ گیا اور ہر طرف بد بو پھیل گئی کمرے میں ہر طرف سے آہیں اور سسکیوں کی آوازیں آئیں۔

رولوکا کمرے سے باہر آ گیا اور پھر اس نے کمرے میں آگ ڈال دی بہت تیزی سے آگ پھیل گئی اور کمرے کے باہر بھی آگ آگئی اور پورا گھر سوکھی لکڑی کی مانند تیزی سے جلنے لگا، پورا محلہ اٹھ گیا آگ آگ کا شور مچ گیا مگر آگ کے قریب کوئی نہیں جا رہا تھا کیوں آگ کی تپش بہت زیادہ تھی اس سے زیادہ خطرناک وہ نقص تھا جو چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ کسی نے آگ

بجھانے کی کوشش نہ کی اور دو گھنٹے تیز آگ بھڑکتی رہی چنگاریاں اڑتی رہیں اور پٹانے چھوٹتے رہے پھلجوریاں اڑتی رہیں لوگ ناکوں پر کپڑا رکھے تماشا دیکھتے رہے۔ رولوکا دور کھڑا رہا دو گھنٹے کے بعد آگ کم ہوئی اور ختم ہو گئی گھر کی جگہ ایک راکھ کا ڈھیر تھا اور دیوار تک جل کر راکھ ہو چکے تھے گھر کا کوئی نشان باقی نہیں تھا۔

اب رولوکا واپس مڑا۔ لکھی چند کے پاس آ گیا اور بولا۔ ”کام ہو گیا، میں نے اس درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر جلا دیا جس میں زہریلے پھل لگتے تھے۔ اب تم اپنی بیٹی کرن کی شادی کر دینا اور دلی سے دو انگلو الیتا۔“

لکھی چند نے کہا۔ ”آپ نے بڑی محنت کی بہت وقت دیا میں آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔“

”اس طرح کہ تم بھی کسی ضرورت مند کی مدد کر دیا کرنا یہی میرا معاوضہ بھی ہوگا۔“ اور رولوکا روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

حکیم وقار کے دوا خانے میں ہر روز سیکڑوں مریض اپنی بیماری کے سلسلے میں آتے تھے۔ جو صاحب ثروت ہوتے تھے وہ پوری ادائیگی کرتے تھے اور جو غریب ہوتے ان سے مطالبہ نہیں کیا جاتا تھا مگر ان کا بھی علاج پوری توجہ سے ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پورے ہندوستان میں حکیم وقار کا دوا خانہ مشہور ہو گیا تھا۔

ایک مریض کا علاج حکیم وقار خود کر رہے تھے مگر فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا مرض الگ نوعیت کا تھا وہ بظاہر صحت مند نظر آتا تھا غذا بھی پیٹ بھر کر کھاتا تھا مگر لگتا تھا اور مزے کی بات یہ کہ اس کی بڑبڑاہٹ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک عجیب سی انجانی زبان میں الفاظ ادا ہوتے۔ آخر مجبور ہو کر حکیم وقار نے رولوکا کو مصر سے طلب کر لیا اور کہا۔

”میں نے اس پر اپنے تجربے کا نچوڑ لگا دیا مگر حالت تبدیل نہیں ہوئی۔ سمجھ نہیں آ رہا کہ اس کے دورے کا سبب کیا ہے؟ اگر وجہ پتہ چلے تو علاج ہو سکتا ہے۔“ رولوکا نے پوچھا۔ ”مریض کہاں ہے۔“

مجھے فکر ہوگئی، میں نے ان کو ریت پر چہل قدمی سے روکنا چاہا مگر یہ باز نہ آئے مجبوراً مجھے ان کا تعاقب کرنا پڑا اور کئی دفعہ ان کو اٹھا کر لانا پڑا۔“

”یہ دورے کی کسی مخصوص جگہ پر یا کسی مخصوص وقفہ سے پڑتے ہیں۔“ رولوکانے پوچھا۔

”نہیں کوئی جگہ مخصوص نہیں اور نہ ہی دوروں کا ٹائم مقرر ہے۔ کبھی تین ہفتہ دورہ نہیں پڑتا اور کبھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرتا۔“ عورت نے جواب دیا۔

”تو پھر آپ کو یہاں پر رہنا ہوگا، دورے کے دوران ان کا معائنہ بہتر ہو سکے گا۔“ رولوکانے کہا۔

”یہاں پر کمرہ رہنے کو مل جائے گا۔“ عورت بولی۔

عورت نے قاسم کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”سن لیا، حکیم صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔“

قاسم جواب تک خاموش تھا اپنی بھاری آواز میں بولا۔ ”زلیخا میں تمہارے اصرار پر آیا ہوں تم جو کہو گی کروں گا تم تو جانتی ہو مجھے علاج میں کتنی دلچسپی ہے۔“

”میں جو کر رہی ہوں تمہاری بھلائی کے لئے کر رہی ہوں، تم پر دورہ پڑتا ہے اور اذیت مجھے ہوتی ہے۔“

”حکیم صاحب جو خرچ ہوگا میں ادا کروں گی ایک کمرہ دلواویں۔“

”خرچ کی بات تو بعد کی ہے، آپ کو کمرہ مل جائے گا۔ آپ ان کے ساتھ رہیں گی اور جب بھی دورہ پڑے فوراً بتائیں گی اگر آپ پسند کریں تو میں ایک عورت آپ کی خدمت کے لئے مقرر کر دوں گا وہ مجھے اطلاع کرے گی۔“ رولوکانے جواب دیا۔

”اگر ایسا ہو جائے تو اس سے بہتر کیا ہے؟“ عورت بولی۔

اور قاسم کو ایک صاف ستھرا کمرہ دے دیا گیا ایک عورت بھی مقرر کر دی گئی۔

دو دن کے بعد عورت نے اطلاع دی کہ دورہ پڑ گیا ہے رولوکا اور حکیم وقار اس کے کمرے کی طرف دوڑے

حکیم وقار بولے۔ ”آج آئے گا بلکہ شاید آج بھی چکا ہو، اس کا نام قاسم ہے اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ آتا ہے رہنے والا وہ بیکانیر کا ہے۔“

کچھ ہی دیر میں قاسم آ گیا، قاسم ایک جوان آدمی تھا۔ بظاہر مریض نظر نہیں آتا تھا، اس کی بیوی بڑی خوبصورت عورت تھی، نقوش، مصری نظر آتے تھے، دونوں گورے اور قد آور تھے۔

حکیم وقار نے قاسم سے کہا۔ ”اب کیسے ہو؟“ قاسم کے بولنے سے پہلے اس کی بیوی بولی۔

”حکیم صاحب حالت میں زیادہ فرق نہیں ہے، رات کو بھی دورہ پڑ گیا تھا۔“

یہ سن کر رولوکانے پوچھا۔ ”دورہ کتنی دیر رہتا ہے اور کس وجہ سے پڑتا ہے؟“

عورت بولی۔ ”کس وجہ سے پڑتا ہے اس کا تو اندازہ نہیں ہے مگر آدھا گھنٹے سے ایک گھنٹہ رہتا ہے دورے کے دوران یہ کسی انجانی زبان میں بڑبڑاتے ہیں، پتہ نہیں کیا باتیں کرتے ہیں میری سمجھ میں تو آتی نہیں۔“

”وجہ میں نے پوچھی تھی اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ کسی خاص چیز کو دیکھ کر یا کسی قسم کے خاص حالات میں دورہ پڑتا ہے۔“ رولوکانے پوچھا۔

”یہ چاندنی رات میں ریت پر تفریح کرنے کے عادی ہیں، کہتے ہیں مجھے اچھا لگتا ہے، آپ کو پتہ ہے ہمارے شہر میں چاروں طرف ریت ہی ریت ہے، یہ اکثر رات کو اس ریت پر ننگے پاؤں پھرتے ہیں یہ ان کی پرانی عادت ہے ایک رات یہ واپس نہ آئے تو میں نوکر کے ساتھ ان کی تلاش میں گئی، گھر سے دور یہ ریت پر پڑے تھے اور نہ معلوم کس زبان میں بڑبڑا رہے تھے ایسا لگتا تھا کہ کسی سے باتیں کر رہے ہیں ان کی آنکھیں بند تھیں، میں اور نوکر ان کو اٹھا کر گھر لے آئے اور دو گھنٹے کے بعد ان کو ہوش آ گیا۔“

مگر ان کو اپنی بے ہوشی کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا اس کے بعد پھر ایک ماہ کے بعد یہی واقعہ ہوا، اب

ہے کہ ایسا آدمی تلاش کیا جائے جو اس زبان کو سمجھ سکے۔“
رولوکا نے کہا۔

”میرے ایک جاننے والے ہیں جو علی گڑھ میں
رہتے ہیں وہ بہت سی زبانیں جانتے ہیں میں ان کو لے کر
آتا ہوں شاید ان کی سمجھ میں کچھ آجائے۔“ حکیم وقار نے
کہا۔

”تو پھر آپ صبح ہی چلے جائیں اور شام تک
آجائیں۔“ رولوکا بولا۔۔۔۔۔

سویرے ہی حکیم وقار علی گڑھ چلے گئے۔

شام کو ان کے ساتھ ایک صاحب آ گئے، نہایت عمر
رسیدہ ستر، پچتر سال کے، سفید پا جامہ اور کرتا مگر عمر کے
حساب سے ان کی صحت اچھی تھی رولوکا سے ان کا تعارف
حکیم صاحب نے کرایا۔

”یہ ہیں پروفیسر شیرازی بہت سی قدیم زبانوں کے
ماہر ہیں۔“

دودن کے بعد پھر دورہ بڑ گیا۔ رولوکا کے ساتھ حکیم
صاحب اور شیرازی، قاسم کے کمرے کی طرف دوڑے،
کمرے میں اس کی بیوی زلیخا موجود تھی۔ یہ سب خاموشی
سے قاسم کے بستر کے قریب کھڑے ہو گئے، قاسم نے چند
منٹ کے بعد بڑبڑانا شروع کر دیا، پروفیسر شیرازی اس
کے اور قریب ہو گئے اور غور سے سننے لگے۔ ان کے چہرے
کے تاثرات بدلتے رہے اور پھر دورہ ختم ہو گیا اور قاسم نے
آنکھ کھول دی۔ تینوں حضرات کمرے سے باہر آ گئے،
شیرازی خاموش تھے۔ رولوکا نے بھی کوئی سوال نہ کیا۔ حکیم
وقار کے کمرے میں بیٹھنے کے بعد شیرازی بولے۔

”میں یہ کہوں کہ میں نے یہ زبان پہلی بار سنی ہے تو
اس کا مطلب ہوگا کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مگر اس
کے باوجود مجھے پورا یقین ہے کہ یہ زبان ایشیائی ہے اور
اس کا تعلق مصر سے ہے، یہ میں اپنے تجربے اور انداز گفتگو
کے حوالے سے کہہ رہا ہوں حالانکہ الفاظ میری سمجھ میں
نہیں آتے ہیں۔“

”تو پھر اس کا حل کیا ہے؟“ حکیم وقار بولے۔

قاسم بستر پر پڑا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں اس کے
سر ہانے اس کی بیوی کھڑی تھی۔

رولوکا اور حکیم صاحب اس کے دائیں اور بائیں
کھڑے ہو گئے، چند منٹ کے بعد قاسم نامعلوم زبان میں
بڑانے لگا دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا مگر دونوں کی
سمجھ میں کچھ نہ آیا ایک گھنٹے تک وہ رک رک کر بولتا رہا
جیسے کسی سے بات کر رہا ہو، اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا
اور کچھ دیر کے بعد آنکھیں کھول کر حیرت سے دیکھنے لگا۔

رولوکا نے پوچھا۔ ”اب تم کیسے ہو؟“

قاسم اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”میں تو ٹھیک ہوں
آپ کیوں آئے نہیں؟“

رولوکا بولا۔ ”تم یہ بتاؤ تم کو دورے کے دوران کیا
محسوس ہوتا ہے۔“

”میں تو سوراہا تھا سکون سے مجھے کچھ نہیں معلوم۔“
رولوکا نے حکیم وقار کی طرف دیکھا اور ان کو باہر

آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں باہر آ گئے تو رولوکا نے کہا۔

”ایسا لگتا ہے اس کو واقعی کچھ پتہ نہیں ہے کہ وہ
دورے میں بے ہوش ہوا ہے اس کے شعور میں یہی ہے کہ
وہ سوتا ہے، سونے کے بعد وہ کیا باتیں کرتا ہے اس کے
بارے میں بھی اس کو کچھ پتہ نہیں چلتا، مجھے لگتا ہے کہ اس
کی بڑبڑاہٹ کا تعلق اس کے شعور سے نہیں ہے اگر ایسا
ہوتا تو اس کو ضرور کچھ نہ کچھ یاد تو رہتا کہ وہ خواب میں کیا
کہتا رہا ہے کیونکہ انسان کو خواب کی باتیں کچھ نہ کچھ یاد
ضرور رہتی ہیں جبکہ اس کا ذہن سپاٹ رہتا ہے۔“

حکیم وقار نے گردن ہلا کر رولوکا کی بات کی تائید کی
اور بولے۔

”تمہارے اندازے ہمیشہ درست ہوتے ہیں تو
پھر یہ بھی درست ہوگا۔“

”یہ جو کچھ باتیں کرتا ہے ہم کو تو بڑبڑاہٹ سی معلوم
ہوتی ہے مگر ایسا نہیں ہے اس کا رک رک کر بولنا ظاہر کرتا
ہے کہ وہ کسی سے سوال جواب کرتا ہے، بات کرتا ہے مگر یہ
زبان اتنی قدیم ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی اس کا حل یہ

”جب تک مرض کی جڑ تک آپ نہ جائیں علاج نہیں کر سکتے، معاملہ پے چیدہ تو ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔“ شیرازی بولے تو رولوکا نے پوچھا۔ ”آپ بتائیے کیا کرنا چاہئے۔“

آپ کو مصر جانا ہوگا، میرے جاننے والے ایک پروفیسر ہیں، ان کا نام عمر قاسمی ہے وہ آج بھی قاہرہ میں موجود ہیں گو کہ ان کی عمر بہت ہو چکی ہے وہ مصر کی قدیم زبانوں کے ماہر ترین آدمی ہیں، مصر میں اہرام سے نکلی ہوئی تحریروں کو پڑھتے ہیں۔ شیرازی نے کہا۔

”میرا جانا تو مشکل نہیں ہے مگر میں ان کو کیا بتاؤں گا، مریض جو زبان بولتا ہے اس کا ترجمہ تو وہ سن کر ہی کریں گے یا تو ان کو لایا جائے یا مریض کو قاہرہ لے جایا جائے دو صورتیں ہیں۔“ رولوکا نے کہا۔

”ان کا آنا تو بے حد مشکل ہوگا، آپ مریض کو قاہرہ لے جاؤ یہ آسان ہے۔“ حکیم وقار نے کہا۔ ”اس کے لئے ان کی بیوی کا رضامند ہونا ضروری ہے۔“

”تو پھر بات کر لیتے ہیں۔“ رولوکا نے جواب دیا اور زلیخا کو بلوایا۔

شیرازی نے زلیخا سے کہا۔ ”دیکھو بیٹی تمہارا شوہر جو زبان بولتا ہے میں نہیں کہتا کہ وہ صرف بڑبڑاتا ہے وہ ہم کو بڑبڑاہٹ معلوم ہوتی ہے مگر وہ باتیں کرتا ہے اور جو کچھ باتیں کرتا ہے وہ اس کے شعور سے باہر کی باتیں ہیں اس کو کچھ یاد نہیں رہتا۔“

مجھے افسوس ہے کہ میں بھی اس زبان کو نہیں سمجھ سکا ہوں مگر ایک آدمی ہے جو کہ اس بڑبڑاہٹ کو الفاظ کے قالب میں ڈھال سکتا ہے وہ ہے پروفیسر عمر قاسمی یہ قاہرہ میں رہتا ہے مجھ سے عمر میں کچھ زیادہ ہی ہے وہ تو یہاں نہیں آئے گا دوسرے کنواں پیاسے کے پاس نہیں آتا پیاسے کو کنوئیں کے پاس جانا پڑتا ہے اگر تم علاج کرانا چاہتی ہو اور اس گتھی کو کھولنا چاہتی ہو تو تم کو مریض کو لیکر قاہرہ جانا ہوگا۔ بولو کیا کہتی ہو؟“

”مگر میں اکیلی عورت ہوں نئی جگہ یہ کیسے ممکن ہے۔“ زلیخا بولی۔

رولوکا نے جواب دیا۔ ”آپ کو ہم اکیلے نہیں جانے دیں گے میں آپ کے ساتھ ہوں گا کیونکہ میں خود بھی اس زبان کو سمجھنا چاہتا ہوں۔“

”تو پھر میں جانے کو تیار ہوں کچھ بیکانیر میں کام ہیں ان کو کر کے میں چلوں گی۔“ زلیخا بولی۔

زلیخا کے جانے کے بعد حکیم وقار بولے۔ ”یہ کیس کچھ ضرورت سے زیادہ الجھا ہوا نہیں ہے۔“

رولوکا ہنس کر بولا۔ ”حکیم صاحب میں نے بڑے بڑے تجربے کئے ہیں مگر اس کائنات میں اتنا کچھ ہے کہ میرے سامنے ہر دفعہ نئی چیز آتی ہے اور میرے تجربے میں اضافہ کرتی ہے آپ جانتے ہیں میں ہر نئی چیز کو غور سے دیکھنے کا عادی ہوں، قاسم کے کیس کا مجھے خود شوق ہے۔ مصر کی سر زمین حیرت انگیز ہے اس کی تاریخ بہت قدیم ہے ان کے علم و ہنر کے چرچے آج تک ہیں اور رہتی دنیا تک رہیں گے۔ قاسم کے ساتھ میں ضرور ہوں گا۔“

”ایسا لگتا ہے تم کو بھی کچھ اشارہ ملا ہے۔“ حکیم وقار نے مسکرا کر کہا۔ ”میں اشارہ نہیں ملا مگر مجھے تجسس ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”میں تمہارے اشاروں کی زبان سمجھتا ہوں تمہاری کامیابی کے لئے میں دعا کروں گا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔“ حکیم صاحب بولے۔

”اگر اس دوران میری ضرورت آپ کو پیش آئے تو کسی وقت بھی یاد کر لینا۔“ رولوکا نے کہا۔

”میں پتہ کرتا ہوں قاہرہ کے لئے کون سا جہاز کب جانے والا ہے۔“ حکیم صاحب نے کہا۔

ایک ہفتہ میں زلیخا بیکانیر سے واپس آ گئی۔ حکیم صاحب نے بتایا۔ ”بھئی جانا ہے تین سیٹ کنفرم ہیں۔ جہاز گوڈون کنگ گودی پر کھڑا ہے اس کی روانگی بدھ کو ہونی ہے۔“

ضرورت تھی پروفیسر نے دو کمرے ان کے لئے خالی کرادیئے۔

دو دن کے بعد قاسم کو دورہ پڑا اور پروفیسر فوراً اس کے برابر آکھڑے ہوئے رولوکا نے ایک کرسی ان کے قریب کردی اور وہ اس پر بیٹھ گئے۔ قاسم کی بڑبڑاہٹ شروع ہوگئی اور پروفیسر اس کے منہ کے قریب گئے۔

قاسم کی بڑبڑاہٹ جاری رہی پروفیسر کے چہرے کے تاثرات سے حیرت کا اظہار ہوتا تھا یہ سلسلہ ایک گھنٹہ جاری رہا پھر قاسم نے آنکھیں کھول لیں اور پروفیسر اٹھ کر کمرے سے باہر گئے رولوکا بھی ان کے ساتھ تھا پروفیسر خاموشی سے اپنے کمرے میں گئے ان کے چہرے کے تاثرات حیرت زدہ تھے اور وہ گہری سوچ میں مبتلا تھے۔ رولوکا نے کوئی سوال نہ کیا دنوں خاموشی آنے سے سانس بیٹھ گئے کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اس خاموشی کے پردہ کو چیرتی آواز رولوکا کے کانوں میں آئی۔

”حیرت انگیز تعجب خیز۔“

رولوکا اب بھی خاموش تھا وہ جانتا تھا کہ پروفیسر خود بتائیں گے۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد پروفیسر قاسم کی آواز پھر آئی۔ ”حکیم کامل یہ ایک حیرت انگیز معاملہ ہے میں نے جو سنا ہے وہ ناقابل یقین ہے۔“

کچھ تفصیل تو بتائیں رولوکا نے پوچھا۔

”تم یہ بتاؤ یہ کہاں کا رہنے والا ہے؟“ پروفیسر نے سوال کر دیا۔

”یہ ہندوستان کا ایک ریگستانی علاقہ ہے اس کا نام بیکانیر ہے وہاں کا ہے۔“ رولوکا بولا۔

”اس کی پیدائش کہاں کی ہے اس کا خاندان آباؤ اجداد کہاں کے تھے۔“ پروفیسر نے کہا۔

”میں ایسا کرتا ہوں اس کی بیوی کو زیادہ پتہ ہوگا اس کو بلاتا ہوں۔“ اور وہ زلیخا کو پروفیسر کے پاس لے آیا۔ پروفیسر کے سوال پر زلیخا بولی۔

”قاسم ایک بڑے زمیندار حیدر کا بیٹا ہے، حیدر کے انتقال کے بعد یہی ساری جائیداد اور زمینوں کا مالک

قاسم اور زلیخا نے تیاری کر لی تھی اتوار کو وہ رولوکا کے ساتھ بمبئی روانہ ہو گئے۔

بمبئی میں ان کا قیام گودی کے قریب ہوٹل میں ہوا۔ گولڈنگ کنگ بدھ کو قافہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ قاسم اور زلیخا دونوں ایک کیمپن میں تھے ان کے برابر کے کیمپن میں رولوکا حکیم کامل کے روپ میں ان کے ساتھ تھا۔ جہاز کا سفر خوشگوار تھا۔ مگر رولوکا کی موجودگی کی وجہ سے زلیخا مطمئن رہی، دو کمرے ان کے پاس تھے اب رولوکا کو قافہ میں پروفیسر کو تلاش کرنا تھا مگر وہ اتنا مشہور آدمی تھے کہ رولوکا بڑی آسانی سے ان تک پہنچ گیا۔

پروفیسر قاسم بہت بوڑھے تھے ان کے جسم کے سارے بال سفید تھے، رنگ سرخ تھا اور قد نہ لمبا تھا نہ چھوٹا ان کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک خاص بات تھی انہوں نے رولوکا کو اجنبی نظروں سے دیکھا اور بولے۔

”تم نے شیرازی کا حوالہ دیا ہے وہ میرا بہت قدیم دوست ہے اس کے ساتھ میرا بہت اچھا وقت گزرا ہے تم میرے مہمان ہو، کہو کیسے آتا ہوا؟“

رولوکا نے مریض کی پوری کیفیت بیان کر دی۔ پروفیسر بولے۔ ”انسان کبھی بھی وہ کرتا ہے جو اس کو پتہ نہیں ہوتا، وہ زبان جو اس کی نہیں ہوتی لیکن وہ بولتا ہے یہ معاملات بہت پے چیدہ ہیں یہ نفسیاتی بھی ہوتا ہے اور مریض کی اصلیت بھی، ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا تم ایسا کرو مریض کو میرے گھر لے آؤ میں اس کی حالت دیکھوں گا اس کی زبان سنوں گا پھر بتاؤں گا ابھی مرض میں شدت نہیں ہے اگر شدت ہوتی تو دو روز کا وقفہ کم ہو جاتا۔“

رولوکا نے ہوٹل کے کمرے پر قرار رکھے، قاسم اور زلیخا کو لے کر پروفیسر کے محل نما مکان میں آ گیا، یہ مکان بھی پروفیسر کی طرح بوڑھا تھا اور بہت بڑا تھا پروفیسر کا خاندان اس میں آباد تھا مگر اس کے باوجود یہ خالی خالی لگتا تھا خاص طور سے پروفیسر جہاں رہتا تھا وہاں پر سکون ہی سکون تھا۔ پروفیسر کا کام بھی ایسا تھا کہ ان کو تنہائی کی

ہے اور اس کی پیدائش بیکانیر کی ہے میری پیدائش بھی وہیں کی ہے ہم دونوں کا بچپن ایک ساتھ گزرا ہے۔ پھر ہماری شادی ہوگئی۔“

”اچھا یہ بتائیے اس کے باپ حیدر کی پیدائش کہاں ہوئی۔“ پروفیسر نے سوال کیا۔

”میرے اندازے کے مطابق ان کی پیدائش بھی وہیں کی ہے۔“ زلیخا بولی۔

”تو پھر اس کے دادا کی پیدائش مصر کی ہوگی۔“ پروفیسر نے کہا۔

”یہ آپ کس بنیاد پر کہہ سکتے ہیں۔“ رولوکا بولا۔۔۔۔۔

پھر پروفیسر بولے۔ ”قاسم آج جس سے باتیں کر رہا تھا میں اس کے بارے میں نہیں سمجھ سکا ہوں مگر باتوں کے دوران ایک ایسا نام بار بار آ رہا تھا جو کہ مصر کی تاریخ کا بہت پرانا نام ہے اس نے بڑی بڑی جنگیں لڑیں اور بہت بڑا فاتح تھا مگر اس کا زمانہ بہت پرانا ہے حیرت کی بات یہ ہے کہ قاسم اسی کی نسل کا ہے، میرے خیال میں اس کے زوال کے بعد اس کے خاندان کا شیرازہ بٹھ گیا اور اس کی اولاد میں مصر سے بھاگ گئیں اور شاید کوئی ہندوستان بھی آ گئی ہو، یہ وہی نسل ہے اس کی بڑ بڑاہٹ ایک قدیم زبان ہے جو کہ اب نہیں رہی، یہ بار بار واپس نہ آنے کا کہہ رہا تھا اور سامنے جو تھا وہ اس کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ اسکندریہ آئے وہ باقاعدہ سوال و جواب تھے کچھ قدیم حوالے بھی دیئے جا رہے تھے جو کہ تاریخ کا حصہ ہیں۔“

”مصر اور وہ بھی اسکندریہ، قاسم کو بلانے کی وجہ نہیں پتہ چلی۔“ رولوکا بولا۔۔۔۔۔

”نہیں اس کے لئے مجھے قاسم پر کچھ تجربات کرنا ہوں گے مگر یہ بتا دوں کہ مجھے امید نہیں کہ میں کچھ پتہ کر سکوں کیونکہ قاسم کے اندر مجھے کچھ نظر نہیں آتا اس پر بیرونی اثرات آتے ہیں اور وہ باتیں کرتا ہے اس کا شعور اور لاشعور ان باتوں سے مبرا لگتا ہے مگر میں چپک ضرور کروں گا۔“

رولوکا سمجھ گیا کہ پروفیسر نے کیا کرنا ہے۔ رات کو پروفیسر نے قاسم پر تجربہ کیا، قاسم کو نیند کی حالت میں پہنچا کر پروفیسر نے پوچھا۔ ”تو کون ہے؟“

”میں قاسم بن حیدر ہوں میں بیکانیر شہر کا رہنے والا ہوں۔“

”تیرا باپ حیدر کہاں پیدا ہوا۔“ پروفیسر نے پوچھا۔

”بیکانیر میں پیدا ہوا۔“ جواب ملا۔

”دادا کہاں کا تھا۔“ سوال ہوا۔

”پتہ نہیں۔“ جواب ملا۔ پروفیسر نے ہر قسم کے

سوالات کئے مگر کچھ اندازہ نہیں ہوا۔ پروفیسر نے رولوکا کی طرف دیکھا۔ رولوکا نے کہا۔ ”آپ کا خیال درست تھا۔“

”قاسم کی بڑ بڑاہٹ نما گفتگو میں تاریخ کے دو نام آئے ہیں۔ ایک نام کیسیس کا جو کہ مارک انٹی کا حریف تھا

دوسرا بڑا نام مارک انٹی کا، یہ دونوں نام تاریخ میں موجود

ہیں، مارک انٹی ایک بہت بڑا جرینل اور بادشاہ تھا، اس

نے مصر پر بہت عرصہ حکومت کی اور ملکہ قلوپٹرہ کا عاشق

تھا اور اس کے ہاتھوں تباہ ہوا۔ ملکہ کو سب سے زیادہ اپنا

اقتدار پیارا تھا۔“ پروفیسر نے کہا۔

”قاسم کی بات چیت تو بڑی اہمیت اختیار کر گئی

ہے۔“ رولوکا بولا۔۔۔۔۔

”تم نے درست کہا، میں زیادہ غور اور توجہ سے

اس کی بات سنوں گا۔ میرا خیال ہے اسی سے کچھ راستہ

ملے گا۔

”تم میری کچھ مدد کر سکتے ہو۔“ پروفیسر نے

پوچھا۔

”کس قسم کی مدد آپ کو درکار ہوگی۔“ رولوکا

بولا۔۔۔۔۔

”اگر قاسم کی جگہ وغیرہ کی طرف اشارے کرے تو

تم وہاں جاؤ گے تاکہ اس کی سچائی کا پتہ چلے۔“ پروفیسر

بولا۔۔۔۔۔

”ہاں میں یہ کر سکتا ہوں۔“ رولوکا بولا۔۔۔۔۔

اور کھل جائے اور اصل کہانی ہمارے سامنے آ جائے۔“
 پروفیسر نے کہا۔

”آپ کے خیال میں زلیخا کو ساتھ لے جانا چاہئے۔“ رولوکا بولا۔۔۔۔۔

”میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا، میاں، بیوی ساتھ ہوں گے تو ان دونوں کو بوریٹ اور تھکان نہیں ہوگی دونوں ہی جوان ہیں صحت مند ہیں۔ فخر پر سفر کر سکتے ہیں کیونکہ ریگستان میں اندر تک گاڑی نہیں جائے گی اور زیادہ سفر خچروں اور اونٹوں پر کرنا ہوگا۔“

دوسرے دن کوئل آ گیا وہ پروفیسر کا خاص آدمی تھا اور شاگرد بھی تھا، اس کی عمر چالیس سے اوپر تھی مگر نہایت صحت مند تھا قد اس کا لمبا تھا اور جسم کسی پہلوان کی طرح مضبوط تھا۔ پروفیسر نے رولوکا کا تعارف اس سے کرایا اور کہا۔ ”یہ لوگ اتنی کے مقبرے تک جائیں گے جو چیز سفر میں درکار ہو اس کی خریداری کر لوں، دوسرا اور ایک عورت ہیں، خوراک اور پانی کا پورا انتظام کرنا۔“

گوئل نے سر جھکا کر اقرار کیا اور چلا گیا۔
 رولوکا نے زلیخا کو بتا دیا کہ۔ ”ہم کو ایک لمبا سفر کرنا

ہے، اپنے ضروری لباس وغیرہ رکھ لو غیر ضروری اور زنی چیز نہ رکھنا کیونکہ اونٹوں پر سفر کرنا ہوگا بولوم تیار ہو میں تم سے اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ اس سفر میں سخت مقامات بھی آ سکتے ہیں۔ ریگستانی طوفان کا بھی سامنا ہو سکتا ہے تم نہ جانا چاہو تو بھی قاسم کا جانا ضروری ہے۔“

زلیخا بولی۔ ”میں ہر مصیبت کا مقابلہ کروں گی مگر قاسم کے ساتھ رہوں گی۔“

تین چار دن سفر کی تیاری میں لگے اس دوران قاسم پر دو دورے پڑے پروفیسر نے اس کی بات چیت سنی اور رولوکا کو بتایا۔ ”اس نے اپنے مخاطب کو کہہ دیا ہے کہ وہ آئے گا۔“

ایک جیب کا انتظام پروفیسر نے کر دیا اور چار آدمیوں کا قافلہ روانہ ہوا اس میں ایک ڈرائیور بڑھ گیا۔ مگر ڈرائیور کا ساتھ صرف وہاں تک تھا جہاں سے روڈ ختم

دوسرے دن قاسم پر دورہ پڑا اور پروفیسر اس کے سر پر موجود تھا۔ قاسم بولا۔ ”ہاں میں تمہارے نزدیک ہوں مگر میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا، مصر نے مجھے اور میرے خاندان کو کچھ نہیں دیا۔“ پھر وہ ذرا رک کر بولا۔ ”ہرگز نہیں تم کچھ کہو۔“ پھر ذرا رک کر بولا۔ ”تم میرے کتنے بھی قریب ہو میں اس جگہ نہیں جاؤں گا جہاں پر میرے آباؤ اجداد کے ساتھ ظلم ہوا ان کو مارا گیا، ان کی عورتوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا گیا۔“

قاسم کا چہرہ بے ہوشی کے دوران بھی غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ پھر ذرا رک کر وہ بولا۔ ”ہاں میں اپنے پیارے فرعون مارک انتی کے پاس آؤں گا۔ مگر تم وہاں نہ آنا میں ملکہ بائیزر کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا کیونکہ اس کے دشمن تھے ایک حسین دوست اور معشوقہ کے روپ میں دوسرا بہادری کے نشے میں، میں دونوں کو برابر سمجھتا ہوں۔“

پروفیسر یہ گفتگو سن کر رولوکا سے بولا۔ ”اب ایک راستہ نظر آتا ہے مگر اس میں تم کو سخت کرنا ہوگی۔“

”میں ہر طرح تیار ہوں۔“ رولوکا نے جواب دیا۔
 ”مارک انتی کے مقبرے تک جانا ہوگا اور قاسم کو بھی

لے جانا پڑے گا میں جانتا ہوں یہ سفر بہت مشکل ہوگا، میری عمر اور صحت اجازت نہیں دیتی اب تم خود اس کیس پر کام کرو گے میری ضرورت ہو تو میں قاہرہ میں موجود ہوں بولویہ ایک مشکل کام ہے کرو گے۔“

رولوکا بولا۔ ”یہ میرا مرض ہے کیوں نہ کروں گا مگر آپ کی مدد تو ضروری ہے۔“

”میں نے کہا تھا کہ میں قاہرہ میں موجود ہوں جس قسم کی ضرورت پڑے مجھ سے رابطہ کرنا میں کروں گا۔“
 پروفیسر نے کہا۔ ”تم سفر کی تیاری کرو میں ایک آدمی تم کو دوں گا اس کا نام گوئل ہے وہ تم کو بتائے گا کہ تم کو کس کس چیز کی سفر میں ضرورت ہوگی وہ یہاں کا مانا ہوا گائیڈ ہے وہ تم کو مارک انتی کے مقبرے تک لے جائے گا گوکہ اب تم کو اتنی کمی تو وہاں نہ ملے مگر مقبرے میں تو جا سکتے ہو، قاسم وہاں جانا چاہتا ہے، ہو سکتا ہے وہاں جا کر قاسم کچھ

ہو جاتا تھا اور صرف ریگستان رہ جاتا تھا۔

پہاڑ ایک مقام پر نہیں رہتے یہ پہاڑ ہوا کے محتاج ہوتے ہیں ہوا ان کو لئے پھرتی ہے اس پتی ریت پر بھی زندگی تھی ریت کی چھبلی جس کو طیب ریگ ماہی کہتے ہیں ریت پر دوڑتی پھرتی نظر آرہی تھیں ان کی یہ دوڑ دھوپ غذا کی تلاش میں تھی کہیں کہیں صحرائی سانپ جن کی رنگت بالکل ریت جیسی تھی اور جسم پر چمک بھی موجود تھی وہ بھی پھرتے نظر آتے تھے وہ بھی اپنی غذا حاصل کر رہے تھے یہ دیرانہ بھی آباد تھا۔

خالق کائنات نے ہر جگہ ہر مقام پر زندگی پیدا کی ہے سانپ نے ایک چھبلی کو پکڑا اور ہماری موجودگی سے بے خبر منہ میں اتارنے لگا ہم آگے بڑھ گئے انسان کو بھی بھوک لگتی ہے دنیا کی سب سے قیمتی شے خوراک ہے غذا ہے اس کا مقابلہ سونا، چاندی، ہیرے جواہرات بھی نہیں کر سکتے ہر چیز کھانے کے آگے بچھ ہیں دنیا میں روٹی کی خاطر کیا نہیں ہوتا آدمی دین ایمان بچ دیتا ہے۔ اپنی اولاد کا سودا کرتا ہے عورت اپنی عزت و حرمت سرعام فردخت کر دیتی ہے یہ صرف اور صرف روٹی کے حصول کے لئے ہوتا ہے، سونا، چاندی کے ڈھیر جمع کرنے والے بھی روٹی کھا کر زندہ رہتے ہیں، اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر حکم چلانے والے بھی روٹی کے محتاج ہیں، سارے ٹھیل تماشے روٹی کراتی ہے اور انسان جو کر بن کر اس کے سامنے ناچتا ہے کبھی راجہ بن کر کبھی بھکاری بن کر دونوں کا مرکز صرف روٹی ہوتی ہے۔

دور دور تک سائے کا نام نشان نہیں تھا بھوک سب کو لگ رہی تھی گوئل کا اونٹ سب سے آگے تھا۔ وہ رک گیا تو سب رک گئے رولوکا نے کہا۔ ”گوئل کیا خیال ہے کھانا کھالیا جائے۔“ گوئل ہنس کر بولا۔ ”میں تو رکا ہی اس لئے ہوں کیونکہ سب کو ہی بھوک لگ رہی ہوگی۔“ وہ اونٹ پر سے اتر پڑا اور ایک چھو لداری فوراً لگا دی سب اونٹوں سے اتر آئے اونٹوں کو بانہہ دیا اور سب بیٹھ کر کھانا کھانے لگے دن بھر دھوپ میں سفر کرنے کے بعد ان کو چھو لداری کا سایہ بہت اچھا لگا، سب کھانے کے بعد رکے رہے اور پھر

وہ جگہ ایک گاؤں کی تھی اس کا نام مرقان تھا یہاں پر آبادی زیادہ نہ تھی مگر اونٹوں کا یہ ٹھکانا تھا۔ یہاں سے نچرا وراونٹ مل جاتے تھے یہاں لوگوں کا ذریعہ معاش اونٹ پالنا فروخت کرنا اور کرائے پر دینا تھا۔ مرقان میں کھانے، پینے کا سامان پانی کی چھاگلیں اور ضروری چیزیں بھی مل جاتی تھی اور قیام کرنے کو کمرے بھی تھے۔ رولوکا اور اس کے ساتھی تین روز کے سفر کے بعد یہاں پہنچے کیونکہ راستہ بند ہو گیا تھا۔ ریت کے طوفان نے سڑک بند کر دی تھی۔

سرکاری لوگ سڑک سے ریت صاف کر رہے تھے ایک رات اور ایک دن وہ لوگ آرام کرتے رہے اور پھر اونٹ کرائے پر حاصل کئے، گوئل کو اونٹوں کی پہچان ہی اس نے چھانٹ چھانٹ کر جانور لئے اور کرایہ ادا کیا اور سامان دلا دیا، چاروں اونٹ کو خوب کھلایا گیا اور پانی پلا دیا گیا۔ پانی کی چھاگلیں اور خشک خوراک خریدی گئی ایک بہترین بندوق گوئل کے پاس تھی ایک اور خریدی گئی وہ قاسم کے پاس تھی رولوکا کے پاس کچھ نہ تھا اس نے کہا۔

”گوئل مجھے ہتھیار کی ضرورت نہیں ہے۔“ گوئل ذرا حیران ہوا مگر بولا نہیں اور دن کے دس بجے یہ قافلہ جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ آسمان پر سورج موجود تھا اور ابھی ریت گرم نہیں ہوئی تھی۔

ہوا ٹھنڈی تھی مگر دھوپ میں ریت چمک رہی تھی۔ آسمان پر پرندے بھی اڑتے نظر آ رہے تھے۔ سامنے لوق و ق صحرا، کسی دبیز قالین کی طرح زمین پر پنچھی ٹھنڈی ریت جو کہ کچھ دیر کے بعد گرم ہونے والی تھی۔ اس کے ہوا کے دوش پر اڑتے ذرات اور اگر یہی ذرات بگولہ بن جائیں تو انسان ان کے رحم و کرم پر رہ جاتا ہے اور صحرائی ریت کے نیچے دفن بھی ہو سکتا ہے۔

اونٹ بڑی ست خرامی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ دن کے دو بجے تھے اور دھوپ ریت پر بکھری ہوئی تھی ہر طرف ریت کے نیلے نظر آتے تھے بعض بعض پر تو چھوٹے موٹے پہاڑ کا گمان گزرتا تھا مگر یہ ریت کے

روانہ ہو گئے۔

خواب آلود خاموشی ریگستانوں کی اپنی ایک روایت ہے ایک تاریخ ہے ایسے ہی ریت کے سمندر میں مجنوں اپنی لیلیٰ کو پکار پکارتے آہلہ پا بھٹکتا پھرتا تھا۔ مگر ریگستان بڑی ظالم جگہ بھی ہے اس کے مزاج کا اندازہ کرنا بڑا دشوار ہوتا ہے جو لوگ زندگی اس کی نظر کرتے ہیں وہ بھی کبھی کبھی دھوکا کھاتے ہیں۔

گوئل نے کہا۔ ”حکیم صاحب آپ آرام کریں میں رات کو جاگوں گا کیونکہ رات میں بھی ریگستان جاگتا ہے کچھ پتہ نہیں کہ اس کا موڈ کیا ہو جائے۔“

رولوکا نے کہا۔ ”گوئل تم نے درست کہا مگر میں راتوں کو جاگنے کا عادی ہوں میں اپنی نیند گھوڑے پر سوار ہو کر بھی پوری کر لیتا ہوں تم میری فکر نہ کرو اور بے فکر ہو کر سو جاؤ، میں دونوں خیموں کے درمیان ہوں۔“ گوئل نے اسرار کیا مگر رولوکا نہ مانا اور گوئل سفری بستر پر لیٹ گیا اور چند منٹ کے بعد سو گیا۔ رولوکا نے آسمان پر نظر کی چاندنی پھیلی ہوئی تھی ہوا ٹھنڈی تھی۔

”انتونی تم کہاں ہو؟“ اس کے دل نے آواز دی۔
”اے مصر کی حسین ساحرہ میں تم کو یاد کرتا ہوں اگر تم کہیں ہو اور تم تک میرا پیغام پہنچ رہا ہے تو جواب دو۔“
چند منٹ گزرے تھے کہ اس کو لگا جیسے وہ کچھ سن رہا ہے آواز دہمی ہے مگر صاف سمجھ میں آ رہی ہے۔

”میرے دوست میرے حسن میں نے تمہارے اندر کی آواز سن لی ہے یہ تم ہی اس دنیا میں ہو جو کہ مجھے مخاطب کر سکتے ہو، آج کے زمانے میں تمہارے علاوہ کسی انسان میں یہ قدرت نہیں میں ہوں، میرا بوڑھا مالک اب ختم ہوا چاہتا ہے وہ لافانی بوڑھا اب فنا کی گود میں جا رہا ہے اس کا جسم آدھا پانی بن کر ریت میں جذب ہو چکا ہے اس کی زبان بندی ہو چکی ہے، اس کے سارے ٹھیلے تماشے جو ہزاروں سال سے جاری تھے ختم ہو رہے ہیں، میں آزاد ہوں تم کہو کہاں پر ہو اور تم کو میری کیا ضرورت ہے میں اگر تمہارے کسی کام آ سکوں تو یہ میری زندگی کا بہترین معرف ہوگا۔“

دھوپ کی رنگت میں فرق آیا اس کی گرمی کی شدت میں کمی ہو گئی اور پھر ماند پڑنے لگی آسمان جو پہلے خالی تھا اور دیران نظر آتا تھا اس پر پرندے نظر آنے لگے دنیا کا کاروبار ختم ہوا پرندے اپنے رین بسیرے میں واپس جانے لگے۔ وقت کی گردش اسی طرح صدیوں سے جاری و ساری ہے اجالے اور اندھیرے کا اور روشنی کا یہ عمل ایک میکائیکی عمل ہے جو کہ خالق کائنات نے اپنی قدرت سے قائم کیا ہے اس میں ذرا فرق نہیں آیا انسان آتا ہے زمین کے سینے پر کبھی چنگیز خاں کبھی فرعون بن جاتا ہے طاقت اور اقتدار کے نشے میں خدائی کا دعویٰ کرتا ہے اور پھر فنا کی گود میں خاموشی سے چلا جاتا ہے۔ کون جانتا ہے کہ دقیانوس کون تھا کس کو پتہ ہے کہ قارون کون تھا اس نے دولت جمع کی مگر اس کے کس کام آئی سب زمین کے سینے میں غرق ہو گئی اور وہ خالی ہاتھ واپس گیا اور ہمیشہ روئی کا محتاج رہا۔

رات ہونے لگی گوئل نے سفر روک دیا اور قیام کرنے کی تیاری کرنے لگا رولوکا اور اس نے چھو لدا ریاں کھڑی کر دیں ایک چھو لدا ریا قیام اور زلیخا کو دے دی اور ایک میں گوئل اور رولوکا نے بستر لگالیا۔

اب اندھیرا پوری طرح چھا گیا تھا مگر رات کے دس بجے چاند نکل آیا اور ریت پر چاندنی پھیل گئی۔ قدرت کے انتظام کی یہ خوبی ہے اس نے ہر جگہ پر حسن رکھا ہے صرف دیکھنے والی نظر کی ضرورت ہے۔

اس ویران صحرا کو بھی اس نے ایک حسن عطا کیا ہے۔ ریگستان کی چاندنی بھری راتیں بہت دلکش اور رومان انگیز ہوتی ہیں دل پر ایک لطیف اور شائستگی کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔ آدی خود کو بھول جاتا ہے جام و سیوح کو ہاتھ لگائے بغیر بھی مستی میں آ جاتا ہے اس پر مدہوشی چھا جاتی ہے اور وہ برے سے برے حالات میں بھی سوچتا ہے کہ دنیا اتنی بری جگہ نہیں ہے جتنی وہ سمجھتا ہے۔

ریگستان اور آسمان سے جھم جھم برسی چاندنی اور

”انتونی! اے مصری سرزمین کی قدیم ساحرہ! تم کو جدید دور میں لانے والے ساحر بھول گیا تھا کہ موت کا ذائقہ ہر انسان کو چکھنا پڑتا ہے، رب کا نجات ہر ایک کو موقعہ دیتا ہے اور عمر دیتا ہے کہ اس کا وہ بندہ اپنے کئے پر غور کر لے اگر اس نے اپنے خالق کے حکم کے خلاف کچھ کیا ہے تو معافی مانگ لے اور آئندہ کے لئے دل سے توبہ کر لے، رب کا نجات بڑا رحیم ہے، وہ معاف کرتا ہے مگر جو لوگ سیکڑوں سال کی زندگی پا کر بھی اس کو یاد نہیں کرتے اس کے دیئے گئے مواقع سے فائدہ نہیں اٹھاتے ان کا حشر اس ساحر جیسا ہوتا ہے، تم اب اس کی پابند نہیں ہو مجھے تمہاری ضرورت ہے، میں تمہاری سرزمین پر ابھی ہوں اور قاہرہ سے جنوب کی جانب سفر پر ہوں مجھ پر تین انسانوں کی ذمہ داری ہے، بولو تم میری مدد کرو گی۔“

”تم اگر ستم نہ بناتے تو بھی میں تم کو تلاش کر لیتی کیونکہ میں صحرا کی بیٹی ہوں، ہزاروں سال سے میری روح اس صحرا میں بھٹک رہی ہے اس کے ریت کے ہر ذرے سے مجھے واقفیت ہے۔ میں غمگین ہوں تمہارے پاس آ جاؤ گی۔“

دونوں چھو لہاریوں میں گہری خاموشی تھی۔ چاند نے اپنا چہرہ چھپایا تھا اور چاندنی کی چادر سمٹ چکی تھی ہوا میں سردی کی لہر بھی مگر اس گہرے سناٹے میں بھی ایک حسن تھا۔ انسانی آنکھ میں حسن ہوتا ہے اور اس کا تعلق انسان کے اندر کے موسم سے اس کا گہرا تعلق ہے اگر انسان خوش ہے تو اس کو حسن نظر آتا ہے اگر اندر پریشان ہے تو آنکھ حسین سے حسین چیز دیکھ کر بھی دل کو مٹا نہیں کرتی رتو لو کا خوش تھا اس نے جس کو یاد کیا تھا۔ اس کا جواب موصول ہو گیا تھا۔ رات کی تنہائی اور ویرانی میں بھی اس کی آنکھ حسن تلاش کرنے میں کامیاب تھی۔ انسانی نفیسات کا یہ بڑا واضح فارمولا ہے، رتو لو کا جانتا تھا ہر کوئی جانتا ہے اور محسوس کرتا ہے۔

رات کے آخری پہر اس کے سامنے صحرائی حسینہ انتونی اس کے سامنے تھی اور کہہ رہی تھی۔

”مجھے کچھ دیر ہو گئی اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا مالک مصری ساحر آخری سفر پر روانہ ہو رہا تھا اس کی آنکھوں میں صرف میری تصویر تھی اس کا جسم پانی بن کر بہہ چکا تھا، صرف سر تھا اور سر میں صرف آنکھیں زندہ تھیں اور ان آنکھوں میں میری تصویر تھی جب وہ تصویر دھندلا گئی اور آنکھیں ویران ہو کر پانی بن گئیں تو مجھے یقین ہو گیا کہ بوڑھا ساحر ہزاروں سال کوشش کرنے پر بھی دوبارہ مصر پر حکومت نہ کر سکا مگر اس کا یہ احسان مجھ پر ضرور ہے کہ اس کے سحر نے میرے جسم کو برقرار رکھا، کس طرح برقرار رکھا، یہ تم نے خود دیکھا ہے اور پھر میری روح دوبارہ میرے تندرست جسم میں داخل ہو گئی اور میں زندہ ہوں۔“

”بے شک یہی ہوا ہے مگر تم کو ایک بات یاد رکھنا ہو گی کہ تمہارے جسم کو برقرار رکھنے والا ساحر ختم ہو چکا ہے اور تمہارا موجودہ جسم اس کا عنایت کردہ ہے، ساحر ختم ہوا تو اس کا سحر بھی ختم ہو جاتا ہے تمہارا جسم تمہاری روح کا ساتھ نہیں دے گا، یہ بھی کسی وقت پانی بن کر ریت میں جذب ہو جائے گا کیوں کہ طبعی عمر تو اس کی بھی ختم ہو چکی ہے، ساحر کی زندگی کے ساتھ تمہارے جسم کا تعلق تھا وہ ختم ہو گیا ہے تم خوش ہو مگر یہ خوشی نہیں ہے کیونکہ تم بھی پانی پانی ہونے والی ہو، اس صورت میں بتاؤ تم میرا ساتھ کس طرح دو گی۔“ رتو لو کا بولا۔۔۔۔۔

”یہ بڑا خوفناک پہلو ہے، میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا، میں اپنی آزادی کا جشن منا رہی تھی اس طرف میری سوچ نہیں گئی تھی، تم نے مجھے یاد دلایا، میرے ہدم میرے دوست تم واقعی اس دنیا کے ذہین ترین انسان ہو، میرا جسم پانی بن کر بہہ جائے مجھے اس کی اب ضرورت کیا ہے جوانی اور حسن کو آفرینا تو ہونا ہوتا ہے مجھے جوانی بھی ملی اور حسن بھی مگر میرے کس کام کا، میری دلی انگلیں دلی خواہشات پوری نہ ہوئیں، میں دوسروں کا آلہ کار بنی رہی اور ہزاروں سال میں نے یہ اذیت برداشت کی اب میں اس حسین جسم کا کیا کروں گی میرا اصل تو قائم رہے گا میں

”گوئل جو لوگ اپنے فرائض کو جانتے ہیں وہ ان سے غفلت کبھی نہیں کرتے۔“ رولوکا بولا.....

”مجھے جگا دیتے کچھ تو آرام کرتے تاکہ دن میں آپ فریش ہوں۔“ گوئل بولا.....

”تم فکر نہ کرو، میں اپنی نینداؤں پر بھی پوری کر لوں گا۔“ رولوکا بولا.....

گوئل نے کہا۔ ”میں چائے بناتا ہوں اور ناشتہ تیار کرتا ہوں۔“

چند منٹ کے بعد قاسم اور زلیخا بھی باہر آ گئے قاسم بولا۔ ”حکیم صاحب اس ریگستان میں بڑی مست نیند آئی ہے، میں زندگی میں اتنی غفلت کی گہری نیند نہیں سویا خدا قسم ساری تھکن اتر آ گئی۔“

زلیخا نے مسکرا کر کہا۔ ”حکیم صاحب مجھے تو ایسا لگا کہ جیسے میں نے کوئی نشہ آور دوا کھائی ہے مجھے پتہ نہیں کہ رات کب گزر گئی، ایسی سوئی کہ اب آنکھ کھلی ہے۔“

”اس کی وجہ تھکن تھی اور کوئی خاص بات نہیں تھی۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

گوئل نے آواز دی۔ ”ناشتہ تیار ہے آ جاؤ۔“

قاسم اور زلیخا نے کھلی کی اور چھو لدا ری میں آ گئے ریت پر درمی پڑی تھی۔ گرم گرم چائے اور سفری ناشتہ موجود تھا بھوکے تھے اس لئے ناشتہ خوب ہوا اور پھر رواں گئی کی تیاری ہوئی۔ رولوکا نے پوچھا۔

”گوئل جنوب کی طرف کتنا اور چلنا ہے۔“

گوئل نے جواب دیا۔ ”اگر ہم ابھی سے اپنی سمت تبدیل کر لیں تو بھی اپنی منزل پر جاسکتے ہیں مگر میں ایسا نہیں کروں گا اس لئے کہ وہ راستہ خطرناک ہے اس طرف طوفان بہت آتے ہیں، ہوا کا دباؤ زیادہ ہے، میں جس طرف سفر کر رہا ہوں یہ راستہ ذرا طویل ہے مگر یہاں پر طوفان اور خطرناک ہوا کا ڈر کم ہے۔“

رولوکا نے گردن ہلائی اور اندرونی رابطہ پر انتونی سے یہی سوال کر دیا۔ انتونی نے جواب دیا۔ ”گوئل ہوشیار گائیڈ ہے اس نے ٹھیک کہا ہے کہیں پر یہ غلطی کرے گا تو

روحانی طور پر تمہاری خدمت کروں گی میں رب کائنات سے کہوں گی کہ میرے جسم سے مجھے آج اور ابھی نجات دے دے کیونکہ یہ ایک ساحر کا قائم کردہ جسم ہے مجھے نہیں چاہئے یہ فطری جسم، نہیں چاہئے نہیں چاہئے۔“

اور رات کے اس آخری پہر میں رحمت خداوندی نے انتونی کی فریاد سن لی اور انتونی کا جسم چند منٹ میں صحرائی ریت پر پانی بن کر بہہ گیا اور روح اپنی جگہ پر رہی، اب جہاں پر انتونی بیٹھی تھی وہاں پر ایک گیلانستان ریت پر تھا اور انتونی کی خوشی میں ڈوبی آواز آ رہی تھی۔

”اے مہربان دوست! ہزاروں سال میں نے دنیا میں گزارے آج میری دعا اتنی جلدی شرف قبولیت پا گئی تم حیران نہیں ہوئے۔“

رولوکا نے جواب دیا۔ ”نہیں مجھے حیرت نہیں ہے اس لئے کہ مالک اور نوکر کا فرق میں جانتا ہوں۔ مالک اگر اپنے نوکر پر مہربان ہے تو اس کی ہزار غلطیاں معاف کر سکتا ہے ہزار مواقع دے سکتا ہے اور اگر ناراض ہے تو فوراً پکڑ سکتا ہے اس کے اوپر کوئی نہیں ہے اس کو کسی کو جواب نہیں دینا ہے۔ اس نے تمہارے دل سے نکلی ہوئی دعائیں اور شاید تمہاری یہ بات کہ تم کو ایک ساحر کا عطا کردہ جسم نہیں چاہئے پسند آئی اور تمہاری خواہش پوری کر دی اب تم کو یہ شکایت نہیں ہوگی کہ تمہاری دلی خواہش کبھی پوری نہیں ہوئی۔“

”میں کبھی یہ شکایت نہیں کروں گی اور تمہاری خدمت کروں گی تم نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔ میرے پاس میرا کچھ نہیں ہے سب کچھ اس کا دیا ہوا ہے جو اس کائنات کا مالک و مختار ہے۔“

رات کا سفر ختم ہوا سورج کی آمد آمد ہوئی اور سورج کی پہلی کرن نے ریت کے ذرات کو سونا بنا دیا اور روشنی ہر طرف پھیل گئی۔ رولوکا دونوں چھو لدا ریلوں کے درمیان اپنی جگہ اسی طرح بیٹھا تھا۔ سب سے پہلے گوئل بیدار ہو کر باہر آیا اور رولوکا کو دیکھ کر حیرت سے بولا۔

”آپ اب تک اسی طرح بیٹھے ہو ماسٹر۔“

میں بتاؤں گی۔“ اور چار اونٹوں کا قافلہ پھر روانہ ہوا۔ سورج کے سرائٹھاتے ہی گرمی کی شدت میں اضافہ ہونے لگا رات کی ٹھنڈی ہواؤں کی جگہ گرم ہوائیں آنے لگیں۔

گرمی اور سخت سفر کے دوران بھی قافلہ آگے بڑھتا رہا اور شام ہوگئی گوئل نے رکنے کا اعلان کر دیا یہ پہاڑی علاقہ تھا اس سفید رنگت کے پہاڑ کے ارد گرد ریت کا کھلا میدان تھا حیرت تھی اس ریگستان میں یہ ٹیلا اور سخت پتھرا کا ٹیلا گوئل نے بتایا۔ ”کئی زمانے میں بہت اونچا پہاڑ ہوا کرتا تھا مگر مقبروں اور اہراموں کو بنانے کے لئے اس پہاڑ کو توڑا گیا اور یہ کم ہوتے ہوئے میدان ہو گیا تھا مگر اب پھر سے اس نے سر اٹھایا ہے اور یہ ٹیلا نظر آتا ہے یہ ہزاروں سال کا چکر ہے میں نے تو بچپن سے اس کو ایسا ہی دیکھا ہے میں کئی بار اس طرف سے گزرا ہوں ریگستانی ریت کے مقابلے میں یہ جگہ قیام کرنے کو مناسب ہے مگر کچھ خطرات بھی ہیں۔“ رولوکا نے پوچھا۔ ”خطرات کس قسم کے ہیں۔“

”بات یہ ہے کہ یہاں پر یونانی اور رومیہ نے مصری لوگوں پر بڑا ظلم کیا تھا، تعمیرات کے لئے مصری مزدور ہی تھے ان پر یونانی آقا بہت ظلم کرتے تھے اور پہاڑ کے بڑے بڑے پتھران کو زمین پر گھسیٹ کر اس مقام تک پہنچا دیتے تھے، جہاں پر ضرورت ہوتی تھی، سارا کام انسانی طاقت پر تھا، سخت گرمی اور ناکافی غذا کے باوجود مصری یہ کرنے پر مجبور تھے، ہزاروں اس پہاڑ کو تراشتے اور پتھروں کو تعمیرات کے مقام پر پہنچانے میں مر گئے، کہتے ہیں ان کی بھوکی پیاسی روجیں اس پہاڑی کے ارد گرد منزل لاتی ہیں، پہاڑ ختم ہوا تب بھی وہ اسی علاقے میں ہیں۔“ گوئل نے اپنی معلومات کے مطابق جواب دیا۔

رولوکا کچھ دیر چپ رہا اور پھر بولا۔ ”گوئل یہ کوئی خطرے والی بات نہیں ہے تم تھمہرنے کا بندوبست کرو۔“ رولوکا نے انتونی سے پوچھا۔ ”حقیقت کیا ہے؟“ انتونی نے کہا۔ ”جب سے یہ پہاڑ ختم ہوا ہے یہی

بات مشہور ہے، یہاں کے ہر پرانے باشندے کو یہ معلوم ہے، یہ بات غلط بھی نہیں ہے مگر ان رومنوں کے انتقام کا جو لوگ نشانہ تھے وہ واقعی یونانی اور رومی تھے مگر اب مصر میں ان کا وجود نہیں رہا اس لئے یہ روجیں خاموش ہیں کسی کو نقصان نہیں پہنچائیں، ہاں اگر تمہارے قافلے میں کوئی یونانی ہے تو اس کا خیال رکھنا ہوگا اور پھر سن لو، قاسم مصری نہیں ہے مگر اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح مصر سے ضرور ہے ہو سکتا ہے کہ اس کا تعلق کسی یونانی رومی خاندان سے ہو اور وہ صرف اس جرم میں ان رومنوں کا نشانہ بن جائے۔“ انتونی نے جواب دیا۔

”تمہارا خدشہ درست ہے مگر میں ہوں اور تم خود ہو تم سے بڑھ کر کون ہے؟ میں اس کی حفاظت کا بندوبست کر دیتا ہوں مگر تم بھی ہوشیار رہنا۔“ رولوکا بولا۔۔۔۔۔۔ گوئل نے رات کے کھانے کا اعلان کیا اور سب گوئل کے پاس آ گئے۔ رولوکا نے کھانے سے پہلے کہا۔ ”قاسم تم اور زلیخا کھانے کے بعد اپنی چھو لداری میں چلے جاؤ گے اور اندر سے بند کر لو گے، باہر کسی قسم کے حالات ہوں کسی قسم کی آواز تم سنو، تم کو باہر نہیں آنا ہے، میں اور گوئل باہر ہوں گے، میری بات پر تم کو عمل کرنا ہے رولوکیا کہتے ہو؟“

قاسم بولا۔ ”آپ کی بات ہمارے لئے پتھر کی لکیر ہے ہم صبح تک ہرگز واپس نہیں آئیں گے اندر رہیں گے۔“

زلیخانے کہا۔ ”ہم آپ کے حکم کے غلام ہیں ہرگز ہرگز باہر نہیں آئیں گے۔“ اور پھر سب کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے دوران گوئل نے کہا۔

”ہمارے امیر کا حکم بلا وجہ نہیں ہے ہم سب کے فائدے کے لئے ہے۔“

کھانے کے بعد قاسم اور زلیخا اپنی چھو لداری میں چلے گئے۔ رولوکا نے گوئل سے کہا۔

”تم بے شک اس صحرا کے دائی ہو اور ہر قسم کے حالات کو برداشت کرنے کو تیار ہو مگر میری بات غور سے

ہے، میں نے اس پہاڑ کو ختم ہوتے دیکھا ہے، میں نے یونانیوں کے تسم زندگی میں اور اس کے بعد بھی دیکھے ہیں، میں گواہ ہوں، میں یونانیوں کا دشمن بے وجہ نہیں ہوں اور یہ سب بھی بے وجہ نہیں ہیں۔“

تک پہنچایا اور اس میں خود کو چھپایا وہ قائلین سیزر کے دربار میں کھولا گیا اور اس میں سے دنیا کی حسین ساحرہ قلو پطرہ برآمد ہوئی اور سیزر کے دل و دماغ پر چھا گئی اور وقت نے دیکھا کہ یہ حسین فتنہ اتنا با اثر ہوا کہ سیزر کا زوال ہوا۔۔۔۔۔

یہ وہی سیزر تھا جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اس کے ایک لفظ سے دنیا زیر و زبر ہو جاتی تھی جس نے فوج کے چالیس دستوں سے لوگوں کی تقدیریں پلٹ دیں وہ سیزر جس پر کوئی جادو اثر نہیں کرتا تھا۔

وہ عزم و احتیاط کا پتلا، وہ برف کا محمد بیکر، وہ روم کا عظیم اعظم، وہ شہرہ آفاق مرد جس کو دیکھ کر لوگوں کے کلیجے دہل جاتے تھے، وہ نامور شجاع اس طرح ایک دغا باز لڑکی کے آغوش میں بے بس ہو کر گر پڑے گا، کیا ہے اس بات کا ثبوت نہیں کہ روم کا یہ سپوت یہ عظیم سیزر ایک معمولی مٹی کا بنا ہوا انسان تھا، اس لئے اس کا انجام وہی ہوا جو کہ ہونا چاہئے تھا۔

قلو پطرہ نے اپنے بھائی جو کہ اس کا خاوند بھی تھا کو زہر دے کر ہلاک کر دیا اور اس کی جگہ اپنے بیٹے کو شریک سلطنت بنا کر رومیوں کی ہمدردی حاصل کر لی کیونکہ اس کا بیٹا سیزر کا بھی بیٹا تھا۔

”قلو پطرہ“ نے مصر کے تخت و تاج حاصل کر لیا لیکن ہم مصری اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مصر کا بچہ بچہ اس سے نفرت کرتا تھا اور آزادی کا خواہاں تھا۔ ہر شخص آزادی کے لئے اپنی جان دینے کو تیار تھا اور اپنے نجات دہندہ کی طرف آنکھ لگائے ہوئے تھا۔ میں مقدس دیوی ایسی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو کچھ بیان کر رہا ہوں وہ میں نے خود دیکھے ہیں۔

ملکہ کی ہوشیاری اور چالاکی کے باوجود اس کا ایک جانی دشمن اس کے دربار کا خاص آدمی بن گیا۔ وہ ایک مقدس کاہن کا بیٹا تھا اور ہمارے فرعونوں کی اولاد تھا اس کو وارث تخت بنانے کے لئے ہی ملکہ کے دربار تک پہنچایا گیا اور اس بات کو نہایت خفیہ رکھا گیا تھا اس کا نام ہر مقدس تھا مکہ کو ختم کرنا اس کا فرض تھا۔ اس کے

باپ اور ماموں نے پورے مصر میں ملکہ کے خلاف ایک سازش تیار کی تھی اور عوام جو کہ پہلے ہی ملکہ سے تنگ تھے اس لئے ہر مقدس کا ساتھ دینے کو تیار تھے۔

ہر مقدس سے ملکہ بہت مانوس تھی اور گھٹنوں اس کو اپنی خلوت میں رکھتی تھی اور امور سلطنت اور ذاتی باتیں کیا کرتی تھی ملکہ نے کہا۔ ”آہ شہزادوں سرداروں اور غرور نخوت سے بھرے رومیوں نے تنگ کر دیا ہے۔ میرے سامنے آ کر خود کو ادنیٰ اور حقیر غلام ظاہر کرتے ہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ میری غیبت میں میرا مذاق اڑاتے ہیں اور مجھے روم کا ماتحت خیال کرتے ہیں۔ ان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو میرا ہمدرد ہو، یہ سب بے شعور ظالم خون چوسنے والی جنگلیں ہیں اور کٹھ پتلیاں ہیں۔ مجھے اپنے گرد و پیش کے حالات دیکھتے ہوئے یہی حکمت عملی اختیار کرنا پڑی ہیں ایک طاقت کو دوسری طاقت کے ساتھ لڑاؤں اور مصر کو ان کی دستبرد سے محفوظ رکھوں اس کاوش کا مجھے کیا صلہ مل رہا ہے یہی کہ لوگ مجھے برا کہتے ہیں میری رعایا بھی مجھ سے متفر ہے میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ گھر میں ایک عورت ہوں پھر بھی اگر ان لوگوں کو موقع ملے تو وہ میرے قتل کرنے میں دیر نہ کریں۔“

ہر مقدس کا بہن جو خود بھی اس کی موت کا منتظر تھا اور اسی غرض سے اس نے دربار تک رسائی حاصل کی تھی خاموش بیٹھا رہا اور ملکہ نے دوبارہ کہا۔

”افسوس یہ لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں اور مجھے غلط قرار دیتے ہیں اگرچہ میرے پائے ثبات کو ساری عمر میں صرف ایک دفعہ نعرش ہوئی ہے وہ اس وقت جب میں نے معاشرت کی ظاہری پابندیوں کو خیر باد کہہ کر دنیا کے سب سے بڑے انسان سے محبت کی مگر اس محبت کے شعلوں سے میرا جذبہ پنہاں مشتعل ہوا لیکن اس کی لو بہت مقدس اور معتبرک رہی۔ بعض رذیل انسان کہتے ہیں کہ میں نے اپنے بھائی کو زہر دیا جس کو روم کی مجلس غیر فطری طور پر میرا خاوند بنانا چاہتی تھی حالانکہ یہ الزام بالکل غلط ہے میرا بھائی بیمار ہو کر طبعی موت مرا، اب یہ افواہ بھی مشہور

☆ ☆ (303) ☆

تلاش ہے جس سے میں اپنے دل کی باتیں کر سکوں، مجھ میں بہت ہی کمزوریاں ہیں اور میں ان سے اچھی طرح واقف ہوں پھر بھی میں اس قابل ہوں، تم مجھ پر اعتبار کرو، بتاؤ کیا تم میری تنہائی پر رحم نہیں کرو گے اور کیا تم میری دوستی کا حق ادا نہیں کرو گے کیونکہ میرے پاس عاشقوں خدمت گاروں، درباریوں اور ناسلے کی کمی نہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس کو میں اپنا موٹس اور دوست قرار دے سکوں۔“

یہ کہہ کر وہ ہر مقس کی طرف جھکی اور اس کے بدن کو چھوتی ہوئی اپنی سحر بھری آنکھوں سے ہر مقس کو دیکھا اور ہر مقس اس کی سلطوت سے مغلوب ہو گیا اور آئندہ وہ شب کی تجویزوں کا خیال کرتے ہوئے اس پر شدید ندامت طاری ہوئی۔

اس نے سوچا۔ ”میں، ملکہ کا ہونے والا قاتل اس کا معتمد اور دوست بنوں، میرے لباس میں اس کو ہلاک کرنے کے لئے ایک تیز خنجر چھپا ہے۔“ ہر مقس نے اپنا سر جھکالیا اور ایک آہ یا کراہنے کی آواز اس کے دل کی گہرائیوں سے بلند ہوئی۔ ملکہ یہ سمجھی کہ ہر مقس اس کی مہربانی سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہے، نہایت شیریں انداز میں مسکرائی اور کہا۔ ”اب دیر ہو رہی ہے کل تم جب ستاروں کا مشاہدہ کرنے کے بعد میرے پاس آؤ گے تو اور باتیں کریں گے اس وقت تم میری باتوں کا جواب دینا۔“ اس نے یہ کہہ کر ہر مقس کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ وہ اس کا بوسہ لے، ہر مقس نے یہ سوچے بغیر کہ وہ کیا کر رہا ہے بوسہ لیا اور وہ چلی گئی۔

ہر مقس حیران اس کے جانے کے بعد کھڑا رہا گویا عالم خواب میں کھو گیا ہو۔

دونوں گھات لگائے ہوئے تھے دونوں شکاری تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ کون شکار ہوتا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر مقس ملکہ کے حسن بلاغیہ سے متاثر ضرور ہوا تھا اس کے دل میں کہیں تا کہیں کوئی نرم گوشہ ملکہ کے لئے ضرور پیدا ہوا تھا، ہر مقس کا شن اور اس کی توہم کی امیدوں

ہو رہی ہے کہ میں اپنی بہن کو قتل کرنا چاہتی ہوں میں اپنی بہن سے محبت کرتی ہوں مگر میرا خیال یہ ہے کہ اگر میری بہن کا داؤ چلے تو وہ مجھے قتل کرنے میں تامل نہیں کرے گی یہ سب لوگ بلا وجہ میرے دشمن جان بنے ہوئے ہیں اور مجھے شک ہے کہ تم کا بہن اعظم کے بیٹے ہر مقس تم بھی کسی نیک ارادے سے میرے قریب نہیں آئے ہو مگر یاد رکھو میرے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے اچھی طرح سمجھ لو کہ حسد کتنی خطرناک بیماری ہے یہ ایک مرض ہے جس کے سبب کم حیثیت لوگوں کی ریقانی آنکھ ہر چیز کو زرد دیکھتی ہے اور نیکی کے کشادہ چہرے میں برائی اور پاکیزہ ترین دو شیرہ کی روح پر بدامنی کا داغ پاتی ہے اس لئے میں تمہیں نصیحت کروں گی کہ تم بڑے آدمیوں کے متعلق اپنی رائے قائم کرنے میں عجلت سے کام نہ لو اور ان کو بلا وجہ برا نہ کہو لاکھوں عیب جو نگاہیں اس بات میں مشغول رہتی ہیں۔ وہ پر عظمت انسانوں کے ہر لفظ اور ہر فعل میں غلطی تلاش کریں اور ہزار ہا لوگ گلا بھڑا بھڑا کر ان کے چھوٹے سے چھوٹے عیب کا اعلان کرتے ہیں۔

حتیٰ کہ ان کی صدائے بازگشت سے تمام دنیا گونج اٹھتی ہے، میرے خیال میں تم کسی بات کو نہ کہیے نہ کہو کہ یہ اسی طرح ہے اور یقیناً اس طرح ہے بلکہ یہ کہو کہ نہیں معاملہ اس کے برعکس تو نہیں۔ کیا اطلاع صحیح موصول ہوئی ہے؟ کیا یہ حکم ملکہ نے اپنی مرضی سے جاری کیا ہے؟ میرے افعال کے متعلق ٹھنڈے دل سے رائے قائم کرو، یاد رکھو کہ ملکہ کبھی اپنے اختیار سے کام نہیں لیتی وہ صرف ان سیاسی طاقتوں کا آلہ کار ہے جن سے تاریخ کی ضخیم کتابیں مرتب ہوئی ہیں۔

تم میرے ہم در دوست اور مشیر بنو جس پر میں ہر وقت اعتبار کر سکوں کیونکہ میں اپنے دربار کے سب لوگوں سے زیادہ تنہا ہوں میں صرف تم پر اعتبار کرتی ہوں۔ کیونکہ تمہاری خاموش آنکھیں وفاداری کے نور کی حامل ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ تمہیں ایک مرتبہ پر پہنچاؤں، میں اب یہ جاننا تنہائی برداشت نہیں کر سکتی، مجھے ایک ایسے آدمی کی

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا، ماسٹر یہ جگہ اتنی پر اس نہیں ہے جتنی نظر آ رہی ہے مگر رات گزر گئی اور کچھ نہ ہوا۔“

گوگل حیرت سے بولا۔۔۔۔۔
”ہر بات ہر آدمی کے سمجھ میں نہیں آتی تم اپنا کام کرو اور مجھے اپنا کام کرنے دو، میرا مریض میرے ساتھ ہے مجھے اس کا علاج کرنا اور تمہیں ہم سب کو منزل تک پہنچانا ہے جو کچھ تم دیکھو محسوس کرو اس کا اظہار نہ کرو اور کوئی سوال نہ کرو کیونکہ میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔“ رد لوکا نے کہا۔

”میں معافی چاہتا ہوں ماسٹر، آئندہ کوئی سوال نہیں کروں گا۔“

اور گوگل ناشتہ تیار کرنے چلا گیا۔ قاسم اور زلیخا بھی اپنی چھو لدا ری سے آ گئے۔ زلیخا نے کہا۔

”حکیم صاحب آپ دورا میں جا گئے ہیں پتہ ہے یہ تو بڑے نا انصافی کی بات ہے کچھ ہمارا بھی فرض ہے آپ نے اکیلے کیوں اتنی تکلیف اٹھائیں۔“

رد لوکا ہنس پڑا اور بولا۔ ”تم سب کو میں اس سرزمین پر لایا ہوں تم کو شاید پتہ نہیں کہ مصر کی سرزمین دنیا کی سرزمین سے زیادہ پر سحر اور حیرت انگیز ہے اس کو سمجھنے والے بھی نہیں سمجھتے اور چکرا جاتے ہیں ہر قدم پر ایک نئی کہانی موجود ہے تم تو اس کے بارے میں لاعلم ہو، علم والے بھی پریشانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔“

ہاں تمہاری یہ بات میں ماننے لیتا ہوں کہ آرام کروں تو پھر آج کا سفر ملتی میں سوتا ہوں اور تم لوگ صحرا میں تفریح کرو اور خوب کھاؤ پیو اس بات کی فکر نہ کرنا کہ تم ایک ایسی جگہ ہو جہاں ضروریات کی چیزیں نہیں ہیں تم ایک دیرانے میں ہو۔ اس دیرانے میں بھی حسن ہے اور تم اگر چاہو تو اس سے لغت اندوز ہو سکتے ہو تمہاری خدمت کو گوگل موجود ہے۔ یہ صحرائی کیڑا ہے میں شام کو خود اٹھ جاؤں گا۔“ اور رد لوکا چھو لدا ری میں آ گیا۔

دوپہر ہو گئی دھوپ کی تمازت میں تیزی آ گئی اور

کا اور اپنے عظیم باپ کا ہن اعظم کی امیدوں کا مرکز ہر مفس ایک دورا ہے پر کھڑا تھا اور اس کی طرف ہزاروں مصریوں کی نگاہیں جچی ہوئی تھیں۔

وہ مصری جو اس کی خاطر اپنی جانیں اس کے ایک اشارے پر بچھاؤ کرنے کو تیار تھے۔ ہر مفس کو اس کا احساس تھا اور وہ اپنا فرض اور اپنے باپ کا قرض اتارنا چاہتا تھا مگر ملکہ کی عنایات اور مہربانیاں اس پر بڑھتی جا رہی تھیں ان مہربانیوں اور ملکہ کے اس پر اعتبار نے اس کے دل میں ملکہ کے لئے نرم گوشہ ضرور پیدا کر دیا تھا۔
رات کا سفر ختم ہونے کو تھا اور پھر بوڑھی آواز رک گئی تو رد لوکا بولا۔۔۔۔۔

”اب رات ختم ہونے کو ہے مگر ملکہ قلد پطہ کا قصہ ادھورا ہے تم کوکل آتا ہو گا مگر اس جلوس کے ساتھ نہ آنا، تم جانتے ہو کہ ان کے آنے سے کچھ نہ ہو گا تم خود آ جانا اور اگر نہ آئے تو یاد رکھو میں تم کو بلوا سکتا ہوں، تم نے دیکھ لیا ہے کہ مرے ہوئے لوگوں سے زیادہ زندہ انسان طاقتور ہوتا ہے۔“

بوڑھی آواز آئی۔ ”تم نے درست کہا ہے۔ ارے جدید دور کے انسان! میں تیرا حکم ماننے پر مجبور ہوں میں ضرور آؤں گا۔“ اور بوڑھی آواز بند ہو گئی، رد لوکا اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

اور کچھ دیر میں صبح کے نمودار ہونے کے آثار ہو گئے۔ اندھیرے کی چادر سمٹ گئی اور سوچ نے سر ابھارا اور ریگستان کی ریت پر اس کی کرینیں پھیل گئیں۔

گوگل اٹھ کر باہر آ گیا اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ رد لوکا اسی جگہ اسی انداز میں بیٹھا تھا وہ حیرت سے بولا۔

”آپ اس مقام پر بیٹھے ہو ماسٹر۔ رات تو اچھی گزری؟“

رد لوکا کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”رات میں کیا ہونا تھا تم ناشتہ تیار کرو۔“

سب چھو لداری کے سائے میں آ گئے۔

ہوا بند ہو گئی گولک باہر آیا اور چیخ کر بولا۔
 ”چھو لداری کو اچھی طرح بند کرلو طوفان آ رہا ہے۔“ ان
 کی چھو لداریاں پہاڑی کے ایسے مقام پر تھیں کہ ایک
 طرف سے وہ محفوظ تھے۔ گولک نے ہتھوڑا بٹکر کیوں کو
 اور مضبوط کر دیا اور اپنی چھو لداری میں اندر آ کر بیٹھ گیا۔
 رولو کا بے خبر سوراہا تھا گولک نے جگانا مناسب خیال نہ کیا
 اور خود اس طوفان کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ مگر اس نے
 دیکھا کہ طوفان کے آنے سے پہلے رولو کا اٹھ گیا اور
 بولا.....

”تم اس طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکو گے کیونکہ اس کو
 لانے والے کا نشانہ قاسم ہے تم اندر رہو اور باہر میں جاتا
 ہوں۔“ اور رولو کا باہر چلا گیا گولک نے حیرت سے اس کو
 دیکھا ضرور مگر کچھ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا۔

دور آسمان تک ریت کی چادر تھی دور دور کوئی
 پرندہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ رولو کا اکیلا کھڑا تھا مگر اکیلا نظر
 آنے والا اکیلا نہ تھا ایک بہت بڑا گولہ جس کی اونچائی
 آسمان تک تھی اور اس میں ریت اتنی تیزی سے گردش
 کر رہی تھی جیسے کوئی چکی چل رہی ہو اس کے گھماؤ کی آواز
 بھی چکی جیسی تھی مگر بہت تیز۔

رولو کا سامنے وہ گولہ گردش کر رہا تھا رولو کا نے
 اچانک ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”رک جاشور نہ کر میں کھڑا ہوں
 مجھ سے کلام کر۔“ گولے کی گردش میں فرق نہ آیا مگر وہ
 اپنی جگہ پر ہی رہا۔

رولو کا پھر بولا۔ ”میں جانتا ہوں تو کون ہے مگر اے
 حسین ساحرہ تیرا وجود ختم ہوا اور تیرا انتقام بھی، اب قدیم
 باتوں کو فراموش کر دے اور میری راہ سے ہٹ جاو نہ یاد
 رکھ تیرے مقدس دیوتا اور تیری ملکہ اور عظیم کاہن تجھے
 نہیں بچا سکیں گے تیرے دور کے ساحر اور ان کا سحر ختم
 ہو چکا ہے ذرا دیکھ تیرے سامنے کون ہے ستاروں کے
 حالات کیا ہیں تیری بد نصیبی ابھی باقی ہے تو جن کاہنوں پر
 اور دیوتاؤں پر بھروسہ کرتی ہے ان کا دور ختم ہو یا ہزاروں

سال بعد کا زمانہ ہے اس زمانے میں اہراموں اور مقبروں
 کو کھود ڈالا گیا ہے تمہاری قدیم روچیں کچھ نہ کر سکیں تم پرانی
 دشمنی کو کہاں تک دل میں رکھو گی مصر کی تقدیر تم بدل نہیں
 سکیں تمہارے بڑے دیوتا بھی یہ کام نہ کر سکے اب
 جاؤ اور میری راہ میں نہ آنا۔“

اچانک گولے نے رخ بدل لیا اور واپس جانے لگا
 اور پھر دور تک نظر آنے لگا۔ ریت اپنی جگہ بیٹھ گئی گولک
 ریت کے طوفان کا انتظار کرتا رہا مگر ایک ذرہ ریت
 کا چھو لداری کے اندر نہ آیا۔

آواز بند ہو گئی اور گولک چھو لداری سے باہر آ گیا اور
 حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگا اور پھر بولا.....

”یہ کیا ہوا ماسٹر طوفان کہاں گیا۔“
 ”جہاں سے آیا تھا چلا گیا۔“ رولو کا نے جواب
 دیا۔ قاسم اور زلیخا بھی باہر آ گئے۔

رولو کا نے کہا۔ ”اس سرزمین پر بڑے عجیب تماثے
 ہوتے رہے ہیں اور شاید آگے بھی ہونگے ہم جس کام
 سے آئے ہیں ہمیں وہ کام کرنا ہے رات کو کوئی اپنی جگہ
 سے نہیں ہلے گا۔ سورج کی روشنی پھیل جائے تو آپ لوگ
 باہر آئیں کچھ باتیں ایسی ہیں جو کہ آپ سمجھ نہیں سکتے۔“

اندھیرا ہوتے ہی رولو کا کے سوا سب اندر چلے گئے
 آسمان پر تارے بھی نظر آنے لگے رولو کا دونوں
 چھو لداریوں کے درمیان ایستادہ ہو گیا۔ اس کے اطراف
 میں اس کے کارندے دور دور موجود تھے رات بارہ بجے
 وہی بوڑھی آواز آئی۔ ”میں آپ کے حکم سے حاضر
 ہوں۔“

رولو کا نے پوچھا۔ ”ہر مقس اور ملکہ کے دشمنی کا کیا
 انجام ہوا بتاؤ۔“

”میں نے بتایا تھا کہ کاہن اعظم اور مصری قوم نے
 ہر مقس کو ملکہ کے قتل پر مامور کیا تھا کیونکہ وہ غیر مصری
 حکومت اور لوگوں کو پسند نہیں کرتے اس سازش میں
 ہر مقس کی چچا زاد بہن شاریاں بھی شامل تھیں وہ ملکہ کے
 پاس ایک باندی کے بھیس میں تھیں اور ملکہ کی بہت منہ

ملکہ نے کہا۔

”میرے دوست کیا تم آگئے بہت اچھا کیا کیونکہ تنہائی میں میرا جی گھبرا گیا ہے یہ دنیا کسی قدر تکلیف دہ ہے ہم اس میں کتنے انسانوں کو دیکھتے ہیں اور ان سے کس قدر کم انسانوں کو دوبارہ دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اچھا تم یوں بے گانوں کی طرح کھڑے نہ رہو اور میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔“

ہر مقس پھر آداب بجالایا اور کرسی پر ملکہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد ہر مقس نے کہا۔ ”اے اعلیٰ قدر ملکہ میں نے آپ کی خواہش کے مطابق نہایت احتیاط سے ستاروں کے احکامات مرتب کئے ہیں اگر آپ کا حکم ہو تو آپ کے قریب آ کر ان کی تشریح کروں۔“

یہ کہہ کر ہر مقس اٹھا تا کہ وہ پلنگ کے پچھلی طرف جائے اور جب ملکہ اس کے پیش کئے ہوئے کاغذات پر نظر ڈالے تو اپنا خنجر اس کی پشت میں پیوست کر دے مگر اس نے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا تھا کہ ملکہ نے آہستہ سے تبسم کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنی جگہ پر بیٹھے رہو اور کاغذات مجھے دے دو کیونکہ مجھے تمہارا چہرہ بہت دلکش معلوم ہوتا ہے اور میں تم کو اپنی نظروں کے سامنے دیکھنا پسند کرتی ہوں۔“

جب ہر مقس کی یہ چال بیکار ہو گئی تو وہ اس کے سوا کیا کر سکتا تھا کہ کاغذات ملکہ کے حوالے کر دے اور جب وہ ان کے مطالعہ میں منہمک ہو تو دفعۃً اٹھ کر اپنا خنجر اس کے سینے میں بھونک دے ملکہ نے کاغذات کی طرف ہاتھ بڑھایا اور انہیں پکڑتے وقت ہاتھ کو س کیا پھر اس نے ان کو پڑھنا شروع کیا لیکن ہر مقس نے محسوس کیا کہ اس کی ساری توجہ اس کی طرف تھی آخر اس نے پوچھا۔

”تم بار بار اپنا ہاتھ چغے کے اندر کیوں لے جاتے ہو نصیب دشمن آج تمہاری طبیعت کچھ خراب ہے۔“

”ہر مقس پر ذرا سی گھبراہٹ آئی مگر وہ سنبھل گیا اور بولا۔

”ملکہ میرا دل آج ضرورت سے زیادہ دھڑک رہا ہے۔“

ملکہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور تحریر پڑھنے لگی۔ اگرچہ اس

چڑھی تھی وہ ملکہ کو مراد دینا چاہتی تھی کیونکہ اس نے ہر مقس کی آنکھوں میں ملکہ کے لئے نرم گوشہ دیکھ لیا تھا اور وہ خود ہر مقس کو چاہتی تھی ملکہ کی موجودگی میں وہ ہر مقس کو نہیں پاسکتی تھی ہر مقس ملکہ کی طرف چلنے کو تیار ہوا تو شاریاں بولی۔ ”آقا جانے سے پہلے میری ایک بات سن لیں آج رات تقدیر ایک بہت بڑا واقعہ تشکیل دے رہی ہے اور ممکن ہے وہ اپنے دردی شدت میں مجھے یا تمہیں یا ہم دونوں کو تباہ کر ڈالے اس حادثے کا امکان پورا پورا ہے اس لئے آپ میری خطاؤں اور میری محبت اگر آپ کے دل میں ہے تو اس کو یاد رکھیں خطاؤں کو معاف کر دیں۔“

”ہر مقس نے پردوں کو سرکایا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ ملکہ نہایت خوبصورت لباس پہنے ہوئے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں پروں کا ایک پنکھا تھا جس پر موتی جڑے ہوئے تھے اس کے قریب ہی ہاتھی دانت کا ایک رباب تھا پاس ہی ایک میز پڑی تھی جس پر کچھ انجیر ایک بلوری جام اور ایک شراب سے بھری ہوئی صحراچی رکھی تھی ہر مقس آہستہ سے اس لطیف اور مدہم روشنی کی طرف بڑھا جس کی شعاعوں کے نیچے ملکہ آرام فرم تھی۔

آج اس کے چہرے میں غیر معمولی جاؤ بیت تھی وہ اپنے بستر پر تکیوں کا سہارا لئے بیٹھی تھی اور کمرے کی شمعوں کی روشنی میں ایک چمکتا ہوا ستارہ معلوم ہوتی تھی اس کے ملبوسات اور بالوں سے خوشبوؤں کی پللیں آرہی تھیں اس کے ہونٹوں سے نغموں کا رس ٹپک رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں تمام روشنیاں بدلتی اور جمع ہوتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں یہ وہی عورت تھی جس کو ہر مقس قتل کرنے آیا تھا جس پر ہزاروں مصریوں کا قتل کا الزام تھا۔

ملکہ کے سامنے ہر مقس آداب بجالایا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ لیکن ملکہ نے کوئی توجہ نہ کی اس کا موتی جڑا پنکھا حرکت کرتا رہا ہر مقس اس کے عین سامنے کھڑا ہو گیا ملکہ نے آنکھ اٹھا کر دیکھا اس وقت پنکھا اس کی چھائی پر تھا اور اس کے پر اس طرح کی چھائی پر پڑے تھے گویا وہ اس کی خوبصورت چھائی کو چھپانا چاہتے ہوں۔

کام یا دھاس لئے وہ اپنی جگہ قائم رہا۔
ملکہ نے مسکرا کر کہا۔ ”کیا میرے ناچیز گانے کا
شکر یہ ادا کرنے کے لئے تمہارے پاس الفاظ نہیں۔“
ہر مقس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”ملکہ آپ کے
گیت نے مجھے مبہوت کر دیا ہے میں اس کی تعریف کے
لئے اپنے پاس الفاظ نہیں پاتا ہوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ
آپ کا گیت جس کا ایک ایک لفظ ایک مستقل دعوت عشق
ہے کہیں میرے دل کو آپ کے دام محبت میں اسیر نہ
کر دے۔“

ملکہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”جس شخص کا دل لوہے کی
طرح سخت ہو اس پر عشق کی آگ کیا اثر کر سکتی ہے۔“
ہر مقس نے سوچا آگ تو لوہے کو نرم کرتی ہے مگر
منہ سے کچھ نہ بولا اور کانٹے ہاتھ سے خنجر کا قبضہ پکڑا تاکہ
حملہ کرے مگر باطنی کشش ہر لحظہ زیادہ مضطرب کرتی جاتی
تھی اس لئے ارادہ کیا کہ جتنی جلد ہو سکے ملکہ کا کام تمام
کر دے اور اپنا فرض ادا کرے۔ ملکہ نے محبت بھرے لہجہ
میں کہا۔ ”ادھر آؤ میں آج تم سے بہت سی باتیں کرنا
چاہتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے پہلو میں ہر مقس کو
جگہ دی ہر مقس نے سوچا ملکہ کے نزدیک پہنچ کر اس پر
اور آسانی سے حملہ کر سکوں گا۔

اس لئے وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ملکہ نے اپنا سر
پیچھے کی طرف جھکا لیا اور ہر مقس کو اپنی خواب آلود آنکھوں
سے دیکھنے لگی اب ہر مقس کے پاس حملہ کرنے کا بہترین
موقع تھا کیونکہ ملکہ کا سینہ بالکل عریاں تھا۔ ہر مقس نے
ایک بار پھر خنجر کے قبضے پر ہاتھ ڈالا لیکن ملکہ نے اس کی
کلائی پکڑ لی اور پیار سے کہا۔ ”تم آج اس قدر بے قرار
کیوں ہو؟ کیا تم بیمار ہو؟“ ہر مقس اپنی ناکامی سے
پریشان تھا وہ کچھ نہ بولا۔

ملکہ نے ہاتھ نہ چھوڑا اور کہا۔ ”اگر تم بیمار ہو تو آؤ
اس بستر پر لیٹ جاؤ تمہاری پریشانی دور ہو جائے گی۔
معلوم ہوتا ہے ستاروں کے مطالعہ نے تمہیں تھکا دیا ہے
دیکھو یہ رات کی ہوا جو پھولوں کی خوشبو سے لدی ہوئی ہے

کی توجہ ہر مقس کی طرف ہی تھی اب ہر مقس پریشان ہوا
اور اس نے سوچا۔ ”یہ مشکل کام میں کس طرح انجام دوں
گا اگر اچانک حملہ کر دوں تو وہ دیکھ لیگی اور اس کے شور
کرنے سے سارے اس کے آدمی آجائیں گے۔“
آخر اس نے فیصلہ کیا کہ کچھ دیر اور موقع کی تلاش میں
رہوں۔

ملکہ نے کہا۔ ”میں ان ستاروں کے ہیر پھیر سے
تھک آ گئی ہوں اب کوئی اور دل بہلاوے کی بات کرو کہو
آج کیا مشغلہ اختیار کیا جائے میں تم کو نقص دکھا کر محظوظ
کر سکتی ہوں کیونکہ کوئی عورت مجھ سے بہتر نقص نہیں کر سکتی
لیکن یہ بات ایک ملکہ کی شایان شان نہیں ہے میرے
خیال میں موسیقی اس سے بہتر رہے گی۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھی دانت کا برہا اٹھایا اور اس
کے تاروں کو نہایت لطیف انداز میں چھیڑا پھر اس کی دل
نشین آواز ایک رنگین نغمے کی صورت میں بلند ہوئی۔

اور ایک نہایت رومان انگیز اور انتہائی آواز جس
میں اس کی خواہشات کا ذکر تھا۔ اس نغمے میں تعریف بھی
تھی اس کی خواہشات بھی تھیں اور پھر ملکہ کا شیریں نغمہ
آہستہ آہستہ ختم ہوا۔

لیکن ہر مقس کے دل میں ہر لحظہ زیادہ موج پیدا
کرتی گئیں اس نے ایسی وجد انگیز یا جذبات کے رس میں
ڈوب لی ہوئی آواز بھی نہیں سنی تھی اور واقعی اس کی آواز کا اثر
تھا بلکہ اس میں معطر فضا کا اثر بھی شامل تھا اس فضا میں ہر
قسم کی دلفریب چیزیں موجود تھیں۔ اس میں ان خیالات
اور الفاظ کا اثر بھی مضمر تھا جن کو اس گیت میں بہت
نفاست کے ساتھ سمویا لیا تھا پھر اس پر سطوت خاتون کی
بے مثال خوبصورت اور رعنائی جیسی باتیں تھیں تعریف تھی
جنہوں نے اس گانے میں جادو کا اثر پیدا کر دیا تھا۔

ملکہ گارہی تھی تو ہر مقس کو ایسا لگ رہا تھا کہ جو کچھ
گیت میں کہا ہے وہ سب اس کے سامنے ہے۔ جب اس
نے برہٹ فرش پر رکھ دیا اور ہر مقس کی طرف ہاتھ پھیلائے
تو وہ ہر مقس کو ان طرف کھینچ لے گئی لیکن ہر مقس کو اپنا

کھاتے ہوئے اشکوں کا طوفان بہایا ہو، کیا تم نے کبھی اپنی روح کو کسی دوسری بیتاب روح کی پر اسرار گہرائیوں میں کھودینے کی کوشش نہیں کی۔؟“

یہ الفاظ کہتے ہوئے وہ بتدریج ہر مقس کے قریب آگئی اور آخر ایک لمبی آہ بھر کر اپنی ہانہیں ہر مقس کی گردن میں ڈال دیں ملکہ نے اپنی نیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اپنا باطنی حسن آشکار کیا اس کا نفس غمخیز اس کے بالوں سے کھیلنے لگا اور اس کے ہونٹ ہونٹوں سے پیوست ہو گئے ملکہ کے ہونٹوں اس کے لطیف لمس نے جو آغوش مرگ سے زیادہ ہلاکت آفرین تھا اس کی محبت کے سوا باقی باتیں ہر مقس نے فراموش کر دیں۔

اس کو صرف اس بات کا احساس تھا کہ ایک حسین پیکر نے اس کو اپنے بازوؤں میں لپیٹ لیا ہے اور اس کو اپنا محبوب کہہ کر پکارتی ہے اس کے دلبریز اور پر اسرار قسم نے جو ایک پھول کی طرح دلاؤ دین تھا اپنا ملک عزت قسم مقدس دیوی اور عزیز و اقارب سب بھلا دیئے۔

ملکہ نے شراب کا جام ہر مقس کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”لو میری محبت کے ثبوت میں ایک جام شراب نوش کرو۔“ ہر مقس پر تونش بے پیٹے ہی طاری تھا اس نے ساغر اٹھایا اور ایک لمبا گھونٹ پیا اس کے پینے کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں کوئی نیلی چیز ملائی گئی ہے۔

شراب پینے کی دیر تھی کہ طاقت بالکل صلب ہو گئی اور ملکہ کو موقع ملا کہ وہ چھپت کر اس خنجر کو باہر نکال لے جو ہر مقس کے لباس کے نیچے چھپا ہوا تھا ملکہ نے اپنے بالوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا۔

”آخر بازی میرے ہاتھ رہی میں نے آج وہ بازی جیتی جس کی شرط مصر کی عظیم الشان سلطنت تھی یہ ٹھیل اس قابل تھا کہ اس کو کھلیا جائے یہ خنجر تھا جس سے تم مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ اے شاہی حریف جس کے مددگار اب بھی محل کے باہر کھڑے ہیں اگر تو بیدار ہے تو بتا کہ اب کون سا امر مانگ ہے کہ میں یہ خنجر تیرے جسم میں پیوست نہ کر دوں۔“ ہر مقس نے ملکہ کے الفاظ سنے اور

کس طرح کھڑکی میں سے اٹھ کھیلیاں کرتی ہوئی آ رہی ہے ذرا شیریں زم زموں کو سنو جو سمندر کی موجوں کے چٹان سے ٹکرانے سے پیدا ہو رہے ہیں اگر چنان کی آواز بہت مدہم ہے پھر بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کے شور نے سامنے کے پہاڑ سے بھرنے والے تیز ٹھنڈے آبشار کے ترنم کو بالکل محو کر دیا ہے۔ ذرا اس شوخ بلبل کا میٹھا ترانہ سنو وہ کس طرح محبت بھرے دل سے مسرت کا پیغام دے رہا ہے، آہ! یہ رات کس قدر سہانی ہے اور قدرت کی موسیقی جو درختوں پر پرندوں ہواؤں اور سمندر کی مضطرب موجوں سے بلند ہو رہی ہے کتنی شیریں ہے ان سب کی دھن اور راگ ایک ہی ہے۔

آج میرے دل میں یہ خیال آیا ہے کہ میرا میلان اور شوق تم سے ملوث ہیں۔ ملنا یہ ثابت کرتا ہے کہ تم بھی شاہی خاندان کے چشم و چراغ ہو تمہاری رگوں میں بھی شاہی خون موجزن ہے لیکن تم میرے سینے کی طرف کیا دیکھ رہے ہو۔“ ملکہ کی آخری بات سن کر ہر مقس حیران ہوا وہ بے شک شاہی خاندان کا آدمی تھا اس کو کاہن اعظم اور مصر کے برگزیدہ بزرگوں نے فرعون کا خطاب بھی دے دیا اور اس کو ملکہ کے قتل پر مامور کر دیا تھا اس کی خاطر اس کو ہر طرح کے حالات سے لڑنے کا حوصلہ اور طریقہ دیا تھا۔

اس نے گہرا کر کہا۔ ”مجھے جانے کی اجازت دیں میری طبیعت بہت پریشان ہے۔“ ہر مقس نے انھیں کی کوشش کی مگر ملکہ نے روک دیا اور کہا۔ ”تم کو کچھ دیر اور رکنا ہوگا۔“

ہر مقس پریشانی میں مبتلا ہو گیا اور بولا..... ”ملکہ مجھے عشق و محبت سے کیا سرور کا مجھے جانے دیجئے کیونکہ میرا دم گھٹا جاتا ہے۔“

ملکہ نے کہا۔ ”کیا تم نے کسی عورت سے محبت نہیں کی یہ تو تم نے بہت ہی انہونی اور عجیب بات کی ہے کیا تم نے کسی عورت کا دل اپنے دل کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر دھڑکتے ہوئے نہیں سنا اور کسی ایسے معبود و محبت کی آنکھوں کو نہیں دیکھا جس نے تمہاری چھاتی پر جھک کر تمہیں

اپنے کمزور ہاتھوں سے اپنی چھائی کی طرف اشارہ کیا کیونکہ ہر مقس اپنی ناکامی پر خود شرمندہ تھا اور چاہتا تھا کہ اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔

ملکہ نے وہ چمکتا ہوئے خنجر اٹھایا اور اس کو ہوا میں بلند کر کے نیچے کی طرف لائی۔ حتیٰ کہ اس کی نوک ہر مقس کے بدن میں چبھتی ہوئی معلوم ہوئی لیکن ملکہ نے اپنا ارادہ بدل دیا اور وہ خنجر پھینک دیا اور کہا۔

”نہیں مجھے تجھ سے انس ہے اس لئے میں تیری خطا معاف کرتی ہوں۔ تجھ جیسے انسان کو ہلاک کرنا ایک ظلم ہوگا اے برگشتہ قسمت فرعون جسے ایک عورت نے مغلوب کیا میں تیری جان بخشی کرتی ہوں تاکہ تیری پستی میرے عروج کا باعث ہو۔“

ہر مقس کی آنکھوں کی بصارت ماند پڑ گئی کانوں میں بلبل کا نغمہ سمندر کی آواز اور ملکہ کی ہنسی گونجتی رہ گئی جب نقاہت کے سبب بے ہوش ہو گیا تو ملکہ کی ہنسی نیند کی دنیا میں بھی اس کے ساتھ تھی یہ اس کی ذلت کا آغاز تھا۔ ایک عظیم کاہن کا فرزند ایک مصر کا ہونے والا فرعون ذلت میں پڑا تھا۔

ہر مقس ایک بار پھر بیدار ہوا اس نے دیکھا کہ وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ہے وہ حیران ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور سوچنے لگا کیا میں نے کوئی خواب دیکھا ہے یقیناً یہ خواب کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔

اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ وہ نیند کی سے بیدار ہو کر خود کو غدار پائے گا اور مصر کی آزادی کی امیدیں اس کے نائل ہاتھوں سے ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جائیں۔ وہ خود حیران تھا کہ اس نے اپنے ملک اپنے بزرگوں سے غدار کی ہے جو میری کامیابی کی آس میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کو تیار بیٹھے ہیں ہزاروں نوجوان اس کے اشارے کے منتظر، اس کاہن اعظم کے ایک اشارے کے منتظر ہیں، یہ ایک واقعی خواب تھا ایک روح فرسا خواب جو شاید شدید غصی کوفت اور تھکن سے پیدا ہوا تو کیا وجہ ہے کہ دالان میں شامریاں کے پاس نہیں۔

ہر مقس حیران تھا کہ وہ اپنے کمرے میں لیٹ کر پڑا تھا اس کا سر جھکا رہا تھا دفعۃً اس کو عجیب چیز دکھائی دی وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے دل میں کہا یہ انسانی وضع قطع کی کیا چیز جو خون سے تھڑکی ہوئی سفید کپڑے میں لپیٹی ہے وہ اس کی طرف دوڑا اور اس کو پورے زور سے ٹھوکر ماری تو وہ لڑکھ کر دوڑ جا پڑی وہ خوف و ہراس میں نیم دیوانہ ہو کر اس نے سفید کپڑے کو بھاڑ ڈالا جس میں وہ لپیٹی تھی اس نے دیکھا کہ وہ ایک مردہ شخص کی اکڑی ہوئی لاش تھی، یہ بدست شخص رومی سردار پالس تھا ایک خنجر جس کا دستہ ابوالہول کی شکل کا تھا اس کے سینے میں پیوست تھا اور اس کے پھل کے ساتھ پاس اس کی فراخ چھائی پر ایک کاغذ چسپاں تھا جس پر یہ تحریر تھا۔

”ہر مقس آداب! میں وہ رومی سردار پالس ہوں جس کو تو نے اپنی سازش میں شامل کیا اب دیکھ لے کہ غدار انسانوں کا کیا حشر ہوا کرتا ہے۔“

اس لاش کو دیکھ کر ہر مقس پر ڈر سوار ہو گیا اور دہشت سے پیچھے ہٹا گیا۔ یہاں تک دیوار سے جا لگا اور اس کے کانوں میں پرندوں کی آوازیں آنے لگیں جو کہ صبح کی آمد کے ترانے گار ہے تھے اب اس کو یقین ہو گیا کہ جو کچھ دیکھا ہے خواب نہیں تھا بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے رسوا ہو چکا ہے۔

ہر مقس کو اس کا باپ یاد آ گیا اور اس نے تصور میں اس کو دیکھ لیا جب اس کو میری کوتاہی کی دل شکن داستان سنائی گئی اور اس کی امیدیں خاک میں مل گئیں ہر مقس کو اپنا ماموں یاد آیا جو کہ ایک سرگرم محبت وطن تھا اور رات بھر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ میرا انتظار کرتا رہا۔ ہر مقس کی ناکامی کے سبب اس کے معاونین پر کیا گزری ہوگی اگر ملکہ کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ ہر مقس اس کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو پھر اس کے مددگاروں کے بارے میں بھی علم ہو چکا ہوگا۔ وہ حیران تھا کہ یہ راز کس نے فاش فاش کیا، کیا؟ پالس نے راز فاش کر دیا۔ اس کو تو کسی کے نام نہیں پتہ تھے مگر جو فہرست جیب میں تھی وہ تو ملکہ کے پاس

طرح نفرت انگیز معلوم ہوتا اور یہ خنجر اس کے خون کی بجائے میرے خون سے تر ہوتا۔“

ملکہ کے الفاظ وہ سمجھ گیا میرا راز پالس نے فاش کیا۔ ملکہ نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”اور جب تم میرے پاس آئے تو میں جانتی تھی کہ تم مجھے قتل کرنے کے ارادے سے آئے ہو جب تم اپنا

ہاتھ بار بار اپنے لباس کے اندر لے جاتے تھے تو میں اچھی طرح جانتی تھی کہ تم اپنے خنجر کے قبضے پر ہاتھ ڈالتے ہو اس

کام کا ارادہ کرتے ہو جس کو تم پسند نہیں کرتے، آہ یہ کتنا عجیب اور زہر گداز منظر تھا۔ یہ ایک ایسا وقت تھا جو

الحقیقت بسر کرنے کے لائق تھا جب ہم داؤ پیچ کے جواب میں داؤ پیچ اور طاقت کے مقابلہ میں طاقت کا اظہار کرتے

تھے تو میں ہر لمحہ تعجب کرتی تھی کہ ہم دونوں میں سے کون غالب رہے گا۔ پہرے دار دروازے کے باہر گشت

کر رہے ہیں پھر بھی تمہیں یہ شب نہ گزرے کہ تم ان کی وجہ سے اس کمرے میں مقید ہو تم میرے ساتھ ایسی زنجیر میں

وابستہ کئے ہوئے ہو جو قید خانے کی زنجیروں سے بہت زیادہ مضبوط ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھے کوئی نقصان

نہیں پہنچا سکتے کیونکہ میری محبت تمہیں یہ اجازت نہیں دیتی کہ تم میرے ساتھ بے اعتنائی کرو، یہ ایک ایسی چیز ہے

جس کا مقابلہ میری فوجوں کے مقابلے سے بھی زیادہ دشوار ہے اگر یہ بات مجھے معلوم نہ ہوتی تو تم کسی کے دنیا سے

رخصت ہو چکے ہوتے یہ لو تمہارا خنجر اگر جرات ہے تو مجھے قتل کر دو۔“ اس نے خنجر ہر مقس کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور

اپنی چھاتی برہنہ کر کے اس کے آگے بڑھی تاکہ وہ خنجر سے اس پر وار کرے۔

کچھ دیر ای حالت میں کھڑی رہی اور پھر کہا۔ ”تم مجھے قتل نہیں کر سکتے کیونکہ تمہاری طبیعت اس ناگوار کام

سے وحشت کرتی ہے پھر اس عورت کو قتل کرنا جو تمہارے ساتھ دل جان سے محبت کرتی ہے ایسی کیا بات ہے جس کو

تم کبھی برداشت نہیں کر سکتے دیکھو اپنا ہاتھ روکو اور اس خنجر کو اپنی چھاتی کی طرف نہ لے جاؤ کیونکہ اگر تم کسی اور شخص کو

ہوگی اور ملکہ کو سب کے نام پتہ چل چکے ہوں گے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مصر کے تمام مجاہد وطن کا وہی حال ہوگا

جو پالس کا ہوا ہے، اس خیال سے ہر مقس کے دل پر ایک ٹھیس لگی اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا اور جب

دوبارہ ہوش میں آیا تو اس کو سایوں کی درازی سے اندازہ ہو کہ دو پہر ڈھل چکی ہے۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اس کے سامنے پالس کی لاش پڑی تھی، اس کو ایسا لگا جیسے پالس کی لاش خوفناک طور پر

اس کو دیکھ رہی ہے وہ گھبرا کر دروازے کی طرف بھاگا دروازہ بند تھا اور اس کے باہر پہرے داروں کے گشت کی

آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہر مقس جب دروازے کے پاس گیا تو پہرے

داروں نے لٹکارا اور اپنے نیزے کھول کر کھڑے ہو گئے پھر دروازہ کھلا اور ملکہ ذرق برق لباس پہنے ہوئے اندر

داخل ہوئی اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا ہر مقس پریشانی کے عالم میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ملکہ بڑی تمکنت

سے اس کے سامنے کھڑی ہو گئی اس نے ایک شیریں تبسم اور تسلیات کیا۔ ”میرا مقصد تمہارے پاس پہنچ گیا۔“ یہ

کہہ کر اس نے پالس کی لاش کی طرف اشارہ کیا جو بہت کر یہ صورت اختیار کر چکی تھی۔ ملکہ نے پہرے داروں کو بلایا

اور کہا۔ ”اس مردار کو اٹھا کر باہر لے جاؤ اور اسے پیل کوؤں کے لئے پھینک دو لیکن ٹھہرو یہ خنجر اس کی چھاتی

سے نکال کر میز پر رکھ دو۔“ پہرے دار اس کے حکم کی تعمیل کے لئے جھک گئے

اور اس خنجر کو جو کہ خون سے زنگ آلود ہو کر سرخ ہو گیا تھا باہر نکال کر میز پر رکھ دیا پھر انہوں نے پالس کی لاش

اٹھائی اور بھاری قدم اٹھاتے اس کو بیڑھیوں سے نیچے لے گئے۔

جب پہرے دار چلے گئے تو ملکہ نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہوتا کہ تم غداروں کے ہاتھوں میں کٹ پتلی بنے

ہوئے ہو، دیکھو تقدیر کا رخ کتنی جلدی بدلتا ہے اگر یہ غدار پالس نہ ہوتا تو یقین ہے کہ میرا جسم بھی اس کے جسم کی

اگر تم مصر کا تخت و تاج حاصل کر لیتے پھر بھی تمہیں رومیوں سے بننا پڑتا میں تمہاری تسلی کے لئے یہ بھی بتا دوں کہ میری رعایا میری طبیعت کو اچھی طرح نہیں سمجھی اس وسیع سرزمین پر کوئی شخص نہیں جو مصر سے زیادہ مجھ سے محبت رکھتا ہو بلکہ میں کہوں گی تم بھی مصر سے زیادہ مجھ سے محبت نہیں رکھتے۔

لیکن بد قسمتی سے ناموافق حالات نے میرا ہاتھ روک رکھا ہے جنگوں سازشوں اور بغاوتوں نے مجھے اس بات کا موقع نہیں دیا کہ میں اپنی رعایا کی صحیح طور پر خدمت کر سکوں۔ لیکن اب میں توقع کرتی ہوں تم اس کام میں میری مدد کرو گے کہو کیا یہ معمولی بات ہے کہ تم نے ملکہ کا دل جیت لیا وہ دل جس کو تم ہمیشہ کے لئے خاموش کر دینا چاہتے تھے تم وہ انسان ہو جو مصر کے باشندوں کے ساتھ میرا رابطہ مضبوط کرو گے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نئی اور پرانی حکومت اور قدیم و جدید خیالات کو جمع کریں گے ہماری خوش قسمتی ہے کہ واقعات خود بخود ہماری فلاح و بہبود کا ذریعہ بن گئے ہیں اب تم زیادہ پرامن طریقے سے فرعون کے تخت پر قابض ہو جاؤ گے یہ اتفاق تھا کہ ایک رومی نابکار نے تمہارا راز فاش کر دیا اور میں تمہیں نشلی دوا ملا کر تمام کاغذات حاصل کر لئے جن سے تمہاری زبردست سازش کا بھید کھل گیا۔

اب تم میری محبت کے وسیلے سے اپنا مقصود حاصل کرو گے اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکے گا کہ تم نے اپنے وطن سے غداری کی ہے جب مصر کے لوگ دیکھیں گے کہ تم نے کس حکمت عملی سے دریائے نیل پر اپنی فرمانروائی کا اثر پھیلایا ہے تو وہ ضرور تمہاری کوششوں کو تحسین آفرین نظر سے دیکھیں گے۔ بتاؤ اس تجویز کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟“

ہرمقس نے اپنا سراٹھایا اور اس کے دل میں ایک روشنی کی شعاع داخل ہوئی کیونکہ جب انسان ڈوبنے لگتا ہے تو وہ تنکے ہی کا سہارا لیا کرتا ہے اس نے ملکہ سے کہا۔

”مجھے اپنی زندگی کی فکر نہیں میں صرف یہ پوچھنا

قتل نہیں کر سکتے تو پھر تم اپنے آپ کو کس طرح قتل کر سکتے ہو کیا تم اس رنجیدہ ہستی کا سامنا کرنے کی جرأت رکھتے ہو جو اقلیم فنا میں حکمران ہے۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ مادر مقدس اپنے اس فرزند کو محبت کی نظر سے دیکھے گی۔ جو اس کا حلف توڑنے اور دنیا کے تمام کاموں میں رہنے کے بعد خود شہید کر کے اس کے سامنے جائے گا۔ اگر تم اپنے خون سے ہاتھ رنگ کر دیوی کے سامنے جانا چاہتے ہو تو یہ بتاؤ تم اپنے گناہوں کا کفارہ کیسے ادا کرو گے۔“

ان الفاظ نے ہرمقس کا دل چورا چور کر دیا اور اس سے ضبط نہ ہو سکا کیونکہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس میں مرنے کی جرأت بھی نہیں ہے وہ شرمندگی کے سبب اوندھے منہ پٹنگ پر گر پڑا اور اپنی ذلت پر خون کے آنسو بہانے لگا۔

ملکہ اس کے قریب آئی اور اس کی تسکین و تشخص کے لئے اپنی باہیں اس کی گردن میں ڈال دیں۔

اور کہا۔ ”سنو اب بھی تم اپنی بگڑی بنا سکتے ہو کیونکہ میں تم سے ناراض نہیں ہوں ہماری بازی بہت بڑی بازی تھی لیکن عورتوں کا جادو مردوں کے جادو سے کہیں زیادہ موثر ہوتا ہے میں نے اسے استعمال کیا اور تم پر غالب آئی میں تم سے نہ صرف ایک عورت اور ملکہ کی حیثیت سے ہمدردی رکھتی ہوں بلکہ میرا تعلق تمہارے ساتھ اس سے بھی زیادہ ہے میں پسند نہیں کرتی کہ تم رنج و غم میں مبتلا ہو تمہارا فرض تھا کہ تم اپنے ملک کو آزاد کراتے اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو میں بھی یہی کرتی جس کام کی میں نے قسم کھائی تھی اس کام کو انجام دینے کی کوشش کرتی تمہارا کام بہت شاندار اور صبر آزمایا تھا اور تمہاری جسارت ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے میں خوش ہوں کہ تم اپنی ناکامی پر تاسف ہو اور میں اس ناکامی پر تم سے ایک عورت کی حیثیت سے ہمدردی رکھتی ہوں تمہارا کام اس قدر خراب نہیں ہوا جتنا کہ تم خیال کرتے ہو۔ اب بھی تم چاہو تو یہ سدھر سکتا ہے تمہاری سازش کی بنیاد مضبوط نہ تھی کیونکہ یہ ممکن نہ تھا کہ مصر ارد گرد کی مخالف طاقتوں سے محفوظ رہے

چاہتا ہوں کہ ان لوگوں سے کیا سلوک کیا جائے گا جو اس سازش میں میرے ساتھ شریک تھے۔“

ملکہ نے کہا۔ ”ہاں تمہارا معمر باپ اور تمہارا ماموں جس کی سیدھی سادھی شکل دیکھ کر کسی کو یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ وہ زبردست محبت وطن ہے۔“

ہرمقس کا خیال تھا وہ شادمیاں کا نام بھی لے گی لیکن ملکہ نے اس کا نام نہیں لیا۔ ملکہ نے دوسرے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ”ان کے علاوہ بہت لوگ بھی ہیں اور میں ان سب کو جانتی ہوں۔“

ہرمقس نے کہا۔ ”ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟“

”میری محبت یا ان لوگوں کی فوری ہلاکت جو اس سازش میں شامل تھے ان دونوں میں سے مجھے چاہئے منتخب کر لے۔“ پھر ہرمقس نے نظریں اٹھائیں اور دیکھا کہ ملکہ کی آنکھیں چمک رہی ہیں گویا وہ ان پر سختی کرنے کے لئے تیار ہے اس لئے آخری کوشش کے طور پر ایک آہ بھر کر اس کے ہونٹوں کو بوسہ دیا اور اپنی غلامی اور ذلت پر ایک نہ مٹنے والی مہر ثبت کر دی اس کے بعد ملکہ یونانی حسن کی دیوی زہرہ کی طرح فاتحانہ انداز کے ساتھ اس کا رنگ آلود خنجر اٹھا کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

ہرمقس قطعی نہ سمجھ سکا کہ اس کو دھوکا دیا گیا ہے اور کسی مصلحت کی بناء پر زندہ رکھا گیا ہے اس کی سمجھ میں یہ بھی نہ آ سکا کہ خونخوار ملکہ اس قدر رحمدل کی طرح بن گئی وہ نہیں جانتا تھا کہ ملکہ کا لطف و کرم کسی مصلحت شناسی کا نتیجہ ہے اور محبت کو اس میں کوئی دخل نہیں اس نے نہایت عیاری سے ہرمقس کو اپنی ذلت گرہ گہرا کا سیر کر لیا اس نے پالس اور میرے ماموں کے سوا کسی شخص کو سزا دینے سے موت نہ دی لیکن اور قسم کی اذیتیں بہت لوگوں کو پہنچائی لگیں۔

ملکہ کے رخصت ہونے کے بعد ہرمقس کے دل پر ایک بار پھر رنج و غم کے گھٹا ٹوپ بادل چھا گئے ان لحاظ کی فحشی بہت شدید تھی کیونکہ دیوتاؤں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا دیوتا اس کی میری دعاؤں پر کوئی توجہ نہیں کرتے تھے

وہ ایسا محسوس کرتا تھا جیسے تاریکی نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اگرچہ اس تاریکی میں کبھی کبھی ملکہ کی حسین ستاروں جیسی روشن آنکھیں چمک اٹھتی تھیں اور اس کی ہمدردی سے بھری ہوئی پھٹی آواز ہرمقس کے کانوں میں گونجتی ہوئی معلوم ہوتی تھی آہ ناکام انسان کا دل بھی ایک عجیب چیز ہے ملکہ کے التفات نے ایک بار پھر ہرمقس کی بجھتی ہوئی امیدوں کی لوا کساد دی اور وہ اپنے ذہن میں بڑے بڑے ہوائی قلعے تعمیر کرنے لگا۔

وہ خیال کرتا تھا کہ اگر ملکہ مجھ پر اسی طرح مہربان رہی تو ممکن ہے کہ میں اپنی کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لئے ایک ایسا راستہ پیدا کروں جو پہلے راستے سے کہیں زیادہ پسندیدہ ہو لیکن افسوس یہ امید محض ایک خواب پریشان تھی جس طرح موج سراب کی تشنہ شب مسافر کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے اسی طرح یہ موہوم امید بھی ہرمقس کی تباہی کا باعث ہوئی۔“

رات گزر گئی اور بوڑھی آواز خاموش ہو گئی۔ رولوکا نے کہا۔ ”اے بوڑھی روح تو نے اپنا تعارف نہیں کرایا تو کون ہے یہ تو بتا۔“

سکپاتی آواز آئی۔ ”اس کی ضرورت جب ہوگی میں بتا دوں گا ابھی بات ادھوری ہے اور آج کا وقت ختم ہوا میں تم کو سب ماجرہ بتا کر خوش ہوں جو راز میرے پاس اب تک محفوظ تھے بے کار تھے دنیا کے سامنے جانیں گے تو عبرت کا سامان ہوگا لوگ سبق حاصل کریں گے۔“

آواز دور ہو گئی سورج کی پہلی کرن زمین پر پڑی اور ریگستانی ریت چمک اٹھی آسمان پر پرندوں کی آمد شروع ہو گئی اور گول اٹھ کر رولوکا کے قریب آ گیا اور بولا۔۔۔۔۔

”ماسٹر مجھے یہ حق تو نہیں کہ میں آپ سے کوئی سوال کروں مگر میں پھر انسان ہوں جذبہ تجسس میرے اندر بھی ہے میں نے سیکڑوں سفر اس چل چلاتی ریت پر کئے ہیں۔ بہت دفعہ مرتے مرتے بھی بچا ہوں انسانوں کا اس ریت پر پیاس سے دم توڑتے بھی دیکھا ہے مگر یہ میری

گول کی آواز آئی ناشتہ تیار ہے اور سب چھو لدا ری کے اندر چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

قدیم روح کی بوڑھی آواز آئی۔ ”اے میرے جدید دور کے انسان کیا تو میری طرف مخاطب ہے۔“
 رولوکا بولا۔ ”ہاں میں تیری آواز سننے کو ہمدن گوش ہوں۔“

آواز آئی۔ ”ہر مقس قید ہو گیا اور گیارہ شاید پندرہ دن کمرے میں قید رہا اس دوران اس کو خورد و نوش کا تمام سامان ملتا رہا وہ باہر کے حالات سے بے خبر تھا ملکہ رات کو اس کے کمرے میں روز آتی اور اس کے ساتھ پیار محبت کی باتیں کرتی تھی اور سیاسی حالات پر بات کرنے سے کترات تھی۔ وہ ہر رات ایک نئے رنگ میں ہر مقس کے پاس آتی تھی، اس کی سچ دھج بھی خوب ہوتی تھی وہ نہایت ہنس کھ اور زندہ دل ہوتی تھی کبھی عشقیہ راز و نیاز کی باتیں کرتی تھی اور کبھی کبھی متفکر ہوتی تھی گویا ساری دنیا کے کاموں کا بوجھ اس کے ہی سر پر تھا وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ مصر کو کس طرح آسودہ حال بنایا جائے اور روما کے عقاب دار جھنڈو کو کس طرح ڈھکیل دیا جائے۔

ہر مقس اس سے بیزار تھا گو کہ اس نے اس کا اظہار ملکہ کے سامنے نہیں کیا تھا اس نے ابتدا میں اس کی باتوں پر توجہ نہیں دی۔ مگر کب تک رفتہ رفتہ وہ بھی دلچسپی لینے لگا اور اس کو ملکہ کی محبت پر اعتبار آتا گیا اور اس نے بھی اپنے دل کی باتیں کرنا شروع کر دیں اور ملکہ کو اپنی تجاویز اور مشورے دینے لگا وہ تجاویز اور مشوروں کو بہت توجہ سے سنتی اور ان کو عمل میں لانے کے وسائل و ذرائع پر بحث کرتی اس نے بتایا کہ وہ مصر کے عبادت خانوں کی مرمت کرائے گی اور خداؤں کے لئے نئے بیکل تعمیر کرائے گی مذہب کو زیادہ پاکیزہ بنائے گی اس کی باتیں ہر مقس کے دل میں اترتی جا رہی تھیں اور ایک وقت آیا کہ اس کو ہر طرف ملکہ ہی ملکہ نظر آنے لگی اس نے ملکہ ہی کو اپنے دل میں بسالیا اس نے اپنی بیتاب روح کے شدید ترین

زندگی کا عجیب سفر ہے جس میں ابھی تک کوئی بالچل کوئی وقت کوئی رکاوٹ کوئی پریشانی نہیں آئی پانی کی مقدار روزانہ استعمال کے بعد بھی اتنی ہی ہے کھانے کی اشیاء میں کمی واقع نہیں ہوئی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر کوئی تفریحی سفر ہے اور ہمارا رابطہ بیرونی دنیا سے باقاعدہ قائم ہے میرے لئے یہ حیرت انگیز معاملہ ہے۔“ گول خاموش ہو گیا۔

رولوکا بولا۔ ”دیکھو گول انسان کی سمجھ میں ہر بات نہیں آتی تم نے جو مشاہدہ کیا وہ تمہاری گہری نظر کا کمال ہے تم میں سے یہ کہوں گا کہ اس ریگستان میں ابھی بہت کچھ دیکھنے کو باقی ہے ابھی ابتداء ہوئی ہے تم نے بہت سفر کئے مگر تمہاری آنکھ وہ نہ دیکھ سکی جو میں دیکھتا ہوں میرے مریض کا علاج ہونے کا موقع نہیں آیا اس کے لئے ابھی کچھ اور قیام کرنا ہو گا تم نے دیکھا کہ مریض کو دور سے بند ہو گئے ہیں مگر یہ ٹھیک نہیں ہوا ہے۔ تم جو دیکھو وہ خواب سمجھ کر بھول جانا اپنے احساسات اور جذبات کو کنٹرول میں رکھنا کیونکہ انسان ان کی وجہ سے کبھی کبھی خسارے میں چلا جاتا ہے۔“

گول خاموشی سے اٹھا اور ناشتہ بنانے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد قاسم اور زلیخا آ گئے۔ قاسم بولا.....
 ”حکیم صاحب یہ ویران ریگستان میں میری بیماری کا علاج ہے کیونکہ میں خود کو بہت چاک و چوند پاتا ہوں۔“

اس کے بعد زلیخا بولی۔ ”حکیم صاحب شہروں کے شور ہنگاموں سے دور یہ ریگستان اچھا لگ رہا ہے اور قاسم کا صحت بھی اچھی ہو رہی ہے۔“ رولوکا یہ سن کر مسکرایا اور لا.....

”تو پھر تم لوگوں کے لئے یہاں پر ہی قیام کا بندوبست کروادیا جائے مگر یاد رکھو جو دو افادہ کرتی ہے اس کو بھی انسان ہمیشہ استعمال کرنا پسند نہیں کرتا تم دونوں دوش ہو س ریگستانی زندگی کا مزالو، آگے بھی جانا ہے اور اپس بھی جانا ہے مگر ابھی اس میں وقت ہے۔“

میں اگر تم کو آزاد کر دیتی تو اہل مصر تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کرتے اور شاید قتل بھی کر ڈالتے اب تمہاری سازش ناکام ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں اور لوگوں کا غصہ کم ہو گیا ہے اس لئے میں تم کو رہا کر دوں گی تم پھر میرے منجم کی حیثیت سے دربار میں داخل ہو گے میں تمہاری رہائی کی وجہ سے یہ بتاؤں گی کہ تم نے اپنی صفائی پیش کر دی ہے اور جنگ کے متعلق تمہاری پیشن گوئیاں درست ثابت ہوتی ہیں۔“

ہرمقس کو آزاد لی گئی اس نے پھر دربار میں آنا شروع کر دیا لیکن بہت کم، اپنی غداری پر بہت نادم تھا اور یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ اس کا کوئی شناسا اس کو دربار میں نفرت کی نظر سے دیکھے یہ اس کا خوش نصیبی تھی کہ دربار میں کوئی نہیں تھا جو تھے وہ ملکہ کی سفاکی سے ڈرتے تھے چچا زاد اشار میاں کینز جو کہ سازش میں پوری طرح شریک تھی وہ بھی خاموش تھی ہرمقس کو پتہ تھا کہ وہ محل میں موجود ہے وہ شاید اس لئے بچ گئی کہ اس کا نام فہرست میں نہیں تھا۔

ہرمقس آزاد تو تھا مگر اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا تھا اور گناہ کا احساس کھاتے جاتا تھا۔ اس کے چہرے کی بشاشت بالکل رخصت ہو گئی تھی وہ ظاہری طور پر آزاد تھا لیکن جاسوس ہر وقت اس پر نظر رکھتے تھے ابھی تک اس کو محل سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔

ہرمقس اس آزادی سے بیزار تھا وہ اپنی الجھنوں میں گرفتار تھا کہ کونسل ڈیلیس اسکندر یہ میں وارد ہوا وہ حکومت روم کے رکن اعظم مارکس انٹونیس کا سفیر بن کر آیا تھا جو فلپائی کی لڑائی میں فتح پانے کے بعد ایشیا میں داخل ہوا تھا تاکہ وہ اپنے باجگزار بادشاہوں سے روپیہ وصول کرے اور اپنے سپاہیوں کی آتش حرص بجھائے چونکہ انٹی کو ملکہ مصر کے خلاف یہ شکایت تھی کہ اس نے حکومت روم کی مخالفت کی ہے اس لئے اس نے ملکہ مصر سے باز پرس کے لئے اس کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔

احساس سے ملکہ سے محبت کرنی شروع کر دی اس کے پاس اب ملکہ کے سوا اور رہا ہی کیا تھا اس نے اپنی زندگی ملکہ کے لئے ہی وقف کر دی وہ اس پر اس طرح فدا تھا جس طرح ایک بے تاب پروانہ شمع پر فدا ہوتا ہے۔

اس قید کے گیارہ دنوں میں وہی عورت جو تباہی کا باعث ہوئی معبود محبت بن گئی اور وہ اس کے ساتھ اس قدر شدید محبت کرنے لگا کہ اس کا ماضی ایک افسانہ اور حال ایک رنگین خواب بن گیا ملکہ یہ چاہتی تھی یہ ملکہ کی فتح کامل تھی اس نے ہرمقس کو بالکل مغلوب کر لیا اور ذلت کی کلیف دلدل میں بھی فرق پیدا کر دیا۔

ایک دن وہ اس کے پاس آ گئی اس نے شاہانہ لباس پہن رکھا تھا اس کے ہاتھ میں عصائے سلطنت اور سر پر سونے کا تاج تھا اس نے بتایا کہ وہ روم کے سفیروں کو چھوڑ کر دربار سے آئی ہوں وہ باتیں کرتے کرتے اجاگ ابھی اور اپنا تاج اتار کر اس کے سر پر رکھ دیا پھر اس نے اپنا لبادہ پہنایا اور ہاتھ میں عصائے حکومت دیکر آداب بجالائی اور کہا۔ ”اب تم میرے بادشاہ ہو۔“

ہرمقس اس کو مذاق سمجھا اور غصے میں تاج اتار کر زمین پر ڈال دیا اور کہا۔ ”آخر میرے جیسے خستہ حال قیدی کی اس طرح تضحیک کرنے کا مطلب کیا ہے۔“ ملکہ چند قدم پیچھے ہٹ گئی اور بولی۔

”ناراض نہ ہو تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ میں تم سے مذاق کر رہی ہوں اور تم واقعی فرعون نہیں بنو گے۔“

”سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح فرعون مصر بنوں گا۔“ ہرمقس نے سوال کیا۔

پھر دوبارہ سوچ کر ہرمقس بولا۔ ”اس کی صرف ایک صورت ہے کہ ملکہ مصر میرے ساتھ شادی کر لے۔“

ملکہ نے نظر جھکا کر کہا ”ممکن ہے میرا ارادہ یہی ہو۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم یہاں پر کمزور نظر آتے ہو مجھے یہ بھی اطلاع ہے کہ تم کھانا بھی پورا نہیں کھاتے تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ میں نے تم کو اس جگہ تمہاری بھلائی کے لئے رکھا ہے اور اب بھی تمہارے تحفظ کے لئے یہ ضروری ہے

ملکہ اپنے عائد سلطنت کے ساتھ جن میں ہر مقص بھی شامل تھا بڑے کمرے میں سونے کے تخت پر جلوہ فرما تھی اس نے جو بداردوں کو حکم دیا کہ وہ انتی کے سفیر کا خیر مقدم کریں محافظ پاہیوں نے رومی سفیر کی سلامتی اتاری اور اہل دربار اس کی آمد کے منتظر ہوئے۔ وہ چمکتی ہوئی سنہری زرہ بکتر اور سرخ ریشی چنہ پہنے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اس کا چہرہ بہت وجیہ اور جسم بہت چست تھا لیکن منہ اور آنکھوں سے سرد مہری چمکتی تھی جب چو بدارد اس کے نام القاب اور عہدوں کا اعلان کر چکے تو اس نے ملکہ کو حیرت کی نظر سے دیکھا جو اپنے حسن درخشاں سے تخت شاہی پر جلوہ افروز تھی ڈیلیس کو ملکہ مصر کے سامنے عرض ادب کرنا تھا لیکن وہ نقش حیرت بنا کھڑا تھا آخر ملکہ نے کہا معزز ڈیلیس پر شوکت انتی کے سفیر جس کا طویل سایہ تمام دنیا پر اس طرح چھایا ہوا ہے گویا جنگ کا دیوتا بہ نفس نفیس ہم معمولی بادشاہوں کی محفل میں کھڑا ہے میں ملکہ مصر تم سے استدعا کرتی ہوں کہ تم اپنی تشریف آوری کا مقصد بیان کرو۔

مکار رومی سفیر نے ملکہ کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور پہلے کی طرح بت بنا کھڑا کر دیا۔ یہ دیکھ کر ملکہ نے کہا۔ ”معزز ڈیلیس کیا وجہ ہے کہ تم اس طرح خاموش کھڑے ہو ہمارے سوال کا جواب نہیں دیتے کیا تم سرزمین مشرق میں اپنے زیادہ عرصہ رہے ہو کہ تم رومی زبان نہیں سمجھ سکتے تاؤ تم کون سی زبان بولتے ہو ہم اس میں تمہارے ساتھ گفتگو کریں گے۔“

یہ سن کر سفیر نرم اور صاف لہجے میں بولا۔ پر سطوت ملکہ مصر اگر آپ کے سامنے میری قوت گفتار سلب ہو گئی تو مجھے معاف کر دیں۔ کیونکہ کوئی شخص آپ کے حسن سے مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ سورج کے دیکھنے کے بعد انسان کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتا اس طرح آپ کا حسن جہاں آرا دیکھ کر میرے ہوش و حواس رخصت ہو گئے اور مجھے آپ کے سوا باقی تمام چیزیں فراموش ہو گئیں۔“

ملکہ بولی۔ ”معزز سفیر معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے وطن میں چالپوسی کی خوب شق کرائی جاتی ہے۔“

سفیر نے جواب۔ ”محترم ملکہ خوشامد کا سانس بادلوں کو جنبش میں نہیں لاسکتا، میرے آقا نے آپ کو ایک خط ارسال کیا ہے جس پر اس کی مہر گرامی ثبت ہے اگر آپ اجازت دیں تو یہ مہر تو ذکر خط کا مضمون آپ کے سامنے پیش کروں۔“

ملکہ نے کہا۔ ”ہم پیغام سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہیں۔“

اس کے بعد سفیر نے مراسلہ پڑھا جس کا مضمون یہ تھا۔

”حکومت روما کے رکن اعظم مارکس انتونیس کی طرف سے قلوبطرحہ کو تسلیمات جو ہمارے لطف و کرم سے ثمالی اور جنوبی مصر کی ملکہ ہے۔ ہر گاہ کہ یہ بات ہماری سماعت تک پہنچی ہے کہ تم نے اپنے عہد و بیان اور فرض عین کے برعکس اپنے سپہ سالار اور قبرص کے گورنر کو یہ ہدایت کی کہ وہ ہمارے خلاف ییزر کے قاتل اور باغی کلیسیا کی مدد کرے ہر گاہ کہ ہمیں موثر ذرائع سے معلوم ہوا کہ تم ہماری مخالفت کے لئے عظیم الشان فوج تیار کر رہی ہو ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم کسی قسم کے توقف اور میل محبت کے بغیر فوراً اسیقیہ آؤ اور ہمارے سامنے حاضر ہو کر ان الزامات کا جواب دو جو تمہارے خلاف عائد کئے گئے ہیں ہم تمہیں تنبیہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے ہمارے حکم کی تعمیل نہ کی تو یہ بات تمہارے لئے خطرہ سے خالی نہ ہوگی۔“

ملکہ نے یہ بلند بانگ الفاظ سنے تو اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں اور اس نے کہا۔ ”تم نے ہمارے سامنے بڑے طعرات سے قصیدے خوانی کی اور اب اس کی ملاوٹ دور کرنے کے لئے ایک تلخ دوا پیش کر رہے ہو ہم نے تمہارے آقا کا مراسلہ سنا جس کو طبعی کا فرمان کہنا زیادہ مناسب ہے اب اس کا جواب سنو وہ الزامات جو اس مکتوب میں درج ہیں حقیقت سے بالکل بےید ہیں لیکن پھر

بھی ہم اپنے سیاسی افعال کی صفائی تمہارے سامنے پیش نہیں کریں گے اور نہ دور دراز کا سفر کر کے ایک ادوی مجرم کی حیثیت سے معزز انتہی کی عدالت میں حاضر ہوں گے اگر انتہی ہم سے گفتگو کرنے کا خواہاں ہے اور ان امور کے متعلق ہم سے باز پرس کرنا چاہتا ہے تو سمندر کا راستہ کھلا ہے وہ ہمارے پاس آئے ہم اس کا شاہانہ استقبال کریں گے۔“

سفیر نے ملکہ کی آتش غضب فرو کرنے کے لئے ہلکا سا تبسم کیا اور نہایت متین لہجے میں کہا۔

”ملکہ مصر آپ انتہی کی طبیعت سے واقف نہیں ہیں اس کی تحریر سے ایسا لگتا ہے کہ اس کا قلم ایک نیزہ ہے اور سیاہی انسانی خون مگر جب آپ اس کو دیکھیں گی تو وہ آپ کو بہت ہی سلیم الطبع اور نرم مزاج معلوم ہوگا اس لئے بہتر یہی ہے کہ آپ اس کے حضور چلیں اور مجھے سخت الفاظ کے ساتھ واپس نہ کریں۔ کیونکہ اگر انتہی اسکندر میں آگیا تو پھر مصر اور اس کے باشندوں کی خیر نہیں ہوگی۔“

”وہ آئے گا اور لشکر جرار لے کر آئے گا جنگ و جدل کی نیت سے آئے گا پھر آپ کے لئے بہت مشکل ہوگا کہ آپ روما کی بے پناہ طاقت کا مقابلہ کریں اس لئے میں استدعا کرتا ہوں کہ آپ ضرور اس کے فرمان کی تعمیل کریں اگر آپ اپنے حسن کے ساتھ بہترین ملبوس پہن کر اس کی خدمت میں جائیں گی تو آپ کو اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔“

سفیر کی بات ختم ہوئی اور ملکہ کو ہر مقصد پر معنی نظروں سے دیکھنے لگا، ہر مقصد نے اس کا مطلب سمجھ لیا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ملکہ نے بھی اس کا مطلب سمجھ لیا اور اس کی آنکھوں میں خیالات کا ایک سیاہ بادل اٹھنا دکھائی دیا وہ تھوڑی دیر اپنی تھوڑی کوتاہ کا سہارہ دینے بیٹھی رہی اور عیار سفیر اس کو غور سے دیکھتا رہا اس کی منہ پڑھا کینہ اور بچا ذات بہن بھی دوسری حسین لڑکیوں کے ساتھ کھڑی تھی اس نے سفیر کا مطلب سمجھ لیا تھا اور اس کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا جس طرح ابر بہار شفق کی روشنی میں سرخ ہو جاتا ہے

اور اس کے پیچھے بجلی کی چمک دکھائی دیتی ہے۔
ملکہ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”معزز سفیر یہ اہم معاملہ ہے ہم اس کا جواب کامل غور و خوض کے بعد دینا چاہتے ہیں اس لئے تم یہاں کچھ قیام کرو اور ہماری محدود استطاعت کے مطابق خوش دلی سے سہراوقات کرو ہم تمہیں دس دن کے اندر، اندر اپنے فیصلے سے آگاہ کریں گے۔“

سفیر نے تھوڑی دیر مائل کیا پھر تبسم کرتے ہوئے کہا۔ ”بہت اچھا میں پورے دس دن بعد خدمت میں حاضر ہوں گا اور گیارہویں دن اپنے آقا کی خدمت میں روانہ ہو جاؤں گا۔“

ایک بار پھر ملکہ کے اشارے پر رومی سفیر کی سلامی اتاری گئی اور وہ آداب بجا کر رخصت ہو گیا۔

اے میرے جدید دور کے طاقتور انسان اب اس کہانی میں میرے آقا انتہی اعظم کا ذکر ہے انتہی آدمی تھا اور اس کی طاقت بے پناہ تھی مصر اور دنیا کی ساری فوجیں اس کے فوجی بیڑے کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں اس کی سمندری جہاز اتنے بڑے تھے کہ ہزاروں سپاہیوں کے رہنے کی گنجائش تھی وہ جس سمندر کی بندرگاہ پر رک جاتے تھے ان کی حکومت ہو جاتی تھی ملکہ مصر کی فوجیں اس کے مقابلے میں کھڑی نہیں ہو سکتی تھیں یہ بات ملکہ مصر خوب جانتی تھی مگر اس کے پاس ایک ہتھیار ایسا ضرور تھا جس کا توڑ انتہی جیسے طاقتور بادشاہ کے پاس بھی نہیں تھا وہ تھا اس کا حسن جہاں سوز اور اس حسن کے استعمال کا طریقہ اس کا بائنگلن اس کے طور طریقے اور طرز گفتگو مردوں کی کمزوریوں پر اس کی نظر کس مرد کو کس انداز سے برتا ہے یہ ملکہ مصر کا کمال تھا بے شک وہ ایک پوری فوج کے برابر تھی۔“

روا کو لا بولا۔ ”تم نے ملکہ قلوپٹرہ کے بارے میں بیان کیا مگر اے بوڑھی روح میں ایک مریض کو لے کر آیا ہوں تم نے اس کے بارے میں نہیں بتایا کہ وہ مریض ہندوستان میں پیدا ہوا اس نے نہ مصر کی سرزمین دیکھی اور نہ کوئی تعلق اس سرزمین سے رہا پھر وہ مصر کی زبان بولتا ہے

کرتے ہیں اور خود گول کا یہ انوکھا سفر ہے۔ اس سفر میں اب تک کسی قسم کی پریشانی نہیں آئی حالانکہ وہ جس مقام پر قیام پذیر ہیں یہاں کے بارے میں وہ صرف یہ جانتا ہے کہ یہاں پر آ کر آدمی گم ہو جاتا ہے یا باگل مگر ان کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا وہ رولو کا کی سادہ نظر آنے والی شخصیت ہے اس درجے متاثر تھا کہ نظریں جھکا کر بات کرتا تھا۔

چاندنی نہیں تھی ہر طرف اندھیرے کی چادر پھیل چلی تھی قاسم اور زلیخا اپنی چھو لہاری میں جا چکے تھے گول بھی اندر تھا اور اور رولو کا اپنی جگہ پر موجود تھا۔

آواز آئی۔ ”اب صبح آقا نئی اعظم کا ذکر ہوگا۔ ہر مقلد کو ملکہ نے طلب کر لیا ہر مقلد اس کی خلوت گاہ میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ملکہ کی طبیعت بہت بے چین ہے اس سے پہلے وہ کبھی اتنی مضطرب نہیں ہوئی تھی وہ کہتی تھی اور ایک سفید شیرنی کی طرح سنگ مرمر کے خوش اصرار اصرار رہتی تھی۔“

اور اس کے دل پر مختلف قسم کے خیالات میں اس کے افق دل پر لہرا رہے تھے کسی بھی اس کے خیالات کا لمس اس کی گہری نیلگوں آنکھوں میں بھی دکھائی دیتا تھا۔

ہر مقلد کو ملکہ کردہ کھڑی ہوئی اور ہر مقلد کا ہاتھ پکڑ کر ”تم سب گئے میں بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہی تھی لیکن آج مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت ہے، تم دیکھ رہے ہو کہ میری زندگی کن مصیبتوں کا شکار ہے میں بچپن سے ہی غل غل کا شکار ہوں اور ایسا لگتا ہے کہ آخری دم تک ایسا ہی ہوگا۔“

تم نے مجھے لقمہ اجل بنانے کی کوشش کی اور میری جان جانے میں صرف ایک نقطے کی کسر رہ گئی اور اب دفعۃً ایک نئی پریشانی ایک نئی مشکل طوفانِ خراس کی طرح خط افق کے نیچے نمودار ہو کر میرے دل پر چڑھ گئی ہے آج تم نے اس تند مزاج اور غرور سے بھرے ہوئے رومی سفیر کو دیکھا اس کا لہجہ کتنا نرم تھا وہ بالکل گربہ مسکین

جو کہ عظیم انتمی اور قلوب پرہ کے زمانے میں بولی جاتی تھی اس کا مطلب ہوا کہ کوئی ایسی روح ہے جو اس کے اندر طول کر جاتی ہے اور وہ روح تمہارے زمانے کی ہے تم مجھے اس کے بارے میں بتاؤ اگر نہیں بتاؤ گے تو تم جانتے ہو میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔“

”ارے اس دور کے انسان میں نے پہلے دن ہی تیرے بارے میں اندازہ کر لیا تھا تجھے سب کچھ بتاؤں گا مگر تو یقین کر مجھے پتہ نہیں ہے کہ وہ کون سی روح ہوگی مگر ایک بات میں یقین ہے کہ ملکہ ہوں کہ میرے مریض کا تعلق مصر کی سرزمین سے کسی نہ کسی طرح ضرور بنتا ہے ہو سکتا ہے اس کے آباء اجداد مصر کے قدیم باشندے ہوں، کچھ اور بھی کچھ نہیں بتایا جا سکتا اس کے لئے تم کو انتظار کرنا ہوگا کیونکہ مصر کی سرزمین پر ہزاروں سال پرانی رو جس موجود ہیں ان میں کسی ایک کو انتظار کرنا آسان نہیں میں پتہ کر لوں گا اور میری بتاؤں کا مگر میرے طاقتور دوست تجھے مجھ پر اعتبار کرنا ہوگا اور انتظار کرنا ہوگا۔“

”میں زندگی بھر تو انتظار نہیں کروں گا تیری تو کوئی عمر نہیں، زندہ انسان کی تو ایک عمر ہوتی ہے۔“ رولو نے جواب دیا۔

بوڑھی آواز آئی۔ ”میرے جانتا تو انتظار کرنا ہوگا میں اگر اس سے پہلے بتا سکتا تو بھی بتا دوں گا۔“ وہ آواز بند ہو گئی کیونکہ رات کا سفر ختم ہو رہا تھا اور سورج کی آمد آمد کی گول کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ قافلہ اس ٹکری کے دامن میں کیوں رکا ہوا ہے اندازے اس کے تھے مگر کوئی

واضح صورت نہیں تھی نہ تو اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ حکیم کی شکل میں نظر آنے والا شخص معمولی نہیں اس میں ضرور کچھ ایسا ہے کہ پتہ نہیں چلتا کھانے کی اشیاء اور ہر وہ چیز جو کھانا ہونہ کم ہوتی ہے نہ خراب پانی کی مشقیں ہر وقت بھری رہتی ہیں اور کسی قسم کے کیڑے مکوڑے چھو لہاریوں سے دور رہتے ہیں قاسم اور زلیخا بھی خوش ہیں انہوں نے ایک انوکھی اور نئی زندگی دیکھی ہے وہ صحرا میں بھی دور تک تفریح

کھاتے۔

لیکن تم فرعون مصر نہیں ہو تم جانتے ہو کہ اہل مصر مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ اس کا زندہ ثبوت تمہاری اپنی سازش جس میں تقریباً آدھا ملک شامل تھا اس سے تم اندازہ کرو جب صورت حال یہ ہو تو میں کس طرح حملہ آور کا مقابلہ کر سکتی ہوں اگر اہل مصر میں وفاداری کا دم بھریں تو میں بے خوف ہو کر رومی فوجوں کا مقابلہ کر سکتی ہوں مگر دوسری صورت بھی ہے کہ میں کرائے کے سپاہی حاصل کروں اس کے لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ رومیہ کہاں سے حاصل کیا جائے پچھلی جنگوں نے مجھے مفلس کر دیا ہے اگرچہ مصر میں دینے بہت ہیں پھر بھی میں ان کو حاصل کرنے سے قاصر ہوں۔ میرے دوست تم ان اہراموں کے موروثی کا بن ہو تمہارا باپ بھی کا بن اعظم ہے اس لئے تم کو تمہارے باپ نے کسی پوشیدہ خزانے کا راز ضرور بتایا ہو گا تم بتاؤ وہ خزانہ کہاں ہے۔“

یہ سوال کرنے کے بعد ملکہ ہرمیس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر خاموشی سے اس کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ ہرمیس خاموش تھا پھر بولا۔ ”محترم ملکہ بالفرض یہ روایات ہوں اور مجھے پتہ ہو کہ کوئی خزانہ موجود ہے اور میں آپ کو اس خزانے کا پتہ بھی آپ کو بتا سکوں جو فرعون مصر نے مصر کی ضرورت کے لئے فراہم کر رکھا ہے تو میں کیسے یقین کر لوں کہ آپ اس کو درست طور پر استعمال میں لائیں گی۔“

ملکہ مصر نے فوراً جواب دیا۔ ”تم میری ضروریات اور خیالات سے واقف ہو پھر تم کیوں سمجھتے ہو کہ میں اس دولت کو درست طریقہ پر استعمال نہیں کروں گی، میرے اچھے دوست اگر خزانہ ہے تو مجھے بتاؤ مجھے مزید تنگ نہ کرو۔“

ہرمیس نے کہا۔ ”یہ خزانہ ایک اہرام میں موجود ہے اگرچہ میں نے اس کو دیکھا نہیں ہے لیکن یہ جانتا ہوں کہ اب تک فرعون مصر میں سے کسی نے دینے کو ہاتھ

کی طرح اظہارِ عجز کرتا تھا اور ساتھ ہی شیروں کی طرح پنجے بھی دکھاتا تھا کیا تم نے اس کا وہ بھاری پنجہ دیکھا میرے خدا وہ کتنا خوفناک تھا لیکن ڈرنے کی بات نہیں میں انٹی کو اچھی طرح جانتی ہوں میں کس کتنی جھج میں نے اس کو دیکھا تھا اس کی شخصیت کا مجھے اندازہ ہے وہ بے شک بہادر ہے لیکن ساتھ ہی پر لے درجے کا بے وقوف بھی ہے جو شخص اس کی محبت کا دم بھرتا ہے وہ اس پر اپنی جان تک قربان کرنے پر تیار ہو جاتا ہے وہ انکساری کی حالت میں موجوں کی طرح سمٹا رہتا ہے لیکن غرور کی ہوا گلے ہی لباب کی طرح آپے سے باہر ہو جاتا ہے کثرتِ ذراں کو عیش و عشرت کی طرف مائل کر دیتی ہے اور وہ عورتوں کا غلام بن جاتا ہے یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ وہ روما کا سب سے بڑا آدمی بن گیا ہے اور تمام دنیا اس کے رعب سے تھر تھرا کھپتی ہے اس قسم کا عروج عموماً عارضی ہوتا ہے پھر بھی جب تک اس کا ستارہ روج پر ہے وہ دنیا پر سمندر کی طرح چھایا رہے گا اور ہماری تباہی پر خندہ زن ہوگا۔“

ہرمیس نے جواب دیا۔ ”آخر انٹی بھی ایک انسان ہے اور اس کے ہزار ہا دشمن ہیں اگر ہم کوشش کریں تو اس کا اقتدار خاک میں ملایا جاسکتا ہے۔“

ملکہ نے کہا۔ ”تم درست کہتے ہو لیکن یاد رکھو اگر میں جواب دہی کے لئے اس کے دربار میں نہ جاؤں تو وہ اپنی پوری طاقت سے مصر پر حملہ کر دے گا پھر بتاؤ ہماری کیا حالت ہوگی۔“

ہرمیس نے جواب دیا۔ ”انٹی ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے اگر اس نے مصر پر حملہ کیا تو ہم اس کو مار مار کر روما کی طرف بھگا دیں گے۔“

”اس کے ساتھ یہی ہونا چاہئے لیکن موجودہ حالات میں ایسا ہونا نامکن ہے میں ایک عورت بے دست و پا ہوں میری جگہ پر اگر تم فرعون مصر ہوتے تو مصر کے باشندے ایک دل ہو کر تمہاری مدد کرتے اور تم اپنے ارادے کو عملی طور پر کامیاب بنا کر د

لگانے کی جرأت نہیں کی ہے کیونکہ جس نے یہ خزانہ جمع کیا ہے اس نے وصیت کر دی ہے کہ جو یہ خزانہ بلاوجہ نکالے گا وہ شدید مصیبت کا شکار ہو جائے گا۔“

ملکہ نے کہا۔ ”اس سے تو ایسا لگتا ہے کہ یا تو قدیم فرماں روا بہت بزدل تھے یا ان کو کوئی بڑی ضرورت پیش ہی نہیں آئی اس لئے مجھے یقین ہے کہ وہ خزانہ قدرت نے میرے لئے محفوظ رکھا ہے۔ اب مجھے بتاؤ کہ وہ بے بہا خزانہ کس جگہ پوشیدہ ہے تاکہ میں اس کو مصر کی حفاظت کے لئے کام میں لاؤں گا۔“

ہر مقس ملکہ کی بات سن کر خاموش ہی رہا اور اس کی آنکھیں دور کہیں خداؤں میں لگی رہیں۔ ملکہ اس کے جواب کی منتظر رہی مگر ہر مقس خاموش تھا کچھ دیر ملکہ اس کے جواب کا انتظار کرتی رہی مگر زیادہ دیر اس سے صبر نہ ہوا اور بے چینی سے بولی۔ ”میں تمہارے جواب کا انتظار کر رہی ہوں۔“

ہر مقس نے جواب دیا۔ ”میں یہ بات آپ کو اس وقت تک نہیں بتا سکتا جب تک آپ قسم نہ کھائیں کہ اس خزانے کو مصر کے تحفظ کے کام میں لایا جائے گا۔“

ملکہ نے فوراً کہا۔ ”میں مصر کے تمام خداؤں کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اگر تم مجھے یہ شاندار خزانہ بتا دو تو میں اس کو مصر کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کروں گی اور سفیر کو ان سے تلخ تر الفاظ کے ساتھ واپس بھیجوں گی جن کو لے کر وہ میرے پاس آیا ہے اس کے ساتھ یہ وعدہ بھی کرتی ہوں کہ میں تمہارے ساتھ شادی کروں گی اور تم خود مصر کی جنگ آزادی کی تیاری کرو گے۔“ یہ کہہ کر ملکہ نے ہر مقس کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور ہر مقس نے اس کی خلوص نیت کا یقین کر لیا ہر مقس نے سوچا ابھی اس کی کامیابی کی راہیں مکمل بند نہیں ہیں ملک کا شریک سلطنت بن کر اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کر لوں گا اس خیال نے ہر مقس کے دل میں ایک مسرت کی لہر دوڑادی مگر پھر بھی اس

نے مزید اطمینان کے لئے پوچھا۔

”کیا ایک بار پھر اپنی قسم کو دہرا سکتی ہیں۔“

ملکہ نے کہا۔ ”میں دوبارہ قسم کھاتی ہوں اور اپنی قسم

پر اس طرح مہر تصدیق ثبت کرتی ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے ہر مقس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس نے بھی ملکہ کی پیشانی کو چوما اور پھر ملکہ اس امور پر بات کرنے لگی جن کا اس کی شادی کے بعد انجام دیا جانا ضروری تھا زیادہ اہم یہ تھا کہ انٹی کو کس طرح روما کی طرف بھگانیں گے۔

”اے میرے جدید دور کے استان یہ عورت کی چالاک اور فتنہ پروری کی داستان ہے۔ ہر مقس جیسا ہوشیار آدمی اور اپنے وقت کا مانا ہوا منجم ستارہ شناس جنگ جو بہادر، ملکہ قلو پطرہ کی چال میں آ گیا اور اس کے اشارے پر چلتا گیا ملکہ کے دل میں کیا تھا ہر مقس ذرا نہ سمجھ سکا اور ذلالت بدنامی اس کا مقدر بنی مگر اب میرا وقت ختم ہوا۔“

اور آواز بند ہو گئی رولو کا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

ڈرڈا انجسٹ کا مشہور و معروف سلسلہ قسط نمبر 35 سے قسط نمبر 46 تک مکمل اور طویل ترین داستان حیرت کتابی شکل میں تیار ہے۔

نمبر ④

رولو کا

پراسرار قوتوں کا مالک

قیمت -/150

تحریر: اے وحید

ڈریپل کیشنز

کتاب مارکیٹ نیو اردو بازار کراچی

Ph:32744391